مُدیر

ساغر نظامی

"ASIA" MEERUT:-

حضرت اشرف نواب میر یوسف علی خان بہادر سالار جنگ ثالث

برّاعظم ایشیا میں علوم و فنونِ لطیف کے عظیم المرتبت سرپرست اور اُردو زبان کے سب سے بڑے حامی کے نام

میں ہندوستانی ادب کی اس کوشش کو جو ایشیا کی سہ ماہی جلد اوّل کی صورت میں نمودار ہوئی ہے

حضرت اشرف امیر الامراء نواب میر یوسف علیخاں
بہادر سالار جنگ ثالث

دام اقبالہٗ

کی ذات سے منتسب کرنے کی عزّت حاصل کرتا ہوں کہ نواب سالار جنگ بہادر دورِ حاضر میں مشرقی علوم و ادبیات کے سرپرست اور خاص کر اُردو زبان کے سب سے بڑے حامی ہیں

دعا گوئے دولت و اقبال

ساغر نظامی

ہندوستانی زبان و ادب، مشرقی تہذیب و تمدن، اور مشرق کی روح آزادی کی پیشکش

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

ایشیا

زیرِ سرپرستی

زعیم قوم پرور عالی جناب ڈاکٹر سید محمود مدظلہ
وزیر تعلیم و ترقی صوبہ بہار

رفیق
حضرت جگر مراد آبادی
سید فرید جعفری (لندن)

اڈیٹر
ساغر نظامی

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

"بادۂ مشرق" پر ملک کے مشہور مزاح نگار ادیب حضرت شوکت تھانوی کی مزاحیہ تنقید

تنقید ۱۹۵۶ "بادۂ مشرق"

۱۵

"یہ کتاب ان لوگوں کے لئے مفید ہے جو اپنی گوناگوں مجبوریوں سے عملی دنیا میں قدم قدم پر جھوٹے حلف اٹھانے کیلئے مجبور ہیں"
(شوکت تھانوی)

"بادۂ مشرق آزادی کا آئینہ ہے" (عبدالاحد شرف الدین پوری)

"جن نادر اور جدید طریقوں سے اسکے (بادہ) اوراق کو آراستہ کیا گیا ہے ان کی مثال ہندوستانی طباعت میں تو کجا انگریزی مطبوعات میں بھی ہم نے اب تک کم دیکھی ہے۔"
(ادبی دنیا لاہور)

بادۂ مشرق سے سرشار ہو کر بے ساختہ یہ الفاظ زبان سے نکلتے ہیں کہ شباب، رنگینی اور موسیقی اس کلام کے عناصر ہیں اور ان اشعار میں ساغر کی وطن پرست آزاد روح بول رہی ہے۔
(رسالہ ادبی دنیا لاہور)

بادۂ مشرق کی اشاعت جس تزک و احتشام کی حامل ہے وہ اردو کی مطبوعہ کتابوں میں اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ آرٹ، حسن، تصور اور نفاستِ تخیل کا کوئی پہلو نہیں ہے جو اس کتاب کی ترتیب و تنظیم میں نظر انداز کر دیا گیا ہو۔
"تیج دیلی" ۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء

ادبستانِ مشرق کی یہ ایک عظیم الشان اور نادر تصنیف ہے۔ جس میں جناب ساغر کا کمالِ شاعری اپنی تمام رعنائیوں، رنگینیوں، میگساریوں، اور شعلہ افشانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔
تیج دیلی۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء

۲

از حضرت شوکت تھانوی

اس سے قبل کہ کچھ اور عرض کیا جائے ضرورت اسکی ہے کہ ساغر صاحب سے اپنے تعلقات کو واضح کر دیا جائے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ ساغر صاحب میرے دوست ہیں مگر دوست کیوں ہیں یہ ایک طویل داستان ہے اور چونکہ داستان پُر لطف ہے لہذا حکایاتِ لذیذ کے ماتحت آتی ہے جنکو طوالت سے بیان کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس حکایتِ لذیذ کو بھی شارٹ ہینڈ میں بیان کر جاؤں اور قطرہ میں دریا والا شاعرانہ مضمون ذرا دادِ طلب انداز سے "باندھ" جاؤں۔ ہاں تو۔ ساغر صاحب میرے دوست محض اسلئے ہیں کہ میں دشمنی کر کے ان سے جیتنے سے قاصر تھا۔ دشمنی بھی اور کر کے دیکھا کہ یہ دال گلنے والی نہیں ہے۔ اکثر ادبی اور شعری مجالس میں ان کا ساتھ ہوا مگر اس طرح کہ وہاں گویا وہی وہ تھے ہم جیسے تھے ہی نہیں۔ وہ چونکہ خوبصورت ہیں لہذا سب نے ان ہی کو دیکھا اور ان کے حسن کے مقابلہ میں ہماری قابلِ برداشت اور "خیر" قسم کی صورت کسی نے دیکھی نہیں۔ وہ چونکہ خوش آواز ہیں اور ان کے حلق میں بجائے رگ پٹھوں کے ہارمونیم کے پردے اتفاقاً لگ گئے ہیں لہذا سب نے ان ہی کو سنا اور جو کچھ ہمنے سنایا وہ گویا سنا یا ہی نہیں۔ یہ تمام منزلیں بھی گذر گئیں اور اس طرح گذریں کہ ہم نے ساغر صاحب

کو دیکھ کر اپنے سلسلہ میں فطرت کے بخل پر دانت پیسے۔ ان کی محبوبیت کے درجہ پر پہونچی ہوئی ہر دلعزیزی پر ٹھنڈی سانسیں بھریں۔ جلے۔ کڑھے۔ خودکشی کو دل چاہا سینکڑوں قاتلانہ پروگرام بنائے لیکن جب ان میں سے کسی میں کامیابی نہ ہوسکی تو دل کو یہ سمجھا کر مطمئن کرنا چاہا کہ لاحول ولا قوۃ یہ بھی کیا تخیل ہے۔ ہم ساغر سے برے ہیں تو کسی سے اچھے بھی تو ہوں گے وہ ہم سے خوش آواز ہیں تو ہم خود مولانا تاجور سے حامد اللہ صاحب افسر سے امین صاحب سلونوی سے ؟ اور اسی قسم کے تمام ہیبتناک پڑھنے والوں سے خوش لحن ہیں اور اگر یہ نہ بھی ہو تو آخر ان خیالات کے ماتحت انسان کب تک مرے کہ ہمکو نظام حیدر آباد کیوں نہیں بنایا۔ ہم رضا شاہ کیوں نہیں ہیں اور میری پیکفورڈ ہمارے گھر میں سے کیوں نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی حکیمانہ تسلیوں سے دل کو قابو میں لائے اور جب کچھ نہ بنائے بن پڑی تو آخر میں یہی طے کیا کہ ہم خود بھی کیوں نہ ساغر کے مداح بن جائیں۔ ان کو دوست بنائیں۔ ان سے محبت کریں اور ان کی خوبیوں پر جلنے کے بجائے خوش ہوں یہ اسکیم ہنوز معرض بحث میں آکر منظور نہ ہونے پائی تھی کہ جناب ساغر نظامی نے اپنا مجموعۂ کلام بادۂ مشرق کے نام سے شائع کر دیا۔ جسکو دیکھ کر ایک گھونسہ کلیجہ پر اور لگا اور بے ساختہ ہمارے دل نے کہا کہ اب بتایئے جناب شوکت صاحب کہ آپ کے گہرستان کو لوگ دیکھیں گے یا اس بادۂ مشرق کو ؟ مگر ہم نے پھر اپنے کو سنبھالا اور اب یہ طے کر لیا کہ واقعی اس شخص سے سوائے اس کے کہ خلوص کیا جائے اور کوئی صورت امن سے زندگی بسر ہونے کی نہیں معلوم ہوتی۔

یہ ہے ساغر صاحب سے مین ابتدائے ملاقات اول تا نہایت طباعت بادۂ مشرق تعلقات کا خلاصہ۔ اس کے بعد بجائے اس کے کہ میں ان تعلقات کے موجودہ دور پر روشنی ڈالوں ذرا مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں بادۂ مشرق کی طرف بہک جاؤں اور اردو زبان اور مشرقی لٹریچر کے اس تاریخی اضافہ کے سلسلہ میں کچھ عرض کر دوں۔

یہ کتاب ۲۴۶ صفحات پر محیط ہے اور ان حضرات کے لئے نہایت مفید ہے جو اپنی گوناگوں مجبوریوں کے ماتحت عملی دنیا میں قدم قدم پر جھوٹے حلف اٹھانے کیلئے مجبور ہیں کہ وہ اس کا ایک نسخہ پانچ روپیہ میں ادبی مرکز میرٹھ سے منگا کر ایک جزودان میں رکھ لیں اور اس قسم کے موقع پر نہایت آسانی کے ساتھ اسکو اٹھا کر سر پر رکھ لیا کریں۔ اسکے بعد بھی اگر ان کی قسم پر کسی کو شک ہو جائے تو ہمارا ذمہ۔ رہ گئے صاحبان ذوق حضرات وہ اس حجیم۔ جمیل۔ ثقیل اور باوجود اس دبازت کے لطیف مجموعہ سے زندگی بھر سر دھن سکتے ہیں۔ معاف کیجئے گا میں اس سلسلہ کے اس گوشہ میں پہونچ گیا جہاں اب سے کچھ دیر بعد پہونچنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ میں اس مجموعہ پر از بسم اللہ تا تائے تمت نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

مجھ کو ساغر صاحب نے جو کاپی عنایت فرمائی ہے اور جسکے متعلق خاص طور پر یہ بات کان میں کہدی ہے کہ کسی سے کہنا نہیں کہ یہ ہدیہ ہے۔ بلکہ کہنا کہ خریدی ہے" اس جلد کے سرورق پر ہندوستان کے فیشن ایبل مصور مسٹر سمیع کا موقلم بجائے خود شعر کہتا ہوا نظر آرہا ہے۔ سمیع صاحب یوں تو مصور بھی ہیں اور مصور بھی مگر اس ٹائٹل میں تو گویا خود ہی کھنچ کر رہ گئے ہیں اور ٹائٹل ہی پر کیا منحصر ہے اس مجموعہ کے ہر باب کے سرورق کو آپ ہی نے مصور کیا ہے اور ہر جگہ آپ کے نقش ونگار ذی حیات نظر آتے ہیں یقیناً قیامت کے دن ان کو ان تمام نقوش میں روح پھونکنا پڑیگی۔ سرورق کے بعد دوسرا سرورق خوشۂ انگور پر بنایا گیا ہے جسمیں ساغر صاحب کا نام سچ مچ ساغر نظر آتا ہے اور ہر انگور سے شراب کھنچتی، رستی اور برستی معلوم ہوتی ہے۔ ان مختلف ٹائٹلوں کے بعد انتساب ہے جو نواب سر سالار جنگ ثالث کے نام سے ہوا ہے۔ انتساب کے ساتھ ہی سر سالار جنگ بہادر کی تصویر بھی ہے جو ایسے رُخ سے کھینچی گئی ہے کہ آپ خود ساغر کا استقبال کرتے نظر آتے ہیں۔ انتساب اور صاحب انتساب کے بعد فہرست ہے اور اس فہرست کے مطابق سب سے پہلے بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کا مقدمہ ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو اول تو خود شاعرہ ہیں۔ دوسرے عورت ہیں۔ تیسرے ہندوستان کی سرکش قوم کی خاتون سپہ سالار کی حیثیت سے یوں بھی ان کو تکلفات کی ضرورت نہ تھی۔ پھر یہ کہ وہ ساغر سے کیا ساغر کی خداوند نعمت حکومت سے بھی دینے والی نہیں مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنے اس مقدمہ میں ساغر کی شاعرانہ اہلیت کا نہایت وسیع النظری کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ یہ مقدمہ تو خیر ایک ضابطہ کی چیز ہے مگر میں نے تو مسز نائیڈو کو اس عالم میں بھی دیکھا ہے کہ لکھنؤ کانگریس سشن کے مشاعرے میں آپ صدر ہیں ساغر شراب کے رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے پھولدار صوفے پر اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں کہ گویا اس صوفہ کا کوئی گلاب جھوم کر ساغر بن گیا ہے۔ مسز نائیڈو اپنا خطبۂ صدارت ارشاد فرمانے کے لئے کھڑی ہوتی ہیں اور ادب و شعر پر عالمانہ بحث کرتے کرتے فرماتی ہیں کہ ہندوستان کے گلستان

کی جان اب ایسے ایسے گلاب ہیں" ایسے ایسے" کا اشارہ ساغر کی جانب تھا اور اشارہ بھی کس کا بلبلِ ہند کا۔ تمام مجمع مسکرایا اور ساغر ہنس کر سچ مچ گلاب بنگئے سروجنی دیوی کے اس مقدمہ کے بعد دیباچے شروع ہوئے ہیں۔ پہلا دیباچہ حضرت خواجہ حسن نظامی کا ہے جسمیں وہ اپنے مخصوص روسی طرزِ نگارش کے ساتھ نمایاں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس دیباچے کے ہر لفظ میں خواجہ صاحب مسکرا مسکرا کر اپنے ایک مرید پر فخر فرما رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کے بعد دوسرا دیباچہ مولانا سیماب اکبرآبادی کا ہے اور خوب ہے۔ آدھا نثر میں آدھا نظم میں اور دونوں ڈیڑھ صفحہ کے اندر۔ تیسرا دیباچہ مولانا انجمن ترقیٔ اردو کا ہے۔ یہ دیباچہ ذرا علمی قسم کا ہے۔

ان دیباچوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے کہ درمیان میں مسز ہیسٹر مردن ہینڈلے واشنگٹن امریکہ کی مشہور آرٹسٹ خاتون کا چارکول سے تیار کیا ہوا ساغر کا اسکیچ ہے جسمیں ساغر کے تمام خط وخال پورے طور پر نمایاں ہیں اور بحیثیت مجموعی معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ کلایو کا تخلص ساغر تھا اور تاریخ کی جدید دریافت یہ ہے کہ لارڈ کلایو خواجہ حسن نظامی صاحب کے مرید بھی تھے غالباً یہی وجہ ہے کہ انگریز قوم کو خواجہ حسن نظامی صاحب کے وطن ہندوستان سے محبت پیدا ہوئی اور آج خواجہ صاحب کا وطن دہلی ہندوستان کا پایۂ تخت بنا ہوا ہے۔ اسکیچ بھی ساغر کی زندگی کے اہم واقعات میں سے ایک واقعہ ہے انجیل میں تو یہ آیت نہیں مگر کسی اور مذہبی کتاب میں ضرور ہوگی کہ "مبارک ہے وہ ہندوستانی جسکی تصویر کشی بطور اعتراف فن مس میری کی ایک بہن اپنی مرمریں انگلیوں اور اپنی بلور کی بنی ہوئی کلائیوں سے کرے، اس لئے کہ وہ جنت میں حوروں کا مالک ہوگا"۔

اس اسکیچ کے بعد ایک دیباچہ اور ہے جو ڈاکٹر سید محمود صاحب نے لکھا ہے جسمیں آپ فرماتے ہیں

"یہ نوجوان شاعر اردو شاعری اور اردو انشا پردازی میں بہت سی جدتوں کا موجد ہے
اسکی شاعری روحانیت، نازک خیالی، تخیل۔ فلسفیانہ رفعت۔ شباب، زندگی۔
جذبات محبت۔ اور خاص کر جذبات حب الوطنی سے پُر ہے"۔

۔اعتراف۔ اعتراف ہے یا محبت اس کو ساغر صاحب جانیں بہرحال اگر اعتراف نہیں بلکہ محض اظہار جذبات ہے تو بھی بُرا کیا ہے۔ مگر ڈاکٹر محمود کا ایسا ذمہ دار فرد محض اظہارِ جذبات کے لئے اس قدر نہیں کہہ سکتا لہٰذا معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان پر ساغر کا واقعی یہ اثر ہے۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ اثر صرف ہم ہی پر ہوا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ کم سے کم اس سلسلہ میں ہم بھی اپنے وقت کے ڈاکٹر محمود ہیں۔

دیباچوں کے بعد ساغر صاحب نے جرعات کے زیرِ عنوان گویا وہ چیز لکھی ہے جسکو ہم لوگ اپنی زبان میں عرض حال کہتے ہیں اور ان جرعات کے بعد گویا بادۂ مشرق کا دور شروع ہوتا ہے۔

میں یہاں ساغر نظامی کے شاعرانہ عیوب و محاسن کا شمار کرانا نہیں چاہتا اور نہ خواہ مخواہ تنقید میں ٹانگ اڑا کر خود بحیثیت مزاح نگار کے چاروں شانے چت گرنا چاہتا ہوں بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بادۂ مشرق کے متعلق اس رائے کو پیش کر دوں جو خود میں نے قائم کی ہے لہٰذا مجھ کو ذرا آزادی کے ساتھ چلنے دیجئے اور بہانے دیجئے جدھر میں جاؤں۔

ساغر صاحب کے متعلق ارباب علم۔ سخن سنجانِ ملک وملت۔ نقادانِ وقت اور اس قسم کے دوسرے ذمہ دار افراد کی جو رائے بھی ہو اس سے خالی الذہن ہوکر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس شاعرِ مشرق کو میرے محسوسات میں کیا حیثیت حاصل ہے۔

ساغر صاحب کے متعلق یہ مضمون لکھتے ہوئے خدا جانے کیوں میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہوا جا رہا ہوں۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں ڈر رہا ہوں یا بہا رہا ہوں یا ساغر صاحب کو کوئی مذہبی چیز سمجھتا ہوں یا ان کے بادۂ مشرق کو مسجد یا بانجہ قسم کی کوئی چیز سمجھتا ہوں حالانکہ ان میں سے کوئی بات نہیں۔ بلکہ واقعہ صرف یہ ہے کہ میں اس الجھن میں ہوں کہ آخر لکھوں تو کیا لکھوں۔ اس لئے بادۂ مشرق ساغر کے کلام کا مجموعہ ہے اور ساغر کو محبت کے مارے صرف میں ہی نہیں بلکہ عداوت کی وجہ سے ان کے حریف بھی شاعرِ وقت کہتے ہیں اور سچ پوچھئے تو ان سے عداوت کی وجہ ہی جلنے والوں کیلئے صرف

یہ ہے کہ وہ شاعرِ وقت کیوں ہیں! ؟

قصہ دراصل یہ ہے کہ ان حضرت نے شعر کہہ کر اور شعر سنا کر دنیائے شعر میں نئے نئے راستے پیدا کئے بلکہ یہ کہئے کہ آپ دنیائے شعر کے واسکوڈی گاما بنکر آئے اور ایک نئی دنیا دریافت کی۔ پہلے تو سخت مخالفتیں ہوئیں جس نے ساغر کو سنا وہی کھولا۔ جس نے ساغر کا کلام دیکھا وہی ڈنڈا لیکر تنقید لکھنے بیٹھ گیا۔ شعرائے کرام کے حاسد طبقہ میں کھلبلی سی مچ گئی، بڑے بڑے بُت انہدام کے خوف سے حرکت میں آگئے اور ساغر کو اس میدان سے ہٹانے، ان کو چپ کرنے، ان کو بے اثر بنانے مختصر یہ کہ ان کو ہر ممکن طریقہ پر دبانے کی پوری کوششیں ہوئیں مگر یہ جادو جاگ رہا تھا اور سروں پر چڑھ کر بول رہا تھا آخرکار اس واسکوڈی گاما نے اپنی دریافت کی ہوئی دنیا پر اپنا پرچم لہرادیا اور حکمرانی کرنے لگا۔ اب حکمرانی کرتے کرتے آپ کو خدائی کی سوجھی ہے اور بادۂ مشرق کے نام سے ایک کتاب نازل فرمائی ہے۔

مجھ کو ساغر کی غزلیں بھی پسند ہیں اور نظمیں بھی اردو بھی پسند ہے اور ہندی بھی مگر ان کا ہندی کلام تو بعض اوقات ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں لیڈرانہ انداز سے یہ کہوں کہ ساغر نے ہندی الفاظ کو اپنا کر جس طرح اپنے اشعار میں جگہ دی ہے اس سے ملک کی مشترکہ زبان کا مسئلہ خود بخود طے ہوجاتا ہے۔ جی نہیں ان امور کو تو ڈاکٹر محمود۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ گاندھی جی وغیرہ سمجھ سکتے ہیں مگر میں تو صرف اتنا سمجھا ہوں کہ ساغر نے اردو، ہندی یا فارسی کی کوئی قید ہی نہیں رکھی ہے بلکہ جس زبان میں ان کو جتنی شعریت نظر آئی اسکو بلا شرکت غیرے اپنا کر بیٹھ رہے۔ ہندی ہو یا اردو فارسی ہو یا سنسکرت یہ بھونرا ہر ایک کا رس چوس کر محض اپنی شیریں دہنی سے کام رکھتا ہے۔ بہرحال مجھ کو ساغر کی ہندی نظموں سے عشق ہے اور میں دنیا کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ شاعرِ مشرق کے اس رنگ کو دیکھ کر میرے معیارِ انتخاب کی تمیز داری کا فیصلہ کرے۔

صاحب، اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا ان کی نظم "روح کا شوالہ" بار بار یاد آرہی ہے۔ اس کا ایک بند سُن لیجئے۔

جیون میرا روپ بدل کر بن جائے اک ہار ان کے گلے کا ہار۔ بچاری میرا من سنگھار

مجھ کو گلے یوں پڑتے دیکھیں دیوی وہ من ہار گندھ جاویں اک ہار میں دونوں سنسار اور ساکار

تجھ کو کیوں ہے عار بچاری کچھ تو منہ سے بول

پٹ مندر کے کھول

میرا دعویٰ ہے کہ جھوم تو سب ہی جائیں گے خواہ اس کے بعد سوچ کر مخالفت کریں۔ خدا کرے سنسار اور ساکار کی طرح زبان اور رسم الخط کے معاملہ میں مولانا عبدالحق اور گاندھی جی یعنی انجمن ترقی اردو اور ہندی ساہتیہ سمیلن ایک ہی ہار میں گندھ جاویں اور وہ ہار یہی زبان ہو جسکی طرح ساغر نے ڈالی ہے یعنی "روح کا شوالہ" کی زبان جسمیں عار، سنسار، اور ساکار سب بغیر کسی امتیاز کے استعمال ہورہے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ یہ علیحدہ علیحدہ مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ خیر یہ تو ایک سنجیدہ بحث چھڑ گئی۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شعر میں جو نشتر، جو رس جو دیوانہ گری ہونا چاہئے کیا وہ اس چیز میں نہیں ہے جو ساغر نے پیش کی ہے اور جسکا ایک پرتو میں نے آپ کو دکھایا ہے اور سنئے ؎

ٹوٹ چکا اے ساجن درپن ٹوٹ چکا

کون اب دیکھے کون دکھائے ٹوٹے کو اب کون اُٹھائے

کس کی صورت اس میں آئے کس کی مورت اس کو بھائے

ساجن میرے من کا درپن

ٹوٹ کے بھی جوہر دکھلائے

ٹوٹ چکا اے ساجن درپن ٹوٹ چکا

میں ساغر کے کلام کے ہر رنگ کو کہاں تک پیش کروں گا اور کیونکر پیش کرنے کے بعد زندہ رہوں گا اسی رنگ پر مجھ کو جھومنے دیجئے اور اب میرا ساتھ دیجئے ایک چھوٹی سی نظم سنا کر میں اس مضمون کی اس قسط کو ختم کرتا ہوں۔

سندر نین رس بھرے، بھونرا رس کو آئے
کالی زلفیں موہنی جیسے بدری چھائے
دو بھر ہو جینا اُسے جو تم سے نیہہ لگائے
سسک سسک کر جان دے بلک بلک مر جائے
کیوں وہ اپنے داس کو درشن دینے آئے
کیوں وہ اپنے حسن کا روپ انوپ دکھائے
اے پریمی کیوں آس میں اپنے نین تھکائے
اس کی تو خود چاہ ہے بلک بلک مر جائے

گانے کو دل چاہتا ہے اور اگر آپ اسکو مزاح نہ سمجھیں تو گھنگرو باندھ کر ناچنے کو دل چاہتا ہے اور آخر میں مر جانے کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اب بتائیے کہ جب ایک مزاح نگار پر بھی ساغر کا کلام یہ اثر کر سکتا ہے تو سنجیدہ طبقہ کا کیا حال ہوگا!؟

شوکت

بادۂ مشرق محترمہ جہاں آرا بیگم صاحبہ شاہنواز ایم ایل اے کی نگاہ میں

ساغر نظامی، ہمارے اُن نوجوان شاعروں میں سے ہیں جو ہمیں مستقبل کا اُمید افزا پیغام دیتے ہیں۔ ہمارا قومی ادب پستی اور یاس کی گہرائیوں میں گر چکا تھا، خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بعض نوجوان ادیب اسے اُمید اور اتحاد کی بلندیوں کی طرف لئے جاتے ہیں، ہمارے ملک و قوم کی جو حالت ہے اسے دیکھتے ہوئے ایسے شاعروں کا وجود ایک قومی کامیابی کا پیش خیمہ ہے جو قوم کے افراد کو یگانگت انسانی ہمدردی اور فطری توانائی کا سبق دیں۔ ساغر صاحب ایک ایسے شاعر ہیں۔ اُن کے پڑھنے کا انداز سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔ اُنکی نظمیں انھیں سے سننی چاہئیں۔ سننے والے پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی ہے جسکا نقش مدت تک قائم رہتا ہے۔

میں نے فرصت کے اوقات میں اُنکا دیوان "بادۂ مشرق" پڑھا ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ لاجواب کتاب دیکھنے پڑھنے اور پاس رکھنے کے قابل ہے اسکی ظاہری اور معنوی خوبیاں یکساں ہیں جا بجا خوبصورتی اور رنگینی نے ظاہری اور معنوی حیثیت سے ایک ادبی گلزار کی صورت پیدا کردی ہے۔ "بادۂ مشرق" ہر ہندوستانی گھر میں موجود ہونی چاہئے۔

جہاں آرا شاہنواز۔ لاہور، ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء

آزادی کا آئینہ

بادۂ مشرق کو میں نے اکثر دیکھا۔ اور اب بھی اکثر دیکھتا ہوں، بلکہ تکیہ کے پاس رکھتا ہوں کہ مبادا پڑھنے کیلئے جی چاہ جائے۔ بسا اوقات میں اسکی ظاہری خوبیوں اور باطنی حسن کا مقابلہ کرنے بیٹھ جاتا ہوں لیکن اب تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ ظاہر و باطن میں کسکا پلہ بھاری ہے، کتابت اور طباعت کی جدتوں کو دیکھتا ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ بس دیکھتا رہوں اور جب کلام پڑھنا شروع کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہی کہ قلب کی آواز ہے جو کاغذ پر الفاظ کے پیکر میں موجود ہے۔ میرے لئے بہت مشکل ہے کہ بادہ کے متعلق کچھ عرض کروں۔

ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان، اردو کی ہزاروں کتابیں طبع ہوچکی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب تک اتنی شاندار اور جدتوں کی حامل کتاب زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس کی طباعت کو دیکھ کر "ساغر پریس" کی خوبیوں کا اندازہ کرنیکا موقع بھی مل گیاہے کیونکہ یہ کتاب میرٹھ کے ساغر پریس کی طباعتی خوبصورتی کی زندہ یادگار ہے۔

بادۂ مشرق، حقیقت میں بادۂ مشرق ہے، جسے ہر مشرقی کو اپنے ہونٹوں سے لگا کر وطنی فرض ادا کرنا چاہیئے۔ ایک مشرقی کو زندگی کس طرح گذارنی چاہیئے اس کو ملک و وطن کی کس طرح اور کیا خدمت کرنی چاہیئے اپنا فرض کیونکر ادا کرنا چاہیئے، بادۂ مشرق کے مطالعہ سے نہایت آسانی سے معلوم ہوسکتا ہی۔

بادۂ مشرق آزادی کا آئینہ ہے۔ خدا ساغر کو ملک کیلئے وطن کے لئے اور قوم کے لئے عمر نوح عطا فرمائے۔

مولانا (عبدالاحد شرف الدین پوری)

رسالہ "ادبی دنیا" لاہور کی رائے

"بادۂ مشرق" حضرت ساغر نظامی کے کلام کا مبسوط مجموعہ ہے جو تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ معنوی خوبیوں سے قطع نظر ظاہری حسن کی تخلیق میں اتنا اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر گام پر گوناگوں دل کشیاں دامن دل کو کھینچ کر محو حیرت بنالیتی ہیں۔ جن نادر اور جدید طریقوں سے اس کے اوراق کو آراستہ کیا گیاہے ان کی مثال ہندوستانی طباعت میں تو کجا انگریزی مطبوعات میں بھی ہم نے اب تک کم دیکھی ہے۔ تمام کتاب پارچمنٹ کاغذ پر چھپی ہے اور کتابت میں دیدہ زیبی کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ جلد آرٹ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

مجموعے کے آغاز میں مسز سروجنی نائیڈو۔ خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالحق اور ڈاکٹر سید محمود کے دیباچے ہیں جن میں اس کے محاسن کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان بزرگوں کے انتقادات کے ہوتے ہوئے اپنی طرف سے کسی رائے کا اظہار بے ادبی معلوم ہوتی ہے اور یوں بھی اہل ذوق میں سے کون ایسا بدقسمت ہوگا جس نے ساغر کے نغمات سے لطف نہ اٹھایا ہو لیکن "بادۂ مشرق" سے سرشار ہوکر بے ساختہ یہ الفاظ زبان سے نکلتے ہیں، کہ شباب، رنگینی اور موسیقی اس کلام کے عناصر ہیں۔ ان اشعار میں ساغر کی وطن پرست آزاد روح بول رہی ہے اور اہل وطن کو وطنیت کی عظمتوں اور مسرتوں کی طرف بلا رہی ہے۔

بادۂ مشرق میں نظمیں۔ غزلیں۔ گیت۔ رباعیاں سبھی اصناف موجود ہیں اور اس فراوانی سے ہیں کہ یہ مختصر سی تنقید ان کے انتخاب کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی۔ ہم "ادبی دنیا" کے ناظرین سے یہی کہیں گے کہ وہ اسے خود منگا کر دیکھیں اور اس کے موضوعات سے بصیرت حاصل کریں۔

قیمت قسم اول چھ روپے، قسم دوم پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ ادبی مرکز گھنٹہ گھر میرٹھ — رسالہ ادبی دنیا لاہور۔ نومبر ۱۹۳۶ء

"تیج ویکلی" دہلی کی رائے

بادۂ مشرق" (مصنفہ جناب ساغر نظامی) تقطیع $\frac{20 \times 30}{8}$ حجم ۶۴۰ صفحات۔ (قیمت فی جلد پانچ روپیہ)

جناب ساغر کی اس تصنیف پر جوان کے بلند و کیف آفریں کلام کا ایک نادر الوجود مجموعہ ہے اور جو اپنے دامن میں آتش نوائیوں اور نغمہ ریزیوں کا

ایک لازوال خزانہ لئے ہوئے ہے ریویو لکھنے سے پہلے ہم اس کتاب کے حسن ظاہری کے متعلق چند سطریں لکھنی چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ صورت و معنی کا رشتہ ہمیشہ سے یہی ہے کہ صورت پہلے دکھائی دیتی ہے اور معنوی محاسن بعد کو نظر آتے ہیں" **بادۂ مشرق**" کی اشاعت جس تزک و احتشام کی حامل ہے وہ اردو کی مطبوعہ کتابوں میں اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ آرٹ، حسن، تصوّر اور نفاست تخیل کا کوئی پہلو نہیں ہے جو اس کتاب کی ترتیب و تنظیم میں نظر انداز کر دیا گیا ہو، کتابت نہایت صاف اور بے عیب ہے۔ کاغذ بہت چکنا اور قیمتی ہے اور طباعت اپنی مثال آپ ہے۔ "بادۂ مشرق" بارہ ابواب پر مشتمل ہے اور ان ابواب کی تقسیم بھی بیحد دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اردو کی بہت کم کتابیں اس اہتمام و التزام کے ساتھ چھپتی ہیں اور ساغر صاحب نے "بادۂ مشرق کو دنیائے شعر و ادب کے علاوہ دنیائے طباعت و اشاعت کے لئے بھی ایک قابلِ تقلید مثال بنا دیا ہے۔

بادۂ مشرق کے حسن معنوی کو دیکھ کر جب ہم تبصرہ لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھئے

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے

ادبستان مشرق کی یہ ایک عظیم الشان اور نادر تصنیف ہے جس میں جناب ساغر کا کمال شاعری اپنی تمام رعنائیوں، رنگینیوں، میگساریوں اور شعلہ افشانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس میں ایک طرف اگر احساسِ قومیت کا بلند ترین جذبہ، وطن پرستی کا جوش و خروش، انسانی اخوت کا درس، حریت کی تعلیم اور آزادی کی طلب دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے تو دوسری طرف پُرکیف زندگی کی ایک وسیع دنیا جام بہ دست اور میخانہ بدوش نظر آتی ہے "بادۂ مشرق" جن گرانمایہ عناصر اور لطیف اجزا کا مجموعہ ہے وہ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور روحانیت کا ایک لطیف پہلو لئے ہوئے بقاء حیات کی دعوت دیتے ہیں۔

تیج ویکلی دہلی ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء

آنریبل جسٹس شاہ سلیمان (بالقابہ) کا مکتوب گرامی

الہ آباد ۱۹ر مارچ ۱۹۳۷ء

پیارے مسٹر صمد یار خاں

۸

بادۂ مشرق کی اعزازی جلد جو آپ نے ارسال فرمائی اسکی شکر گذاری میں جو تاخیر ہوئی اسکے متعلق اظہار افسوس کرتا ہوں۔ میں نے آپ کے بلند پایہ منظومات کو جو نہایت اعلیٰ معیار کے ہیں، بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا کیونکہ آپ خود ایک شاعر مشہور ہیں اس لئے ان کی تحسین میرے لئے غیر ضروری ہے مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کے منظومات کو وہی مقبولیت اور استحسان حاصل ہوگا جس کے کہ وہ مستحق ہیں

طباعت کی نفاست اور کتابت کے ([illegible]) نے جو آپ ہی کے پریس (ساغر پریس) کا مرہونِ منت ہے اس کے حسن کو دوبالا اور اسکی قیمت کو افزوں کر دیا ہے

آپکا مخلص۔ شاہ محمد سلیمان

اسد یار خاں اعظم منیجر مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

فہرست

سالانہ چندہ صہ ششماہی سے

قیمت فی پرچہ عہ

رسالہ "ایشیا" سہ ماہی اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۷ء

شمارہ	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ	شمارہ	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۶۰	بنیادی حقوق و فرائض اور کانگریس کا اقتصادی پروگرام	جنرل سیکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی الہ آباد	۱۶۴	۶۳	معارف	ایڈیٹر	۱۶۸
۶۱	منروا فلم کمپنی			۶۴	خضر راہ	ایڈیٹر حکیم یوسف حسن	۱۶۸
	رسائل				**اخبارات**		
۶۲	ہندوستانی ماہنامہ	ایڈیٹر رشید کمالی ایم۔اے		۶۵	باتصویر ترقی ہفتہ وار	ایڈیٹر حضرت عمر انصاری	۱۶۸

"ایشیا" کے معزز خریداروں سے!

اصولی نوعیت تو یہی ہے کہ جس وقت تک ادبی مرکز اس نمبر کے علاوہ ۵ نمبر آپ کی خدمت میں اور نہ پیش کر دے آپ خریداری کا اعادہ نہ فرمائیں اور ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ ۵ نمبر پیش کئے بغیر دوبارہ سالانہ چندہ نہ طلب کریں۔ لیکن بہرحال یہ حقیقت بھی ایشیا کے سرپرستوں پر روشن ہے کہ ادارۂ "ایشیا" اُن کی روحانی و دماغی ضیافت، تجارتی اصولوں سے آزاد ہوکر کرتا رہا ہے اس معمولی سے خلاقی امکان کی بنا پر ہماری استدعا ہے کہ اگر اس نمبر کے بعد قدیم خریدار اپنی خریداری کا اعادہ فرماتے ہوئے مبلغ صہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں گے تو اُن کی یہ نوازش ایک امدادِ ادبی کی حیثیت رکھے گی اور ہم اپنے خیالات و تصوّرات کو عملی جامہ پہنا سکیں گے۔ — منیجر

لارڈ کلایو کے سیاہ کارنامے

تصحیح - مندرجۂ بالا عنوان کے ماتحت صفحہ ۱۷ سطر ۱۴ پر "سبکدوشی" غلطی سے چھپ گیا ہے۔ "سبکدوشی" کے بجائے سبک دستی پڑھا جائے۔

دیوان غالب طاہر ایڈیشن

حضرت مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے نبیرہ اور میرے دوست آغا طاہر صاحب دہلوی نے نہایت حسین و جمیل "دیوانِ غالب طاہر ایڈیشن مجلّا و مطلا آرٹ پیپر پر شائع کیا ہے جو تمام کا تمام بلاک سے چھاپا گیا ہے اور دیوان غالب کا صحیح ترین نسخہ ہے۔ جرمنی دیوان غالب کے مقابلہ میں یہ سب سے پہلا پاکٹ ایڈیشن ہے جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بدرجہا بہتر ہے۔ جرمنی ایڈیشن تو ہے کہ مصری حروف کی وجہ سے بہ آسانی نہیں پڑھا جا سکتا۔ لیکن دیوان غالب طاہر ایڈیشن جو دہلی کے اعلیٰ ترین ماہر فن خوش نویس کا لکھا ہوا اور تمام کا تمام بلاک کا چھپا ہوا ہے۔ ہر ورق پر آئینہ پیش کرتا ہے۔ شروع میں مرزا اسد اللہ خان غالب کی شبیہ ہے اس کے بعد اِن کے مزار کا فوٹو، اور فوٹو کے بعد اِن کے خط اور مُہر کا بلاک ہے ہم آغا صاحب کو اس ایڈیشن کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اُنھوں نے مشرق کے شاعرِ اعظم کے کلام کا صحیح ترین نسخہ شائع فرما کر اردو ادب پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ قیمت مجلّا و مطلا ۱؎ علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ:- آزاد بک ڈپو کوچہ چیلان دہلی (۲) مکتبۂ ساغر میرٹھ

مجھے آہ و فغانِ نیمِ شب کا پھر پیام آیا ——— !

کامل ایک سال کے بعد ایشیا پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے اس سے پہلے بھی اس کی حاضری ممکن تھی، لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ پیدا ہو کر پھر زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو جائے۔ پورا ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کا آغاز میرے لئے جن ذاتی مصائب اور پریشانیوں کا باعث بنا رہا۔ اس کی رام کہانی آپ کے سامنے رونا اس لئے لاحاصل خیال کرتا ہوں کہ خدمت کے نتیجوں کو آپ سے تعلق ہے کہ میری ذاتی مصیبتوں سے! اور ذاتی مصیبتوں کا سہارا لے کر کوئی بیان صفائی دینا بھی میرے نزدیک دیانت داری نہیں ہے۔ بلکہ مصیبت جیسی خطرناک شے سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔

میں نے ایشیا کی اشاعت کے عظیم بار کو اپنے کاندھوں پر اٹھایا اور اٹھائے رہا۔ گو سفر رک رک کر منزل بہ منزل جاری رہ سکا لیکن ہمت ہار جانے والے مسافروں میں میرا نام نہیں لکھا جا سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ مسافر کے پاس زادِ راہ کم اور "متاعِ ہمت" زیادہ تھی۔ زادِ راہ ختم ہو گیا مگر "متاعِ ہمت"

میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی ؎

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی　　　کہ میری زندگی کیا ہے یہی طغیانِ مشتاقی

یہی "طغیانِ مشتاقی" آخر ایک ایسے مرکز پر لے آیا جو منزل رس بھی ہے اور "متاعِ ہمت" و طاقتِ سفر میں ایک توازن بھی قائم کرسکتا ہے۔ یعنی ایشیا کو سہ ماہی رسالے کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے اور اس وقت تک وقت کی پوری پابندی کے ساتھ شائع کیا جاتا رہے گا جس وقت تک کہ ادبی مرکز ایشیا کو از سرِ نو ماہنامہ کی صورت میں شائع کرنے کی طاقت حاصل نہ کرلے۔ اس وقت تک ایشیا کے جس قدر نمبر شائع ہوئے ہیں اُن کے مطالعہ سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ایشیا کی اشاعت تجارتی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر ہندوستانی لٹریچر کی تجارت سے ہندوستان میں روپیہ کمایا جاسکتا ہے تو اس تخیّل کو بھی حقیقت تسلیم کیا جاسکتا ہے ورنہ اس حقیقت کو تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ادبی کام کرنے والوں کو قدم قدم پر جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ روح کو گھلا دینے والی اور دماغ کو چکرا دینے والی ہیں۔

ذرا کچھ اور غور کے ساتھ اگر اس مسئلہ کے متعلق سوچا جائے تو اس کا سلجھانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ کسی تحریک یا کسی کام کو چلانے کے لئے سب سے بنیادی شے "سرمایہ" ہے۔ اور ع

اہلِ نوا کے حق میں بجلی ہے "آشیانہ"

"سرمایہ" ہی ہمارے پاس نہیں ہے۔ دوسری بدبختی تجارتی ذہنیت کا فقدان ہے۔ باوجود اس طاقت کے جو عوام کی محبت و ہمنوائی نے ہم کو عطا کی ہے۔ ہم اپنی جدوجہد میں توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔ کیونکر رکھ سکتے ہیں۔ محبت و ہمنوائی کے جواب میں تجارت کرنا غیر شاعر کا تو کام ہوسکتا ہے شاعر کا کام ہرگز نہیں ہوسکتا!

یہ ہیں وہ نفسیاتی وجوہ و اسباب جو میں معلوم و محسوس کرسکا ہوں۔ تجارت اور شاعری دو بالکل مختلف راستے ہیں۔ مگر ہندوستانی ادب اور زبان کی خدمت کرنے کے لئے ہم کو اُن راہوں پر قدم رکھنا ہی پڑے گا۔ جو تنظیم سے تعلق رکھتی ہیں۔ زندگی ایک کھلی ہوئی جہدی حقیقت ہے اس کو ہم جمود و انتشار میں کبھی نہیں پاسکتے۔

باوجود اپنی کم مائگی اور خامی کے میدان میں ڈٹ کر زمانے کا اور خود اپنا مقابلہ کرنا کسی تیسری طاقت ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ وہ طاقت کیا ہے!؟ اقبالؔ نے خوب کہا ہے ؎

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں　　　خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

اک آگ ہے اک چنگاری ہے جو تمام پیکر کو پھونکے دیتی ہے اور بغیر تصورِ نتائج کے معروف رکھتی ہے۔ کبھی شعر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے کبھی نثر کی صورت میں، کبھی ایشیا کی صورت میں اور کبھی پیمانہ کی شکل میں، اگر اس آگ سے تقدیرِ ملک اور قسمت قوم کے تاریک و ویران کھنڈروں میں کبھی کسی روشنی کی نمود ہوسکی تو بس یہی ہماری تمام شعلہ نوائی اور دل سوزی کا حاصل ہوگا۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات　　　ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

ایشیا کے تمام دوست اور خاص طور پر "خریداروں" کو اس کی غیر حاضری سے جو شدید روحانی تکلیف ہوئی وہ اس لئے معاف کردینے کے قابل ہے کہ آپ سب سے زیادہ میں خود ایک روحانی کرب میں مبتلا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ نئے انتظامات سے عمل میں جو ثبات پیدا ہوگا وہ آپ کی تسکینِ روح اور تفریحِ نظر کا سامان اپنے ساتھ ضرور لائے گا۔

ایشیا کو سہ ماہی کرنے کے بعد ماہنامہ "پیمانہ" کا اجراء جولائی ۱۹۴۳ء سے کردیا گیا ہے۔ اس کے اجراء کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ محض شعر و

۱۳

ادب اور لطیف مضامین کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں وہ محض ایک روپیہ سال میں بہترین اور اعلیٰ ترین ادب لطیف پیمانہ میں مطالعہ کر سکیں
لٹریچر سے بھی پہلے ایک چیز ہے۔ جس کا نام "بھوک" ہے اور ہم کو بھوکے ہندوستان میں اپنی فاقہ کشی کو پیش نظر رکھ کر ہر کام کرنا پڑے گا۔
اسی نکتۂ خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ایسا کم خرچ رسالہ ادبی مرکز نے شائع کیا ہے جسے ہندوستانی ادب سے ہر شوق رکھنے والا آسانی
خرید سکتا ہے۔

اور اسی حقیقت کی بنا پر ایشیا کے زرِ سالانہ میں کوئی کمی بیشی نہیں کی گئی گو اس کے حجم میں زیادتی ہوگئی ہے اور موجودہ نمبر تو نے
دو سو صفحات پر شائع کیا جا رہا ہے۔ تصاویر عمداً اس نمبر میں شائع نہیں کی گئی ہیں اور اس کے وجوہ یہ ہیں کہ اول تو نادر تصاویر حاصل نہیں کی
جا سکیں دوسرے کسی رسالہ کا مقصد یہ ہونا بھی نہیں چاہئے کہ تصاویر کی بنیاد پر اپنے ادب کی بنیاد قائم کرے۔ آج ہندوستان کو مفید ادب
کی ضرورت ہے، انقلاب آفریں اور بیداری پیدا کرنے والے لٹریچر کی ضرورت ہے اس ضرورت کو اپنی بضاعت کے مطابق اس نمبر میں پورا کرنے کی جان توڑ
کوشش کی گئی ہے

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں   کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

یہ ایک رسم سہی لیکن دوستوں اور معاونین کے احسانات کا اعتراف یقیناً ضمیر کی عبادت ہے۔ ایسے ناحق شناس زمانے میں جب زندگی کی کشمکش نے
انسان کے کیریکٹر کی بقا کے امکانات کو دھندلا کر دیا ہے کسی کی طرف سے ایک خفی نگاہِ کرم بھی میرے نزدیک دنیائے التفات کی حیثیت رکھتی ہے
اسی لئے بغیر تخصیص اُن تمام شعرا و انشا پرداز احباب کی نوازشات کا ممنون ہوں جنکا کرم میرے لئے ارزاں رہا۔

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی مسعود!

ابھی مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کی موت کے ڈالے ہوئے زخم سینوں میں بھرے بھی نہیں تھے کہ راس مسعود کی مرگ ناگہاں نے دل پر
ایک گہرا چرکا لگا دیا۔

سر سید راس مسعود کی مرگِ ناگہاں ہرگز دنیا کے ہونے والے واقعات کی طرح معمولی نہیں کہی جا سکتی۔ مسعود سر سید کے جواہر خانہ کا وہ گوہرِ شب چراغ
تھا جس کی جوت سے ایک طرف محض ادبستانِ مشرق جگمگاتا تھا تو دوسری طرف اس کے انوار سے مجلس انسانی کے تمام باقی گوشے منور رہتے
تھے لیکن اُس کی یکا یک موت نے آج نہ صرف ایوانِ ادب کو تاریک کر دیا بلکہ مجلس انسانی کے ہر گوشہ کو دھندلا کر دیا۔

تخلیق کے قدرتی اصول کی بنا پر ہر تاریکی کے بعد روشنی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ نئی نسل سے بہت سے ستارے ہستی کے آسمان پر جلوہ گر ہونگے
لیکن مسعود کی طرح مہر نیم روز بن کر اب جگمگانا کسی کی قسمت نہیں

میں اُن کے اُن خوش اعتقاد ماتم کرنے والوں میں نہیں ہوں جو اُن کو سیاسیات کا مرد بھی خیال فرماتے ہیں۔ میری رائے اُن بدرجاتی خصوصیتوں
سے بہت بلند و مخصوص ہے۔ وہ ایک خطیب یا وقتی سیاست [illegible] ہرگز نہیں تھے۔ اُن کی حیثیت ایک فاضل [illegible] اور ایسے ادیب کی تھی جو مشرقی و
مغربی علوم پر بالکلیۃ حاوی ہوتا ہے۔

بہ حیثیت انسان وہ اعلیٰ ترین انسان تھے۔ اُن کا دل گداز وسیع اور روشن تھا اور انسانی محبت و ہمدردی کی آگ اُن کو سر سید کے تشکدہ

سے دارثتاً ملی تھی وہ سادہ مزاج اور درد آشنا دل رکھتے تھے جس میں نفاق اور نفرت کے عناصر کبھی تلاش کے بعد بھی نہیں پائے گئے، مشرقی علم و ادب سے اُن کو فطری لاگ تھی اور وہ ہر جگہ ادبی فضا پیدا کرنے میں مہارت رکھتے تھے اُن کا اخلاص اور سادگی، اپنی مجلس کو آفتاب سے لے کر ذرّوں تک سے سجا لیتی تھی اور آفتاب کے ساتھ وہ ذرّے بھی چمک اُٹھتے تھے۔ ہندوستان میں راس مسعود آخری شخص تھا جس نے اس گئے گذرے زمانے میں شعر و ادب کی قدرشناسی کرنے اور قدرشناس بنانے کی قدیم پرستارانِ ادب کی طرح کوشش کی اور آج اُس آخری شخص کو موت ہم سے چھین کر لے گئی۔ ادبی حلقوں میں قدم قدم پر اس کا ماتم ہو رہا ہے مگر اس نقصان کی تلافی انسان سے کب ممکن ہے!؟

میں ساری عمر اُن ملاقاتوں کو فراموش نہیں کر سکتا جو اپنے اندر دلچسپی، معلومات، عظمت اور راحت و دانستگی ایک دنیا رکھتی تھیں۔ سر راس مسعود کی عالی ظرفی، تبحّر علمی، ذوق کی نزاکت، مذاق کی لطافت، اہلِ علم و فن کی قدردانی اور انسانی ہمدردی کا ایک عام جذبہ اُن کے اندر دیکھ کر ہر کوئی اُن کا اسیر ہو جاتا تھا۔

سر سیّد اعظم کے پوتے سر راس مسعود ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے ۱۹۰۶ء تک اپنی والدہ ماجدہ کی آغوشِ محبت میں مشرقی تعلیم و تربیت کے مدارج طے کرتے رہے۔ ۱۹۰۶ء میں انگلستان تشریف لیگئے۔ ۱۹۱۱ء میں آکسفورڈ میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی اور بیرسٹری کی سند لے کر ہندوستان واپس تشریف لائے۔ پٹنہ میں آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم صوبۂ بہار کے ساتھ پریکٹس شروع کی۔ آنریبل ڈاکٹر سید محمود سے راس مسعود کے تعلقات نہایت برادرانہ تھے اور ڈاکٹر محمود کو جو صدمہ اُن کی ناگہانی موت سے ہوا وہ ناقابلِ بیان ہے۔

۱۹۱۳ء میں آپ امپیریل ایجوکیشنل سروس کے زمرۂ ملازمت میں شریک ہوئے اور پٹنہ میں ہیڈ ماسٹری کے عہدہ پر مامور ہو گئے۔ اس کے بعد "ریونشیا کالج" کٹک میں پروفیسر ہو گئے۔

لیکن جگمگاتے ہوئے ہیرے کی شعاعوں نے خود جوہری کو دعوتِ نظّارہ دی اور اُن کو حضور نظام دکن کی جوہرشناس نگاہ نے تعلیمات حیدرآباد کی قیادت کے لئے انتخاب فرمالیا۔ چنانچہ آپ حیدرآباد میں ۱۹۲۸ء تک ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن رہے۔

بارہ سال دورانِ قیام حیدرآباد میں راس مسعود نے سلطنت دکن کی بہترین خدمات انجام دیں۔ جن میں سے ان کا سب سے بڑا کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی ہے۔

مادری زبان میں تعلیم کا تخیّل سر راس مسعود ہی کے دماغ کا نتیجہ تھا جس نے ہندوستانی زبان کو فنا ہونے سے بچا لیا اور عظیم الشان ثبات بخشا۔

حیدرآباد کے بعد آپ علی گڑھ تشریف لائے اور جمیع مسلمانانِ ہند نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کشتی کی ناخدائی آپ کے سپرد کر دی۔ گو آپ جانتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی مسلم جیسی نفاق پرست قوم کی درسگاہ ہے، اور اس کی سیاسیات کا ایک رُخ نہیں لاکھوں گوشے ہیں لیکن جذبۂ خدمت نے سب پر حاوی کر دیا اور اپنے دادا کے لگائے ہوئے باغ کی باغبانی کرنے لگے۔

لیکن کون ہے جو جاتے جاتے ملت مسلمانوں کی ناقدرشناسی کا داغ اپنے دل پر نہیں لے گیا۔ محمد علی ہو کہ راس مسعود سب کے سینے قوم کے سلوک سے داغدار ہو گئے اور قوم ان کے اُٹھ جانے کے بعد بھی اُسی طرح سو رہی ہے، اُسی طرح یقین کے عالم میں ہے کہ وہ نہایت قائد پرست ہے۔ بہرحال علیگڈھ میں سر راس مسعود کو اپنی قوم کی بےحسی، نفاق، پارٹی بازی، اور خودغرضی کے جو تلخ تجربات ہوئے وہ ایسے نہ تھے کہ راس مسعود جیسا ذی احساس شخص اِن سے متاثر نہ ہوتا۔ اِن تجربات کی تلخی نے اِن کے دل میں ناسور ڈال دئے۔ اور آج ناسور ہے نہ صاحب ناسور!؟

وہ اک بے تکلف اور دلچسپ انسان تھے مگر جب اِن سے ملاقات ہوئی میں نے اُن کو ایک وحشت انگیز غم میں مبتلا پایا۔ ۔ ۔

آخر عمر میں بھوپال میں وزیر تعلیم و صحت عامہ .... کے عہدے پر مامور ہوئے اور ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو بروز جمعہ دن میں گیارہ بج کر دس منٹ پر انتقال فرما گئے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ قدرت و وقت کی ستم ظریفی تھی اور مسلمانوں کی مردم ناشناسی۔ راس مسعود جیسا عظیم الشان شخص اور مغربی و مشرقی علوم کا ماہر ——— ایک ریاست کا وزیر تعلیم بنایا گیا۔ میرے خیال نے یہ ایک قسم کی نظر بندی تھی جس کی ذمہ دار صرف قوم تھی لیکن بہرحال آج ہم میں راس مسعود موجود نہیں ہیں مگر اُن کی یاد اور اُن کا نام تا ابد باقی و قائم رہے گا۔

مے شبانہ کی مستی تو ہو چکی، لیکن
کھٹک رہا ہے دلوں میں کرشمۂ ساقی

اگر راس مسعود کی موت کے غم کا اندازہ کرنا چاہتے ہو تو اس شعر کے خالق اقبال سے دریافت کرو اُس کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں اور رہا میں، مجھے تو ازدیادِ غم سے رونے کا بھی ہوش نہیں ؎

شک نہ کر میری خشک آنکھوں پر
یُوں بھی آنسو بہائے جاتے ہیں

چین اور جاپان کی جنگ

تہذیب اور ارتقا، تجارتی مفاد، تمدن کی ترویج، تنظیم اور اسی قسم کے دوسرے باطل اور پُر فریب بہانوں کا سہارا لیکر ملوکیت پرست اقوام دوسروں کے ملکوں اور سلطنتوں پر غاصب اور قابض ہونا چاہتی ہیں یورپ کی فطرت کا جہاں تک تعلق ہے اس کا خاص مسلک ہی یہ ہے۔ اٹلی کی تازہ کامیاب کشتہ حبش میں ابھی تک حرارت باقی ہے اور اٹلی کے جبڑوں میں ابھی اپنے تازہ شکار کا خون لسٹھرا ہوا ہے لیکن مشرق میں جو اپنی روحانی افضلیت اور کلچر و روایات تہذیب کا گہوارہ تھا۔ جہاں کے باشندوں کی ذہنیت مغربیوں سے بالکل مختلف ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟!

چین و جاپان کی تازہ جنگ نے یہ ثابت کردیا کہ مشرق اپنی مشرقیت کو ذبح کر رہا ہے۔ بیرن ٹنا سابق وزیر اعظم جاپان کی اسکیم کے وہ الفاظ ابھی ہمارے ذہن میں محفوظ ہیں جس میں اُس نے منچوریا اور منگولیا پر قابض ہونے کی رائے دی تھی اس طرح وہ چین کی فوجی، سیاسی، اور اقتصادی ترقی کو تباہ کر ڈالنا چاہتا تھا اور چین کے اُن تمام ذرائع پر قبضہ کرلینا چاہتا تھا جو مدافعت کے وقت چین کو بچا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اس کے یہ الفاظ سننے کے قابل ہیں کہ:۔

"ہم ان کی امداد سے ہندوستان، جزیرہ نما ملایا، ایشیائے کوچک، اور نیز یورپ کی فتح کے لئے آگے بڑھ سکیں گے" ہونے والوں کو ان الفاظ سے جاپان کے عزائم کا اندازہ نو سال پہلے ہی ہو گیا تھا۔ دراصل جاپان ہوس ملک گیری میں کسی مغربی فسسٹ طاقت سے کم نہیں ہے۔ وہ ہندوستان پر بڑی للچائی ہوئی نگاہیں ڈال کر رہ جاتا ہے لیکن اس کی نقل و حرکت بتاتی ہے کہ وہ توسیع سلطنت کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے

16

یورپ کی ہر حکومت شہنشاہیت کے حصول کے لئے بیچین ہے۔ اٹلی نے آخر انسانیت کی گردن پر چھری پھیر کر حبش کو حاصل کرہی لیا۔ یہی حال جاپان کا ہے چین کے ہزاروں انسان بمباری کئے جا رہے ہیں ایک ملک کا سکون برباد کردیا گیا ہے جاپان نے شہریوں اور فوجیوں میں کوئی تمیز باقی نہیں رکھی۔ جاپان نے چین میں بین الاقوامی بستی تباہ و برباد کردی۔ چینی ساحل کی مورچہ بندی کر ڈالی۔ یہ اور ایسے تمام امور اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ قدیم فاتحین کے قزاقانہ غیر انسانی طریقۂ جنگ اور موجودہ طریقۂ جنگ میں کوئی فرق نہیں۔ - - جو قوم آج ارتقاء تہذیب کی ڈینگیں مارتی ہے وہ جھوٹی اور مکار ہے۔ انسان کی درندگی میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ایشیا میں یہ بے سکونی اور قتل و غارت کی گرم بازاری ایشیا کے سکون کو درہم و برہم کر رہی ہے۔ اور اس کی کلی ذمہ داری جاپان پر عائد ہوتی ہے ہم ہندوستانی جبلی فطرت ظالم کی دشمن اور مظلوم کی دوست ہے چین کے ساتھی ہیں۔ ہندوستان، برطانوی جوئے کو اُتار کر پھینک دینا چاہتا ہے اور آزاد ہو کر کامل خود مختارانہ زندگی بسر کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے وہ کیونکر یہ پسند کر سکتا ہے کہ چین جاپان کا غلام ہو جائے اور جاپان جو ایشیا میں امپیریلزم کا سب سے بڑا حامی ہے اپنی شہنشاہیت کا ڈنکا بجانے لگے۔ صدر کانگریس کے حکم کے مطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کو "چین ڈے" ہر ہندوستانی کو منانا چاہئے اور جاپان کے خلاف اظہارِ نفرت کرنا چاہئے چین سے جاپان کی یہ جنگ موجودہ زمانے کے قطعی منافی ہے۔ جاپان نے بغیر اعلانِ جنگ چین پر گولا باری کا آغاز کیا ہے اور ہزاروں چینیوں کا قتلِ عام آزادی سے کیا جا رہا ہے اس لئے ہندوستانیوں کا فرض ہے کہ وہ چین سے ہمدردی اور جاپان کے خلاف شدید اظہارِ نفرت کریں۔ میری رائے میں تو ایسے ظالم اور قاتل سوداگر کے مصنوعات کا بائیکاٹ کرنا ہر انسان کے لئے فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ باقی صفحہ ۱۶۹ پر

رُوحِ ادبُ

ایشیا

کیا اس زمانے میں ایشیا کا وجود ہے یا وہ محض ایک نام ہے ؟

ایک ایشیا تو وہ ہے جو جغرافیہ میں ایک برِّ اعظم کا نام ہے، وہ قائم رہیگا جب تک نصاب کی کتابوں کے علم میں کوئی خاص انقلاب پیدا نہ ہو جائے، وہ جاپان سے قطبِ شمالی بحیرۂ اخضر سے ایشیائے کوچک فلسطین سے کوہِ طور باب المندب سے راس عمان کراچی سے سیلون برما سے ہانگ کانگ اور آس پاس کے بڑے چھوٹے جزیروں تک پھیلے ہوئے قطعۂ زمین کا نام ہے، یہ سب کچھ اس لئے گنوایا کہ سکول کے زمانے کے ایک مدت بعد بغیر کسی امتحان کے ان کے گنوانے میں مزا آیا

"ایک ایشیا وہ ہے جو پیغمبروں کا مولد و مسکن ہے جہاں تقریباً ہر قسم کی روحانیت جنم لیتی ہے، جہاں خدا کبھی انسان کی شکل میں اور کبھی بذاتِ خود جلوہ گر ہوتا رہتا ہے" ——— "ایک ایشیا پرانے سے پرانے رسم و رواج کی سرزمین ہے۔

ایک اور ایشیا شخصی حکومت اور استبداد کی آرام گاہ ہے۔

اور ایشیا قضا و قدر کا معتقد بھی ہے، وہ سستی و آہستگی سے محبت کرتا ہے، یورپ کے تیز موٹر کار کے مقابل میں وہ اپنی سست رو بیل گاڑی رکھتا ہے کیا یہی ہے ایشیا ؟ کیا اس میں صبر و استقلال و ہمت یا سرعت و جوش یا ایثار یا علم پروری نہیں جیسی کہ آج یورپ میں پائی جاتی ہے ۔ زندگی حال ہے، اس میں موجود حاضر کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ماضی و مستقبل کو نہیں، ایشیا وہی سمجھا جاتا ہے جو آج ہے نہ وہ کل تک تھا نہ وہ جو کل ہوگا، اسی لئے ایشیا آج تنزّل کا مرادف ہے اور یورپ ترقی کا۔ ورنہ دوسری صورتوں میں کیا ایشیا نے وہی کچھ نہیں کر دکھایا جو یورپ آج دنیا کو دکھا رہا ہے۔ ہائے ماضی و مستقبل میں ایک بڑا فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ ماضی کو ہم بدل نہیں سکتے لیکن مستقبل کو ایک بڑی حد تک ہم جیسا چاہیں بنا سکتے ہیں، دورِ حاضر نے ایشیا کو بھی یہ سبق سکھایا ہے، اس کا مستقبل اسکے ماضی و حال سے مختلف ہونے والا ہے ۔

ایشیا اب محض بیل گاڑی کی دنیا نہیں ہے اور ہے بھی تو رہے گی نہیں، وہ بھی اب موٹر کار اور ہوائی جہاز اور ریڈیو سے اپنا رشتہ جوڑ رہا ہے۔ تو کیا ایشیائیت فنا ہو جائیگی ؟ کیا اب مشرق و مغرب کا اختلاف مٹ جائیگا ؟ یہ اختلاف اگر مٹ جائے اور ایشیا اور یورپ اور افریقہ اور امریکہ، اور کالی گوری نسلیں سب ایک ہو جائیں تو اس سے زیادہ مبارک کون سا انقلاب ہو ؟ اس نقطۂ نظر سے روٹھی ہوئی ایشیائیت بھی فنا ہو جائے تو بہتر ہے لیکن ایک دوسری شکل میں ایشیائیت کبھی فنا نہیں ہو سکتی اور نہ اُسے معدوم ہونا چاہئے ۔

صحیح ایشیائیت کے یہ معنی ہیں کہ ہر وہ اچھی چیز جو ایشیا کے ذریعے سے دنیا میں آئی قائم رہے، حلم و انکسار، ایمان و اعتقاد، آہستگی، اطمینان، توکّل، خاندانی نظام، محبت و اخوت اور ایسے ہی اور انسانی اوصاف گو وہ محض ایشیا سے مخصوص ہیں اور گو آج دنیا انھیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی اور گو اب ان کی ایشیائی صورت عموماً مسخ بھی ہو چکی ہے تاہم تھیں ایشیائیت کی "ایجادیں" اور کوئی وجہ نہیں کہ آج کل کی دنیا میں جہاں ہمیں اعتمادِ نفس اور سرعت اور انفرادیت اور جدّت پسندی کا سبق سیکھنا ہے ——— وہاں ہم اِن اوصاف کو کھو دیں اور اپنے اس آبائی ترکے سے منہ موڑ لیں ۔

دنیا کا مستقبل یہ ہے کہ مغربیت و مشرقیت کا صحیح امتزاج ہو، نہ یورپ رہے نہ ایشیا یا کہئے کہ یورپ بھی رہے اور ایشیا بھی رہے دونوں مل جلکر رہیں اور الگ ہونے پر بھی الگ نہ ہوں۔ یہ نسل ہو نہ وہ، نہ مشرق ہو نہ مغرب بلکہ انسانیت ہو اور دنیا۔

فلسفی اور عاقل اور تجربہ کار لوگ مسکرائیں گے کہ یہ تو فرضی قصے ہیں اور فضول خواہشیں ہیں، یہ فرضی ہو یا فضول یہ ہے وہ صحیح نصب العین جو ہمارے پیشِ نظر ہونا چاہیے، دنیا کا مستقبل نہ اس قوم کے لئے ہے نہ اس قوم کے لئے بلکہ نوعِ انسان کے لئے ۔

میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن)

کمالِ انگورہ

ترکی کی جمہوری حکومت کے دوسرے دور (۱۹۲۱ء) کا تعارف

از پروفیسر مولوی ابرار حسین صاحب فاروقی بی اے (علیگ)

"کوئی قوم اپنی عزت و خودداری کو برقرار نہیں رکھ سکتی جب تک کہ وہ آزادی سے مالا مال نہ ہو۔" (غازی اتاترک)

تمام اخلاقی فلسفوں کا مقصد یہ تھا کہ انسان اس فرض کو محسوس کرے جو خود اسکی جنس کی طرف سے اُس پر عائد ہوتا ہے کوئی شک نہیں کہ مذاہب نے ایک بڑی حد تک اس فرض کی طرف انسانوں کی رہبری کی مگر بالآخر مذاہب کے علمبرداروں نے مذاہب کی چمکتی ہوئی پیشانی پر ناکامی کا سیاہ داغ ڈال دیا جو اب کوثر کے چھینٹوں سے بھی نہیں دھل سکتا۔ اس انقلاب کے بعد اب نیکی اسلئے نہیں کی جائیگی کہ اس نیکی کے پس منظر میں کسی اعتقاد کے نقوش کی طاقت ہے بلکہ انسان کو دنیا چلانے کیلئے نیکی کی ضرورت ہے، اب سب کچھ اسی ضروری حقیقت کی بنا پر ہوگا۔

آزادی کی منزل کی جانب غلام اور بھوکی قوموں کی رہبری کرنا سب سے افضل اور اقدس نیکی ہے، مولوی ابرار حسین صاحب فاروقی نے یہ مضمون ارسال فرما کر ایشیا کے ذریعہ اسی افضل اور اقدس نیکی کا مقدس اقدام کیا ہے ترکی کی جدوجہد آزادی کی داستان شاید ہندوستان کے ساری دنیا سے زیادہ "مطمئن" مسلمانوں میں احساس کی ہلکی سی چنگاری پیدا کردے، اگر ایسا ہوا اور نہ ہونے کے کچھ معنی نہیں ہیں تو یقیناً فاروقی صاحب نہ صرف ادارہ ایشیا کے شکریہ کے مستحق ہیں بلکہ تمام قوم کے جذبات تشکر کا استحقاق ان کو حاصل ہوتا ہے۔

ابرار حسین صاحب فاروقی بی اے (علیگ) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اُن اساتذہ میں سے ایک

ہیں جنکی مساعی اور اُستادانہ شفقت و اخلاص نے مسلمانوں کی نوجوان نسل کے سنوارنے میں بہترین حصّہ لیا ہے یہ مضمون آپ کی عنقریب چھپنے والی کتاب "کمال انگورہ" کے دوسرے دور کا ایک ٹکڑا ہے۔ کمال انگورہ کا پہلا دور زیر طبع ہے اور اس کی تیاری کی اطلاع ناظرین کو انسٹیٹیوٹ کے ذریعہ بہت جلد دی جائیگی، دوسرا دور زیر تصنیف ہے تیسرا دور زیر ترتیب اور چوتھا دور زیر فکر ہے۔ یہ چاروں دور کتابی شکل میں شایع ہوں گے۔ ہماری یہ بھی کوشش ہوگی کہ کتابی شکل میں آنے سے پہلے ادوار کے کچھ حصّے آپ کے معلومات کے لئے ایشیا میں شایع کرنے کی عزت حاصل کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ہماری آرزو اس بنیادی جذبۂ نیکی کی بنا پر ہے۔ اس لئے انسان سے نیکی کرنے والا فاروقی دل ضرور اس آرزو کا خیر مقدم کرے گا۔"

ساغر نظامی

میدانِ عمل اور جمہوریت

پہلا دور یعنی پورا ۱۹۲۰ء تنظیمی جدوجہد میں گذرا جس میں احرار نے نہ صرف خانہ جنگی اور طوائف الملوکی کو دور کیا بلکہ اقتصادی اور سیاسی پیچیدگیوں کا بھی بحسن و خوبی ازالہ کیا۔ مغربی محاذ پر یونانیوں کو صرف مصروف پیکار رکھا اور اس طرح سے ان کی درندگی کو صبر و شکیبائی سے برداشت کرتے رہے البتہ مشرق و شمال پر پوری توجہ کی۔ جہاں فرانس۔ آرمینیا۔ کرد اور بالشویکوں سے مقابلہ تھا۔ کردوں کو اپنا ہم آہنگ کر لیا۔ فرانس کے غاصبانہ قبضہ کا خاتمہ کیا۔ آرمینیا کی بغاوت اور باغیانہ امنگوں کو ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیا۔ بالشویکی زعم کو نیچا دکھایا۔ دوسری طرف اندرون ملک میں جو بعض اشرار نے شورشیں برپا کر رکھی تھیں ان کو فنا کر کے امن قائم کیا۔ "مجلس وطنی کبیر" کی بنیاد ڈالی جس میں ملک کے نمائندے بحیثیت ارکین شریک ہوئے اور انھوں نے متفقہ طور پر ایک "میثاق ملی" تیار کر کے منظور کیا۔ جسکا مفاد "آزادیٔ کامل" تھا۔ غرضکہ ۱۹۲۰ء کا دور ہر حیثیت سے تنظیمی دور تھا۔ بلکہ ملّی موت و حیات کا دور تھا جس سے گذرنا اسی قوم کا حق تھا۔ جس نے ہمیشہ موت کی بارگاہ سے حیاتِ ابدی کا تمغہ پایا۔

۱۹۲۰ء میں اندرون اناطولیہ کے سیاسی حالات اس قدر پردۂ خفا میں تھے کہ ان کا معلوم کرنا تقریبًا ناممکن تھا، کچھ تو اس وجہ سے کہ احرار کے اپنے ذرائع رسل و رسائل مسدود تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ لامرکزیت کارفرما تھی اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ "الہامی خبر رساں ایجنسیوں" نے اپنے دوستوں کی خاطر شغافی کی اشاعت کا ٹھیکہ لے لیا تھا جس کے لئے حقیقت کی ضرورت نہ تھی بلکہ "اقلیتوں" کی حمایت کے لئے سیاسی ڈاکٹروں نے بھی یہی نسخہ تجویز کیا تھا

۲۰

غرضکہ ان وجوہ سے ان کے سبق آموز اور مشکور مساعی معرضِ خفا میں تھے۔ البتہ ان کے "نج" کے افسانے تمام دنیا میں پھیلائے جا رہے تھے۔ وہ اگر باغیوں کی سرکوبی کرتے تھے۔ مجرموں کو کیفرِ کردار کو پہونچاتے تھے تو ظلم اور سفاکی کے مجرم ہوتے تھے لیکن دوسری قومیں معصوموں اور بے گناہوں کا خون کر کے بھی عادل۔ منصف اور متمدن کہے جانے کی مستحق تھیں۔

مجلس وطنی کبیر کا ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء یوم جمعہ کو بعد نماز جمعہ افتتاح ہوا اور وزارت کی تشکیل حسب ذیل ہوئی :۔

۱۔ فوزی پاشا — وزیر جنگ
۲۔ یوسف کمال — وزیر خارجہ (انھیں نے ماسکو سے معاہدہ کیا تھا)
۳۔ عطا بک — وزیر داخلیہ
۴۔ خواجہ فہمی آفندی — وزیر امورِ مذہبی (جس طرح آستانہ میں شیخ الاسلام کا عہدہ تھا اور وہ رکن وزارت ہوا کرتا تھا)

۵- فریدبک   وزیر مالیہ عمومیہ
۶- حافظ محمد بک   وزیر عدالت و قانون

مجلس وطنی کبیر کی پہلی سالگرہ

۲۳ اپریل ۱۹۲۱ئہ کو کامل ایک سال کے بعد انگورہ میں "مجلس وطنی کبیر" کی سالگرہ بڑے زور و شور سے منائی گئی۔ آفریں اس قوم پر کہ جو خونی معرکوں میں مصروف ہوتے ہوئے ابھی قومی عیدیں منائے اور نفس مطمئنہ کا مظاہرہ کرے، بہرحال اس سالگرہ کے موقع پر "حاکمیت ملیہ" (نیم سرکاری اخبار) کے اڈیٹر نے بانئی تحریک اناطولیہ بطل حریت غازی مصطفےٰ کمال اتاترک سے ملاقات کی اور "مجلس وطنی کبیر" کے خیال ابتدا، اور اس کی تدریجی ترقی کے متعلق معلومات چاہی جسکا جواب غازی مصطفےٰ کمال اتاترک نے اجمالاً دو حصوں میں عطا فرمایا جو حسب ذیل ہے:-

"میں آزادی کا عاشق ہوں اور یہ وہ عشق ہے جسکو میں نے اپنے ماں باپ سے ورثہ میں پایا ہے جو شخص مجھ کو بچپن سے جانتا ہے اور جسکو میری خاندانی و سرکاری زندگی کا حال معلوم ہے وہ خوب سمجھتا ہے کہ میں اس عشق و محبت کا متوالا ہوں، یہ میرا ایمان ہے کہ کوئی قوم اپنی عزت اور خودداری کو برقرار نہیں رکھ سکتی ہے جب تک کہ وہ آزادی سے مالا مال نہ ہو۔ میں ذاتی طور سے اس مخصوص صفت پر زور دیتا ہوں اور اسی وجہ سے میری رائے ہے کہ تاوقتیکہ میری قوم اس صفت سے آراستہ نہ ہو میں آزادی کا دعویٰ نہیں کرسکتا ہوں۔ حتیٰ کہ جب تک میں آزاد ملک کا فرزند نہ ہوں اسوقت تک میں زندہ نہیں رہ سکتا ہوں۔ اس لئے ملکی آزادی نہ صرف اہم مسئلہ ہے بلکہ وہی زندگی ہے۔ میں یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ ہمارے لئے اپنے ملکی مصالح کے اعتبار سے دوسری قوموں سے دوستانہ و سیاسی تعلقات کا قائم کرنا لازمی ہے کیونکہ تمدنی زندگی کا تقاضہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر دنیا کی کوئی قوم یہ ارادہ کرلے کہ وہ ہمارے ہاتھ باندھ کر ہماری آزادی کو غصب کرلے تو پھر میں اس قوم کا بدترین دشمن ہوجاؤں گا تاوقتیکہ وہ اس مقصد سے باز نہ آجائے۔ مثالاً میں یہ کہوں گا کہ ہم بزمانہ جنگ عظیم جرمنی کے ساتھ ہوکر لڑے کیونکہ جغرافیائی حالت، سابقہ تاریخی واقعات اور سیاسی تو ازن نے ہم کو اس بات پر مجبور کیا تھا۔ غرضکہ ہم نے جرمنی کی طرف دستِ محبت بڑھایا حتیٰ کہ وہ ہمارے لشکروں اور ہماری حکومت میں داخل ہوگئے جسکو ہم نے بلکل گوارا کیا۔ لیکن جب بعض جرمنیوں نے ہمارے راستے میں روڑے اٹکانے شروع کئے، جس سے ہماری آزادی اور استقلال میں خلل واقع ہونے لگا تو سب سے پہلے میں ہی بلا قید و شرط ان کے خلاف ہوا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی زمانہ جنگ میں ایک سال تک میں ان لوگوں کا مخالف رہا جو میری اس رائے کو کچھ وزن نہیں دیتے تھے۔ بالآخر میں نے جنگ کے اختتام کے قریب شام کی قیادت کو منظور کرلیا اور وہاں چلا گیا۔ لیکن میں اس سے متفق نہیں تھا کہ جنگ جاری رہے بلکہ میں یہ چاہتا تھا کہ پہلی فرصت میں اسکو ختم کردیا جانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اس اپنے خیال کو سرکاری طور سے واضح بھی کردیا تھا۔ یہ میرے دل میں کبھی خیال تک نہیں آتا تھا کہ انگریز، اطالوی اور فرانسیسی ہمارے ٹکڑے پارچے کردینے اور ہماری قوم کی تذلیل پر تلے ہوئے ہیں اور وہ وحشی جانوروں کے مثل حرکات مذبوحی کرینگے البتہ یہ مجھے ضرور گمان تھا کہ اگر ہمکو شکست ہوئی تو سزا اور نقصان اٹھائے بغیر ہم اس جنگ سے بچکر نہیں نکلیں گے۔ اس کے علاوہ یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ قومیں جو انسانیت - مدنیت اور

انصاف کی مدافعت کے دعویدار ہیں خواہ ان کے نفسیات اور ذہنیتیں کچھ بھی کیوں نہ ہوں وہ ترکی تاریخ کی
تباہی کے درپے ہو جائیں گی اور ترکی قوم کی آزادی کو ملیامیٹ کر کے اس کی زندگی اور عزت کو خاک میں
ملا دینے کی کوشش کرینگی۔ غرضکہ یہ خیالات لے کر میں "آطنہ" سے "آستانہ" کی طرف چلا۔ کیونکہ آطنہ کے
لشکر "یلدرم" (برق) کی قیادت میرے سپرد تھی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آستانہ شرائط وقفۂ جنگ پر دستخط کر چکا تھا
اور معاہدۂ صلح کا منتظر تھا غرضکہ وہاں پہونچکر میں جب کبھی انگریزی۔ اطالوی اور فرانسیسی مدبرین اور فوجیوں
سے ملا اور ان پر اپنی اس رائے کو یہ کہکر میں نے ظاہر کیا کہ:-

"ہمارے لئے دول وسطےٰ کے ساتھ جنگ کی آگ میں کودنا
ضروری تھا کیونکہ تم نے ہمکو غیر جانبدار رہنے ہی نہیں دیا تھا۔
اس لئے کہ زار روس تمہارے ساتھ تھا۔ ہم تم سے اس چیز میں
ضرور گفتگو کر سکتے ہیں جو شکست کے لئے مستلزم ہے لیکن کسی قوم
کو محض شکست کی پاداش میں آزادی سے محروم نہیں کیا جا سکتا ہے"

لیکن میں جس قدر زیادہ پُر اثر طریقہ سے ان سے اس معاملہ میں گفتگو کرتا تھا اسی قدر زیادہ مجھے ان اقوال سے
جو ان کی زبانوں سے سنتا تھا حیرت ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ اتحادیوں کے فوجی افسروں اور سپاہیوں کی ترکوں پر زیادتیاں
اور ان کی ذلت آمیز حرکتیں کرنی اس حقیقت کو اور واضح کر رہی تھیں۔ چنانچہ آستانہ مع اپنے سلطان۔
ارکان حکومت۔ افسران فوج اور باشندگان کے ششدر اور حیران تھا اور زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا تھا کہ
جنکا توڑنا ناممکن تھا۔ چنانچہ میں بھی اسی طرح سے پابہ زنجیر تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ کوئی شریک غم مل جاتا
اور غمگساری کرتا۔ بعض اوقات ایسے غیرت مند لوگ ملتے تھے کہ جو بُرے نتائج کو محسوس کر رہے تھے اور ان سے
رہائی کے وسیلے ڈھونڈ رہے تھے لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ یہ وسیلے آستانہ ہی میں مل جائیں گے اسی وجہ سے وہ
نئے نئے پروگرام بناتے تھے جو بے سود تھے کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ کہاں سے کام شروع کیا جانا چاہئے تھا۔
کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ خیال کرتے تھے کہ غیروں کی حمایت ان کو اس مصیبت سے رہائی دلائیگی حالانکہ ان کو
یہ نہیں معلوم تھا کہ وہی غیر لوگ آزادی کی روح کو بالکلیہ پامال کر رہے تھے۔ اس وقت مجھ کو کامل یقین ہو گیا تھا
کہ دشمن نے ہماری آزادی کو ملیامیٹ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ لیکن قوم اس حقیقت سے اس وقت تک بے خبر
رہی جب تک کہ آستانہ "خلیج گوہیرے کے غصہ کا شکار ہو کر آخری سانس نہ لینے لگا"۔ وہاں کا ہر ہوشمند
اور دانشمند یا تو دشمن کی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا اور یا غافل ہونے کی وجہ سے گمراہی کے گڑھے میں پڑا ہوا تھا
غرضکہ وہاں نہ تو صحیح راستہ دکھائی دیتا تھا اور نہ ٹھیک نشانہ متعین کیا جا سکتا تھا۔ جسکی طرف قوم کی رہنمائی
کی جاتی اس لئے ہر حالت میں تحریک کا مرکز آستانہ سے باہر ہی ہو سکتا تھا۔ اب ضرورت یہ تھی کہ وہ مرکز متعین
کیا جاکر تمام قوم کی اس طرف رہنمائی کی جاتی۔ کچھ دنوں میں نے اس پر غور کیا اور بعض اپنے بھائیوں سے اس
معاملہ میں تبادلۂ خیالات بھی کیا جنکو میں نے اپنا ہم خیال پایا۔ اس وقت میں نے ارادہ کیا کہ اناطولیہ جاکر نہ صرف
عام رائے اور قومی احساس کا پتہ چلاؤں بلکہ ملک کے ذرائع بھی معلوم کروں لیکن میرے لئے آستانہ چھوڑنا بھی ایک

زبردست مسئلہ تھا۔ میں اسی اُدھیڑبن میں تھا کہ قدرت نے میری مدد کی اور حکومت نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا فوج اناطولیہ کی انسپکٹری منظور ہے۔ میں نے یہ خدمت بے سوچے سمجھے منظور کرلی۔ کیونکہ مجھے کامل یقین تھا کہ اس وقت اناطولیہ پہنچنے سے میرے لئے کل راستے کھل جائیں گے۔ چنانچہ جس روز میں آستانہ سے روانہ ہوا ہوں اسی روز دشمن نے سمرنا پر قبضہ کیا تھا جس سے اسکی بدنیتی اور خیانت معلوم ہوگئی تھی۔ غرضکہ میں نے فوراً اناطولیہ کی طرف روانگی کا آخری فیصلہ کیا تاکہ وہاں پہونچ کر قوم کو تمام حالات سے آگاہ کردوں اور جو قومی آزادی خطرہ میں پڑ چکی تھی اس کی مدافعت اور محافظت کے لئے اس کو تیار کرلوں۔ ارکان حرب کے بعض افسروں کے سامنے جن پر مجھ کو کامل بھروسہ تھا یہ مسئلہ میں نے پیش کرکے ان سے مدد کی امید ظاہر کی تاکہ میرے کاموں میں تکلّفات نہ پیش آئیں۔ جہاز پر سوار ہونے سے قبل میں باب عالی میں گیا تو دیکھا کہ اس خبر کے پہنچتے ہی کہ سمرنا پر دشمن نے قبضہ کرلیا ہے۔ وزراء جمع ہیں چنانچہ جونہی انھوں نے میری حاضری سنی جلسہ ملتوی کردیا اور ان میں سے بعض نے مجھ سے آکر کہا "اب ہمکو کیا کرنا چاہئے" میں نے جواب دیا "تیار ہوجاؤ" انھوں نے کہا "یہاں کیونکر تیار ہوں" میں نے جواب دیا "جو کچھ تم یہاں کرسکتے ہو کرو پھر کام کو جاری رکھنے کے لئے مجھ سے آکر مل جانا" یہ کہکر میں ان سے رخصت ہوا اور جہاز میں سوار ہو کر ساحل "سامسون" پر اترا۔ سرزمین اناطولیہ پر پہونچتے ہی میں نے دیکھا کہ تمام قوم کا رجحان اس درجہ پر پہونچ چکا تھا کہ وہ اب وطن کی آزادی کی مدافعت میں بے چین تھی۔ دو سال میں جو واقعات رونما ہوئے تھے انھوں نے یہ ثابت کردیا تھا کہ جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ ٹھیک اور قوم کا عزم و ایمان راسخ تھا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ مجھے اس پر فخر ہے۔"

یہ تو سوال کے اس حصہ کا جواب تھا جسمیں فاضل اڈیٹر نے "خیال عمل" کے اسباب دریافت کئے تھے۔ اس کے بعد یہ سوال کیا کہ عملاً اسکی ابتدا کیونکر اور کب سے ہوئی اور ایک سال میں اس نے مدارج ترقی کو کیونکر طے کیا تو صدر جمہوریہ نے فرمایا:۔

" ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو جب آستانہ پر قبضہ ہوگیا جس کی وجہ سے قوم اور ملک اپنے دارالخلافہ اور مرکزیت سے محروم ہوگئی تو انگورہ میں "مجلس وطنی" کا قائم کرنا ضروری ہوگیا تاکہ ملک کی آزادی اور اس کی نجات کے متعلق سوچا جائے۔ چنانچہ اسمیں ہمکو کامیابی ہوئی اور قوم کے بعض لیڈر وسط اپریل میں بھاگ کر یہاں پہونچ گئے چونکہ ذرائع حمل و نقل ناقص تھے اس لئے ان لوگوں کے یہاں پہونچنے میں دیر ہوئی اس تاخیر سے مجھ کو ناقابل بیان تکلیف ہوئی تھی غرضکہ میں اپنے رفقاء کے ساتھ رات دن اسی تگ و دو میں رہنے لگا کہ ملک کی نجات کیلئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ میں یہ خوب جانتا تھا کہ تمام قوم میں فطرتاً اخلاص و صداقت موجود ہے وہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے بے چین ہے اور اس کے قلوب ایمان صادق سے لبریز ہیں۔ مجھے کامل یقین تھا کہ اگر ہم معقول تدابیر پر قابو پاگئے تو یقیناً ہم ان تمام خطرات کا ازالہ کردیں گے جو بعض شریروں نے اپنی گمراہی سے ملک کے بعض حصوں میں پھیلا رکھے تھے۔

دشمن اندرون ملک میں رائے عامہ کو مسموم کرنے کی برابر کوشش اور بیرون ملک کے لوگوں کے خیالات پراگندہ کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ میری ذات پر حملہ کر رہے تھے اور اس سے انکاری تھے کہ ملک میں قومی ہیجان تھا اور قوم اپنی بیدار قوتوں کے ساتھ اپنی آزادی اور حقوق کی مدافعت کے لئے بالکلیہ تیار ہوگئی تھی۔ اسی وجہ

سے یہ لوگ ایک طرف قوم سے اور دوسری طرف حکومت آستانہ سے یہ کہتے تھے کہ "مصطفےٰ کمال کو نہ تو تسلیم کرو اور نہ اس پر اعتماد کرو۔ اتحادی حکومتیں ترکی قوم کے ساتھ جو کچھ سختی کر رہی ہیں وہ صرف اسی شخص کی وجہ سے ہیں"! یہ کہہ رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر میرا خاتمہ ہوگیا تو پھر ملک اور قوم کو بیرونی دوستی و صداقت حاصل ہوجائیگی غرضکہ اس طرح سے وہ لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ علانیہ زہر پھیلایا جارہا ہے اس کے علاوہ ان ریشہ دوانیوں، سازشوں اور بہتانوں کے نتیجہ پر بھی میری نظر تھی۔ لیکن جب کبھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ لوگ مجھ کو ان تمام مصیبتوں کا جو ملک پر نازل تھیں سبب سمجھیں گے تو میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے تھے۔ اسی لئے میں نے ایک روز یہ سوچا کہ اس اہم خدمت کے بوجھ کو جو میں نے اپنے سر لیا ہے اتار پھینکوں یہ سوچکر میں نے اپنے احباب سے جو میرے شریک کار تھے مشورہ کرتے ہوئے کہا، کہ اس بوجھ کو وہ لے لیں لیکن ان تمام نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو دشمن اور شیر ہوجائیں گے اور ان کے ارادے اور مضبوط ہوجائیں گے۔ اندرونی بغاوت کی آگ اسقدر تیزی سے بھڑک رہی تھی کہ اب وہ انگورہ کے دروازہ پر آگئی تھی اور میں نے اس خطرناک اور ہولناک ذمہ داری کو اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ اس وقت میں نے پھر یہ سوچا کہ خواہ کچھ بھی ہو اب اس حالت میں پیچھے ہٹ جانے کے یہی معنے سمجھے جائیں گے کہ یا تو جس خدمت کو ہم نے اپنے ذمہ لیا تھا اس میں مایوسی ہوئی اور یا جس کام کو ہم نے شروع کیا تھا اس کی ذمہ داری سے خوفزدہ ہوگئے تھے۔ غرضکہ اور اسی قسم کے تاویلات ہونگے جو یقیناً ہمارے پاک مقصد کو برباد کرکے اس قوت مجتمعہ کو پاش پاش کردیں گی جو اس مقصد کے لئے مجتمع ہوئی تھی۔ آخرکار میں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنے احباب کی صداقت اور اپنی قوم کے ارادے اور ایمان پر بھروسہ کرکے اس مقدس خدمت کو تاختم جہاد قومی انجام دیتا ہے مجھے یقین تھا کہ اللہ کی مدد سے ہم دشمن کو بالآخر اس کی عاجزی تسلیم کراہی دیں گے۔ لیکن چونکہ اب تحریک قومی میں تاخیر کا موقع نہیں تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس کے لئے قواعد وضوابط مرتب ہوجائیں لہذا اب ہم نے مناسب سمجھا کہ "مجلس وطنی" قائم کیا جائے چنانچہ ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء یوم جمعہ بعد نماز اسکے افتتاح کے لئے مقرر کیا گیا۔ میں دو بجے مجلس کی طرف چلا جارہا تھا اور وہی تمام باتیں سوچ رہا تھا جو مہینوں سے میرے دماغ میں چکر لگا رہی تھیں جنکا ذکر میں نے ابھی اوپر کیا ہے۔ جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ سردارانِ قوم مجھ پر اعتماد و اعتبار کی نظریں ڈال رہے ہیں۔ جس نے اس بات کو مضبوط تر کردیا تھا کہ جو کوششیں ہم کر رہے ہیں وہ قومی اُمیدوں کے عین مطابق ہیں۔ میں اس عظیم سعادت و افتخار کے احساس کو بیان نہیں کرسکتا ہوں جو میں نے اس وقت محسوس کیا جبکہ ان احباب سے اس جلسہ گاہ میں دوچار ہوا۔ وہ وہ لوگ تھے جو قوم کے خواہشات وجذبات کی صحیح نمایندگی کرتے ہوئے ہمارے ہر عمل میں شریک ہونے والے تھے۔

الاخبار قاہرہ۔ ۲۴ مئی ۱۹۲۱ء یوم سہ شنبہ
مطابق ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۳۹ھ ہجری۔

تبدیلِ وزارت

۱۹۲۰ء کی وزارت مئی ۱۹۲۱ء کو وزیر جنگ کے بعض تجاویز سے اختلاف کی بنا پر مستعفی ہوگئی۔ چنانچہ نئی وزارت کی حسب ذیل تشکیل ہوئی اور جنرل رافت پاشا، سپہ سالار افواج جنوبی اناطولیہ مجلس وزراء کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۔	فوزی پاشا	وزیر جنگ
۲۔	یوسف کمال پاشا	وزیر خارجہ
۳۔	عطا بک	وزیر داخلیہ
۴۔	خواجہ فہمی آفندی	وزیر شریعت اسلامیہ
۵	حسن بک	وزیر مال
۶۔	جلال بک	وزیر اقتصادیات
۷۔	ڈاکٹر رفیق بک	وزیر صحت و امداد
۸	رفیق شوکت بک	وزیر قانون
۹۔	عمر لطفی بک	وزیر تعمیرات
۱۰۔	حمداللہ صبحی بک	وزیر تعلیمات

وزارت کا یہ "نقش ثانی" "نقش اول" سے بہتر قرار پایا۔ دو سابق وزیروں (فرید بک وزیر مال اور حافظ محمد بک وزیر قانون) کے علاوہ باقیماندہ بحالہ اپنے اپنے عہدوں پر رہے البتہ اتنا اضافہ اور کر دیا گیا تھا کہ وزراء کی تعداد قریب قریب المضاعف ہوگئی تھی۔ اس لئے کہ ایکسال کی تنظیم کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ کاموں کو دوبارہ تقسیم کیا جا کر سررشتہ جات کو ازسرنو مرتب کیا جائے۔ لیکن وزارت کے اس تغیر سے سیاست میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا تھا کیونکہ وزارت کی نئی تشکیل کسی سیاسی اختلاف کی بنا پر نہیں تھی۔

ملک کی تنظیمی تکمیل پر حکومت جارجیا کے سابق سفیر موسیو مودیوانی متعینہ حکومت انقرہ نے جو حسب ذیل مختصر بیان اخبار "وقت" کو دیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی مالی، سیاسی اور فوجی حالت نہ صرف قابل ستائش تھی بلکہ قابل رشک تھی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

"پولس اور فوج کے دوبارہ تنظیم میں حکومت انقرہ کو حسب دلخواہ کامیابی ہوئی۔ جسکی وجہ سے فوجی قوت اس سے کہیں زیادہ ہوگئی ہے جتنی کہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔

"مجلس وطنی کبیر" میں اسوقت تین اہم پارٹیاں ہیں۔ قوم پرور وسط میں دائیں جانب اور زیادتی پسند بائیں جانب۔ جو پارٹی وسط میں بیٹھتی ہے وہی حکومت کی پارٹی ہے اور سب سے زیادہ قوی ہے۔

اس کے ساتھ ہی سفیر نے یہ بھی کہا کہ وہاں کی مالی حالت بہت ہی اچھی ہے اور یہ کہ اس نے ایشیائے کوچک کی سیاحت کے دوران میں غیر مسلم قوموں کے ساتھ کسی قسم کا بُرا سلوک نہیں دیکھا۔

الاخبار۔ قاہرہ۔ ۱۳ مئی ۱۹۲۱ء

اس ایک سال کی جانکاہی کے بعد کمالی جماعت نہ صرف منظم ہوگئی تھی بلکہ طاقتور بھی تھی اور اب وہ تذبذب جو ملی موت وحیات

نسبت ان کے دلوں میں تھا وہ قطعاً باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ بقول "الاخبار (قاہرہ) مورخہ یکم جون ۱۹۳۱ء
"مصطفیٰ کمال پاشا نے بیان کیا ہے کہ ترکی لشکر اس وقت (۲۸۰۰۰۰) دو لاکھ اسی ہزار سے زیادہ ہے
جو نہ صرف بالکلیہ مسلح ہے بلکہ اس کے قبضہ میں کافی ذخیرہ اور توپیں بھی ہیں اب دشمنوں کا سمرنا خالی کرنا یقینی
امر ہے۔"
وہ یونان جس نے ۱۹۲۰ء میں سمرنا پر اس زعم باطل میں چند اپنے دوستوں کی مدد سے قبضہ کر لیا تھا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ پورے اناطولیہ
کا مالک ہو جائیگا۔ اب سمرنا کے تخلیہ کی تیاری اور تھریس کی ملکیت کی فکر کر رہا تھا۔ چنانچہ دو سال بعد "تیاری" کی تکمیل ہو گئی۔ جسکی تفصیل آئندہ آئیگی۔

شبنم و آفتاب

(از حضرت آذر ہاشمی کانپوری)

رہتے ہیں وہ جمال ریز فہم بشر سے دور، دور
عالم دل کے پاس پاس، حد نظر سے دور دور

عشق ہمیشہ شکستگی، جوشش طلب کی زندگی
میں ہوں اسی لئے تری راہگذر سے دور دور

شرم و گنہ کی نسبتیں آپ ہیں اپنی رفعتیں
رہ نہ سکیں وہ رحمتیں دامن تر سے دور دور

ان سے اب اُنکے ہجر کی کیجئے کیا شکایتیں
خود ہمیں آجتک رہے اپنی نظر سے دور دور

لذت سجدہ کیا کہوں، سجدہ بے اثر سہی
یار کا نقش پا تو ہے غیر کا سنگ در سہی

بار کرم اُٹھائے کون، امتئی دل مٹائے کون؟
عشق کی زندگی تو ہے قہر کی اک نظر سہی

عارض برق ریز ہی یوں نہ حجاب اُٹھائیے
جائیے میری شام غم شام نہیں سحر سہی

کیا نہیں آپ جانتے شبنم و آفتاب کو
وہ رُخ آتشیں سہی، یہ مری چشم تر سہی

لذت قرب پر نہیں نسبت سجدہ منحصر
سجدہ آستاں نہ ہو، سجدہ رہگذر سہی

اردو زبان کی تاریخ

از محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ایل ایل بی (علیگ)

"ہمارے دوست تنہا صاحب بی اے کئی سال سے قدیم و جدید شعرا کا ایک تذکرہ تحریر فرما رہے ہیں یہ مضمون اسی تذکرہ کا ایک جزو ہے یہ مضمون جس دقت نظر اور تلاش و مطالعہ کا نتیجہ ہے آپ پر خود ہی روشن ہو جائیگا۔ مضمون نگار حضرات کا شکریہ ادا کرنا سنتِ ادارت ہے لیکن تنہا صاحب محض مضمون نگار نہیں ہیں، وہ میرے قریب ترین دوست ہیں۔ ذوق نے دماغوں کو اور صداقت نے دلوں کو متحد کر دیا ہے۔ غالباً اظہار سپاس سے ضبط سپاس میں شعریت ہے۔"

وہ تذکرہ جس کے بسیط ابواب کا یہ مضمون ایک مختصر جزو ہے۔ ایک نہتم باشان تصنیف ہے جس کے متعلق کچھ تحریر کرنا قبل از وقت ہے۔ مگر یقین ہے کہ اس کی اشاعت دنیائے ادب میں کافی مفید اور ہنگامہ خیز ثابت ہوگی۔ میں اس لئے مطمئن ہوں کہ خوش قسمتی سے شاعر نہیں ورنہ تنہا صاحب کے سیف قلم سے میں بھی محفوظ نہ رہتا۔

لیکن بہرحال جب یہ تذکرہ شایع ہوگا تو میں غور کرونگا کہ ظالم کا ساتھ دیا جائے یا مظلوم کا!؟ تذکرہ کی جامعیت، علمی اہمیت اور تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا اندازہ آپ اس مضمون سے بخوبی کر سکتے ہیں جو تحقیقی ادب کی بہترین مثال ہے اور تنہا صاحب کی کاوش کی خود ہی داد دے رہا ہے۔

ہماری آرزو ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ تذکرہ شائع ہو، میری رائے میں اگر "ہندوستانی اکیڈمی" یا کوئی دوسری انجمن اس تذکرہ کو بالمعاوضہ حاصل کر کے شائع کرے تو اردو ادب مالامال ہو جائے اور ایک انمول موتی گوشۂ صدف سے نکل کر اپنی جوت سے دنیا کو روشن کر دے۔

ساغر

یہ امر مسلّمہ ہے کہ جب دو صاحب زبان قومیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور ان میں باہم رشتۂ اتحاد و ارتباط قائم ہوتا ہے تو قانونِ فطرت کے مطابق، اخلاق، مذہب، زبان، طرزِ بود و ماند، ادب و آداب، لباس اور دیگر شعائر پر ایک دوسرے کا اثر نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ اثر کچھ مدت میں ایک صورت اختیار کر لیتا ہے اور سب کو نظر آنے لگتا ہے۔ اس قاعدۂ کلیہ میں کوئی استثنار نہیں

جن لوگوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ اس امر کی بھی شہادت دے سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں دیگر امور متذکرہ بالا کی نسبت دونوں قوموں کی زبان پر خصوصاً زیادہ اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ اظہارِ مطالب کے لئے ہر شخص وہی لفظ استعمال کرنے کی قصداً کوشش کرتا ہے جسکو دوسری قوم کا فرد بآسانی سمجھ لے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ آخرالذکر قوم کی زبان کا لفظ بولا جائے۔ اس طریقے سے دونوں قوموں کے افراد روزمرہ کے کاروبار چلانے کے لئے کچھ الفاظ ایک دوسرے کی زبان کے سیکھ لیتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ایک زبان کے بہت سے الفاظ دوسری زبان کے اصلی الفاظ بن جاتے ہیں۔

اب خیال کیجئے کہ جب پہلی صدی ہجری کے اواخر میں عربوں نے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ کو اور بعد ازاں ملتان کو اپنی فتوحات میں شامل کر لیا اور وہ اسلامی قلمرو کا ایک جزو ہو گئے تو کیا اسلامی تہذیب و تمدن کا رواج وہاں شروع نہ ہو گیا ہوگا اور عربی زبان کے بہت سے الفاظ سندھی بولی میں داخل نہ ہو گئے ہوں گے۔ یقیناً ایسا ہوا ہوگا۔ عربوں نے بھی اکثر سندھی الفاظ کو معرب بنا لیا۔ مثلاً جاٹ یا جٹ کو زط کہنے لگے۔ تیسری صدی ہجری میں صفاریوں نے ایران کو فتح کر لیا تو ان کے ایرانی اثرات قربت کی وجہ سے سندھ کو متاثر کرنے لگے۔ چنانچہ اس عہد کے سیاحوں کا بیان ہے کہ یہاں کے باشندے ہندو اور مسلمان عراقی لباس پہنتے تھے، ہندو بھی شلوار کا استعمال کرتے تھے اور ڈاڑھیاں رکھتے تھے۔ چوتھی صدی کے سیاح اصطخری کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے تھے۔

جب سلطان محمود غزنوی نے پانچویں صدی ہجری کے شروع میں لاہور پر قبضہ کرکے پنجاب کو اپنی سلطنت سے ملحق کر لیا اور لاہور کا نام محمود پور رکھ کر اپنے ولی عہد[1] کا صدر مقام بنا دیا، جس کے ماتحت فوج کی بڑی تعداد رہتی تھی اور جس میں زیادہ تر ترک، افغان، خلج وغیرہ تھے تو مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد محمود ہی کے وقت سے پنجاب میں آباد ہو گئی اور اس کا یہ اثر ہوا کہ ابوریحان بیرونی نے جو علامہ البیرونی کے نام سے موسوم ہے اور جس کا شمار دربارِ غزنوی کے افاضل اور اکابر میں ہے، ہندوؤں کی قدیم علمی درس گاہوں میں طالب علمی کرکے سنسکرت حاصل کی اور ہندوؤں کے علوم عربی میں اور عربوں کے علوم سنسکرت میں منتقل کئے اور برسوں ان شہروں میں رہ کر جہاں اسلام کا نام و نشان بھی نہ تھا یہاں کی مروجہ زبانیں سیکھیں۔ جن کتابوں کو اس نے عربی میں منتقل کیا۔ اُن کے نام سنسکیا اور پتنجلی ہیں۔ اسی عہد سے وابستہ فارسی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان ہے جس کی نسبت تذکرۂ مجمع الفصحا میں لکھا ہے "ورا سہ دیوان بود تازی، ہندی، پارسی" اور مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ "تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں اس نے ایک دیوان لکھا تھا"۔ یہ غزنویوں کے عہدِ اولیں کا ایک نامور مسلمان شاعر تھا۔ وہ لاہور میں پیدا ہوا تھا، اگرچہ خاندانی لحاظ سے وہ عجمی تھا تاہم اس نے اپنے وطنِ ولادت کی زبان میں بھی ایک دیوان مرتب کر ڈالا۔

۲۸

خود فارسی[2] زبان میں ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو اسی عہد میں فارسی پر ہندی اثرات کی گواہی دیتے ہیں مثلاً لفظ بت جو بودھ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یا کوتوال جو ٹھیٹ ہندی یعنی کوٹ والا بمعنی مالکِ قلعہ تھا۔ یہ لفظ شاہنامۂ فردوسی میں موجود ہے۔ شعر

چو آگاہ شد کوتوالِ حصار برآویخت با رستم نامدار

صاحبِ شرف نامہ کہتے ہیں۔

"واز شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بخراسان و فارس مشہور شدہ"۔

لکھن یعنی لنگھن[3] (روزۂ ہندواں) منوچہری کے ہاں ملتا ہے۔ شل یعنی سیل ہندی ہے اور فرخی کے ہاں ملتا ہے

بگونۂ شلِ افغانیاں دو پرہ و تیز چو دستہ دستہ ہم تیرہائے بے سوفار

چندن، فرخی اور منوچہری کے ہاں آتا ہے۔ جسے ہم آجکل صندل کہتے ہیں۔ برشکال (ورس کال) یعنی برسات کا موسم ہندی لفظ ہے۔

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۳۰ و ۳۱ [2] پنجاب میں اردو صفحہ ۳۳ و ۳۴ [3] یہ لفظ برت کی جگہ استعمال نہیں ہوتا۔ عورتوں کی بول چال ہے بمعنی فاقہ [4] پنجاب میں اردو صفحہ ۲۹ ساحر

مسعود سعد سلمان کے ہاں موجود ہے ؎ برشکال اے بہار ہندوستان   اے نجات از بلائے تابستان۔ علاوہ ازیں ہندی کا محاورہ "مار مار" بھی استعمال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:- چو رعد زا بر بغرید کوس محمودی   بر آمد از پس دیوار حصن مار مار۔

حکیم سنائی اسی عہد کے ایک شاعر ہیں جو ہندوستان بھی آئے تھے۔ ایک شعر میں پانی کے لفظ کو اس طرح استعمال کر گئے ہیں گویا کہ فارسی زبان کا لفظ ہے ؎ نہ در آں معدہ خدرہ میدہ   نہ در آں دیدہ قطرۂ پانی۔ عثمان مختاری غزنوی بھی ہندوستان آئے تھے انھوں نے ایک شعر میں دو ہندی لفظ باندھ دیئے ہیں ؎ زمن بریسے باد بے بجستہ گفتے چوں۔ گس بدیدے برمن نشستہ گفتے مار۔ اس شعر میں چوں اور مار دونوں ہندی لفظ ہیں۔

مسعود رازی[1] سلطان محمود اور سلطان مسعود شہید کے عہد کا شاعر ہے۔ اس کو سلطان نے حکم دیا تھا کہ ہندوستان ہی میں رہے۔ اُستاد ابو الفرج رونی اسی شاعر کا فرزند ہے۔ رونی منسوب ہے رونہ کی طرف جو لاہور کا ایک موضع بیان کیا جاتا ہے ابو الفرج نے اپنی تمام عمر لاہور میں ہی گزاری۔ ضرورتاً ایک آدھ مرتبہ غزنین کا سفر کیا۔ علماء میں سب سے مقدم شیخ اسمٰعیل لاہوری متوفی ۴۴۸ھ ہیں جو جامع علوم ظاہری و باطنی تھے اور سادات بخارا سے تھے۔ وہ لاہور ہی میں آباد ہو گئے تھے۔ مشائخ کے سلسلہ میں ابی الحسن بن ابو عثمان الجلابی صاحب کشف المحجوب ہیں جو ۴۶۵ھ میں انتقال فرما گئے اور لاہور ہی میں سپردِ خاک ہوئے۔ فی زمانہ داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ شاہ یوسف دوسرے بلند پایہ بزرگ ہیں جو ۵۱۵ھ میں فوت ہوئے۔ ان بزرگوں کے علاوہ شیخ فخر الدین حسین زنجانی لاہوری سید احمد توختہ ترمذی لاہوری۔ سید یعقوب صدر دیوان زنجانی لاہوری بھی مشہور ہیں جو قرن ششم ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان امور سے واضح ہوتا ہے کہ یقیناً لاہور ان ایام میں ایک بارونق اسلامی شہر اور مرجع علم و فضل و ادب بن گیا تھا۔

آلِ غزنہ[2] کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال تک رہی ہے۔ اس عرصہ میں مسلمان اور ہندو اقوام کی یکجائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے۔ سرکاری ضروریات کی بنا پر بھی شاہی عہدہ داروں اور ملازمین کے لئے اس ملک کی زبان سے واقف ہونا ضروری تھا۔ غزنویوں کے قبضہ میں تمام پنجاب سندھ اور ملتان تھا، ہانسی، سرستی اور میرٹھ تک ان کے قبضہ میں تھے۔ اتنے بڑے علاقہ کے مالی و ملکی انتظام کے لئے عمّال کو اس ملک کی زبان سیکھنی ضروری تھی۔ مسلمان چونکہ تازہ ولایت تھے اور یہاں کی زبانوں کے ناموں سے بھی ناواقف تھے۔ اسی لئے انھوں نے اس مخلوط زبان کا نام ہند کی نسبت سے ہندی رکھ دیا۔ سلطان محمود کے زمانہ میں ہندی زبان کے ترجمانوں کی ایک جماعت غزنین میں مقیم تھی۔ ان میں تلک ہندی اور بہرام کے نام مشہور ہیں، تلک نے جو ہندی اور فارسی زبانوں سے خوب ماہر تھا کشمیر میں تربیت پائی تھی۔ وہ ترجمانی سے ترقی کر کے ہندو افواج کے سپہ سالار (غزنین میں ہندوؤں کی فوج بھی رہا کرتی تھی) سندر کی وفات پر سپہ سالاری کے درجہ پر پہونچ گیا تھا۔

کوئی تعجب نہیں اگر خود سلطان محمود ہندی زبان سے کسی قدر آشنا ہو کیونکہ جب ۴۱۳ھ کی مہم میں سلطان کالنجر پہونچتا ہے تو نندا کالنجر کا راجہ سلطان کی مدح میں ہندی شعر لکھ کر بھیجتا ہے، سلطان اِن اشعار سے اس قدر خوش ہوتا ہے کہ صلہ میں نندا کو پندرہ قلعوں کی حکومت کا پٹہ لکھ دیتا ہے۔ جن میں کالنجر بھی شامل تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ پنجاب کے میدانوں میں مسلمان حملہ آور بہت جلد سیاسی منافرت کے باوجود ہندوؤں کے ساتھ مِل جُل کر رہنے سہنے اور اُن کے ساتھ اختلاط اور ارتباط قائم کرنے لگے تھے۔

۱۱۹۳ء میں جب شہاب الدین غوری رائے پتھورا پر فتحیاب ہوا تو چاند کوی ایک نامی شاعر نے پرتھی راج راسو لکھا۔ اس کتاب کے ہر صفحے میں فارسی، عربی کے کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔

اسی زمانہ میں کشمیر کے حکمراں سلطان زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبانوں میں بھی پورا دخل رکھتا تھا۔ فارسی کتابوں کا ترجمہ

---

[1] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۳۳ و ۳۴۔ [2] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۳۹

ہندی میں اور بہت سی ہندی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا اور سب سے پہلے اسی کے حکم سے مہابھارت اور راج ترنگنی (قدیم تاریخ کشمیر) کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔

جب معز الدین یا شہاب الدین اور اس کے ولی قطب الدین ایبک نے چند سال کے عرصہ میں اجمیر، ہانسی، سستی، کہرام، میرٹھ، دہلی، بدایوں، قنوج، بنارس، نہروالہ، تھنگیر، گوالیار، کالنجر، اودھ اور مالوہ فتح کر لئے تو قدرتی طور پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی تعلقات میں اور اضافہ ہو گیا اور ایک مشترک زبان کی ضرورت بیشتر از پیشتر محسوس ہونے لگی۔

چنانچہ اسی عہد کے قریب قریب امیر خسرو نے جو ۷۲۵ھ میں فوت ہوئے خالق باری تصنیف کی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب بہت ضخیم تھی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کتاب امیر خسرو کی تصنیف ہی نہیں ہے بلکہ گیارہویں صدی میں کسی شخص نے اس کو تصنیف کیا اور امیر خسرو کے نام سے مشہور کر دیا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تصنیف امیر خسرو کی نہیں ہے تو نہ سہی لیکن امیر خسرو کے دیگر کلام سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس وقت عام گفتگو میں یہ مشترک زبان سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی تھی۔ چنانچہ امیر خسرو آنکھوں کا ایک مجرب نسخہ دوہروں کی بحر میں اس طرح لکھتے ہیں۔

لود پھٹکری، مردہ سنگ ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنگ افیون چنا بھر مرچیں چار اُرد برابر تھوتا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے ترٹ پیڑ نینوں کی ہرے۔ نیز امیر خسرو کی ایک غزل جس کا مطلع ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اور پہیلیاں، مکرنیاں اور گیت پتہ دیتے ہیں کہ سنہ ھ میں یہاں کے مسلمان یہی زبان اچھی طرح بولتے ہونگے، بیشک ہندوؤں کی نسبت ان کی زبان پر فارسی عربی الفاظ زیادہ آجاتے ہوں گے لیکن جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ زبان جسکو اس وقت کے مسلمان ہندی زبان سے تعبیر کرتے ہیں اور جسکو بعد ازاں اردو کا نام دیا گیا، برج بھاشا کی بیٹی ہے یا نہیں۔ جیسا کہ صاحب آبحیات کا خیال ہے۔ ہم اس بارہ میں "پنجاب میں اردو" کے مؤلف سے متفق ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "جب ان دونوں زبانوں (برج بھاشا اور اردو) کی صرف و نحو اور دوسرے خط و خال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے رستے

۳۰ مختلف ہیں۔ اردو جہاں اپنے اسماء و افعال کو الف پر ختم کرتی ہے، برج واؤ پر ختم کرتی ہے۔ برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے۔ اردو میں مرکب افعال کا مع توابعات کے بہت رواج ہے۔ برج بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے۔ اس لئے اردو کو برج بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی جس کی برج بھاشا ہریانی، راجستھانی، پنجابی اور اردو شاخیں ہیں قدیم پراکرت سوراسینی کی یادگار ہے لیکن جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ .... آج دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے قریب ہی تین زبانوں یعنی ہریانوی، برج اور راجستھانی کا سنگم ہوتا ہے اور گریرسن نے تو صاف دہلی کو ہریانوی زبان کے علاقہ میں شامل کر دیا ہے۔ مگر ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہی یعنی وہی اردو ہی جو گیارہویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے ...
.... بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات سے بن گئی ہے"

جس وقت مسلمان دہلی میں آئے تو دوآبہ میں یقیناً برج بھاشا بولی جاتی تھی کیونکہ شیخ عبد القدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ) اور مخدوم بہاؤالدین برناوی جو علی الترتیب سہارنپور اور میرٹھ کے اضلاع سے تعلق رکھتے ہیں اپنے ہندی اشعار ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو برج کے مماثل ہے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی الکھ داس تخلص کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔
سرود در پردہ پوربی ؎ دہن کارن پی آپ سنوارا ... بن دھن سکھی کنت کنھارا
شہر کھیلے دہن ماہنیں ایوان ... باس پھول منہ اچھے حیوان
کیونکر کھیلوں تج سنگ میتا ... مجھ کارن تیں اتیا کیتا
الکھ داس آکھے سن ہوئی ... سوئی پاک ارتھ ہن سوئی
سبد ؎ ایک تھیں ہم اننت بھیلی آپی آپ بیاہی ... سہجنہ سہجنہ کینا سنبھو برانا ایام سسر اجنوائی
دوہرہ ؎ ایک اکیلا آپ سوجی تھیں یہ سنسار ... آٹھ نیاتھ تھول سوں سبھی ایک انکار
سبد ؎ پھلے نہ بھولے آوے نہ جائے کانسی کا سید کانسی ہی سمائے جل تھیں اپنا ببلا جل ہی ماہ بلائے تیسا یہ سنسار سبھ مولنہہ جائے سمائے۔ دوہرہ۔ آپ کنوائے پی ملے پی کھوئے سب جائے اکتھ کتھا ہے پرم کی جے کوئی بوجھے مائے۔
اسی طرح شیخ بہاؤالدین برناوی فرماتے ہیں
برائے بارش:۔ کاہے لے بدرا ناں برست کاہے تھی ناہن گرجت کاہے ناں جھڑلاوت
کاہے تھی برکھارت تیوت برہن من جو کاہے تھی ناں گھور گھور ستاوت
چتر وسا تیر دہے اُماہو داتا میگھ کہاوت ... گر بن تیا کو ٹاجم گت تھیں ادل بدل لے آوت
دیگر ؎ ان نین کا ہی لیکھ ... ہوں تجھ دیکھوں توں مجھ دیکھ
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو نے برج کو ان علاقوں سے رفتہ رفتہ خارج کردیا ہے اور اب اس کی جگہ پر قابض ہوگئی ہے۔
امیر خسرو دہلی کی زبان کو دہلوی لکھتے ہیں۔ ابوالفضل بھی آئین اکبری میں اس کو دہلوی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ شیخ باجن (متوفی ۹۱۲ھ) بھی اسکو دہلوی کہتے ہیں اور جو نمونہ اس زبان کا دیتے ہیں وہ قطعاً اردو ہے مثلاً:۔
مناجات ؎ روزہ دہر دہر نماز گزاری دینی فرض زکوٰۃ ... بن فضل تیرے چھوٹک ناہیں آگیں لکھیں بات
دوہرہ ؎ بھونرا لیوے پھول رس رسیا لیوے باس ... باجن بلاجے سینچے آس کر بھونرا کھڑا اُداس
؎ باجن جو کیکے عیب ڈھانکے ... اس کتھے درجن تھر تھر کانپے

اس میں شک نہیں کہ اردو اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے، دونوں میں اسماء و افعال کے خاتمہ میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے، یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں۔ پنجابی اور اردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔ قدیم کتب تاریخ و لغات کی شہادت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اہل ہندوستان لاکھ کو لک، باگ کو بگ، کھانڈ کو کھنڈ، بھانڈ کو بھنڈ، ماٹ کو مٹھ، گاڑی کو گڈی، تالاب کو تل کہتے تھے۔ اہل پنجاب ان الفاظ کو آج بھی اسی طرح ادا کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا رہا ہے۔
ساتویں صدی ہجری میں اسی زبان میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو ایک طرف پنجابی سے اور دوسری طرف برج سے ممیز کرتی ہیں۔ شیخ فریدالدین گنج شکرؒ (متوفی ۶۶۴ھ) اور مادر مومناں کے درمیان اردو میں جو گفتگو ہوئی اس کے دو فقرے ہم تک پہونچے ہیں۔ مادر مومناں نے کہا تھا "خوجا برہان الدین بالا (بچہ) ہے" شیخ نے جواب میں فرمایا "پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے" آخری فقرہ میں "کا" اور "ہوتا ہے" ایسے الفاظ ہیں جو اس جگہ

کو پنجابی اور برج سے مختلف کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بابا گنج شکرؒ کا یہ فقرہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے "رحم کرے تو بھوٹیاں، عدل کرے تو لوٹیاں" اور دوسرا فقرہ "پیچ سر کے" مشہور ہے۔ اسی طرح خواجہ چراغ دہلی (متوفی ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) کا فرمودہ "تم اوپر روئے تلے"۔ نقل در نقل ہوتا چلا آیا ہے آٹھویں صدی ہجری کا ایک اور فقرہ جو فیروز شاہ خلجی ۷۵۲ھ و سنہ ۷۹۰ ہجری کے حملۂ سندھ سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف یوں نقل کرتے ہیں "برکت شیخ تھیا اک موا اک نہا"

اسلامی سلطنت دہلی پہونچ کر بہت جلد مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اس لئے یہ زبان اسلامی لشکروں، مہاجروں اور نو آبادوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے میں پہونچ جاتی ہے۔ خلجی اسکو گجرات اور دکن پہونچاتے ہیں۔ محمد تغلق جب آٹھویں صدی ہجری میں دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو آباد کرتا ہے تو یہ زبان دکن میں مسلمان نو آبادوں کی زبان بن جاتی ہے۔ گجرات و دکن میں نویں صدی ہجری سے اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اہلِ گجرات اسکو نویں صدی ہجری میں "زبانِ دہلوی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں لیکن آنے والی صدی میں "گجری" یا گوجری کہنے لگتے ہیں۔ اسی طرح دکن میں پہلے پہل یہ زبان "زبانِ ہندوستان" کہلائی بعد کو "دکنی" کہنے لگے۔ شاہانِ گجرات اسی زبان میں بات چیت کیا کرتے تھے چنانچہ محمود شاہ بیگڑہ کا یہ فقرہ تاریخ میں محفوظ ہے "نیچی بیری سب کوئی جھوڑے" محمد شاہ تغلق نے لفظ "کھڑاکھڑی" کے تلفظ کو اصل دہلوی اور غیر دہلوی باشندوں کی شناخت کے لئے معیار مقرر کر دیا تھا۔

دکن میں[1] حضرت خواجہ بندہ نواز کے والد نے جن کا انتقال ۷۲۱ھ میں ہوا اپنا تخلص راجا رکھا تھا جو آج تک شاہ راجو یا سید راجا کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی طرح حضرت زین الدین خلد آبادی (متوفی ۷۷۱ھ) کا آخری کلام (منجمت بلاوہ) مشہور ہے۔ علاوہ ازیں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رح متوفی ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء کی جانب حسب ذیل اشعار منسوب ہیں:-

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا اُسے — جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں کھوئے خودی اپنی خدا ساتھ محمدؐ — جب گھل گئی خودی تو خدا بن نہ کئی دسے
آنتوں بلیلہ و آنتوں لون — بیتن کے گھر جائے کون

نیز معراج العاشقین[2] بھی آپ ہی کی تصنیف ہے جو انجمن ترقی اُردو نے شائع کر دی ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

"نبی علیہ السّلام کہے۔ انسان کے بوجنے کو پانچ تن۔ ہر ایک تن کو پانچ دروازے ہیں ہور پانچ دربان ہیں"..... وغیرہ

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (متوفی ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) نے شرح مرغوب القلوب نثر میں ایک کتاب لکھی ہے جسکا نمونہ یہ ہے:-

"پیغمبر کہے۔ جے کچ کام کریگا کوئی خدا ناؤں نالے کر تو او کام پاکمال ہوگا۔ سرانا، نواز نا خدا کو بہوت کہ او پالن ہارا ہے عالم کا"

جب دکن کی اسلامی سلطنت بہمنیہ شکست ہو کر بیجاپور، گولکنڈا اور احمد نگر وغیرہ میں تقسیم ہوئی تو چونکہ سلاطین دکن کے محلوں میں ہندو رانیاں آئیں مثلاً والی احمد نگر احمد نظام شاہ اصلاً برہمن تھا اور اسمٰعیل عادل شاہ کی ماں کوکنی تھی۔ لہٰذا سلاطین کی بے تعصبی کی وجہ سے بہت سے ہندو سلطنت کے مشیر ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم عادل شاہ متوفی ۹۶۵ھ کے زمانہ میں شاہی دفتر فارسی سے دکنی زبان میں منتقل ہو گیا۔ اور یہی زبان عوام کی زبان ہو گئی اور اہل علم و ادب کے اظہار خیالات کا آلہ بن گئی۔ اسی زمانہ میں وجدی ایک شاعر گذرا ہے بعض حضرات وجدی کو وجیہہ الدین بتلاتے ہیں جو ایک بزرگ تھے۔ ان کی مثنوی تحفۂ عاشقاں مشہور ہے۔ تحفۂ عاشقاں حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کے خسرو نامہ کا ترجمہ ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں

کروں پاک دل ہور زباں پاک سوں — ثنا پاک اس عاشقِ پاک کوں
کہ جس سے ہوا ہے ادگم عشق کا — اجوں لگ اُبلتا ہے خُم عشق کا

---

[1] دکن میں اردو صفحہ ۶، ۷، ۸ [2] تاریخ نثر اُردو صفحہ ۳۹

پڑیا عکس اس نورکا جس رخن   جھلکنے لگا آرسی کے تمن   سو اس آرسی میں کیا جیوں نظر   ہوا عاشق اپنا آپس دیکھکر
آپس کچھ پرتو کوں معشوق جان   لیا مبتلا ہو کے عاشق کا شان   نکل گنج مخفی سے خلوت کی بھار   کیا جلوہ کر کثرت بے شمار

ایک دوسرے شاعر سعدی دکنی بھی ہیں۔ ان کے چند اشعار مشہور ہیں۔

ہم نا تمن کو دل دیا تم نے لیا ہور دکھ دیا   تم یہ کیا ہم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے
دو مین کے گھر میں بھرول روز و شب خوں دلکو بھرو   بنشیں سنگ لوت دھر دیا نجات و میت ہے
سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ   در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

شاہ برہان الدین جانم خلف میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (متوفی ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء) نے ایک کتاب نثر میں کلمۃ الحقائق کے نام سے تصنیف فرمائی جس کا نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ یہ شاعر بھی تھے۔ فرماتے ہیں: اللہ پاک منزہ ذات اس سوں صفتاں قائم سات، علم ارادت، قدرت، بار سنتا، دیکھتا، بولنہار۔

نمونۂ نثر:- "اللہ کرے سو ہووے کہ قادر، توانا سوئے کہ قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرن ہار۔ سہج سہج سو نیراٹھار دسہج ہوا بھی توں بھی باوجود ہاں کچھ نہیں بھی تھا بقیں، دوجا شریک کوئی نہیں۔ ایسا حال سمجھنا خدا اچھے خدا کوں جس پر کرم خدا کا ہوئے۔"

حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری (متوفی ۱۰۸۶ھ ۱۶۷۵ء) نے گنج مخفی در بحث شاہد و مشہود تقریباً ۱۰۶۱ھ ۱۶۵۰ء تصنیف فرمائی۔ نمونہ حسب ذیل ہے:-

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کوں عیاں کرنے چاہا تو اول اس میں سوں یک نظر نکلی، سو اس سوں امین دیکھ ہوا۔ امین شاہد کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں ذات کے دو طور ہیں، ذات نے آپس کوں دیکھا، اسے نظر کہتے ہیں، دیکھ کر گواہی دیا تو اُسے شاہد کہتے ہیں، یو (یہ) تینوں مرتبے ذات کے ہیں"

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنا کلیات ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا۔ اس میں خیالات کی جدت، استعارات و تشبیہات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی نہیں ہے لیکن جیسا کہ عام قاعدہ ہے ابتدا میں سیدھے سادے خیالات نظم کئے گئے ہیں مثلاً

رکھا ایک ہے ہر ٹیک کدھن لاکھ چمن ہے   لکھ جوت ہے ہر ٹھار دیے ٹیک رتن ہے
سمد ور ہے ایک ہور ندیاں ہیں سو ہزاراں   با تاں سو کر ڈراں ہیں دلے ٹیک سن ہے

کفر ریت کیا ہور اسلام ریت   ہر ایک ریت میں عشق کا راز ہے
پیا باج پیالا پیا جائے نا   پیا باج یک تل جیا جائے نا

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا جانشیں محمد قطب شاہ بھی شاعر تھا، ظل اللہ اس کا تخلص تھا ۱۰۳۵ھ میں فوت ہوا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

میرا دل ہے زر الفت کا کارخانہ   نہیں منجکوں بازار والا کا حاجت   عشق کی تپلی ہے گوری رنگیلی   جیتر ناریاں میں دستی ہے چھبیلی
سنو لوگ میری پریم کی کہانی   کہ پیا ہے رنگ عاشقی کی نشانی

اسی طرح محمد قطب شاہ کا جانشیں سلطان عبد اللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا، تخلص عبد اللہ تھا ۱۰۸۳ھ ہجری میں فوت ہوا چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

دلا حق کی طرف ہو کہ حق آرام دوے گا   سعادت کی تری بات سر انجام دوے گا

سلطان محمد قلی قطب شاہ: تاریخ نثر اردو صفحہ ۴۳ و ۴۵ ہم دکن میں اردو صفحہ ۹۰ و ۱۱۰

اے یار اگر ہے زندہ دل توں   یوں نام کہ جم ہو جام لیتا
عبداللہ علی ولی کے صدقے   معشوق سوں خط مدام لیتا

عبداللہ قطب شاہ کا داماد اور جانشین ابوالحسن تانا شاہ بھی شاعر تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

کس در کہوں جاؤں کہاں مجھ دل بھل بھجرت سے   اک بات کہوں گے سجن یاں جی ہی بارہ بات ہے

ان قطب شاہیوں کے زمانہ میں نشاطی، غواصی، احمد جنیدی، شاہی، مرزا، شغور، بیچارہ، بحری، طالب، نوری اور مومن وغیرہ اچھے شاعر تھے، ایک ایک شعر بطور نمونہ درج کرتا ہوں۔

نشاطی:- خداوندا تجی ہی جم خدائی   ہمیشہ تجکو ساجی کبریائی   یہ شعر اس کی مشہور مثنوی "پھول بن" مصنفہ ۱۰۶۶ھ سے لیا گیا ہے۔

غواصی:- (جہانگیر کے زمانہ میں دلی آیا تھا۔ برس یک ہزار اور ستا دیس میں   کیا ختم یہ نظم دن تیس میں

احمد جنیدی (۱۰۶۴ھ میں ایک مثنوی ماہ پیکر نام لکھی) الٰہی توں کر یو نظم جگ اجال   کہ ہووے تو جگ میں جوں محبوب مثال

شاہی:- ملنا تمھن کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ مچ کہے   کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

مرزا:- (مصاحب تانا شاہ)   عارض نہیں چندر کا ترے گال سوں اچھا   سمجھی ہمن خلف کو نہ تجہ خال سوں اچھا

شغور:-   برسات میں نہ دیکھا نظر بھر کر آفتاب   روشن یہ ہے کہ عاشق ہوا تجھ پہ آفتاب

بیچارہ:- (عالمگیر کے زمانہ میں دلی گیا تھا) پی سے جدا ہونا نہ تھا چاہا خدایا یوں ہوا   جز صبر کچھ چارہ نہیں بیچارہ ہو رہنا پڑا۔

بحری:- (من لگن نام مثنوی ۱۱۱۱ھ تصنیف کی تھی)   ہر تن کو تلاش جوں ہے تن کی   یوں من کو لگن ہے من لگن کی
بحری جو پڑا ہے غیر کے یار   اے غار کے یار اُسے ہو غم خوار

طالب:-   ہمنا کے خون چشم سوں آلودہ کب کرے   وہ پک جسے گرانی ہے رنگِ حنا ستی

نوری:-   نوری اپس کے دل کی کسی سے نہ کہتا تھا   حاصل بھلا اب اس سے دوانے جو تھا سو تھا

مومن:- (مصنف مثنوی اسرارِ عشق) عجب دی شب کہ منجن سیم کر حل   عروسِ بدر سر تمنا نور کی جل

بیان متذکرۂ بالا سے ظاہر ہے کہ دکن میں ہماری زبان برابر ترقی کرتی رہی اور شاہجہاں کے عہد سے بہت پیشتر یہ دکن میں رائج ہو چکی تھی اور نہ صرف نظم میں بلکہ نثر میں ساتھ ساتھ قدم مار رہی تھی۔ [1]

حضرت میراں صاحب یا شاہ میراں جی حسن خدا نما (متوفی ۱۰۷۰ھ ۱۶۵۹ء) نے شرح تمہید ہمدانی یا شرح شرح تمہید ۱۰۵۲ھ ۱۶۴۲ء کے قریب لکھی نمونہ حسب ذیل ہے۔ "خواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم قاضی عین القضات کو کہے کہ تمہیں کئے سو کتاب منجے دکھلاؤ، تو کتاب دیکھکر بہوت خوش ہوئے، ہور کہے کیا خوب بیان میرے نور کا ہور خدا کے نور کا کئے۔" وغیرہ

عہد قطب شاہی کی ایک کتاب احکام الصلوٰۃ ہے، اس کے مصنف عبداللہ ہیں۔ ۱۰۳۲ھ میں اس کو ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نماز کے متعلقات بیان کئے گئے ہیں۔ عبارت کا نمونہ ذیل میں درج ہے۔

اول کلمہ طیب۔ پہلا کلمہ بولتا ہوں میں پاکی کا کہ ایکی پاکی ایمان کی کفرتی۔ شرکتی لا الٰہ الا اللہ نہیں کوئی معبود برحق الا اللہ مگر اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے۔ محمد رسول اللہ۔ محمد رسول خدا کے برحق ہے۔ دوم کلمہ شہادت دوسرا کلمہ بولتا ہوں میں شہادت کا یعنی گواہی دیتا ہوں

[1] "دکن میں اردو" صفحہ ۱۱-۱۲-۱۳۔

اس خدائے تعالیٰ کی یک بنی ہے۔ اشہد ہور گواہی دیتاہوں میں ان لا الہ کہ نہیں کوئی معبود برحق"۔

اس کے بعد مفتاح الخیرات نامی ایک کتاب ہے جو اسی عہد کی تصنیف یا تالیف ہے۔ نمونہ ذیل میں درج ہے۔

" ایمان کی حکماں کا معرفت ہور نماز احکام ہور ارکان پچھاننا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب کوں اس کی پچھان نی چھٹکارا ہے ہور آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار نا ہوئیگا"۔

سنہ ۱۰۴۵ھ میں ملا وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک کتاب "سب رس" تصنیف فرمائی۔ اسکی عبارت مقفیٰ ہے۔ نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"تمام مصحف کا معنیٰ الحمدللہ میں ہے مستقیم۔ ہور تمام الحمدللہ کا معنیٰ بسم اللہ میں ہے قدیم۔ ہور تمام بسم اللہ کا بسم اللہ کے نقطے میں کھیا ہو کریم"۔

شمائل الاتقیا، تصوف کی ایک کتاب ہے جو برہان الدین اولیا اورنگ آباد کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ اسکی نام سے میراں یعقوب نے سنہ ۱۰۶۷ھ میں مرتب کیا تھا۔ نمونہ درج ذیل ہے:۔

" اپنی حیات کے وقت منجے اشارت کیئے تھی جوں شمائل الاتقیا کتاب کوں ہندی زباں میں لیا دے تا ہر کسی کوں سمجھا جاوے اس وقت منجے بیا نہیں تا کہ یک ہزار ستر یہ اٹھوں سال کو رحلت کیئے پران، ان کے بھانجے عارف حق رسیدی عارفوں کی نور دیدی مصطفےٰ کی کلیجی ہور مرتضیٰ کے میں شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے زماں نے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا۔ جی کچھ مشکل آتا تھا سو پیر کی مدد سوں آسان لکھا جاتا تھا"۔

سنہ ۱۰۹۴ھ میں ایک مثنوی موسوم بہ "روح افزا" بھی لکھی گئی تھی۔ اشعار بطور نمونہ ذیل میں درج ہیں

رکھیا استاداں پرانی اسی — ہنر ہور ادب سیکھ لانی اسی
ہر یک علم واقف ہو پڑنا کتاب — اسی خوشنویسی بھی آئی شتاب
ہوا زور کشتی میں سینی میں در — سکیا تیر نیزی کری سب ہنر
چڑیا باپ کا تخت رضوان شاہ — جمع ہور وزیراں بھی ساری سپاہ

بیجاپور[1] میں جو عادل شاہیوں نے اس زبان کی ترقی میں کوشش کی ہے اس کا یہ حال ہے کہ علی عادل شاہ کے زمانہ میں اس کا درباری شاعر نصرتی تھا جو ملک الشعرائی کے خطاب سے سرفراز تھا۔ اس نے گلشن عشق اور علی نامہ دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ مثنوی علی نامہ سنہ ۱۰۷۶ھ میں لکھی گئی اور گلشن عشق سنہ ۱۰۶۸ھ میں ترتیب دی گئی۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

عنایت کا تجھ ہے عالم نواز — کوئی ذرہ خورشید تھی سرفراز
دو عالم کوں سوجانوں لک بات میں — دکھینا چھپا تا پی تجھ ہات میں
دیا ہے توں خاکی کوں ایسا شرف — جو تس سجدہ نوری کبھی صف بصف

ہاشمی نصرتی کا ہم عصر تھا اور مادر زاد اندھا تھا۔ ریختی کا موجد یہی شخص ہے۔ یوسف زلیخا نام ایک مثنوی اس سے یادگار ہے سنہ ۱۰۹۹ھ میں انتقال کر گیا۔ مثنوی مذکور کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ثنا حمد اس کوں سزاوار ہے — سگل عشق کا جس کو بستار ہے
سکت کس میں ہے جو کرے سر بسر — ابتا ہاشمی تو مناجات کر

---

[1] "دکن میں اردو" صفحہ ۲۱ لغایت ۲۳

مرے شعر کرے بادشاہاں پسند بندکرو راکین جو سب ہوشمند

ریختی کا نمونہ بھی حاضر ہے - اگر کوئی آکے دیکھے گا تو دل میں کیا کہے گا وہ مجھے بدنام کیا کرتے کہیں میں جاؤنگی چھوڑ وہ

لیکن شمالی ہند میں یہ مخلوط زبان اس قدر رواج نہیں پا سکی کہ تصنیف و تالیف میں حصہ لیتی - دکن کے بادشاہوں نے اس نئی زبان کی اشاعت میں بہت حصہ لیا، سرکاری دفاتر میں یہی زبان استعمال ہونے لگی - اور فارسی کو خارج کر دیا - شعرا اور مصنفین کی حوصلہ افزائی کی - مگر مغلوں نے اس طرف توجہ نہ کی - سکندر لودی نے ۹۱۵ھ ۱۵۰۹ء میں مصالح ملکی کے لحاظ سے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی ترغیب دی تاکہ وہ دفتری زبان سیکھ کر ملکی کاروبار میں حصہ لے سکیں - برہمن اور راجپوت تو اس طرف متوجہ نہ ہوئے البتہ کایستھوں نے فارسی پڑھنی شروع کر دی اور وہی ایک مدت تک سرکاری عہدوں پر مامور ہوتے رہے - بہر حال سکندر لودی کا یہ حکم بھی موثر ثابت ہوا اور اس کا یہ اثر ہوا کہ خود ہندوؤں کی زبان پر عربی فارسی کے الفاظ چڑھ گئے اور ادھر مسلمان کی زبان پر ملکی بھاشاؤں نے قابو پا لیا اور باہمی میل جول کی وجہ سے یہ مشترک زبان صاف اور رواں ہوتی گئی -

اسی سکندر لودی کے زمانہ میں کبیر شاعر ہوئے ہیں جو بنارس کے رہنے والے تھے اور اَن پڑھ تھے، اگر رامانند کے چیلے ہوئے اور خود کبیر پنتھیوں کا مت نکالا - ان کے دوہروں میں فارسی اور عربی کے الفاظ بکثرت موجود ہیں - مثلاً

دین گنوایو دُنی سے دنی نہ آیو ہاتھ پیر کہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ

دنیا غافل

کبیر سریر سرائے ہے کیوں سوئے سُکھ چین کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

نقارہ

گرو نانک کی تصنیفات میں بھی جو سنہ ۹۴۵ھ ۱۵۳۸ء کے بعد فوت ہوئے عربی فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں -

ساس ماس سب جیو تمہارا تو ہے کھرا پیارا نانک شاعر ایو کہت ہے سچے پروردگارا !

بلکہ سچ پوچھو تو مندرجہ شعر اردو معلوم ہوتا ہے - ابتدا میں اردو کی یہی کیفیت تھی - جو چیزیں وظیفۂ عبادت کے طور پر ہیں ان میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے ہیں - جپ جی کے دو فقرے ملاحظہ ہوں -

وارن جاؤں ان ایک بار تو سدا سلامت جی نرنکار

بابر شاہ جب ہندوستان آیا تو وہ بھی یہاں کی مخلوط زبان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا - اس نے اپنے ترکی دیوان میں ایک شعر لکھا ہے جس کا ایک مصرع یہاں کی زبان میں ہے اور دوسرا مصرع ترکی میں ہے

مجھ کا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی[1] فقرا ہلیغہ بس بولغو سید وریانی ورتی

ہمایوں نے جب بہادر شاہ والیٔ گجرات کے خلاف جنگ کی تو مالوہ میں بہادر شاہ کو رومی خاں کی نمک حرامی سے شکست ہوئی اور وہ بے سروسامانی کے ساتھ گجرات کو بھاگ گیا - ایک طوطا کا پنجرہ بھی مال غنیمت کے ساتھ ہمایوں بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا - اس کی حیرت انگیز باتوں کو سن کر بادشاہ دنگ ہو رہا تھا کہ رومی خاں بھی حاضر ہوا، بادشاہ نے فرمایا "بیائید رومی خاں" اس کا نام سننا تھا کہ طوطا چیخنے لگا "پھٹ رہ رومی خاں حرامخوار پھٹ رہ رومی خاں حرامخوار" - معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ کے لشکری اس شکست کو رومی خاں کی نمک حرامی کا نتیجہ سمجھتے تھے اور بار بار یہی الفاظ کہتے ہونگے طوطے نے بھی یاد کر لئے اور جب رومی خاں کا نام آیا تو اس نے بھی وہی الفاظ دہرا دیئے -

سولہویں صدی میں بعہدِ شیر شاہ سوری ملک محمد جائسی نے پدماوت کی داستان نظم کی اور یہ التزام کیا کہ فارسی عربی کا ایک لفظ نہیں آنے

---

[1] گلِ رعنا صفحہ ۸ میں دوسرے مصرع کے معنی یہ لکھے ہیں "فقرا کو پانی اور روٹی کافی ہے"

دیا اور بحر بھی ہندی رکھی ہے، اور بعد ازاں اکبر کے عہد سے جبکہ مسلمان ہندوؤں سے گھل مِل گئے یہ نوبت پہونچی کہ ہندو شرفا بلکہ راجا مہاراجا ایرانی لباس پہن کر اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے۔ جس طرح کہ آج کل انگریزی بولنے اور انگریزی لباس پہننے پر فخر کیا جاتا ہے۔

جو[1] چیزیں ہندوستان کی پیداوار تھیں ان کے نام قدرتی طور پر ہندی تھے، وہ سب زبانوں پر چڑھ گئے اور فارسی عبارتوں میں بھی ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کئے جانے لگے، مثلاً جھروکہ، درشن، پھول کٹارہ، کھپوہ مرصع، جم دھر، کٹار، تلوار، گھوڑا، ہاتھی، پالکی، نالکی، جھالر، کہار، ڈاک چوکی، چوکی، دیس مکھ، دیس پانڈیہ، پٹیل، پٹواری، رائے، راؤ، راجہ، مہاراجہ، چودھری، پہر، دوپہر، گھڑی، گھڑیال، ڈالی، گھاٹ، گھروارہ، بیوپاری اور اسی طرح کے صدہا الفاظ سلاطین مغلیہ کی شاہی زبان میں ملے جلے نظر آتے ہیں۔

اکبر شاہ جہانگیر کو پیار سے شیخو جیو، مراد کو پہاڑی راجہ اور فیضی کو شیخ جیو کہتا تھا۔ آرام بانو اس کی چہیتی بیٹی تھی، مرتے وقت جہانگیر سے وصیت کرتا ہے۔

"بایں خواہر خود کہ لاڈلہ من است بعد از من باید بر دستے سلوک کنی کہ من با وے میکنم۔"

ایک[2] مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ خان اتکہ اور ادہم خاں میں جھگڑا ہوگیا اور آخر الذکر نے خان کو شہنشاہ اکبر کے روبرو قتل کر ڈالا۔ اس وقت شہنشاہ خفا ہو کر ہندی زبان میں فرمایا "اے بلچہ گاؤدی تو کیوں اتکہ مارا"۔ ایک شعر بھی اکبر سے منسوب ہے جس میں دو ہندی الفاظ آ گئے ہیں دہ وندرا

چیتۂ بادشاہ کالا گرفت   خونِ او دشت را چو لالہ گرفت

یعنی بادشاہ کے چیتے نے ہرن پکڑا اور اس کے خون سے جنگل لال ہوگیا، اکبر نے ایک فیل کا نام "بھیروں" اور دوسرے کا بال سندر رکھا تھا۔ ایک کتیا کا نام مہوہ رکھا تھا جب اکبر نے راجہ بھگونت داس کی لڑکی سے اپنے بیٹے جہانگیر کی شادی کی اور دلھن کی پالکی کو باپ اور بیٹے شاہی محل تک خود اٹھا کر لے گئے تو راجہ نے کہا "ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری   ہم باندی غلام رہے" تو اکبر نے جواب میں کہا "تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی   تم صاحب سردار رہے"۔ مشہور ہے کہ شاہی دلھن نے یہ دوہا گایا "پربت بالنس کرا مورے بابل   نی کا منڈوا چھوا دورے ادھے اوپر کلس بلاجے   دیکھیں راجہ راؤ رے"۔

جہانگیر بادشاہ نے شراب کا نام رام رنگی رکھا تھا۔ شاہجہان بچپن میں باپ کو شاہ بھائی اور دادا کو شاہ بابا کہتا تھا، مراد بخش شاہ شجاع کو بھائی جیو کہتا تھا۔

سترھویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن نے جو ضلع باندہ کے رہنے والے تھے اور پنڈت، شاعر اور فقیر تھے رامائن کو برج بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ یہ کتاب مطبوع خاص و عام ہوگئی۔ ان کے دوہروں میں اکثر اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں فارسی عربی کے الفاظ موجود ہیں

سنکارے سیوک چلے سوامی رُکھ پائے   گھر ترو تروبن و باگ و بر ڈیرا دیو لگائے

(رُخ)   (باغ)

گھر بسواس بچن بٹ بولے   کتنی بھنگ کُلہ بھی کھولے   رام انیک گریب نواجے   لوک بید بر برد براجے

(ٹوپی)   (غریب نواز)

گنی گریب گرام نر ناگر   پنڈت موڑھے ملیں اوجاگر   مایا کو ملے کر کر لمبے ہاتھ   تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات

(غنی غریب)   (غریب)

اسی زمانہ میں سورداس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا۔ ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا

---

[1] گل رعنا صفحہ ۹   [2] مغل عہد میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ (انگریزی) باب پنجم

جو فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔ پس اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ بزرگانِ مذہب اپنے دوہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا کچھ اس سے زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔ سورداس جی کہتے ہیں:-

مایا دہام دہن دنتا باندھوں ہوں اس ساج ۔ سنت کبھی جانت ہوں، تو نا آئیو باج

ساز ۔ باز

کھیت بہت کا ہیتم تانے سبن سنی آواج ۔ دیو نہ جات پار اُترآئے، چاہت چڑھین جہاج

آواز ۔ جہاز

لیجئے پار اُتار سور کو، مہاراج برج راج ۔ نئیں کرت کہت پربھو تم سوں سد گریب نواج

غریب نواز

عبدالرحیم خانِ خاناں نے ہندی میں اپنا تخلص رحمن کیا تھا۔ اس کے کلام کی سادگی نے عوام میں خوب شہرت حاصل کی۔ اگرچہ وہ سنسکرت اور فارسی کا عالم تھا۔ اس کے دوہے عربی، فارسی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے پاک ہیں اور اس طرح اس نے ایک قدم اردو کی طرف اور بڑھایا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

رحمن چپ ہو بیٹھئے دیکھ دنن کے پھیر ۔ جب نیکے دن آئینگے بنت نہ لگئے دیر

آمی پیاوے ماں بن رحیمن ہمیں نہ سہائے ۔ ماں سمہو مرپو بھلو پر دیکھ دے بی بلائے

رحیمن وے نرمر چکے جو کہوں مانگن جائیں ۔ ان تے پہلے وے موئے جن مکھ نکست ناہیں

رحیمن کھو جوا دکھ میں جہاں رسن کی کھان ۔ جہاں گانٹھ تہاں رس نہیں یہی پریت کی ہان

رحیمن دہاگا پریم کا مت توڑو چٹکائے ۔ ٹوٹے سے پن نا ملے۔ ملے گانٹھ پڑ جائے

رحیمن پریت سرائے ملے ہوت رنگ دول ۔ جوں ہردی زردی تجی۔ تجی سفیدی چون

رحیمن ات مشکل بہیو گاڑھے دوؤ کام ۔ سانچ کہے تو جگ نہیں جھوٹے ملے نہ رام

رحیمن سیدہی چال سو پیادہ ہوت وزیر ۔ فرزیں شاہ نہ ہو سکے ٹیڑھے کی تاثیر

رحیمن دیکھ بڑوں کو لگھو نہ دیجیے ڈار ۔ جہاں کام آوے سوئی کیا کرے تردار

الغرض بیانات متذکرہ بالا سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ارتباط سے پہلے ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ اور بعض مخلوط جملے زبانوں پر جاری ہو گئے لیکن ایک مدت تک معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے یہ مخلوط زبان استعمال ہوتی رہی۔ دکن میں اہلِ علم ضرور اس زبان میں تصنیف و تالیف بھی کرنے لگے لیکن شمالی ہند میں اس زبان کو ایک مدت تک علم و ادب کی کرسی پر جگہ نہ ملی۔

رفتہ رفتہ عہد شاہجہاں میں آگرہ کی بجائے دلی پھر دار السلطنت قرار پائی، شہنشاہ اور ارکانِ دولت وہاں رہنے لگے۔ اہلِ سیف، اہلِ قلم، اہلِ حرفہ، اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو معنی فرودگاہ یا لشکر آتا ہے،[1] چونکہ اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے اس لئے وہاں کی بولی کا نام بھی اردو ہو گیا اور یہ زبان خاص و عام میں شاہجہاں کے اردو کی طرف منسوب و مشہور ہو گئی۔

[1] مغل دربار میں فارسی زبان وادب کی تاریخ (انگریزی) باب پنجم

لیکن اس مخلوط زبان کا نام اردو ہونے سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ زبان شاہجہاں کے زمانہ سے رائج ہوئی ہے جیسا کہ ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں، یہ مخلوط اور مشترک زبان تو عربوں کی فتوحات سندھ ہی سے معرضِ وجود میں آگئی تھی اور رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جب مسلمانوں نے دہلی کو اپنا دارالسّلطنت بنایا اور اس زبان کا رواج عام بول چال میں زیادہ ہوا تو بعض لوگ اس کو ہندی، اور بعض لوگ زبان دہلوی کہنے لگے۔ جب یہ زبان اقطاع ہند میں پھیلی تو دکن میں جاکر دکنی اور گجرات میں پہونچکر گجری یا گوجری ہوگئی۔ دکن کا میں شاعروں اور نثاروں نے اسی زبان میں لکھنا شروع کیا اور ممکن ہے کہ اہلِ گجرات نے بھی اس میں نثر و نظم لکھی ہو۔ لیکن اب تک اُس عہد کا ایسا نمونہ اہلِ گجرات نے پیش نہیں کیا جس سے ہم وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے کہ گجرات میں بھی اس زبان میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہوگیا تھا تاہم اہلِ دکن کی نظم و نثر کے نمونوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ ہماری زبان میں شعر کہنا اور نثر لکھنا قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کے زمانہ سے بھی پہلے شروع ہوا اور ظاہر ہے کہ یہ زمانہ شاہجہاں کے عہد سے بہت پہلے کا ہے۔

شاہجہاں کے زمانہ میں اس زبان کا نام ہندی یا دہلوی زبان کی بجائے اردو مشہور ہوا۔ اگرچہ ہمارے شاعروں نے اس کو فارسی زبان سے ممیز کرنے کے لئے ریختہ بھی کہا ہے، چنانچہ ولی دکنی کا شعر ہے جو عالمگیر کے زمانہ میں تھے اور دہلی بھی آئے تھے

ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب یہ ریختہ بولے
سُنے تو اس کو جان و دل سوں حسّانِ عجم آکر

اور شاہ حاتم اپنے دیوان زادہ میں جو ۱۱۷۹ھ کی یادگار ہے اپنے متعلق لکھتے ہیں

"درشعرِ فارسی پیرو صائب است و در ریختہ ولی را اُستادمی داند"

بیشک شاہجہاں کے زمانہ میں اس زبان کا نام اردو ہوا لیکن ڈیڑھ سو برس سے پہلے کسی اہلِ قلم نے اس کو اُردو نہیں لکھا۔ البتہ میر تحسین کے زمانہ سے یہ زبان برابر اردو ہی کے نام سے موسوم ہے اور مرزا غالب کے بعد تو اس زبان کو اردو کے سوا کسی اور نام سے منسوب ہی نہیں کیا گیا۔ ہمارے زمانہ میں اہلِ مغرب ضرور اس کو ہندوستانی کہتے ہیں لیکن یہ نام بھی نیا نہیں ہے۔ مولانا وجہی کتاب "سب رس" میں جو ۱۰۴۰ھ کے قریب تصنیف ہوئی ہے اردو کو زبانِ ہندوستان کہتے ہیں :- "آغاز داستان، زبانِ ہندوستان۔ نقل، ایک شہر تھا، اس کا ناؤں سیستان"

بہرحال شمالی ہند میں ولی کے دہلی تشریف لانے کے بعد اردو میں شعر و شاعری کا چرچا ہوا اور اس میں شک نہیں کہ نظمِ اردو[1] کے آغاز میں یہاں سنسکرت کی تقلید کی گئی۔ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی ہیں، اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا میں ذومعنین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی۔ فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔ اردو میں پہلے پہلے دلی کے شعرا نے شعر کی بنا اسی پر رکھی اور دور اوّل کے شعراء میں یہی قانون جاری رہا۔ اس عہد کے چند اشعار بطور نمونہ پیشکش ہیں ؎

لام نستعلیق کا ہے اس بتِ خوشخط کی زلف	ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے
کیوں نہ ہو ہم سے وہ صنم باغی	قد ہو جس کا نہال کی مانند
تو جو دریا کے پار جاتا ہے	دل مرا وار وار جاتا ہے
تم دیکھو یا نہ دیکھو ہمکو سلام کرنا	یہ تو قدیم ہی سے سر پر ہمارے کر ہے
نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے	کہ آخر بدنما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا

[1] سیر المصنفین جلد اول صفحہ ۲۲

نادر شاہی حملہ کے بعد بہت سے اہل کمال لکھنؤ چلے گئے اور وہیں رہ پڑے۔ خان آرزو۔ سودا۔ میر وغیرہ سب لکھنؤ پہونچے اور پیوند خاک ہوئے
نتیجہ یہ ہوا کہ دلی کے بعد لکھنؤ بھی ان شعرائے واجب الاحترام کی بدولت اردو زبان کا مرکز قرار پایا۔ لکھنؤ کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی
اس کی ادبی مرکزیت بھی رامپور منتقل ہوگئی۔ نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کے دربار میں شعراء اور فضلاء کی سبھا قائم ہوئی اور داغ کے
حیدرآباد دکن چلے جانے پر دکن میں پھر اردو کا چرچا ہوا۔ چنانچہ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی جو تمام مضامین کی تعلیم اپنے طلبا کو ان کی مادری
زبان یعنی اردو میں دیتی ہے۔

مشرقی[1] شہروں میں عظیم آباد بھی اردو کا مرکز قدیم سے چلا آتا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے عہد میں اس شہر میں اردو کے شاعر
اور نثار پیدا ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، میر غلام علی راسخ جو میر کے ہمعصر تھے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ راجہ رام نرائن اور راجہ شتاب رائے
بھی علم و ادب کے شیفتہ تھے، دلی اور دوسرے مقامات سے شعراء اور ادباء آتے اور گوہر مراد لے کر مالامال واپس جاتے، نواب اشرف علی خاں فغاں نے
پٹنہ میں اردو کے لئے جدید شاہراہ پیش کی، ان کی ہدایات سے متاثر ہوکر اردو بہت منزہ ہوئی اور نقائص سے پاک ہوگئی۔ میر شیر علی افسوس
اور میر امن اسی دور کے باکمال افراد تھے جو راجہ شتاب رائے کے صاحبزادہ راجہ بہادر کے دسترخوانِ کرم پر بیٹھے ہوئے ہدیہ تبریک پیش کرتے
تھے موجودہ زمانہ میں شاد جیسا عظیم الشان شاعر بھی عظیم آباد ہی نے پیدا کیا ہے

افسوس اور میر امن وغیرہ ڈاکٹر گلکرائسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں کتابیں ترجمہ اور تالیف کرتے تھے، کیونکہ انگریزوں
نے بھی اردو کی ترقی میں اسے تمام ملک کی زبان سمجھ کر اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اس طرح یہ زبان بنگال اور بہار میں پہونچی اور وہاں اپنے
قدم جمائے۔ بنگال میں اگرچہ بنگالی کا زیادہ رواج ہے لیکن اردو بھی آہستہ آہستہ اپنا قدم جمارہی ہے۔

اس[2] زبان کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے میل کرلیتی ہے، سنسکرت آئی اس سے مل گئی، عربی فارسی آئی
اسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کی اس ملنساری اور آسانی کی وجہ
سے یہ ملکی زبان ہوگئی، کشمیر سے راس کماری تک اور بنگال سے سندھ تک اردو بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ اس قلیل عرصہ میں جب سے ولی نے
اپنی پہلی غزل اردو میں تصنیف کی جسکو سوا دو سو برس کا زمانہ گذرا آج تک جو کچھ ہوا وہ کسی تحریک یا ارادہ سے نہیں ہوا، تاہم اردو کی ترقی نمایاں
روز افزوں ہے، بلاشبہہ یہ رفتار دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں نسبتاً بہت کم ہے۔ لیکن یہ اس کے ابتدائی مدارج ہیں۔ اور
۴۴ دوسری زبانیں اپنی ترقی مکمل کرچکی ہیں، انگریزی زبان نے اپنا موجودہ علم و ادب چوتھی صدی سے بیسویں صدی تک یعنی ایک ہزار چھ سو
برس میں پیدا کیا ہے، جبکہ کل قوم اور حکومت انگلشیہ برابر اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہی ہیں تو کیا یہ تعجب خیز امر نہیں ہے کہ اردو نے بغیر کسی
امداد اور وسیلے کے اس قدر جلد معتدبہ علم و ادب بہم پہنچا لیا۔

بعض اہل وطن اردو کے مقابلے میں ہندی کو کھڑا کر رہے ہیں۔ ہمکو ہندی سے کوئی نفرت نہیں اور مسلمان تو خدا کے فضل سے ہمیشہ
اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کی ترقی میں حصہ لیتے رہے ہیں، ہندی میں چوٹی کے شاعر بہت سے مسلمان ہوچکے ہیں۔ بنگالی زبان
کے ادبیات کا سنگ بنیاد مسلمانوں کے ہاتھ سے رکھا گیا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات بنگال مرتبہ جناب دنیش چندر سین بی اے) "پنجاب میں اردو"
کے مؤلف نے اس عبادت کا خلاصہ صفحہ ۱۱۳ پر درج کیا ہے۔ جو یہاں ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ "بنگالی زبان کے ادبی پایہ تک ارتقا حاصل
کرنے کے متعدد اسباب ہیں۔ ان میں سب سے پیش پیش بلا شائبہ اشتباہ مسلمانوں کی فتح بنگال ہے۔ اگر ہندو راجا بدستور سابق مختار
اور حکمراں رہتے تو بنگالی زبان کے لئے دربار تک رسائی حاصل کرنا ایک دشوار امر تھا۔ ان پٹھانوں نے تیرہویں صدی میں بنگال کو تسخیر کرلیا

---

[1] الناظر لکھنؤ اپریل ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۷۶ و ۲۷۷ [2] سیر المصنفین جلد اول صفحہ ۴۳ ۔

ان کے سلاطین نے بنگالی زبان سیکھی اور اپنی کثیر التعداد ہندو رعایا کے ساتھ جن پر حکمرانی کرنے کیلئے وہ آبسے تھے، قریبی تعلقات قائم کرلئے۔ جب ان سلاطین نے سنسکرت کے مشہور رزمیوں رامائن، ور مہابھارت کا ذکر سنا جو ہندوؤں کی مذہبی اور منزلی زندگی کی تشکیل میں عجیب وغریب اثر رکھتے تھے تو قدرتاً ان کو شوق ہوا کہ ان نظموں کے موضوع سے آگاہی حاصل کریں۔ انھوں نے چند عالموں کو بنگالی زبان میں ان کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ جس زبان کو وہ اب بولتے اور جانتے تھے۔ مہابھارت کا بنگالی ترجمہ ناصر شاہ والیٔ گوڑ کے حکم سے ہوا۔ جس نے سنہ ۱۳۲۵ء تک پورے چالیس سال سلطنت کی تھی۔ (صفحہ ۱۰ و ۱۱) لہٰذا ہمارے اہلِ وطن کو یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں نے اپنی عربی فارسی زبان چھوڑ کر آپ کی زبان کو اختیار کیا۔ جو آپس کے میل جول سے پیدا ہوئی اور بحالتِ موجودہ اردو کہلاتی ہے، اردو نہ صرف آپ کی زبان ہے اور نہ صرف ہماری۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کا برابر کا حصّہ ہے۔ یہ امر انصاف کے خلاف ہے کہ اتنی مدّت گزرنے کے بعد اب آپ اسے خیرباد کہیں اور دو تین سو برس پہلے کی زبان اختیار کریں۔ یہ ترقی معکوس نہایت خطرناک اور قابلِ افسوس ہے۔ آپس میں محبت بڑھانے کے لئے اور نفرت کو دور کرنے کیلئے یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اُردو سے بے نیاز نہ ہوں اور اپنی مشترک زبان کی وسعت اور ترقی میں دل سے کوشاں ہوں۔

دھنک

کرنوں کے چھوّں سے بدری بنی رنگ کی کیاری
بدری کی چلمن سے جھانکی رنگوں کی متواری

جوبن پر ہے رنگ راج کی رنگیں راجکماری
چُندری اپنی اُڑا رہی ہے برکھا رُت کی کنواری

اندر دیوتا چھوڑ رہے ہیں رنگوں کی پچکاری
پاکر کے اشنان لکشمی سکھا رہی ہے ساری

ساغر نظامی

(سنہ ۱۹۳۶ء)

افغانستان کی پہلی جنگ

آک لینڈ کے عہدِ حکومت (۱۸۳۶ - ۱۸۴۲) میں سندھ کا دریائی سفر رنگ لایا۔ افغانستان کے کوہستانوں پر خون و آتش کا ایک ایسا کھیل کھیلا گیا جس کی یاد سے روح لرز جاتی ہے۔

افغانستان پر کیوں حملہ کیا گیا؟ اس حملہ کا مقصد سرحدی استحکام نہیں ہو سکتا۔ برطانی ہندوستان اور افغانستان کے درمیان پانچ دریاؤں کی سرزمین، راجپوتانہ کے صحرا، ہندھ کا ریگستان اور بلوچستان کی چٹانیں تھیں۔ کمپنی نہایت آسانی سے امیرانِ سندھ اور تاجدار پنجاب سے اس قسم کا معاملہ طے کر سکتی تھی۔ آخر اس جنگ کا سبب کیا تھا؟ روس!

روس آیا! روس آیا!! دوڑنا!!! افغانستان کی پہلی جنگ کا بہانہ تھا۔ سبب نہیں! ایک دیانت دار مورخ افغانستان کی جنگ کے اسباب تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ ہوسِ ملک گیری کے علاوہ کوئی سبب دکھائی نہیں دیتا۔

شاہ شجاع لدھیانہ میں کمپنی کے رحم و کرم پر اپنے ایامِ زلیت بسر کرتا تھا۔ افغانستان کے تخت پر دوست محمد قابض تھا۔ آک لینڈ نے برنز کو ایک "تجارتی وفد" کا امیر بنا کر دوست محمد کے پاس بھیجا۔ شاہ افغانستان نے مشرقی مہمان نوازی کے پیشِ نظر برنز کی بہت عزت کی۔ برنز نے تجارتی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے دوست محمد سے برطانی اتحاد کا ذکر چھیڑا۔ دوست محمد نے بھی اپنا مطالبہ پیش کیا جسے برنز نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ برنز نے دوست محمد کو تر نوالہ خیال کرنے میں غلطی کی۔ کوہستان کے اس آہنی انسان نے برنز کے "تجارتی وفد" کو تاجرانہ جواب دیا۔ برنز مایوس ہو کر واپس ہوا۔

۴۲

برنز جون ۱۸۳۵ء میں شملہ پہونچا۔ برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر جنگ کے شعلوں کو ہوا دی گئی۔

برنز کے واپس ہوتے ہی روسی سفیر دیکو ویش کا اثر دربار افغانستان میں قدرتی طور پر زیادہ ہو گیا۔

شاہ شجاع کے دامن سے آتشِ جنگ کو ہوا دی گئی، کمپنی شاہ شجاع اور رنجیت سنگھ کے اتحادِ ثلاثہ نے جنگ افغانستان کو جائز قرار دیا۔ امیرانِ سندھ کو کمزور و نحیف خیال کرتے ہوئے اس اتحاد میں شامل ہونے کی دعوت تک نہ دی گئی۔

انگریزی فوجیں سندھ اور پنجاب سے افغانستان میں داخل ہوئیں، قندھار، غزنی اور کابل کو فتح کرنے کے بعد شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ڈیورنڈ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ برطانوی فوجوں کو تکمیل کار کے بعد باعزت طریقہ سے واپس ہو جانا چاہئے

تھا۔ میک نائن کا یہ بیان کہ شاہ شجاع کی تخت نشینی رعایا کے خلوص کی ترجمانی تھی۔ حقائق کے خلاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ شجاع کو برطانی سنگینوں کے زیر سایہ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ لیکن اس کی ذات محفوظ و مامون نہ تھی، قندہار، غزنی اور کابل نے برائے نام اسے اپنا تاجدار تسلیم کیا تھا۔ ہرات کی آزاد حکومت میں اسے ذرہ بھر دخل نہ تھا۔ کوہستان کی ہر وادی سے شاہ شجاع کے خلاف آواز بلند ہو کر چٹانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اگر شاہ شجاع کی تخت نشینی رعایا کے خلوص کا مظہر ہوتی تو انگریزی فوجوں کو چاہیئے تھا کہ وہ شاہ شجاع کو اسی خلوص کے سپرد کر کے واپس چلی جاتی۔

آک لینڈ کی افغان حکمت عملی ایک بہت بڑی حماقت تھی۔

افغان رعایا کے خلوص کے باوجود انگریزی فوجیں شاہ شجاع کی حفاظت کے لئے قندہار، کابل، غزنی اور جلال آباد میں مقیم تھیں۔ ان فوجوں کے قیام سے برطانوی عزائم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، تمام اختیارات میک نائن کے قبضہ میں تھے، شاہ شجاع افغانستان کا سر جعفر اور میک نائن کو ہستان کا کلائیو تھا، خارجی پالیسی سے شاہ شجاع کو کوئی تعلق نہ تھا۔ سیاسی آزادی ہے کیا؟

رعایا کا ہر ذی ہوش فرد افغانستان کے میر جعفر کی حکومت سے نالاں تھا۔ اپریل ۱۸۴۰ء میں شاہ شجاع جلال آباد سے کابل آیا۔ اسکی آمد کے چند دنوں بعد برطانی فوجوں نے بالاحصار، خالی کر دیا۔ انگریزی فوج کی ایک چھاؤنی کابل کے شمالی میدان میں قائم کی گئی۔ فوجی افسروں نے اپنی بیویوں کو کابل بلا لیا۔ اس نیم شہری اور نیم بدوی زندگی کو پُر لطف بنانے کے لئے ہر قسم کے سامان مہیا کئے گئے۔ طوفان کی آمد سے پہلے یہ لوگ خورد و نوش میں مصروف تھے، طوفان ان مسرتوں اور لطف اندوزیوں کو تنکوں کی طرح بہا کر لے گیا۔

ہندوستان کی طرح افغانستان میں بھی انگریزوں نے " نفاق ڈالو اور حکومت کرو" پر عمل کرنا چاہا۔ میک نائن کے معاون منشی موہن لال نے افغانستان میں افغانی ایندھن اور برطانی دیاسلائی سے خانہ جنگی کی آگ لگانی چاہی لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

میک نائن نے افغان سرداروں کو قتل کرنے کی ایک سازش کی۔ لیکن اسے بھی کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ افغان وفد کے پیش کردہ معاہدہ کو میک نائن نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس انکار کے بعد افغانستان میں سکون طاری ہو گیا۔ یہ سکون تموج سے قبل لہروں کا سکون تھا۔ میک نائن اس سکون سے خلاف امید توقعات وابستہ کئے ہوئے تھا۔ تباہ کن ایام سرما کو آتے دیکھ کر افغان سردار بھی خاموش ہو گئے۔ انگریز سپاہیوں پر خوف و ہراس طاری ہو چکا تھا، وہ افغانستان چھوڑنا چاہتے تھے لیکن افغانستان انھیں نہیں چھوڑتا تھا۔ میک نائن کاغذات صلح ہاتھ میں لئے ہوئے آگے بڑھا۔ کابل اور برطانی معسکر کے درمیانی مقام پر فریقین ملے، یہ امر متفقہ طور پر طے پایا کہ تین دن کے اندر برطانی فوجیں کابل خالی کر دیں گی۔

مقررہ وقت گذر گیا۔ برطانی سپاہی اپنے معسکر میں قیام پذیر تھے۔ معاہدہ کی یہ خلاف ورزی افغانوں کو ناگوار خاطر گذری، اکبر خاں نے میک نائن کی عیاریوں کی داد برطانی سکوں میں دینی چاہی۔ چنانچہ میک نائن کو از سر نو گفت و شنید کی دعوت دی گئی۔ میک نائن نے اس دعوت کو قبول کرنے میں ذرہ بھر تامل نہ کیا۔

۴۳

بڑھتی ہوئی جسارت حق و صداقت سے خالی ہوتی ہے۔

میک نائن اپنے تین ساتھیوں سمیت رود کابل کے کناروں پر اکبر خاں سے ملنے کیلئے روانہ ہوا۔ جب اس کی روانگی کا مقصد اس کے ایک ساتھی کو معلوم ہوا تو اس نے کہا: " سازش ہے جناب! سازش "۔

اس سازش میں شریک ہونے دو" میک نائن نے جواب دیا" ایک آزمودہ کار برطانوی افسر نے جب میک نائن کو اس کے عزائم سے باز رکھنا چاہا تو اس نے جواب میں کہا " میں ایسے معاملات تمہاری نسبت بہتر سمجھتا ہوں۔ مجھے مرنے دو۔ موت بہتر ہے اس زندگی سے جو گذشتہ چالیس روز سے کاٹ رہا ہوں، برطانی وفد رود کابل کی طرف روانہ ہوا۔ مقررہ مقام پر یہ وفد رک گیا۔ اکبر خاں بھی پہونچ گیا۔ رسمی گفت و شنید کے بعد اکبر خاں " بگیر، بگیر " پکارا۔ برہنہ تلواریں میک نائن کی طرف بڑھ رہی تھیں، موت و حیات کی اس آخری کشمکش میں میک نائن

کی زبان سے "از برائے خدا" کے الفاظ نکلے۔

تسخیر کابل اور میک ناٹن کے قتل تک کے واقعات کو یا سو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"اہلِ افغانستان نے بیگمات کی عصمت پر حملہ ہوتے دیکھا۔ ان کے وطن کو لوٹ لیا گیا۔ ہر اُس چیز کو تباہ و برباد کر دیا گیا جو ان کے نزدیک مقدس و متبرک تھی۔ ان مناظر نے ان کی رگوں میں خونِ انتقام دوڑا دیا۔ آزاد افغانستان کے باشندے ان بداعمالیوں اور بدنظمیوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، ان کی نگاہوں میں انگریز ذلیل ہو چکے تھے، ان کے نزدیک انگریز کا وجود تعزز، شرافت اور اخلاق کے عناصر سے خالی تھا۔"

افغانوں نے انگریزوں کی بدعہدیوں کے پیشِ نظر اس کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے وطن کو ان کے ناپاک وجود سے پاک کریں گے۔ ان کے طرزِ تفکر میں شاہ شجاع افغانی مصائب کا سرچشمہ تھا۔ وہ اسے اپنے وطن سے خارج کرنا چاہتے تھے۔ برطانی سنگینوں کی مدد سے حاصل کردہ تختِ افغانستان شاہ شجاع کے لئے کانٹوں کا بچھونا تھا۔ شاہ شجاع کو اسی تخت کے لئے جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ جب شاہ شجاع اپنے وطن کو خیرباد کہتے ہوئے مملکت کمپنی میں پناہ گزیں ہونے کے لئے کابل سے روانہ ہوا۔ تو راستہ میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

برنز کے خلاف بھی افغانستان میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ ان کے نزدیک برنز ایک ذلیل اور ناسپاس گذار انسان تھا، وہ ایک غدار تھا جس نے افغانوں کے لئے مصائب کے دروازے کھول دیئے، وہ غداری کی موت کا مستحق تھا۔ دن کی روشنی میں اُسے کابل میں قتل کر دیا گیا۔

میک ناٹن کا کردار افغانستان میں کلائیو کا پارٹ ادا نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ انگریزوں کی سلامتی افغانستان کو خیرباد کہنے میں تھی۔ اس لئے انھوں نے دوست محمد خاں کو تخت نشین کرنے کا وعدہ کیا۔ اس سلسلہ میں دوست محمد کے فرزند اکبر خاں سے ایک معاہدہ کیا گیا۔ لیکن اس معاہدہ کی خلاف ورزی میں انگریزوں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ میک ناٹن اپنے وحشیانہ اور غیر انسانی طرزِ عمل سے بہت بدنام ہو چکا تھا۔ انگریزوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میک ناٹن کا غدارانہ طرزِ کار اس کی موت کا سبب بنا۔ جب میک ناٹن اور اکبر خاں معاہدہ سے متعلقہ گفت و شنید کر رہے تھے۔ تو میک ناٹن کو قتل کر دیا گیا۔

سید فدا حسین اپنی کتاب "نیرنگِ افغانستان" میں لکھتا ہے۔

۴۴ "میک ناٹن نے اکبر خاں کو اپنی دوستی کا یقین دلاتے ہوئے ایک خط لکھا، اس خط کے ذریعہ میک ناٹن ہی نے اکبر خاں کو اس کے بعض غدار سرداروں سے آگاہ رہنے کا مشورہ دیا لیکن ساتھ ہی میک ناٹن نے ان سرداروں کو اکبر خاں کے خلاف خطوط لکھے۔ میک ناٹن کا خط ملتے ہی اکبر خاں نے اپنے سرداروں کو ایک جرگہ میں بلا کر انھیں میک ناٹن کا خط دکھایا۔ اس پر افغان سرداروں نے بھی وہ خطوط ظاہر کر دیئے جو میک ناٹن نے اُنھیں روانہ کئے تھے۔ میک ناٹن جب اکبر خاں سے ملنے کیلئے گیا تو اس نے اپنے سپاہیوں کو آس پاس کے مقامات پر چھپا دیا۔ اور انھیں اشارہ کا منتظر رہنے کا حکم دیا۔ اکبر خاں نے میک ناٹن سے ان خطوط کا مقصد دریافت کیا۔ میک ناٹن جواب کیلئے اپنے ہونٹوں کو جنبش دینا چاہتا تھا کہ ایک افغان سپاہی نے اکبر خاں کو گھات میں بیٹھے ہوئے برطانوی سپاہیوں کی نقل و حرکت سے آگاہ کیا، اکبر خاں اور میک ناٹن آمادۂ پیکار ہو گئے۔ میک ناٹن نے اپنا پستول اکبر خاں پر چلایا لیکن خود مارا گیا۔"

اس حربی تمثیل کے تین کردار۔ شاہ شجاع۔ برنز اور میک ناٹن۔ سٹیج سے غائب ہوتے ہیں۔ کوہستان کی وادیوں میں ایک نیا کھیل ہونے والا تھا۔ ایک ایسا کھیل جس میں سولہ ہزار افغان شریک تھے، اور جس کی ہولناکیوں اور بربادیوں کو بیان کرنے کے لئے صرف ایک زبان باقی رہی۔

متعدد آلام و مصائب کا شکار ہونے کیلئے سولہ ہزار افراد کا قافلہ ۶ جنوری ۱۸۴۲ء کو کابل سے جلال آباد روانہ ہوا۔ کوہستان برف کی سفید ٹوپیاں اوڑھے کھڑے تھے، میدانوں پر برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھیں۔ سرما کی تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ سپاہی اپنی تلواروں کو بھولے ہوئے اور افسر اپنی وردیوں سے غافل جلال آباد کی طرف چلے جا رہے تھے، کہ اچانک ایک افغان نے ایک برطانی افسر کے کان میں کہا "اکبر خاں نے قسم کھائی ہے کہ وہ صرف ایک انسان کو زندہ رہنے دیگا جو برطانی فوج کی تباہی کا حال بیان کر سکے، سپاہی جی چھوڑ چکے تھے، افسر منہ موڑ چکے تھے موت سولہ ہزار انسانوں کو لقمہ بنانے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی، دریا کے کناروں پر اس قافلہ کو رکنا پڑا، دوپہر کے وقت یہ قافلہ دریا کے دوسرے کنارے پر پہونچا۔

افغان ان ہیبت کے ماروں پر آوازے کس رہے تھے !

لوٹ مار کے دلدادہ افغان برطانی معسکر پر جمع ہو چکے تھے۔ ہر وہ چیز جو ان کے سامنے تھی اٹھالی گئی، لوٹ مار سے زیادہ خونریزی کو مقصدِ حیات خیال کرنے والے افغان بندوقوں کو سنبھالے ہوئے راستہ کے دونوں طرف موت کے فرشتوں کی صورت میں کھڑے ہوگئے

شدت سرما نے کئی انسانوں کی جانیں ضائع کر دیں، تیز و تند سرمائی ہواؤں سے بچنے والے افغانوں کی گولیوں کا شکار ہو کر رہ گئے۔ وہ موت کے منتظر تھے، انھیں اس بات کا خیال نہ تھا کہ تلوار ان کا گلا کاٹے یا شدت سرما ان کی حرکتِ قلب بند کر دے، وہ وادیٔ موت میں آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے، پاس ہی ان کی مائیں زندگی کے آخری سانس توڑ رہی تھیں۔

تاریکیٔ شب نے اہلِ کارواں کے مصائب کو بڑھا دیا، بیخانماں، بے جامہ اور بے سامان انسانوں کی مصیبتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے محض ہوسِ ملک گیری کی خاطر ہزاروں جانیں ضائع ہو رہی تھیں، شہنشاہیت اپنی زندگی کیلئے انسانی جانوں کو وادیٔ موت میں ڈھکیل چکی تھی۔

موت! ہر طرف! طفلی کی موت! شباب کی موت! پیری کی موت!

وادیٔ موت کے سپاہیوں پر صبح نمودار ہوئی۔ لیکن بے زمزمۂ درا۔ کوئی بگل تیاریٔ سفر کیلئے نہ بجایا گیا، سردی، بھوک تھکاوٹ نے اس قافلہ کو موت کے سپرد کر دیا۔ اکبر خاں کا وعدہ پورا ہوا۔ سولہ ہزار انسانوں کی تباہی کی داستان بیان کرنے کے لئے صرف ڈاکٹر برائیڈن جلال آباد کے برطانی قلعہ میں داخل ہو سکا۔ اس کے ابتدائی الفاظ نے اہلِ دفتر کو مایوس کر دیا ہوگا۔ جلال آباد میں بھی ہیجان پیدا ہو گیا۔ انگریزی سپاہیوں کا خوف اس قدر کم ہو چکا تھا کہ قلعہ کی دیواروں سے تین سو گز کے فاصلہ پر افغان چر رہے اپنی بھیڑوں کو چراتے اور مزے سے پشتو گیت گاتے۔ جنرل سیل کمک کی امید پر قلعہ ہی میں مقیم رہا۔

۴۵

اسی اثناء میں آک لینڈ کی جگہ ایلن برا (۱۸۴۲ء۔ ۱۸۴۴ء) گورنر جنرل مقرر ہو چکا تھا۔ ایلن برا نے جنرل پالک کو گذشتہ ہزیمت کا انتقام لینے کے لئے کابل روانہ کیا، اپریل ۱۸۴۲ء میں پالک علی مسجد کے قلعہ پر قابض ہو گیا، انہی ایام میں شاہ شجاع قتل ہو چکا تھا۔ جنرل پالک، جنرل سیل اور جنرل ناٹ تینوں کابل روانہ ہوئے۔ کابل کے بازار کو آگ لگا کر انگریزی فوجوں نے افغانستان کو خالی کر دیا۔

افغانستان کی پہلی جنگ نے انگریزوں کے حربی تدبر اور عسکری برتری کو بہت بری طرح مجروح کیا۔ ہندوستانی رعایا اس شکست کو بڑے مزے سے بیان کرتی، انگریزوں نے ہندوستانیوں کو مرعوب کرنے اور اپنے عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے امیرانِ سندھ کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔

باری

نئی دنیا

(فرمودۂ شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی)

میں نے اک دنیا نئی معلوم کی ہے رُوح میں — دل فریب و دلنواز و دل فروز و دل نشین

اِن تڑپتی تلملاتی پستیوں کے اُس طرف — اک دمکتے، جگمگاتے اوجِ مبہم کے قریں

ہر ورق ہے جسکے دیواں کا کتابِ کائنات — ہر کلی ہے جسکے گلشن کی نگاہِ دُوربیں

زندگی ہے جس جہاں میں اک غلامِ بے وفا — موت ہے جس دائرے میں اک کنیزِ کمتریں

اس جہاں کے لعل و گوہر سے سوا ہے جسکی خاک — اس کرے کے آسماں سے بڑھ کے ہے جسکی زمیں

جسکا ہر بوٹا ہے رشکِ نرگسِ جادو طراز — جسکے ہر غنچے میں نازِ لیلیٰ محمل نشیں

جسکے تابندہ افق کے زرفشاں آغوش میں — اک نفس بھی آنکھ جھپکاتا نہیں مہرِ مبیں

جو ہے ایک ایسا انوکھا عالمِ تمکیں جہاں — حلقۂ بیرونِ در ہے فتنۂ دنیا و دیں

جس رموزِ علم و عرفاں کی بصیرت گاہ میں — ذہن کی آوارگی ہے کاوشِ وہم و یقیں

حق و باطل، نور و ظلمت، خیر و شر، ایمان و کفر — ان تمام افکار سے خالی ہے جو خلدِ بریں

آخرت، جنت، جہنم، قہر، رحمت، مغفرت — عقل کی اس بیہودگی سے پاک ہے جو سرزمیں

رقصِ رندانہ پہ مبنی ہیں جہاں آثارِ حق — ہوئے مستانہ پہ قائم ہیں جہاں ارکانِ دیں

جس رہِ پیغامِ بے پیغامبر میں ہم نفس　　لرزشِ مژگاں ترے شہپرِ روح الامین

خون کی گردش میں رقصاں ہے جہانِ ذکرِ حبیب　　نبض کی جنبش میں غلطاں ہے جہانِ حبل المتیں

میں نے اک دنیا نئی معلوم کی ہے روح میں

دل فریب و دلنواز و دل فروز و دل نشیں

کون یہ در کھٹکھٹاتا ہے؟ ذرا دیکھو کوئی　　خیر ہو اس عرش تک بھی آگئے اہلِ زمیں

"آئے ہیں مجرے کو کچھ اوتار کیا ان سے کہوں؟!"

کہہ دو واپس جائیں ملنے کی مجھے فرصت نہیں

۴۷

جوش

اُردو شاعری پر فقدانِ جدّت اور فارسی کے تتبّع کا الزام

(از سید محمد عسکری صاحب عسکری طباطبائی بی اے لکھنوی)

اُردو شاعری پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اس میں جدت (Originality) اور اس کے شعراء کی خامہ فرسائیاں کچھ نہیں مگر فارسی اساتذہ کی نقالی و پیروی، الزام کے دو جزو ہیں، ایک تو فقدانِ جدت، دوسرے فارسی شاعری کا اتباع۔ پہلے جزو کا جواب دینے کے لئے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ جدت ہے کیا چیز۔ فلاسفہ کا ایک مذہب تو مُصر ہے کہ دنیا میں فی زمانا کوئی ایسی چیز نہیں جو جدت کہلائی جا سکے۔

"ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا" ہر نئی ایجاد اور ہر نیا خیال کبھی زمانۂ ماقبل میں معلوم کیا جا چکا ہے۔ انسان کے ذہن میں کوئی ایسی چیز آ ہی نہیں سکتی جس کا یا کم از کم جس سے مشابہ کسی شے کا وجود فی الواقع پہلے ہی سے نہ ہو۔ ایک جرمن فلسفی کا قول ہے۔

"جدت تمہاری کم نظری کا دوسرا نام ہے" یعنی جس چیز کو تم جدید خیال کر رہے ہو درحقیقت کبھی پہلے موجود رہ چکی ہے، صرف تمہاری نظر اس تک نہیں پہونچی ہے۔ یہ فلسفی شاعری میں جب اس نظریہ کو جگہ دیتے ہیں تو اور بھی سخت ہو جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کوئی شاعر اس بات پر قادر ہی نہیں کہ نیا خیال نظم کر سکے۔ جو کچھ وہ کہے گا اس سے بیشتر کوئی شاعر کہہ چکا ہوگا۔ ہم اس نظریہ کو قطعی طور سے تسلیم کر لینے کے لئے تو تیار نہیں لیکن ہاں اتنا ضرور مانتے ہیں کہ اگر جدید خیال کی تخلیق غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ شاعری میں جدت دراصل جس چیز کا نام ہے وہ جدت ادا ہے۔ ہم اگر اچھوتے سے اچھوتے اور جدید سے جدید خیال کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو اس میں اور قدما کے خیالات میں کچھ اجزا ضرور مشترک پائیں گے، لہٰذا اردو شاعری میں بھی جس چیز کی ہمکو تلاش کرنا چاہیئے جدّت ادا ہے، نہ کہ جدّتِ خیال [1]

---

[1] میں ایشیا کے کسی نمبر میں تحریر کر چکا ہوں کہ عسکری صاحب لکھنویت سے بڑی حد تک آزاد ہیں لیکن بہرحال وہ لکھنوی ہیں اس لئے ان کی رائے میں کبھی کبھی قدامت جھلک جاتی ہے اس مضمون میں اردو شاعری کے متعلق جو رائے قائم کی گئی ہے ضروری نہیں کہ میں اس سے کلیتہً متفق ہوں، اور بنیادی طور پر میری رائے یہی ہے کہ اُردو شاعری فارسی کی متبع ہے اور اچھی طرح متبع ہے مگر اس مضمون کو میں اس لئے شائع کر رہا ہوں کہ یہ مضمون عسکری صاحب کی جرأت کا آئینہ دار ہے۔

جدّتِ ادا، اور جدّتِ خیال ان دونوں کے محاسن کے متعلق پہلے یہ غور کرنا ہے کہ کسی شاعری سے یہ کس درجہ پر

جدّتِ ادا سے مراد ہے اظہارِ مطلب کا نیا اور اچھوتا طریقہ۔ ایک خیال کو مختلف پیرایوں میں ادا کرسکتے ہیں۔ لیکن سب سے انوکھا، اور دلپسند پیرایۂ بیان اختیار کرلینا فطری شاعر ہی کا کام ہے، تشبیہوں کی جدّت اور استعاروں کی ندرت بھی جدّتِ ادا کے ذیل میں آجاتی ہے۔ اکثر سادی سی بات کو اس طرح کہتے ہیں کہ اس میں ہزار حسن پیدا ہوجاتے ہیں اسکا راز بھی جدّتِ ادا میں پوشیدہ ہے۔ اکثر کلام میں ایسا اختصار ہوتا ہے جس میں بڑی وسعت پوشیدہ ہو ایسا اجمال جس میں تفصیل سے زیادہ وضاحت ہو ایسا ابہام جس میں شرح سے زیادہ بسط ہو۔ یہ تمام باتیں جدّتِ ادا کے مفہوم میں داخل ہیں اور پھر بھی ہم اُسی تعریف میں محدود نہیں کرسکتے۔ غرضیکہ اگر ہم اس نقطۂ نظر سے اُردو شاعری کا مطالعہ کریں تو ہمیں اسکے ہر باکمال شاعر کے یہاں بے شمار ایسے جواہر پارے نظر آئیں گے جو تراش خراش، رنگ، ڈھنگ میں فارس کے لعل و جواہر سے مختلف ہیں ہاں سنگ وہی رہتے ہیں اور پھر کیا بیجا ہے۔ یوں تو کسی زبان کی شاعری کو لے لیجئے اور اس کا تقابل دوسری زبان کی شاعری سے کیجئے آپکو متعدد مشترک خیالات مل جائیں گے، خیالات تو دوسری چیز ہیں۔ ہزار ہا الفاظ، امثال اور محاورے ایسے ملیں گے جو دوسری زبانوں کے الفاظ، امثال اور محاورات پر لفظاً و معناً منطبق ہوتے ہیں، پھر اردو شعرا کے خیالات کو جمع کرنے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر فارسی شاعری میں ان کا مماثل تلاش کرلینے کے بعد ان غریبوں پر سرقہ یا کورانہ تقلید کا الزام کہاں تک بجا ہوسکتا ہے۔

اعتراض کا دوسرا جزو پہلے کو واضح کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اردو شاعری میں سوائے فارسی کے تتبع کے کچھ نہیں۔ یہ دعویٰ اصلیت کا شائبہ تو ضرور رکھتا ہے لیکن اس بڑی حد تک مبالغہ کی آمیزش ہے، یہاں تک تو صحیح ہے کہ اردو شعرا نے کچھ نہ کچھ ضرور فارسی اساتذہ کا تتبع کیا لیکن یہ کہنا کہ اردو شاعری میں سوائے کورانہ تقلید کے کوئی جدّت یا ندرت ہے ہی نہیں، ویسا ہی بیجا ہے جیسا یہ کہنا کہ اُردو نے فارسی کا قطعاً تتبع کیا ہی نہیں۔ اُردو شعرا نے اہلِ فارس کا تتبع کیا اور ضرور کیا لیکن سوال تو یہ ہے کہ کس حد تک ایسا کیا اور ایسا کرنے میں وہ کہاں تک بجا رہے اور کہاں تک قصوروار رہے، دُنیا میں ہر زبان کی شاعری میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے، ایک قوم نے دوسری قوم کی، ایک ملک نے دوسرے ملک کی شاعری کی پیروی کی ہے، کیا انگریزی شاعری نے لاطینی زبان سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ کیا یونانیوں نے عربوں کے خیالات مستعار نہیں لئے۔ کیا اہلِ فارس نے عربوں سے استفادہ نہیں کیا۔ پھر اگر اردو شعرا نے فارسی کی پیروی کی تو کہاں تک بُرا کیا۔ اور وہ اس سے کیونکر باز رہ سکتے تھے یہاں پر ایک ضروری نکتہ لحاظ کرنے کے قابل یہ ہے کہ جو پیروی بھی کی ہے وہ زیادہ تر اصنافِ شاعری میں کی ہے نہ کہ خیالات و مضامین میں۔

اردو شعرا نے فارسی اساتذہ کے قصیدوں پر قصیدے اور غزلوں پر غزلیں لکھیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے ان کے خیالات بھی مستعار لئے، انھوں نے بھی مثنویاں لکھیں لیکن ان میں اپنی معاشرت اور طرزِ بود و باش کے نقشے کھینچے (ہمکو اس زمانہ کا مروّجہ اصول بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ فارسی اساتذہ کے قصیدوں پر قصیدے کہنا اور ان کے جواب لکھنا استادی کی سند سمجھا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ سوداؔ اور ذوقؔ کے متعدد قصیدے فارسی قصیدوں کی طرحوں میں ہیں) یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اردو میں چندہ عام تلمیحات فارسی سے اخذ کریں. جو شاعری میں صداقت

بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴ — ہم آغوش ہوسکتے ہیں۔ اگر اردو شاعری کے دورِ ماضیہ سے بحث ہے تو میں یہ کہونگا کہ وہ زبانِ اُردو کے تعمیری دور کی شاعری ہے اور جدّتِ ادا کبھی تعمیری دور میں تخلیق نہیں ہوا کرتی، البتہ جدّتِ خیال کے لئے کوئی قید نہیں، شاعر اور شاعری کی قید بھی نہیں، فطرت اس جوہر کو ہر حالتوں میں بھی عام کرتی ہے، میں ان فلاسفہ سے متفق و مرعوب نہیں جو جدّت کی محدود تعریف کرتے ہیں، اشتراکِ خیال دوسری شے ہے مگر پھر بھی بہت سی باتیں زندگی میں قطعی نئی ہوکر ہم تک پہونچتی ہیں، موجودہ عہد کے شعرا نے جن موضوعات پر نظم نگاری کی ہے، اگر یہ جدّت نہیں ہے تو ہمیں قدما اور متاخرین کے دیوانوں میں اسکو قدامت کی صورت میں دکھایا جائے

اب رہی جدّتِ ادا، سو یہ بالکل ایک ضمنی اور جزوی حسن ہے، ہر آرٹسٹ کو اتنی اٹکل تو ہوتی ہی ہے کہ وہ اپنے آرٹ کو ممیز کردے اور ذرا بچ کر قدم اٹھائے، میں جدّتِ ادا کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا مگر اس پر ساری عمارت کی بنیاد قائم نہیں کرسکتا

ساغر

ادبی کا مرتبہ رکھتی ہیں مثلاً شیریں و فرہاد کے افسانے، رستم و سہراب کی داستانیں اور چند ایسی ہی دیگر باتیں جنھیں بہت سی خود فارسی نے عربی سے مستعار لی تھیں مثلاً لیلیٰ و قیس، اور حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت یوسف وغیرہ سے متعلق قصّے، اور شمع و پروانہ اور گل و بلبل وغیرہ کے افسانے اردو نے فارسی سے مستعار لئے، اس میں شک نہیں کہ ان کی بدولت اردو میں بڑی حد تک تصنع داخل ہو گیا۔ ہندوستان کے رہنے والے شاعروں کا فارس کی بہار نظم کرنا ویسا ہی غیر فطری معلوم ہوتا ہے[5] جیسا اپنے ملک کے عشق و محبت اور جرأت و ہمت کے افسانے مثل نل دمن اور رام داؤ جن کے قصّے چھوڑ کر غیر ملکی فرسودہ داستانیں دُہرانا۔ ناگزیر تھا کہ تصنع پیدا ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص جس نے فارس کی بہار دیکھی ہی نہ ہو، آتشِ گل کے دہکنے اور بلبل کے سوزِ دل کا ماجرا کیا بیان کر سکتا ہے، لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے شاعر شعر کہتے وقت خارجی مناظر کی مدد سے بے نیاز ہوتا ہے ضروری نہیں کہ جب وہ کسی پُر فضا چمن میں رنگا رنگ کھلے ہوئے پھول دیکھے جبھی ان کی سچی تصویر اپنے اشعار میں اُتار سکے اس[6] کی دنیا خود اس کے دل میں موجود ہوتی ہے، اور وہ جو کچھ کہتا ہے صرف[7] روح القدس کا فیضان ہوتا ہے، اُسے بہار نظم کرنے کیلئے پُر فضا باغوں اور شاداب میدانوں کی ضرورت نہیں۔ بیدلؔ کا ایک مطلع ہے جو ہر شاعر پر صادق آتا ہے ؎

نہ با صحرا سرے دارم، نہ با گلزار سودائے
بہ ہر جا میروم، از خویش می جوشد تماشائے

آزادؔ کی وساطت سے ہم تک میرؔ کا وہ قصّہ پہونچا ہے کہ ان کے زیرِ دیوار باغ تھا اور انھوں نے کبھی ادھر آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا، اس طرف کی کھڑکی ہی بند رہتی تھی۔ بہر حال ایک بات تو یہ ہے کہ شاعر کو کبھی خارجی مدد کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور دوسرے یہ بھی کہ اُردو شعرا ایسا کرنے پر ایک حد تک مجبور ہو گئے۔ بہار[8] جسکا نام ہی دراصل کبھی ہندوستان میں آئی ہی نہیں پھر وہ کیا اسکی دلربائیوں کا تذکرہ کرتے، یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں ان چیزوں کا قطعاً فقدان نہیں جنھیں شاعری میں جگہ دی جا سکے، اس میں خوشنما پہاڑوں کے بلند سلسلے بھی ہیں اور سبزہ زاروں کے مخملیں فرش بھی۔ اس میں دریاؤں کی مستقل روانی بھی ہے اور آبشاروں کا مسلسل نغمہ بھی لیکن اس زمانے کے مذاق کو کیا کیا جائے کہ ہر شخص فارسی شعراء کے پیش کردہ مناظر ہی کا دلدادہ تھا۔ ہر زمانے میں ایسا ہوتا ہے، جو زبان عروج پر ہوتی ہے، دوسری زبانوں پر اپنا اثر لازمی ڈالتی ہے، اس زمانے میں فارسی کا دور دورہ تھا اُردو نے مجبوراً اس کے اثرات قبول کئے، کون انکار کر سکتا ہے کہ آج اُردو زبان انگریزی ادب سے متاثر نہیں ہو رہی ہے، پھر قدیم شعرا میں جذبۂ وطن پورے طور پر راسخ ہو چکا تھا، وہ خود یا اُن کے قریبی آبا و اجداد زیادہ تر باہر سے ہندوستان آئے تھے، مسلمان شعرا تو قریب قریب تمام ایران و عرب کے رہنے والے تھے۔ پس وہ اپنے وطنوں کی روایات و رسوم کلیجے سے لگائے اپنے ساتھ لائے تھے اور انھیں شاعری میں داخل کرتے تھے، ایک عرصے تک تو وہ فارسی ہی میں طبع آزمائی اور اُردو میں شعر گوئی اپنی توہین خیال کرتے رہے جب یہ وہم دل سے دور ہوا تو بہت دنوں تک محض تفننِ طبع کے لئے کچھ

نوٹ متعلقہ صفحہ ۴۹ ت ۲ یہ اس لئے بجا ہو سکتا ہے کہ اردو شاعری کی زمین گو بھاشا ہے مگر اسکا پیکر فارسی الفاظ، استعارات، تلمیحات اور روایات سے بنایا گیا ہے اور وہ تمام اجزا و عناصر جن سے اس کا پیکر تیار ہوا ہندی زبان کی شاعری سے نہیں بلکہ فارسی سے مستعار لئے گئے "ساقی" قاتل ترک کا انداز "بندِ قبا" خطِ رخسار اور ایسے صدہا سامان، سدہا کیا کل سامان فارسی کے خزائن سے حاصل کیا گیا:

ہندوستان میں آئے ہوئے مسلمانوں کی زبان فارسی تھی اور اس لئے فارسی ادب ایران کو کلیتہً عبور تھا، تو گویا ان کے دماغوں کا سانچہ ایک خاص قسم کا بنکر رہ گیا تھا وہ بحیثیت ایک ہندوستانی شاعر کے فکر نہیں کرتے تھے، اپنی حاکمیت کی بنا پر وہ ہندوستان کیلئے ہی نہیں خود اپنے لئے بھی اجنبی تھے۔ وہ عادی تھے کہ ہندوستان کے اندر "تعمیر ایران" میں بیٹھ کر ایرانیوں کی طرح فکر کریں جبکہ ان کی مجلس ایران کے شاہوں سے مزین تھی یہی وجہ تھی کہ اُردو میں "وجودیت" (Realism) نہ پیدا ہو سکی، اگر اردو شاعری ہندی شاعری سے کلیتہً متاثر

کہہ لینے، اور اسکے بعد جب وہ زمانہ آیا کہ اردو میں صحیح معنوں میں دادِ سخن سنجی دینے لگے تو ان تشبیہوں، استعاروں، اور تلمیحوں سے کیونکر گریز کر سکتے تھے
جنکا استعمال فطرتِ ثانیہ بن گیا تھا پھر جوں جوں زمانہ گذرتا اور اردو سے اُنس بڑھتا گیا۔ اسمیں خالص وطنی چیزیں بھی شامل کرتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ مسلمان
شعرا جنھوں نے ہندی میں جولانیٔ طبع دکھانا شروع کی اس فن میں کامل ہوگئے۔ ان کے یہاں ایسی تشبیہیں بکثرت ملیں گی جو ٹھیٹھ دیسی ہیں، ان کے مطالعہ
سے ذوقِ شعری جدا لذت یاب ہوتا ہے اور ذوقِ وطن پرستی جدا سیراب! جسکی وجہ یہ ہے کہ ان کی تہ میں خود ما در وطن کی محبت کا ایک قومی جذبہ کارفرما ہے
ملک محمد جائسی کے اشعار ہیں ؎

کنچن دیکھ کسوٹی کسی   جن گھن ماں دامن پرکسی
سرخ کرن جن گنگن بسیکھی   جمنا مانجھ سُرستی دیکھی

(" اسکی مانگ ہے کہ کسوٹی پر خطِ طلا کھنچا ہوا ہے، یا اندھیری رات میں بجلی چمک رہی ہے۔ یا سورج کی کرن پردۂ شب کو چاک کر رہی ہے۔
یا جمنا کے درمیان سرستی بہہ رہی ہے"!)

میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ جو لطافت اور دلکشی ان اشعار میں ہے وہ نہ کسی کی مانگ میں ہے نہ ان مناظر میں۔
ایک اور شعر پیش کرتا ہوں۔ تشبیہہ کی لطافت اور خالص وطنیت ملاحظہ کیجئے اور سر دُھنیئے۔

بھئی اور یہ پھب سب ناماں   جن ایک بکھرے گھر ساماں

"یہ اسکی مانگ نفیس پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ جیسے کالے بادلوں میں بگلوں کی قطار اڑتی چلی جا رہی ہے"

" اردو شاعری میں یہ بات خال خال نظر آتی ہے لیکن مفقود نہیں۔ آتش کہتے ہیں

آئینہ میں عکسِ چشمِ یار کا عالم نہ پوچھ
دیکھ لے آتش کنول پھولے ہوئے تالاب میں

سودا کا مصرع ہے ؎ "تیری نگہ نے ظالم ارجن کا بان مارا" اور انیس نے کہا ہے " ارجن سے کماندار کو ایک تیر سے ماریں" تیر
ماتھے پر چندی لگانے کی رسم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"لطف اگر یہ ہے بتاں! صندلِ پیشانی کا
حسن پھر صبح کے کیا چہرۂ نورانی کا"

ایک جگہ اور خاص ہندوستانی زیور کا ذکر کرتے ہیں اور رہائے کس زبان میں۔

ہوتی تو آج رنگ دوسرا ہوتا۔ مگر یہ تقاضہ اتنا فطری تھا کہ رُوکے نہ روکا جا سکا اور غزل و قدیم اسالیب کو نئے اسالیب اور جدید طرزوں کے مقابلے
میں سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا یہی قدیم کی شکست اور جدید کی فتح ہے۔

؎ (صفحہ ۴۹ کا نوٹ) صرف ایرانی کلچر ہی ایسی ٹھوس بنیاد ہے جس پر عربوں کے سیلاب کا اثر نہیں ہوا بلکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عرب ایرانیوں
سے متاثر ہوئے اور یہ کہ عربوں کے تسلط کو ایرانیوں نے خوشی سے گوارا نہیں کیا۔

؎ (صفحہ ۴۹ کا نوٹ) اصناف شاعری میں پیروی کرنا کوئی جرم نہیں، خیالات اور طرز بیان میں اردو میں فارسی کی کھلی ہوئی پیروی
کی گئی ہے!! اگر عسکری صاحب اس پر مصر ہوئے تو امثال پیش کرنا مشکل نہیں۔

ساغر

کوٹھے اوپر اپنے کھڑا تھا کان میں پہنے بالے دو　　　خلق خدا کی دیکھن آئی چاند تو اک تھا ہالے دو

اور اکثر جگہ پسر برہمن، پسر زرگر وغیرہ کا ذکر اس دعوے کا شاہد ہے کہ یہ کمی زیادہ تر ہندوستان کے فارسی شعرا نے پوری کی ہے۔ مجھ کو امیر خسرو اور حزیں کے شعر یاد آرہے ہیں ؎

از بنارس نروم معبد عام است اینجا　　　ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

ہمچو ہندو زن کسے در عاشقی مردانہ نیست　　　سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

اور امیر خسرو علیہ الرحمۃ کا ایک قطعہ ہے جو نصف فارسی اور نصف اردو میں ہے۔

زرگر پسرے چو ماہ پارا　　　کچھ گڑھئے سنوارئیے پکارا

نقد دل من گرفت بشکست　　　پھر کچھ نہ گڑھا نہ کچھ سنوارا

ایک اور شعر میں ہندوستان کے طریقۂ سلام کی مصوری کی ہے جو محاکات کی اعلے ترین مثال ہے ؎

از صبا شاخ گلے خم شد و بیتاب شدم

نازکیہائے سلام تو مرا یاد آید

یہی وہ مقامات ہیں جہاں شاعری سحر حلال کے دائرہ سے نکلکر اعجاز کی حدوں میں داخل ہوتی ہے۔

خیر ایسی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو شعرا خیالات کی وادی میں فارسی اساتذہ کے نقش قدم پر چلتے ہیں یا اپنی واسطے الگ راہیں نکالی ہیں، اگر ہم نظر غور سے دیکھیں تو چند ایسے اشعار نکالکر جس میں اردو شعرا نے عمداً فارسی والوں کا ترجمہ کیا ہے مثلاً

قدسی	آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را	اختر ز فلک میںنگرد سوئے زمیں را
سودا	آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو	اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو
نظیری	عشق عصیاں است اگر مستور نیست	کشتۂ تیغ زباں مغفور نیست
شیفتہ	عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں	کشتۂ تیغ زباں ناجی و مغفور نہیں
نامعلوم	مس مالیدہ لب را رنگ پاں ہیں	تماشا ہیں، تہ آتش دخاں ہیں
ناسخ	مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے	تماشا ہے تہ آتش دھواں ہے

۵۵ (　　) اسکی وجہ صرف حاکمیت و مذہبیت تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو نل و دمن اور رام دارجن نے کیا قصور کیا تھا۔ مگر ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ آپکے محکوم کے عاشق و معشوق اور آپکے غلاموں کے پیغمبر تھے۔

۵۶ (نوٹ متعلقہ صفحہ ۴۲) عقل اس بات کو باور نہیں کر سکتی، کہ میں نے بیرس نہیں دیکھا اور میں وہاں کے بازاروں اور میدانوں کا حقیقی تصور کر سکوں، سنا جاتا ہے کہ گولر کا پھول کسی نے نہیں دیکھا (اور جو اس کو دیکھ لے بادشاہ ہو جائے) تو جس نے گولر کا پھول نہیں دیکھا وہ کیونکر گولر کی تصویر بنا سکتا ہے اور کس طرح اس پر نظم کہہ سکتا ہے، خیالات آفرینی کے متعلق تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کی دنیا دل میں ہوتی ہے۔ مگر اس نفسیاتی مسئلہ سے آپ انکار نہیں کر سکتے کہ اشیا کو دیکھے بغیر ہم احساس نہیں کر سکتے

ساغر

نامعلوم:- خدارا سوئے مشتاقاں نگاہی　　بیاپے گر نہ باشد گاہے گاہی

ذوقؔ:- اسطرف بھی ہمیں لازم ہے نگاہی گاہے　　دمبدم لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہی گاہے

ہمیں زیادہ تر یہ نظر آئیگا کہ اُردو شعرا نے جدت سے کام لیا ہے اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ ذیل میں فارسی اساتذہ کے منتخب اشعار کا اُردو شعرا کے ہم مضمون اشعار سے ایک تقابل پیش کیا جاتا ہے اور اس باریک فرق کو نمایاں کرنے کی کوشش کیجاتی ہے جو دونوں کے یک رنگ خیالات میں موجود ہے۔ ان اشعار میں اس جدتِ ادا کا نمونہ بھی ملیگا جس کی طرف شروع مضمون میں اشارہ ہے۔

مسیتب خاں ایک فارسی شاعر تھا، اس کی رُباعی ہے اور کس قیامت کی رباعی،

آراستہ آمد و چہ آراستنی　　دلخواست بعشوہ و چہ دلخواستنی
بنشست بمی خوردن و بر خواست برقص　　ہے ہے چہ نشستنی چہ برخواستنی

بعض جگہ شاعر اجمال سے وہ فائدہ اُٹھاتا ہے جو تفصیل سے ممکن نہیں۔ مذکورہ رباعی کے ہر مصرعے میں یہ حسن موجود ہے، کہتا ہے "بناؤ سنگھار کر کے آیا اور کیسا بناؤ سنگھار" اس کے بعد خاموش ہے لیکن یہ خاموشی دفتر دفتر آرائش جمال کے تذکرہ کر رہی ہے۔ اگر ذرا ذہن پر زور دیا جائے ــــ اور اس شعر کے سمجھنے میں جسکی بنیاد تخیل پر ہو اپنی تخیل سے کام لینا ضروری ہے۔ تو حسن اور اسکی آراستگی کے بے شمار پہلو نظر کے سامنے آجاتے ہیں، پھر نازک سا تعلق پہلے اور دوسرے مصرعہ میں یہ ہے کہ اس کے بعد جو کچھ ہونا تھا ہوا، اس نے دل مانگا اور کس انداز سے مانگا کہ بس۔ بیٹھا تو شراب پینے کی خاطر اور اُٹھا تو رقص کرنے کی ٹھان کر۔ ہائے کیا بیٹھنا ہے اور کیا اُٹھنا۔

مجھ کو آخر کے دو مصرعوں سے زیادہ کام ہے جنکا انداز بیان ہو بہو ظفر کے مطلع سے ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی شاعر نے جس منظر کی تصویر کشی کی ہے بے پناہ ہے، کسی خود بیں و خود آرا کا ناز و غمزہ کے ساتھ بے تکلف پہلو میں آکر بیٹھ جانا اور اس پر بادہ نوشی کی مشق یونہی ہلاک کر دینے کو کیا کم ہے کہ جب شراب اور حسن دونوں ملکر اپنے کیف تمام سے ایک کمزور و مغلوب ہستی کو بیخود و مدہوش کر دیں تو رقص کے لیے اُٹھا جائے۔ پھر حسن کا اپنی تمام دلربا اداؤں کے ساتھ رقص میں آجانا قیامت بالائے قیامت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ روشنی کی طرح آگے بڑھنا وہ سائے کی طرح پیچھے ہٹنا، وہ بوئے گل کی طرح پھیلنا اور موج رنگ کی طرح سمٹنا ؎

وہ دل چھینا ہاتھ بڑھا کے ہاتھ　　اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ

بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت خود رقص کناں ہے اور دیکھنے والے سکتے کے عالم میں ایسی بیٹھنے اور اُٹھنے کے انداز کو شاعر نے کہا ہے کہ ہائے کیا بیٹھنا اور کیا اُٹھنا ہے، اب مجھے ظفر کا شعر پیش کرنا ہے جو مضمون میں تو اس سے مختلف ہے لیکن اسی بیساختہ طرزِ ادا کا حامل ہے

؎۵ (نوٹ متعلقہ صفحہ ۴۴) سبحان اللہ! روح القدس کا فیضان! اسکے فیضان کو تسلیم کرنے سے قبل تو ذرا تفکر و تصدیق کی ضرورت ہے آپ کا ذکر نہیں مگر بدقسمتی سے اکثرین کو ان بزرگ کی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

؎۵ یقیناً ایرانی بہار ہندوستان میں کیوں آئیگی۔ لیکن ہندوستان کا موسم بہار اپنی آپ ہی نظیر ہے، ہندوستان ہی ایسا حسین اور شاندار اور مہذب ملک ہے جسکی مائتھالوجی یونان کے علم الاصنام سے ٹکر کھاتی ہے اور جس کے میلے اور تہوار اپنی کثرت میں یونان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہندی مہینوں کے نام ہی اپنے موسموں کا اعلان ہیں اور بہار کے موسم کے مہینے کو ہندی میں "بسنت" کہتے ہیں۔ اس موسم میں کھلنے والے پھول سرس، گیندا اور سرسوں ہیں یہ صرف ہندوستان ہی ہے جسکے ذرہ ذرہ میں شعریت کے دریا موجیں لے رہے ہیں اور شاعری اسطرح بکھری ہوئی ہے کہ غیر شاعر بھی شاعر بن سکتا ہے۔ مالوہ کے جنگل، کشمیر کی وادی،

ظفر اپنے پہلو میں اک دردمند دل رکھتا تھا۔ اس نے زمانے کی ستم رانیاں دیکھی تھیں اس کے یہاں بادۂ عشرت کی یہ سرمستی کہاں۔ ہاں اگر نغمۂ شادی کے بجائے نوحۂ غم" سننا ہو تو آئیے میں اسکے شعر میں سنوا دوں۔ دیکھئے حسن و عشق کا مضمون ہے لیکن سوز و گداز کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا۔ کہتا ہے!

آنا تو خفا آنا، جانا تو رُلا جانا
آنا ہے تو کیا آنا، جانا ہے تو کیا جانا

شعر نہیں آبگینہ ہے، جسکی نزاکت سے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ لگانے سے پاش پاش نہ ہو جائے بھلا ان جذبات و احساسات کی لطافت کا کیا ٹھکانا جو شعر کہتے وقت ظفر کے دل پر طاری ہوئے ہوں گے

اب دیکھیے کہ ان سادے سادے الفاظ سے کتنی مختلف تصویریں نظروں کے سامنے پھر جاتی ہیں، ایک طرف تو کسی کے تیوریاں چڑھائے بیگانہ وار آنے کا انداز ذہن سامع میں متصور ہو جاتا ہے، دوسری طرف خیال گذرتا ہے کہ جتنی دیر بیٹھے روٹھے ہی رہے اور جب چلنے لگے تو کچھ ایسی بیدردی سے منانے والے کے دل میں نشتر توڑ چلے کہ پیمانۂ صبر کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں کے جام بھی چھلک پڑے، قسمت کی خوبی دیکھئے کہ ہزار منتوں مرادوں سے آئے بھی تو مقدر کی طرح برگشتہ رہے اور جتنی دیر بیٹھے دل کو برماتے ہی رہے یہاں تک کہ یونہی تڑپتا چھوڑ چلے۔ اب کوئی ستم کش بیچارہ سوائے اس کے کیا کرے کہ بیٹھا سر دُھنے اور یہ مصرعہ پڑھے کہ واہ ؎

آنا ہے تو کیا آنا، جانا ہے تو کیا جانا

تاثیر جو شعر کی جان ہے، اس مطلع میں بدرجۂ اتم موجود ہے، یہ بات انداز بیان سے پیدا ہوئی۔ الفاظ کا شیرازہ بکھیر دیجئے اور نظم کی نثر کر دیجئے، دیکھئے تاثیر کا طلسم ٹوٹا جاتا ہے، پھر خیال میں بذات خود کوئی باریکی کوئی دقت نہیں، سامنے کی بات ہے لیکن عام شعرا کی نظریں یہاں تک نہیں پہنچتیں اور اگر پہنچتی بھی ہیں تو وہ اس طرح کامیابی کے ساتھ نظم نہیں کر سکتے، اسی کو سہل ممتنع کہتے ہیں۔

ایک عرب شاعر سے کسی نے پوچھا، اچھے شعر کی کیا پہچان ہے؟ اس نے کہا جسے سن کر ہر شخص بول اُٹھے کہ وہ بھی ایسا ہی کہہ سکتا ہے لیکن جب کہنے بیٹھے تو بڑے سے بڑا عالم اور جید سے جید فاضل بھی عاجز ہو جائے ظفر کا شعر اسی تعریف کا مصداق ہے۔

شبلی کا شعر ہے

باآنکہ بہ پرسیدن ما آمدہ مردیم
کایار کہ پرسیدہ رہِ خانۂ مارا

یعنی اگرچہ وہ میری ہی پرسش کیلئے میرے گھر آیا لیکن میں رشک سے مر گیا کہ اس نے میرے گھر کا راستہ نہ معلوم کس سے پوچھا۔ ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ معشوق پہلی مرتبہ عاشق کے گھر آیا ہے جبھی تو اس کے گھر کا راستہ نہیں جانتا تھا۔ باریکی یہ ہے کہ عاشق معشوق کا لطف و کرم اس کے آنے اور پہلی مرتبہ آنیکی خوشی بھول گیا۔ اور رشک کیوجہ سے مر گیا کہ اس نے سر راہ کسی غیر سے بات کر لی۔ میر اس جذبۂ رشک کی ترجمانی یوں کرتا ہے ؎

داغ ہوں رشکِ محبت سے کہ اتنا بیتاب
کس کی پرسش کیلئے گھر سے وہ باہر نکلا

برزخ کے ساحل، یہ تمام سامان، روح کی شاعری کو بیدار کر سکتے ہیں۔ اور بکھری ہوئی فطری شاعری کو روح میں مقید کر دینے کی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر الفاظ، استادی و شاگردی اور فاعلن مفاعلن، مشاعروں اور شاعریوں کے جکڑے ہوئے قیدیوں کیلئے یہ زمینیں بنجر ہیں۔

ساغر

فارسی کا شعر اس کے آگے بیجان معلوم ہوتا ہے اور تصنّع سے بھرا ہوا معشوق کا عاشق کی پرسش کیلئے اس کے گھر تک جانا ایسی بات ہے جسکے یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ برخلاف اس کے کسی خاص جذبہ کے زیر اثر بیساختہ گھر سے باہر نکل پڑنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

پھر نفسیاتِ انسانی سے واقف حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں کہ رشک سے دفعتاً مرجانا زیادہ مطابق فطرت ہے یا اپنی قلبی کیفیت کا یوں اظہار کرنا کہ اپنے تئیں ہمہ تن داغ ہوجانے سے تعبیر کر دیا جائے، مزید براں میر کے یہاں "آنا بیتاب" ایسا ٹکڑا ہے کہ معشوق کی گھبراہٹ اور سراسیمگی کی تصویر کھینچ دیتا ہے اور جس سے رشک کیلئے اور گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں کوچۂ یار میں گیا تو دیکھا کہ وہ ایک مرتبہ بیتابانہ گھر سے باہر نکل پڑا میں رشک سے سراپا داغ ہوگیا کہ نہ معلوم کس کی حالت دریافت کرنے کیلئے اس قدر پریشان و مضطرب ہے۔

معنیٰ کی اس نزاکت پر غور کیجئے کہ خود اسی کا جذبۂ دل تھا جو اپنی کشش سے معشوق کو گھر سے باہر کھینچ لایا لیکن رشک نے اسے اتنا سمجھنے کی اجازت نہ دی اور بدگمانی کا بُرا ہو جس نے کان میں پھونک دیا کہ وہ تو کسی اور کی پرسش کے لئے گھر سے باہر نکلے ہیں۔

میلی:-
ز بدگمانیٔ خود شرمسار خواہی شد
مباش این ہمہ در بندِ امتحاں بامن

'ابھی تو تمہیں میرا اعتبار نہیں، جانتے ہو یہ مجھے اپنی جان عزیز کریگا لیکن جب میں بسرِ چشم تمہارے ہاتھ سے قتل ہوجاؤں گا اور امتحان میں پورا اتر ونگا تو اپنی بدگمانی پر پچھتاؤ گے، دیکھو امتحان سے باز رہو'۔

شعر کا لفظی ترجمہ آخر کے دو مختصر جملوں میں موجود ہے لیکن شاعر کی معجز بیانی دیکھئے کہ اس نے ایسے الفاظ استعمال کئے جو بیشتر کے تمام مطالب کو آئینہ کر دیتے ہیں، وہ صرف اشارے کر دیتا ہے اور ذہن سامع خود بخود معنی پورے کر لیتا ہے یہ بجائے خود شاعری کا ایک بہت بڑا کمال ہے اور پھر مضمون میں کس قیامت کی لطافت ہے، اپنے قتل ہوجانے کا غم نہیں۔ خیال ہے تو یہ ہے کہ قاتل بعد قتل پشیمان نہ ہو۔

میر
بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

اس میں بھی وہ تمام حسن موجود ہے جو فارسی شعر کی زینت تھے۔ مطلب میں فرق اتنا ہے کہ وہاں قاتل کی پشیمانی کا خیال تھا یہاں اسکی بدنامی کا ڈر ہے، خدشہ ہے کہ قاتلوں میں اُس کا نام نکل جائے گا۔ حالانکہ اس کا نتیجہ بھی وہی بعد کا پچھتاوا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو میر نے

پہلے مصرعے میں وہ سب کچھ کہدیا ہے جو میلی کے پورے شعر میں ہے۔ اس طرح ان کا دوسرا مصرعہ پورے کا پورا اس کے شعر پہ بھاری پڑتا ہے اور اور پلّہ گراں کر دیتا ہے، پھر مصرعہ بھی کس قیامت کا مصرعہ ہے "رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو" وہ بیساختگی ہے کہ شک کو جگہ دینے کی گنجائش ہی نہیں۔ جو دلیں متیقن نہ ہو اس طرح کیونکر کہہ سکتا ہے۔ پھر ذرا اور گہری نظر سے دیکھئے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ عاشق کا عشق اب اس نقطے پر پہونچ گیا ہے جو رقابت سے بالا ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں

اقبال
محبت چوں تمام افتد، رقابت از میاں خیزد۔
بہ طوفِ شعلۂ پروانہ با پروانہ می سازد

اسکی پرستاریٔ حسن کا یہ عالم ہے کہ وہ زمانے بھر کو معشوق کا والہ و شیدا جانتا ہے، جبھی تو کہتا ہے اور کس یقین کے ساتھ کہ ایک میں کیا دنیا میں کوئی بھی تم سے اپنی جان کو عزیز نہیں رکھے گا۔ مجھی پر کچھ موقوف نہیں، کسی کو بھی آزمانے کا خیال نہ کرنا

میلی
بسے خوشنود می آید بسوہم، قاصد از کوشش
کہ غیر نامہ حرفے از زبانِ یار ہم دارد

معشوق کے کوچے سے قاصد بڑا خوش خوش واپس آرہا ہے، شاید خط کے علاوہ زبانی پیغام بھی لایا ہے۔ شعر میں بدگمانی کی مرقع کشی کی گئی ہے
دراصل قاصد خط کے جواب لے آنے پر خوش ہے اور انعام کی اُمید پر پھولا ہے۔ لیکن عاشق کو بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس نے خط دینے کے علاوہ
کچھ زبانی بھی کہلوایا ہے اور یہ لطفِ گفتگو حاصل کئے ہوئے ہے جبھی اسقدر خوش ہے بعینہ یہی مضمون آتش بھی کہتا ہے ؎

نکلتی منہ سے قاصد کے نہیں بات
مگر لایا ہے پیغام زبانی

لیکن اس چھوٹے سے شعر میں معانی و مطالب کا ایک دفتر پوشیدہ کر دیتا ہے اسکا راز اس ابہام میں ہے جو پہلے مصرعے میں صرف ہوا ہے
اور لفظِ "مگر" میں جسکے معنی شاید کے ہیں۔

فارسی شاعر نے پہلے مصرعہ میں قاصد کی خوشی کا ذکر کر دیا اور آتش نے وہ اندازِ بیان اختیار کیا جس سے ضمناً یہ اشارہ بھی ہوا اور کلام میں زور اور معانی میں وسعت جدا پیدا ہو گئی۔ انسانی مسرت کی انتہا تحیّر ہے، یہی نکتہ اس نے مدِّنظر رکھا۔ اور کہدیا "نکلتی منہ سے قاصد کے نہیں بات" عالمِ حیرت میں ایسا ہی ہوتا ہے، پھر دوسرے مصرعہ میں جو تشکیک لفظِ مگر سے پیدا کی، متعدد مطالب پر دال ہے، شاید زبانی پیغام بھی نہ لایا ہو۔ اور قاصد جذبۂ رحم و ہمدردی سے مجبور ہو کر چپ ہو کہ یہ خبرِ بد عاشق کو کیا سنائے، پہلے مصرعے کا طرزِ ادا ایسا ہے کہ خود عاشق کے اضطرابِ قلب کشمکشِ انتظار، فرطِ شوق، اور حالتِ اُمید و بیم کی تصویر پیشِ نظر ہو جاتی ہے، معلوم ہوتا ہے وہ انتہائی بیتاب ہے کہ قاصد کے منہ سے کچھ تو نکل چکے اور جب وہ کچھ نہیں بولتا تو اُسے بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ بھی شاید معشوق کے ساتھ لطفِ کلام حاصل کر چکا ہے اور جبھی بالکل مبہوت سا ہو کر رہ گیا ہے
واقعہ تو یہ ہے کہ قاصد نہ جواب تحریری لایا ہے نہ پیغامِ زبانی، اور اس لئے چپ ہے کہ کہے تو کیا کہے۔ مگر ہائے وہ حسرت نصیب، وہ فریب خوردہ آرزو جو یک بیک اُمیدوں کو منقطع بھی نہ کر سکے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ قاصد عاشق کی بیتابی پر اس قدر مبہوت ہو گیا ہو کہ طاقتِ گفتگو کھو بیٹھا ہو، بہرحال ایک امر یقینی ہے، عاشق قاصد کی خوشی پر متوحش ہے اور وہ اس کی وحشت پر خاموش اور جیتی جاگتی تصویر سامع کے پیشِ نظر ہے، اتنے وسیع مطالب کا ایک مختصر سے شعر میں بھر دینا شاعری کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔

دی رقیب از تو جدا بود و دل آزردہ نہ بود
شاد گشتم کہ غمِ عشقِ تو چنداں اش نیست

۵۶
کل رقیب تجھ سے جدا ہونے کے باوجود، دل آزردہ نہیں تھا، میں خوش ہو گیا کہ تیرے عشق کا غم اُسے زیادہ نہیں ہے، شعر میں شوخی ہے اور شوخی کا راز اس نکتہ میں پنہاں ہے کہ رقیب کے اطمینانِ خاطر کو اس کے عشق کی کامیابی پر محمول نہیں کرتا بلکہ اپنے مطلب کی بات یہ سمجھتا ہے کہ اسے معشوق سے محبت ہی نہیں، ورنہ اس کی جدائی میں مطمئن رہنا کیا معنی، ساتھ ہی اپنی بیتاب حالت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو فراقِ یار میں اس پر گذرتی ہے کیونکہ اس کے تصور میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ کوئی فراقِ دوست میں آسودہ رہے۔
مومن جس نے اپنی شاعرانہ طبیعت کی تمام تر جولانیوں کو دائرۂ تغزل میں محدود کر لیا تھا اکثر اپنے اشعار میں اس شوخی کا اظہار کرتا ہے وہ ایک ایسی بات سے جو سر اسر اس کے خلاف ہو اپنے فائدہ کا مطلب پیدا کر لیتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے

ہجراں کا شکوہ لب تلک آیا نہیں ہنوز
لطفِ وصال غیر نے پایا نہیں ہنوز

فارسی شاعر رقیب کے اطمینانِ خاطر کو جو اُسے فراقِ دوست میں حاصل ہے اسی کے خلاف ایک آلۂ کار بناتا ہے اور مومن رقیب کی اُس

انتہائی کامیابی کو جو کسی کو کبھی عشق میں حاصل ہو سکتی ہے مٹی میں ملا دیتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ مشکل کام تھا یا یہ۔ کہتا ہے رقیب نے معشوق کی جدائی کا تو مزہ چکھا ہی نہیں وہ وصل کی لذت کیا جانے، انگریزی مثل ہے (Seberation Sharpens love) پیاسے ہی کو پانی کی قدر ہوتی ہے۔ رقیب جو فراق سے نا آشنا ہے کبھی وصل سے کماحقہ لذت یاب نہیں ہو سکتا۔ کس مزے سے اپنے دل کو تسلی دیتا ہے اس کا تو غم نہیں کہ رقیب اور دوست میں کبھی فراق ہی نہیں ہوتا، اس پر خوش ہے کہ اسے وصل کی پوری لذت نہیں ملتی۔ وہ اکثر معشوق کو ایسے مشورے دیتا ہے جو ظاہر میں اپنے خلاف اور اس کے موافق ہیں لیکن دراصل اپنے موافق اور اس کے خلاف ہیں۔

"منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں"

"محفل میں کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز، دیکھنا"

"سرمگیں آنکھوں نے نامے کو لگاتے کیوں ہو
غیر کے نام کو مٹی میں ملاتے کیوں ہو"

غالب کے یہاں صرف ایک شعر میں یہ بات پائی جاتی ہے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی ۔۔۔ منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

میلی:-
خاطرم جمع است از بدگوئی دشمن کہ باز
گوش بر حرفش نیدارد چو نام من برد

معشوق سے دشمن کی لگائی بجھائی کرنے پر مطمئن ہوں کیونکہ جب میرا نام آجاتا ہے پھر وہ کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتا۔ اس شعر میں بھی وہی شوخی ہے کہ اپنے مفید مطلب پہلو کو لے لیا ہے اور دوسرے کو چھوڑ دیا ہے، انھیں اس کا تو رنج نہیں کہ معشوق کی نفرت اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ جب نام آجاتا ہے وہ ابرا فروختہ ہو کر کوئی بات سننا نہیں گوارا کرتا۔ لیکن اس کی خوشی ضرور ہے کہ دشمن کی بدگوئی کام نہ کرے گی۔
غالب بھی اس مضمون کو باندھتا ہے۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وہ کہتا ہے یہی نہیں کہ وہ دشمن کی بات میری بابت نہیں سنے گا، بلکہ شاید اس سے ناراض ہو کر اسے بھی نکلوا دے اور ہمیشہ کیلئے اس کی بات بگڑ جائے وہ مردود بارگاہ ہو جائے، اسی مضمون کو ذرا بدل کر غالب کیا خوب کہتا ہے۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تجھ سے
وگرنہ خوف بد آموزیِ عدو کیا ہے

میلی:- از بزم ناز آمدن من بروں رود ۔۔۔ برخواست وگرم گردن جا را بہانہ ساخت
معشوق کی انتہائی شوخی کا ذکر ہے، ادھر میں ان کی محفل میں گیا وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے اپنی جگہ دینے کا بہانہ کرکے چلتا ہوا۔ اب بھلا

عاشق کی حالت کا اندازہ کیجیئے کہ جسکی محفل میں آئے وہی اس کے آنے سے چلتا ہوا۔ سب کی نظروں میں اور آپ اپنی نظروں میں اسکا کیا عالم ہوگا مومن کی بزلہ سنجی ملاحظہ ہو۔ آتے ہی مرے نام کے محفل سے اُٹھے وہ بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو۔

وہ اپنے معشوق کی انتہائی تذلیل کو اس کی انتہائی تعظیم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہاں پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مومن کی طبیعت میں میلی کے مجبوب سے بھی کچھ زیادہ شوخی تھی کہتا ہے "اس بدنامی پر بھی میرے نام کی عزت تو دیکھو کہ اسے سن کر وہ سروقد تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا تاویل ہے محبوب تو غصہ سے بیتاب ہو کر اُٹھتا ہے، یہ کہتے ہیں تعظیم کو کھڑا ہوا"

با وجودیکہ میرسم آلودہ گیشوم از دور
ندیدہ حالِ مرا وقتِ بیقراری حیف

جب اس تک پہونچتا ہوں اُسے دور ہی سے دیکھکر آسودہ خاطر اور مطمئن ہو جاتا ہوں، ہائے اس نے میری بیقراری کا حال تو کبھی دیکھا ہی نہیں محبوب کو دیکھ کر اپنا کرب و اضطراب یکسر فراموش کر دینا اور اس کا عاشق کی پریشان حالی سے ہمیشہ بے خبر رہنا۔ کس قدر حسرت خیز ہے۔ مجبوریٔ عشق اور ناکامی محبت کی ترجمانی اس سے بہتر پیرایہ میں کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن غالب نے کہا اور کچھ بڑھ کر کہا ؎

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

محبوب کو دیکھ کر عاشق کی پریشانی و بیچینی کا معدوم ہو جانا اور بات ہے اور دیدار یار سے مریض کے چہرہ پر صحت کا خون دوڑ جانا اور پھر غالب کے شعر میں جس قیامت کا اثر ہے فارسی میں نام کو نہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ فارسی شاعر نے اپنی مصیبت اور درد دل کا اظہار کر دیا۔ اُس نے کہدیا کہ ہائے انھوں نے میری بیقراری کا عالم تو دیکھا ہی نہیں اور غالب نے اتنے ٹکڑے کو محذوف کر دیا صرف اپنی بدلتی ہوئی حالت اور معشوق کی غلط فہمی کا ذکر کر دیا، غیرتِ ناکامی دیکھئے، یہ نہیں بتایا کہ ان کی غلط فہمی سے بیمار کے دل پر کیا گذر گئی اور اس نکتہ میں تاثیر کا راز پنہاں ہے، یہی غیرت و خودداری ہے جو سننے والے کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی ہے۔ کسی فارسی اُستاد کا شعر ہے کہ ؎

ہلالے کہ بر آسماں جائے اوست
تراشیدۂ ناخنِ پائے اوست

اُردو میں ایک عورت نے اسی مضمون کو کہا اور اس حسن سے کہ اس میں چار چاند لگا دیئے۔

تمہارے پاؤں کے ناخن کی ہمسری نہ ہوئی ہلال لاکھ سرِ آسماں بنا بگڑا

اس میں شک نہیں کہ اردو شعر سے فارسی شعر کو وہی نسبت ہے جو شاعرانہ مبالغہ نکالکر ماہِ نو سے ناخنِ پا کو ہو سکتی ہے۔ وہاں صرف ناخن کو ہلال سے تشبیہ دیگئی تھی یہاں چاند کی ان متواتر کوششوں کا نقشہ کھینچ جاتا ہے جو اس نے معشوق کے ناخن کی ہمسری کرنے کے لئے کیں۔ پہلے تو کٹے ہوئے ناخن کی ہمسری کرنے کے لئے ہلال بنا، جب ناکامی ہوئی تو روز بروز اپنے سینے کو کشادہ کرتا گیا اور کسی کے ناخنِ پا سے تقابل کرتا رہا کسی طرح اطمینان نہ ہوا، یہاں تک کہ بدر بن گیا پھر بھی ناکام ہی رہا، کسی کے ناخنِ پا کی رنگینی و دلآویزی نہ آسکی پھر اس نے اپنا جسم تحلیل کرنا یا یوں کہیئے اپنے تئیں غم ناکامی میں گھلانا شروع کیا اور ہلال کی حد تک آ گیا، پھر ہمت باندھی اور یہی عمل دہرایا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ لاکھ بار نہیں دہرایا، یہاں تک کہ چاند کی ساری زندگی ناکام کوششوں کا ایک عبرتناک سلسلہ بن کر رہ گئی ہے" ہلال لاکھ سرِ آسماں بنا بگڑا۔ مصرع نے چاند کی دیوی کو مجسم کر کے پیشِ نظر کر دیا، معلوم ہوتا ہے کوئی خود آرا و خود نگر سو سو طرح سے اپنے حسن میں اضافہ کی کوشش کر رہا ہے، بن بن کر سنور سنور کر اپنے تئیں دیکھتا ہے اور جز بز ہو کر رہ جاتا ہے۔

شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بیساختگی اطلنے مبالغے کا زور گھٹا دیا۔ شعر پڑھیئے اور آپ کو محسوس تک نہ ہوگا کہ اس میں کوئی تصنع آمیز

بات کہی گئی ہے۔ حسنِ تعلیل کی اس سے بہتر اور کامیاب مثال شاید ہی مل سکے پہلا مصرعہ ایسا ہے جو ازاوّل تا آخر محاورے میں ڈھلا ہوا ہے۔ بلکہ خود محاورہ ہوجانے کے قابل ہے جس سے ضمناً یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ چاند جب تمھارے ناخن پا کی ہمسری نہ کرسکا تو تم تو بڑی چیز ہو۔ ایک اور تقابل پیش کرتا ہوں اور اسی پر ختم ہے

حافظ — مجلسِ وعظ دراز است و زماں خواہد شد — گر زمسجد بخرابات روم خوردہ مگیر

قائم — مجلسِ وعظ تو تا دیر۔ رہے گی قائم — یہ ہے میخانہ ، ابھی پی کے چلے آتے ہیں

وہ رنگینی و لطافت، دلکشی و دلاویزی، تاثیر و معنویت اور شوخی و برجستگی جو قائم کے یہاں قائم اور حافظ کے یہاں غائب ہے ممنونِ بیان نہیں ہوسکتی، پہلا شعر مجلسِ وعظ کی طرح بے کیف ہے اور دوسرا محفلِ رندوں کی طرح بارونق (!؟! حیرت!)

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

اوپر کی مثالوں سے ایک حد تک واضح ہوگیا ہوگا کہ اردو شعراء نے فارسی اساتذہ کی کورانہ تقلید کی ہے یا اپنے لئے الگ راہیں تلاش کی ہیں، اعتراض کرنے والے اگر دونوں زبانوں کی شاعری کا مطالعہ نظرِ تحقیق سے کریں تو یہ حقیقت روشن ہوئے بغیر نہ رہے کہ اردو شعراء نے اپنی شاعری کو فارسی کا دست نگر اور منت کش نہیں بنایا ہے۔ انھوں نے جو کچھ خود محسوس کیا وہی کہا ہے۔ اور جس طرح دو آدمیوں کی صورتیں قطعی ایک سی نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح کوئی دو آدمی کسی ——————— جذبے سے ایک طرح متاثر نہیں ہوسکتے۔ افسوس ہے کہ دیگر اقوام تو اپنی شاعری کو معراجِ ترقی و شہرت پر پہونچا دینا چاہتی ہیں لیکن ہمارے یہاں اُن افراد کی کمی نہیں جو اپنی زبان و اسکی شاعری کو اپنی ناواقفیت اور غلط فہمیوں سے ہدفِ اعتراضات بناکر اُسے پستی و قعرِ گمنامی کیطرف لیجانا چاہتے ہیں۔ مبالغہ کا شائبہ بھی نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اردو نے اپنی مختصر حیات میں وہ ترقی کی ہے اور وہ شاعری دنیا کے سامنے پیش کی ہے جو کسی ملک و قوم کی شاعری کے مقابلے میں لائی جاسکتی ہے اور ہیٹی نہیں ثابت ہوگی۔

---

[1] مضمون کے آخر میں عسکری صاحب نے خوب خوب دادِ تشریح و تحقیق دی ہے اس سے ان کی انتقادی قابلیت اور وسعتِ نظر ہونے کا ثبوت ملتا ہے، یقیناً یہ کہنا ظلم ہوگا کہ اردو شاعری میں کچھ گرہ کا نہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اوّل اوّل اردو شاعری فارسی ہی سے متاثر ہوئی اور اس میں جو خیالات اور جو مضامین آئے وہ فارسی سے مستعار لئے گئے لیکن بہرحال تقلید کا انجام اجتہاد ہے۔ جیسے جیسے اردو شاعری میں اعتمادِ فکر اور آفاقی اثرات سے متاثر ہونے کی اہلیت پیدا ہوتی گئی، اردو شاعری سے تقلیدی عناصر کم ہوتے گئے اور اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اردو شاعری فارسی کی اسقدر رہینِ منت ہے۔ نئے اسالیب اور نئی زبان کی نئی شاعری تو قدامت و تقلید کے خلاف ایک زبردست اعلان ہے، یہ اردو شاعری کی انفرادیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ ابھی اس نقش میں کتنے رنگ پیدا نہیں ہوں گے، اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ آگے چل کر یہ دلہن کتنے زیورات سے آراستہ ہوگی۔

ساغر نظامی

تین خواب

"ماضی"

اے ماضیِ معدوم، مرے ماضیِ معدوم (۱) معدوم، مگر اے مرے گہوارۂ معصوم

آ حال کے ایوان میں اک آن کو دم لے ڈر ہے کہ تری یاد بھی ہو جائے نہ موہوم

کیا یاد نہیں تجھ کو وہ ابوابِ فسانہ!؟ جب لفظِ تمنّا میں نہ معنی تھے نہ مفہوم

مجبور سا مجبور نہ آزاد نہ قیدی آزاد سا آزاد، نہ مجبور نہ مظلوم

ہر لفظ میں اک گیت تو ہر گیت میں اک گت بے قید وہ اشعار نہ منثور نہ منظوم

چھوتے ہوئے جب مجھ کو لرزتی تھی جوانی کیا یاد ہے تجھ کو وہ مرا عالمِ معصوم

وہ عالمِ معصوم، وہ فردوس کا سپنا سرشار نہ بے کیف، نہ مسرور نہ مغموم

وہ رخ پہ مرے کاکلِ زرّینِ پریشاں وہ لب پہ مرے موجۂ رنگینیِ معصوم

وہ چشمِ مستانہ، وہ جاوید شرابی آنکھوں میں وہ ڈورے، وہ مری مستیِ مرقوم

وہ ابروئے خمدار، کماں تانے ہوئے سے
وہ گیسوئے پُر پیچ یونہی بکھرے ہوئے سے

سرشار وہ بام و در و گلزار و بیاباں — گل چاک گریباں، چمن آغوش بداماں

وہ رنگ جسے دیکھ کے کندن بھی ہو نادم — وہ نور کہ جھک جائے سرِ مہرِ درخشاں

مہکا ہوا وہ پیکرِ رنگین و معطر — دمکا ہوا وہ قامتِ گلزار بداماں

وہ چمپئی رُخ، اُس پہ پسینے کی وہ بوندیں — وہ گوہرِ رخشاں، وہ مرا جوہرِ عریاں

شبنم کے وہ قطرات وہ پارے کی سی ٹکڑے — پتوں پہ کنول کے کبھی قائم کبھی لرزاں

ہونٹوں میں وہ برسات کی بجلی کا خزانہ — آنکھوں میں شبِ ماہ کا وہ موسمِ خنداں

ہر وقت وہ ہونٹوں میں تبسم ہی تبسم — جیسے ہو چمن زار میں جگنو سی چراغاں

رہ رہ کے تبسم میں ترنم ہی ترنم — ہالو[1] ہو چناروں میں کوئی جیسے غزلخواں

گاتی ہوئی وہ مد بھری آنکھوں کی سیاہی — آفاق میں جیسے کوئی شاما ہو غزلخواں

بوٹا سا وہ قد، آہ وہ اک شمع فروزاں — پرتو سے در و بام پہ ہوتا تھا چراغاں

ہنستی ہوئی بجلی وہ چمکتی ہوئی بجلی — گلشن میں چراغاں کبھی صحرا میں چراغاں

آواز وہ آواز کہ ہر ساز سے آزاد — خود نغمہ و خود بربط و خود سازِ غزلخواں

معصوم وہ وارفتگیِ حسن کا عالم — دامن کا نہ کچھ ہوش، نہ احساسِ گریباں

اللہ رے مری فطرتِ مجنوں کا وہ بچپن — کانٹے کبھی دامن میں تو کانٹوں میں گریباں

---

[1] وادیِ کشمیر کا ایک مغنی کیڑا جو چنار کے درختوں میں ہر وقت گاتا رہتا ہے۔ — ساغر

وہ چال کہ دورِ مے و ساغر بھی خجل تھا — وہ حال کہ بدمست تھا میخانۂ امکاں
اِک سلسلۂ لغزشِ مستانۂ پیہم — ہر گام پہ جنبش میں خمستاں کا خمستاں
کیونکر ہو تصوّر مجھے نازک کمری کا
جھونکا تھا تخیّل میں نسیمِ سحری کا

سومنہ[1]

وہ سومنہ اور سومنہ کی مست فضائیں — وہ کھیت وہ میدان وہ سرشار گھٹائیں
"وہ باغ میں انگریز کی افواج کے ڈیرے[2] — بندوق لئے جھیل کے اطراف میں پھیرے
وہ پٹیاں، وہ وردیاں، وہ پرچم جنگی — الجھی ہوئی ہر شاخ سے آوازِ فرنگی
وہ بدکے ہوئے بیل وہ سہما ہوا دہقاں — اور سایہ میں کیکر کے وہ اک طفلِ پریشاں
وہ خوفزدہ کھیت میں معصوم دلاری — آنکھوں میں لرزتی ہوئی کاجل کی دھاری
وہ پیچ و خمِ راہ میں رہگیر گریزاں — وہ سمٹے ہوئے خوف سے ذرات پریشاں
وہ شاہرہ عام پہ ٹھٹکے ہوئے آمی — چہروں پہ وہ تاریکیِ ایقانِ غلامی"

---

[1] گہوارۂ طفلی شاہراہ اعظم پر ضلع علی گڑھ کا ایک چھوٹا سا گاؤں

[2] جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزی فوج ہندوستان میں بہت کم رہ گئی تھی۔ عسکری تشہیر کے طور پر حکومت ہندوستانیوں کو مرعوب کرنے اور اپنی عسکری طاقت کے مظاہرہ کے طور پر اس باقی فوج کو ہندوستان کے دیہاتوں میں گھما رہی تھی۔ سومنہ شاہراہ اعظم پر ایک گاؤں ہے مجھے فخر ہے کہ اس کے ایک دیہاتی مکان میں میرا بچپن گذرا ہے اور اس کے سرسبز و شاداب میدانوں میں میں نے زندگی کا بہترین موسم گذارا ہے، سومنہ میں بھی فوجوں کا پڑاؤ ہوتا تھا۔ یہ بند اسی عہد و منظر سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ان کو دیکھ کر جو اثر میرے دل پر پڑا تھا اسکو میں نے اس بند میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے

ساغر

"وہ جھیل پہ بندوق کے چلنے کا دھماکہ — وہ چرخ سے مرغابیٔ مجروح کا گرنا

ہر لمحہ وہ ہر روح پہ اک ضربِ غلامی — ہر آن وہ صد وسوسۂ قلبِ غلامی

وہ شور اٹھا گاؤں پہ آئی وہ تباہی — وہ آئے سپاہی ارے وہ آئے سپاہی

اس شور پہ گھر سے مرا گھبرا کے نکلنا — قبضے سے بنواجی کے وہ بل کھا کے نکلنا

وہ قلبِ عساکر میں مرا جان کے جانا — خال و خطِ آفات کو پہچان کے جانا

اللہ رے مرے جذبۂ آزادی کی طفلی — چینی کے کھلونے نظر آتے تھے فرنگی

بیباک تھا کس درجہ مرا ذوقِ تماشا

جنگل تھا مجھے آئینۂ شوقِ تماشا" ______!

وہ سومنہ، وہ سومنہ کی مست فضائیں — وہ کھیت، وہ میدان، وہ سرشار گھٹائیں

وہ مور کی چیخ اور وہ گھنگور گھٹائیں — وہ معبدِ فطرت کے پجاری کی صدائیں

جھاڑی میں وہ شاما کے ترنّم کا تلاطم — رقاصۂ فطرت کے وہ گھنگرو کی صدائیں

کوئل کی وہ کوک اور پپیہے کی وہ پیہو — اک جانِ حزیں اُس پہ بلاؤں پہ بلائیں

وہ جھونپڑوں سے پھونس کے چکّی کا ترنّم — جھیلوں کے کنارے وہ ٹٹیری کی نوائیں

بیلوں کے گلے اور وہ بجتی ہوئی گھنٹی — کاندھوں پہ وہ ہل اور وہ کسانوں کی صدائیں

ٹھہرے ہوئے پانی میں وہ چڑیوں کا نہانا — چھائے ہوئے کہرے میں وہ ٹھٹھری ہوئی گائیں

وہ مسکنِ جمیا وہ مرا مامنِ طفلی — ڈھلتی تھی جہاں حسن و محبت کی ادائیں

وہ گھر میں جمعہ[1] کے کبھی آنکھ مچولی — چمپا[2] کے مکاں پر وہ کبھی پریم سبھائیں

[1] گاؤں کا ایک لڑکا ہم جماعت [2] ہم سایہ لڑکی

وہ چاروں طرف کنواریوں کا مجمعِ رنگیں — دوشیزہ جوانی کبھی دائیں کبھی بائیں

چمپا کا تقاضہ کہ اُجالا ہے ابھی تو — کچھ پھول سِرس کے چلو ہم بین کے لائیں

چوٹی پہ سرس کے جو یہ تارے سے ہیں روشن — یہ پھول بھی ملجائیں تو اک ہار بنائیں

وہ ہار جو دنیا میں نہ گوندھا ہو کسی نے — وہ ہار جو گندھ جائے تو پھر تم پہ چڑھائیں

سایہ میں سرس کے وہ مجھے بھینچ کے کہنا — اسوقت گلے ملکے کوئی گیت ہی گائیں

بالوں کی لٹیں چوم کے وہ چومنا اس کا — اور جھوم کے لینا وہ مرے سر کی بلائیں

پھر شام کے پردے سے وہ تاروں کی گذارش — گر ہم کو اجازت ہو تو ہم بھی چلے آئیں

پھر چاند سے رہ رہ کے شعاعوں کی سفارش — اس نسل کو ہم نور کی دنیا میں بسائیں

اس عمر کے انساں کو کریں دائم و قائم — اس عمر کے آدم کو خدا اپنا بنائیں

وہ چاند وہ گلبار سرس اور وہ ستارے
وہ ریت میں معصوم محبت کے اشارے

ساغر

۶۴

یہ میری ایک طویل نظم کے ابتدائی بند ہیں [illegible]
[illegible]
[illegible] چمپا [illegible] اور سرس [illegible]
[illegible] حقیقی [illegible] دنیا [illegible]
[illegible]

لارڈ کلائیو کے سیاہ کارنامے

ہندوستان پر برطانی تسلّط کی کہانی کا ایک ابتدائی بکرُودہ ورق

(ازسید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی)

" مغرب مشرق پر اور انگلستان ہندوستان پر کس طرح غالب ہوا؟ یہ سوال جب مغربیوں سے کیا جاتا ہے ——— تو وہ مشرق کی داخلی وسیاسی کمزوریوں کا سہارا لیکر اپنی تہذیب اور سیاسی اہلیت کا ڈھول پیٹتے ہیں گویا مشرق اسکا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسکو یوروپی سیاسین اور حکمائے مغرب اپنی آغوش عافیت میں لے کر زندہ رہنے کے قابل بنادیں اور یورپ اسکا واحد اجارہ دار ہے کہ وہ مشرق کے ہر ملک کو منظّم کرے اور مہذّب بنائے ———

——— مگر تاریخ کے دبے ہوئے گوشوں کو اگر کھولا جائے اور پوشیدہ اوراق کا تجزیہ کیا جائے تو ہم کو حقیقت معلوم ہوسکتی ہے ۔ کہ یوروپ کے اقتدار و ترقی کے بانیوں نے کس کس طرح مشرق پر اپنا تسلط قائم کیا اور اس عہد میں انسانیت اور صداقت کو کسطرح کند چھری سے ذبح کیا گیا

سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی نے جنکی بلند ذوقی، خوش مذاقی اور علمی ادبی حیثیت محتاج تعارف نہیں (کہ ہمیشہ تعارف ان کا محتاج رہتا ہے) ٦٥ یہ مضمون تحریر فرما کر ایک راز سربستہ کو عریاں کیا ہے یقیناً یہ تاریخی ادب کی ایک بڑی خدمت ہے، ایشیا اور سید محمد یحییٰ صاحب کا سمبندھ ایسا نہیں ہے کہ تعلق کی عصمت کو شکریہ ادا کر کے مجروح کیا جائے ۔ ان کا شکریہ ادا کرنا بھی ہم ایک نوع کی خودستائی تصور کرتے ہیں ۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو   کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

❋

ساغر

وائے بر سادگی ما کہ فسونش خوردیم

رہزنے بود کمیں کرد و رہِ آدم زد

فضائے بسیط میں جو آوازیں محفوظ ہیں اگر انھیں انسانی اختراع کا کوئی عمل آج گویا بناسکے تو تاریخ کے بہت سے مسلمات جن پر قرنیں

فخر کرتی رہتی ہیں نہ صرف مسلمات کے درجہ سے گرا دیئے جائیں بلکہ بہت سے "ایماندار" خائن، اور بہت سے بہادر بزدل ثابت ہوں گے۔
قوم پرست اور وطن پرور مؤرخین نے اپنے اپنے قومی ابطال کے چہروں پر جو نقاب ڈال دیا ہے اس سے دنیا عجیب و غریب مغالطوں میں پھنس گئی ہے۔
چنانچہ ہر اس انسان کو زبردست شخصیت تسلیم کر لیا جاتا ہے جس نے کسی نہ کسی طرح کامیابی حاصل کر لی ہو اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی انسان
کو ہیرو تسلیم کرنے سے قبل اس کے کیرکٹر کی چھان بین کی جائے یا ان ذرائع اور وسائل کو تلاش کیا جائے جو اس کی کامیابی میں ممد و معاون ہوئے۔
بہر طور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مؤرخین کے ایک زبردست گروہ نے صحیح حالات اور حقیقی واقعات کی پردہ پوشی اس طرح کی ہے گویا یہ ان کا
قومی اور وطنی فرض تھا۔ خصوصاً ہندوستان کے آخری دور کی تاریخ کی تدوین جن اصولوں پر کی گئی ہے وہ ہرگز اس فلسفۂ تاریخ سے دور کی بھی
مناسبت نہیں رکھتے جن کا پیش نظر رکھنا ہر دیانت دار مؤرخ کیلئے ضروری ہے، ہندوستان کی تاریخ میں انگریز مؤرخین نے سیاسی مصلحتوں کو مدِ نظر
رکھ کر جو کتر بیونت کی ہے اس کا ایک اہم نتیجہ تو یہ ہے کہ اس ملک کی دو زبردست قوموں میں کسی نوعیت سے بھی مفادِ مشترکہ اور وحدتِ قومی کا خیال
مؤثر طریق پر جاں گزیں ہونے کیلئے تیار نہیں معلوم ہوتا۔ ہر چند کہ بعض محققین نے بارہا اس قسم کی کوششیں کی ہیں کہ ان تاریخی مغالطوں اور
ماضی کے بے بنیاد فسانوں کو قوم کے دل و دماغ سے خارج کر دیں لیکن جب ہر نسل کے بعد دیگرے دورِ تعلیم کے مختلف مدارج میں سیاسی مؤرخین
کی کتابوں کو رٹ لینے اور یقین کر لینے پر مجبور کی جائیگی تو ظاہر ہے کہ کسی محقق کی تحقیق اور کسی ایماندار نقادِ تاریخ کا تبصرہ اول تو اس تک پہونچیگا نہیں
اور پہونچ بھی گیا تو عہدِ طالب علمی کے پختہ یقین میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

ہندوستان میں برطانی تسلط قائم کرنے والے چار اشخاص تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لارڈ کلائیو بانیٔ اول جس نے برطانی اثر و اقتدار کو تمام
مشرقی ساحل پر مدراس سے لیکر کلکتہ تک قائم کیا، دوسرے اور تیسرے نمبر پر "ولزلی" اور لارڈ ہیسٹنگز "کے نام آتے ہیں۔ انھوں نے مرہٹہ قوت
کو پاش پاش کر دیا اور ہندوستان کے وسطی حصے و نیز جزیرہ نمائے دکن کے مغربی ساحل کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں کیا، چوتھا ورلارڈ ڈلہوزی
کے نام سے مشہور ہے، اس گورنر جنرل نے نہ صرف گذشتہ فتوحات کو منظم اور منضبط ہی کیا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات کی وسعت کو دریائے سندھ
کے ساحل تک پھیلا دیا۔

دیکھنا یہ ہے کہ انگریز مؤرخین کا یہ دعویٰ کس حد تک صحیح ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی محض ایک تجارتی ادارہ تھا اور اس کے وہم و گمان میں بھی
ہندوستان کا فتح کرنا نہ تھا۔ ممکن ہے کہ سنہ ۱۶۰۰ء سے لیکر مغل بادشاہی کے انحطاط تک انگریزوں کی پالیسی محض تجارتی سرگرمیوں تک محدود
بھی ہو اگرچہ تاریخی شہادتیں اس قسم کی موجود ہیں کہ عین اس وقت جبکہ سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب نصف النہار پر تھا، بعض سر پھرے انگریز تاجروں
نے سرزمین ہندوستان پر اپنا قبضہ اور ملکیت قائم کرنے کیلئے بارہا ناکام کوششیں کیں لیکن مغلوں کی زبردست قوت کے مقابلہ میں کچھ پیش نہ چلی
جونہی مغلوں کا چراغ ٹمٹمانا شروع ہوا کہ ان بدیشی سوداگروں نے بھی یکایک تاجرانہ چولا اتار کر پھینک دیا اور ملکی سیاسیات میں علانیہ اور خفیہ حصہ
لینے لگے۔ فرانسیسی اثر و نفوذ کو ملیامیٹ کرنے کے بہانے سے انگریزوں نے ملکی ریاستوں میں جس طرح نفاق کا بیج بو دیا وہ صحیح تاریخ کے صفحات
پر ہمیشہ ثبت رہیگا، بنگال میں نواب سراج الدولہ کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا محض تاجرانہ سرگرمیوں کے نام سے منسوب نہیں کیا جا سکتا
اسی طرح باوجود اس ادعا کے ڈائرکٹران کمپنی مداخلت کی پالیسی کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے اس زمانہ کی سیاست کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ملیگا،
جہاں انگریزوں نے بنیادی طور پر ممالکِ ہند پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ لیکن انگریز مؤرخین کا قلم اس خلافِ حقیقت واقعہ کو بار بار
دہراتا رہتا ہے۔ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے صرف اپنی فیکٹریوں کی محافظت میں ہتھیار اٹھائے۔ حالانکہ دکن کی آویزشیں بہ بانگِ دہل اس حقیقت
کو واضح کرتی ہیں کہ آرکاٹ کا محاصرہ، نواب محمد علی کی حمایت اور نظام حیدرآباد سے ساز باز اس تحریک جوع الارضی کی صدائے بازگشت تھی۔
جسمیں یورپین قومیں خصوصاً انگریز اور فرانسیسی اٹھارہویں صدی کے نصف کے بعد از سرتا پا منہمک ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب یورپ

میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مابین جنگ چھڑی، اس کے شعلے ہندوستان تک پہونچے اور یہاں کے امن و عافیت کو جلا کر خاک کر دیا۔ حقیقتاً یوروپین اقوام کی استعماری پالیسی تاریخ کے ان خونچکاں شہادتوں میں کارفرما تھی " توسیع انگلستان " پر ایک انگریز نقاد جے۔ آر۔ سیلے رقمطراز ہے

" یہ بیان جو اکثر پیش کیا جاتا ہے، اور جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کا بعجلت مطالعہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ برطانی سلطنت محض سوداگری کی اندھا دھند توسیع کا نتیجہ ہے اتنا ہی غلط ثابت ہوا ہے جتنا یہ بیان کہ ہماری سلطنت بے دریغ جارحانہ عسکریت کا حاصل ہے "

" برطانی ہند کے اس انقلابی اور مجرمانہ دور میں (یعنی جب سلطنت کی بنا رکھی جا رہی تھی) اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے قدم محض لوٹ کھسوٹ کے جذبات کی بنا پر آگے کی طرف اٹھے تھے۔ اودھ، روہیلکھنڈ اور بنارس میں وارن ہیسٹنگز کی ظالمانہ کارستانیاں محض دولت جمع کرنے کی خاطر عمل میں آئیں۔ اگر برطانی ہند کی تاریخ مابعد بھی اسی نوعیت کی ہوتی تو بجا طور پر اس کی تشبیہ " پیرو " اور " ہسپانیولا " میں ہسپانوی سلطنت سے دی جا سکتی تھی اور کہا جا سکتا تھا کہ ہماری سلطنت کلیتاً حصول دولت کی وجہ سے ظہور میں آئی ہے "

آگے چلکر یہی مورخ پھر لکھتا ہے :۔

" لارڈ ولزلی نے الحاق اور مداخلت کی پالیسی کو پہلے پہل نافذ کیا، اسی نظریہ کو لارڈ ہسٹنگز نے اختیار کیا، اگرچہ وہ گورنر جنرل کے عہدہ پر مامور ہونے سے قبل اس کا مخالف تھا۔ کچھ عرصہ بعد کمپنی کے آخری گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے تشدد اور تعصب کے ساتھ اسی حکمت عملی کو جاری رکھا۔ . . . کمپنی نے لارڈ ولزلی کے نظریہ کی مخالفت کی۔ لارڈ ہیسٹنگز کو اس کی پالیسی پر قابل ملامت ٹھہرایا۔ یہ نظریہ (الحاق و مداخلت) اکثر شدید سخت گیری کے ساتھ عمل میں لایا گیا، لارڈ ڈلہوزی تاریخ میں فریڈرک اعظم سے مشابہت رکھتا ہے اور اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں جنھیں حق بجانب ثابت کرنا اتنا ہی دشوار ہے جسقدر فریڈرک اعظم کے اس تسلط کو جو اس نے سیلیشیا میں حاصل کیا یا جو طرز عمل تقسیم پولینڈ میں اس نے اختیار کیا، لیکن یہ تمام اعمال گو بعض جرائم کہا جائے تو ہوا و ہوس کے جرائم کہنا ہوگا لیکن ایسی ہوا و ہوس جس میں خود غرضی شامل نہ تھی۔ نہ ڈلہوزی کے متعلق اور نہ کسی اور بڑے گورنر جنرل کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی یہ شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ذلیل قسم کی خونخواری کے مرتکب ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سلطنت ہند کی بنیاد اگرچہ تجارت سے پڑی اور اس کے نتائج میں ایک چیز ہماری عظیم تجارت بھی ہے۔ تاہم اس کا خاکہ نہ تو سوداگروں نے کھینچا تھا اور نہ اس کی غرض و غایت تجارت تھی "

مندرجہ بالا اقتباسات دنیز ان تاریخوں سے جو تنقیدی شان رکھتی ہیں پہلی بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ سلطنت ہند کا ظہور و قیام کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا بلکہ انگریز قوم کی آمد کے ایک صدی بعد ہی سے مدبرین برطانیہ نے ہندوستان کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ چنانچہ باوجودیکہ سوداگران کمپنی ہمیشہ الحاق و مداخلت کی پالیسی کی مخالفت کرتے رہے لیکن اسی کمپنی کے گورنر جنرل بڑی دلیری کے ساتھ یکے بعد دیگرے مغلیہ سلطنت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو شاہ انگلستان کے زیر فرمان مجتمع کرنے میں بے دریغ چالاکیوں، عیاریوں اور ظلم و تعدی کو اپنا لائحہ عمل بنائے رہے، دوسری بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستان میں برطانوی مفاد کو ترقی دینے میں اور قیام سلطنت کی خاطر ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل صاحبان نے ڈائرکٹران کمپنی کے علی الرغم ہر اس ذریعہ کو جائز سمجھا جو ان کی استعماری پالیسی کو کامیاب بنا سکتا تھا اور اگرچہ انگریزی تاریخوں میں یہ ڈھونگ رچایا گیا ہے کہ جن گورنر جنرل صاحبان نے ہندوستان میں جا و بیجا مظالم کئے اس کا مواخذہ قوم انگریز نے بڑی غیر جانبداری کیساتھ کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں لارڈ کلائیو سے لے کر ڈلہوزی تک جو جو جگر خراش مظالم اور جیسی جیسی شرمناک عیاریاں تاریخ کے صفحات سے اخذ کی جا سکتی ہیں، ان کی پردہ پوشی نہ صرف مورخین کے قلم ہی سے عمل میں آئی ہے بلکہ مدبرین سیاست اور عدالت کے ججوں کی سیر چشمی کو بھی اس میں کافی دخل ہے۔ وارن ہیسٹنگز کا تاریخی مقدمہ اس بیان کی ناقابل تردید شہادت ہے، برک اور شیریڈن جیسے فخر زمانہ خطیبوں کی وکالت، بیگمات اودھ کی تباہ حالی کی فریاد پر قوم برطانیہ کی سب سے اعلیٰ عدالت کو متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہوئی، یہ وہ قوم تھی اور اس قوم کے فاضل جج صاحبان تھے جو عورت کی تعظیم و احترام کو اپنا جزو ایمان سمجھتے تھے لیکن ان کی رگ حمیت کو ایشیا کی بیکس خواتین کی سچی داستان

مظلومی حرکت میں لانے سے بالکل قاصر رہی۔ اس قسم کی نسلی عصبیت اور قومی امتیاز تاریخ برطانیہ کے ہر صفحہ سے نمایاں ہے۔

برطانی ہند کی تاریخ کا بانیٔ اول لارڈ کلائیو سمجھا جاتا ہے۔ ۱۷۴۴ء کے اختتام پر وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں بحیثیت محرر داخل ہوا۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ اس شخص کا عہدِ طفولیت جن لغویات اور حشر سامانیوں میں گذرا اس کا اندازہ صرف اس چیز سے ہو سکتا ہے کہ لارڈ کلائیو طالب علمی کے زمانہ میں نہایت رکیک الحرکات اور اعلیٰ درجہ کا شیطان لڑکا تھا، اس کے اُستاد اس کی شرارتوں سے کانپتے تھے۔ مدرسہ میں جہاں کہیں دنگا فساد ہوتا کلائیو کا ہاتھ۔۔۔۔ اسمیں ضرور شامل ہوتا تھا، زیادہ تر تنازعات کا بانی اور سرغنہ خود کلائیو ہی ہوتا تھا، یقیناً ایسا شخص ہر کام میں دلیر ہوتا ہے لارڈ کلائیو عہدِ طفلی سے ہی دلیر اور آزاد طبع واقع ہوا تھا، اسکی سیرۃ کی ممتاز خصوصیات دو ہی تھیں۔ اول دلیری اور جرأت دوسرے نافرمانبردار طبیعت ضمیر اور اسکی صلاح کاریوں سے کلائیو نے کبھی تعلق نہ رکھا، اس کی فرہنگ میں اس لفظ کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ بالفاظِ دیگر کلائیو ایک خود رو شخصیت تھی جس کے غیر تربیت یافتہ قویٰ اور ناتراشیدہ دل و دماغ میں حیوانیت کے عناصر بوجہ اتم موجود تھے، حرص و ہوا، عیاری و چابکدستی، بےخوفی و جرأت اور سب سے زیادہ انانیت اس کی عملی زندگی کے ہر گوشہ سے جھلکتی ہے، ایسے فطری رجحانات کا انسان یقیناً برطانی سلطنت ہند کی خشتِ اوّل رکھنے کیلئے موزوں ترین شخص ہو سکتا تھا، اور اگر ہماری آنکھیں ان دلخراش واقعات کو دیکھتی ہیں جو اس دور غارتگری میں قدم قدم پر ملتے ہیں تو اس کا حقیقی سبب بتانے کے لئے صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ "تاجرانِ فرنگ" کے اس "معصوم قافلہ" کا میر کارواں رابرٹ کلائیو تھا۔

رہزنی را کہ نام کرد، جہانبانی گفت
ستمِ خواجگی او کمرِ بندہ شکست

بہرکیف اس طبیعت اور سیرۃ کا انسان سنہ ۱۷۴۴ء میں آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کا محرر بن کر ہندوستان کی کایا پلٹ کرنے کے لئے ساحلِ مدراس پر قدم رنجہ ہوا، مغلوں کی مرکزیت اورنگزیب کے انتقال کے بعد ہی سے روبہ تنزل تھی۔ مرہٹوں اور صوبائی حاکموں نے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد پہلے ہی سے تعمیر کر لی تھی۔ مغربی اقوام کی تاخت و تاراج کیلئے میدان بالکل خالی تھا۔ لیکن یہ تاخت و تاراج عسکریت اور قوائے جسمانی کے بل بوتے پر اتنی نہ تھی جسقدر قوائے دماغی اور فطرتِ مغربی کو اس میں دخل تھا، رومۃ الکبریٰ کا زرّیں اصول "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" اقوام مغربی کے صحیفۂ سیاست کی بنیادی آیتِ رہبری بن چکا تھا، اس ہتھیار کو لیکر سوداگروں کی کمپنی کا ایک معمولی محرر آگے بڑھا۔ بڑی بےجگری کے ساتھ آرکاٹ کے محاصرہ میں اپنے کمالات دکھائے، تنظیمِ افواج کی کمانداری کا سکہ اپنے ہمعصروں پر بٹھایا، ہر شخص کو یقین تھا کہ لارڈ کلائیو کے عزمِ مصمم کو مشتعل شعلوں کا متواج سمندر بھی روک نہیں سکتا، بنگال کی سرزمین پر امید کی ایک کرن عرصہ سے جھلملا رہی تھی، ہندوستان کے مضمحل قویٰ میں علی وردی خاں کا پوتا سراج الدولہ سب سے پہلے اس بدبختی سرجن کے نشتر کا شکار بننے کے لئے قدرت کی طرف سے انتخاب کیا جا چکا تھا، غالباً اس وقت اس صوبیدار کے دربار میں ہی سب سے زیادہ نمک حراموں کا جمگھٹ تھا، بہرکیف مغربی دماغ کی کاوش نے کال کوٹھری کا افسانہ تیار کیا۔ اٹھارہ فٹ مربع کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں ۱۴۵ مرد اور ایک عورت جسمیں افسران بھی تھے بے رحمی کے ساتھ ٹھونس دیئے گئے۔۔۔۔۔ اگر ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ اتنی تھوڑی سی جگہ میں ۱۴۵ لمبے چوڑے انگریز کیونکر سما سکتے تھے۔ تو اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ روایت میں درایت کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ انگریز مورخین کے مضحکہ خیز مسلّمات کا ایک نادر المثال نمونہ ہے، رابرٹ کلائیو اپنے تمام فطری اوصاف سے آراستہ اس عضوِ ضعیف کو کاٹ کر پھینکدینے کے لئے منتخب کیا گیا۔ سرزمین پلاسی پر پہلی اور مختتم جنگ لڑی گئی۔ میر جعفر اور اس کے ہمنوا سینکڑوں نمک حراموں نے کلائیو کے ہاتھوں کو مضبوط کر دیا تھا۔ امین چند کی دلالی کا واقعہ اور اس کا عبرتناک انجام طلبارِ تاریخ سے مخفی نہیں۔ سچ ہے جو اپنوں کا نہیں ہوتا اس پر بیگانے بھی اعتبار نہیں کرتے۔ کلائیو نے امین چند کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے متعلق ایک انگریز مورخ لکھتا ہے:

"اس دوران میں کلائیو نے جو دست درازیاں کیں ان کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسان تھا لیکن اسکی بعض بداعمالیاں

اتنی مکروہ تھیں کہ جن کی وجہ سے اس کی زندگی پر مستقل داغ لگ گیا۔ امیر البحر واٹسن کا نام اقرار نامہ پر خود لکھدینا ایسا جرم تھا جسکا مقابلہ اگر اس مقصد سے کیا جائے جس کی خاطر اس جرم کا ارتکاب کیا گیا تو کچھ زیادہ بھاری جرم نہ ہوگا۔ یعنی بنگالی امین چند کو دھوکا دینا یہ سچ ہے کہ امین چند ایک بدمعاش اور دھوکہ باز شخص تھا جو یہ کہا کرتا تھا "کہ مجھے جتنا روپیہ دو گے تمہاری میں تمہارے راز طشت از بام کردونگا" لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہ تھے کہ کلائیو ایسے شخص کا مقابلہ اسکے ہی ہتھیاروں سے کرتا۔ اور فریب کاری کی اس پستی تک اتر آتا جسمیں امین چند اور اس کے ہموطن یدطولیٰ رکھتے تھے۔ ایمانداری کے راستہ سے کلائیو کا الگ ہٹ جانا اس کا ذمہ دار غالباً وہ ماحول تھا جس میں وہ سانس لیتا تھا۔ لیکن یہ دھبہ باقی ہے۔ کسی قسم کی لیپا پوتی اسکو دور نہیں کرسکتی۔ اس کا اثر کلائیو پر اس زندگی میں بھی تھا اور آئندہ کبھی نہیں مٹیگا۔"

اس سے قطع نظر کہ امین چند کے ساتھ کلائیو کا سلوک افشائے راز کی دھمکی کی وجہ سے تھا یا محض اس روپیہ کو بچانے کیلئے جو امین چند کو حسب وعدہ دینا چاہئے تھا۔ یہ امر تو ظاہر ہوگیا کہ امین چند اور اس کے ہموطن اتنے جعلساز نہ تھے جتنا کہ خود کلائیو اور اس کے شرکار کار۔ حتیٰ کہ انگلستان کے وہ تمام ممبران پارلیمنٹ اور کمیٹی کے جج جن کے روبرو یہ واقعات پیش کئے گئے اور جنھوں نے کلائیو سے کسی قسم کا مؤاخذہ کرنے کی بجائے یہ سرٹیفکٹ اعطا فرمایا:۔

"لارڈ رابرٹ کلائیو نے اپنے ملک کی قابل قدر اور عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں" اس سرٹیفکٹ کے متعلق برطانی پارلیمنٹ کے ایک ماہر نے لکھا ہے "اس قسم کا ووٹ تقریباً برأت کے مترادف سمجھا جاسکتا ہے"۔ کم ازکم اس سے یہ تو یقینی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کلائیو کو مجرم ٹھہرانے کے لئے تیار نہ تھے، تمام مقدمہ اس فیصلہ کے بعد ختم ہوگیا اور اس کے بعد کلائیو کو پارلیمنٹ کی طرف سے کسی قسم کا حملہ کا خوف نہ رہا:

لیجئے تمام الزامات دُھل گئے، کلائیو کی ساری فریب کاریوں پر قومی خدمت کے صلہ میں پردہ ڈالدیا گیا گویا دوسروں پر ظلم کرنا اور ان کے مال متاع کو لوٹ کر غاصبانہ قبضہ کرنا عظیم الشان قومی خدمت ہے۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جبکہ پٹ جیسے ایماندار حکومت انگلستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے جنگ پلاسی نے ہندوستان کی قسمت خدا جانے کتنے نامعلوم عرصہ تک کے لئے قوم انگریز کے رحم وکرم پر چھوڑ دی۔ لیکن ان لوگوں کا حشر بھی قابل یادگار ہے جنھوں نے اپنے پُرانے آقاؤں سے بدعہدی کرکے کلائیو کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔ امین چند کا انجام تو معلوم ہی ہوگیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سازش کے سب سے بڑے مہرے یعنی میر جعفر کیساتھ کلائیو نے کیا سلوک کیا۔ سراج الدولہ کے قتل کے بعد صوبہ داری کے جلیل القدر منصب پر میر جعفر کلائیو کی مدد سے متمکن ہوا۔ لیکن ذرا بہ نظر غور اس قیمت کو بھی دیکھئے جو نئے تاجداروں کی دوستی اور قدیم حلیفوں سے نمکحرامی کرنے کے عوض میر جعفر کو ادا کرنی پڑی۔ سب سے پہلا کام جو جنگ پلاسی کے بعد میر جعفر نے کلائیو کے حکم سے انجام دیا۔ وہ۔ ان تمام خزائن پر قبضہ کرنے کے متعلق تھا جو سراج الدولہ کے مملوکہ تھے۔ چنانچہ حتی الامکان سراج الدولہ کی تمام دولت میر جعفر کے قبضہ میں آگئی۔ اب ذرا ان مطالبات کو بھی بہ نظر غور ملاحظہ کیجئے جو نہ صرف کمپنی کی طرف سے بلکہ ملازمین کی جانب سے ذاتی حیثیت میں میر جعفر کے سامنے پیش کئے گئے۔ مسند نشین ہوتے ہی میر جعفر کو تجارتی مراعات اور انتقال اراضی کے علاوہ حسب ذیل نقد روپیہ بھی ادا کرنا پڑا:۔

۱۔ بطور تاوان کمپنی کو ... ... ایک کروڑ روپیہ

۲۔ " " باشندگان کلکتہ کو دس لاکھ "

۳۔ " " آرمینیوں کو سات " "

۴۔ " " بحری فوج کو ۲۵ " "

۵۔ " " بری فوج کو ۲۵ " "

۶۔ مسٹر ڈریک (گورنر کلکتہ) کو ۲ " ۸۰ ہزار "

٧- رابرٹ کلائیو ۲ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ

۸- میجر کل پیٹرک ۲ " ۴۰ " "

۹- ایم- واٹس ۲ " " " "

۱۰- مسٹر بیشر ۲ " " " "

اس کے علاوہ پرائیوٹ عطیات کا نمبر ہے جو غریب صوبہ دار کو دوستی کی پاداش میں خزانہ عامہ سے دینے پڑے ان کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

لارڈ کلائیو کو ۱۶ لاکھ[1] روپیہ

واٹس کو ۳ " "

۶ ممبران کونسل کو ۶ " " (یعنی ایک لاکھ فی کس)

کلائیو کے سکریٹری مسٹر والش کو ۵ " "

مسٹر اسکریفٹن ۲ " "

لوشنگٹن پچاس ہزار "

میجر لے گرانٹ ۱ " "

ایسے بھاری مطالبات کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ خالی ہوگیا۔ میر جعفر کا وزیر مال راجہ دولاب رام تنگ کر اپنی زمینداری میں گوشہ نشین ہوگیا۔ میر جعفر نے جن دولتمندوں سے روپیہ اینٹھنا چاہا وہ باغی بن گئے اور بالآخر کلائیو کی اُمید بر آئی، وہ چاہتا تھا کہ میر جعفر اس قسم کی مشکلات میں گرفتار ہو کر دست سوال اس کی طرف بڑھائے تاکہ وہ ظاہری آزادی جو صوبہ دار کو حاصل تھی برائے نام بھی باقی نہ رہے، ایک انگریز مورخ اس حقیقت کو کس شوخ چشمی سے بیان کرتا ہے :-

"کلائیو پہلے ہی سے اس چیز کو تسلیم کر چکا تھا کہ مشرق میں طاقت کا انحصار دولت کی فراوانی پر ہوتا ہے، اس لئے خزانہ خالی کردینے کے بعد میر جعفر ایک بھکاری کی طرح کلائیو کے پیروں میں گرنے پر مجبور ہوگا۔ وہ ہر پہلو سے جملہ حالات کا مطالعہ کر چکا تھا۔ دیسی حکومت کو جو کاری ضرب ۷۰ اس نے لگائی تھی، اس سے سراج الدولہ جیسی مطلق العنان حکومت کا قائم رہنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اس لئے یہ ضروری ہوگیا کہ آئندہ کے لئے دیسی حکمرانی کی نگرانی انگریز کریں۔ اور صوبہ دار کے ہاتھ میں برائے نام حکومت کی باگ ہو، میر جعفر نے خود کو اس کے ہاتھوں میں دیدیا تھا۔ کلائیو موقع کی تاک میں تھا۔ اس وقت اس نے اس معاملہ کو صاف کر دیا کہ وہ خود حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے ...... نتیجہ یہ ہوا کہ معاملات اسی طرح طے ہوئے جس طرح کلائیو چاہتا تھا اور صوبہ دار کی مملکت پر انگریزوں کا تصرف اور بڑھ گیا۔"

لارڈ کلائیو کے اوصاف میں انگریز مورخین کتنے بھی رطب اللسان کیوں نہ ہوں لیکن یہ دھبہ مٹائے نہیں مٹ سکتا کہ اس نے انتہائی بے ایمانی جعلسازی اور فریب کاری سے بنگال میں حکومت انگلشیہ کی بنا ڈالی۔ جتنی مہمات اس نے سر کیں، جتنے عہدنامے اس کے ذریعہ مرتب ہوئے سب میں مشرقی سادہ کاری و اعتماد اور مغربی پُرفریبی، عہد شکنی نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ جنگ پلاسی کے بعد لارڈ کلائیو کا ایک زبردست کارنامہ بادشاہ شاہ عالم کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ میثاق الہ آباد کے متعلق مختلف تاریخوں میں تفصیلات ملیں گی اور کہیں کہیں دبے ہوئے لفظوں میں

---

[1] یہ عطیہ جاگیر کے علاوہ تھا جو میر جعفر کی فیاضی نے کلائیو کو عطا کی تھی۔ اور جس کے سلسلے میں وہ سرکاری طور پر "لارڈ آف پلاسی" تسلیم کیا گیا۔ — ساغر

اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بادشاہ شاہ عالم دہلی سے ناکام ونامراد جب الہ آباد میں سکونت پذیر ہونے پر مجبور ہوا تو کلائیو کے دماغ میں کمپنی کی سرحدوں کو مضبوط کرنے کا سوال چکر لگا رہا تھا۔ نیز وہ اس قدیم توہم سے بھی فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا جو نام نہاد مغل بادشاہوں کی سرداری کے متعلق ہنوز ہندوستان کے ہر گوشہ میں پایا جاتا تھا۔ میثاق الہ آباد کے فوری اور خارجی اسباب کچھ بھی ہوں لیکن کلائیو کے دل میں یہ خیال تھا کہ اکبر اور اورنگ زیب کے مفلس و ناچار جانشین سے حکومت انگلشیہ کے جواز کا پروانہ حاصل کیا جائے۔ شاہ عالم کو ایک طاقتور حلیف کی ضرورت تھی جو دہلی کے تاج و تخت کو واپس دلا سکے، چنانچہ کلائیو نے فوجی امداد کا وعدہ کر کے میثاق الہ آباد پر شاہ دہلی کے دستخط ثبت کرا لئے شاہ عالم کو جس طرح دھوکہ دیا گیا اس کا بیان کسی تاریخ میں صراحتاً نہیں ملتا۔ لیکن ایک قلمی نسخہ میں جو غالباً ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اور بلاشبہ اصل ہے اس واقعہ کا ایک سچا پہلو دکھایا گیا ہے، حقیقتاً اس مضمون کا تعلق زیادہ تر اس قلمی نسخہ سے تھا۔ جسمیں لارڈ کلائیو کے حقیقی کیرکٹر کو صرف ایک واقعہ سے صاف صاف کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام ''شگرف نامہ'' ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ اس خاص واقعہ کو تحریر میں لایا جائے شگرف نامہ کے مصنف اور اس کی تاریخی اہمیت کا بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

''شگرف نامہ''

اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف حصہ کے دوران طوائف الملوکی میں جبکہ ہر بُوالہوس انقلاب روزگار اور ہنگام تشتت سے تمام ممکن فوائد و منافع حاصل کرنے پر تلا بیٹھا تھا اور کسی ایک شخص کو بھی اتنی فرصت نہ تھی کہ ملک کی بربادی اور بندگان خدا کی تباہ حالی کا تذکرہ اور صحیح صحیح واقعات آئندہ نسلوں کی عبرت کیلئے ایک جگہ جمع کر سکے' ایک شخص اعتصام الدین نامی ساکن باجتور ضلع ندیہ نے ترقیم حالات پر کمر ہمت باندھی اور چند صفحوں کے اندر اس راز کو آشکار کر دیا جو دولتِ انگلشیہ کے کارپردازوں نے بڑی ہوشیاری اور انگریز مورخین نے حیرتناک سبکدستی کے ساتھ مخفی رکھنا چاہا تھا۔ سبب تالیف کتاب کے متعلق وہ خود لکھتا ہے:-

''عاجز را کہ بمقتضائے آب خور سفر ولایت انگلند افتاد و واقعات و خصوصیات بحر و بر کہ بدید و شنید آمدہ داستانیست غریب۔ بس شگرف در سنہ یکہزار و نود و نہ ہجریہ مقدسہ . . . . چار و ناچار با حالات زار و نزار بطراز نامہ نا درہ کار دست بانگار بربست . . . . چوں مقصد از اطلاع حالات بود و خالی از فوائد ہم نیست بعبارت پیچیدہ و لغات دقیقہ و استعارات و اصطلاحات کہ مشعر بر درازنفسی و رنگینی کلام ست نہ پرداخت . . . . این مجموعہ کہ از قسم نوادر حالات دارد ''شگرف نامہ ولایت'' نام کردہ بر صفحۂ روزگار یادگار گذاشت۔

ع ''غرض نقشے است کز ما یاد ماند''

خدا معلوم کتنی مدت بعید سے یہ نقش جس کی یاد قائم رکھنے کی آواز و مؤلف نے موثر الفاظ میں ظاہر کی ہے زمانہ کی نامساعدت کے سبب نظروں سے اوجھل رہا لیکن جسطرح ہر چیز کا ایک نہ ایک زمانہ موافقت کا ہوتا ہے اسی طرح کیا عجب ہے کہ شگرف نامہ کے اظہار کا وقت بھی آ پہنچا ہو! اور انگلستان کے وہ چشم دید حالات جنھیں مولف نے بڑی احتیاط کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ ذخیرۂ معلومات میں قابلقدر اضافہ کا موجب نہیں۔ شگرف نامہ حقیقتاً انگلستان کے تمدن و معاشرت پر ایک سیاحانہ نظر تک ہی محدود نہیں بلکہ مؤلف کی دقت نظر اور عظیم قوت مشاہدہ نے زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو بیان کیا ہے جو اٹھارویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف حصہ میں قوم انگلشیہ سے تعلق رکھتے تھے! اس شخص کی قوت تحقیق بھی اس دوران میں کافی سرگرم عمل رہی۔ بحری سفر میں سمندروں کے تموج، جزائر کے نوادرات بعض عجیب و غریب قوموں کے حالات، جہازوں کی تعمیر اور کل پرزوں کی معلومات، ہر چیز کو دیکھنا، غور کرنا، پرکھنا اور پھر سادہ لفظوں میں بیان کر دینا غرض تمام جزئیات کا مجمل تذکرہ اس شخص کی قادرالکلامی اور تحقیق و تدقیق کے ذوق و شوق پر زبردست دلیل ہے۔ شگرف نامہ کے اسلوب بیان اور سفر کے چیدہ چیدہ واقعات کا برمحل اور بلا مبالغہ بیان کرنا ظاہر کرتا ہے کہ مشرق کا ذہن مشاہدہ اور ادراک اشیاء میں کسی قوم سے پیچھے نہیں تھا بلکہ اس کی ذکی طبیعت باوجود ان تمام دشواریوں کے جو دوسرے

ملک کی زبان اور طریقوں سے عدمِ واقفیت کے سبب راستہ میں حائل ہوجاتی ہیں۔ حالات کے معلوم کرنے میں اپنے مغربی معاصرین سے کہیں زیادہ زود رس تھی۔

تالیف کتاب کا سبب مؤلف نے سفر انگلستان بیان کیا ہے۔ مقدمہ میں یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ سفر انگلستان اسے کیوں اختیار کرنا پڑا۔ سفر اختیار کرنے کا سبب ہی اس مضمون کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے اور اگرچہ خود مؤلف نے اس سبب کو ایک ضمنی واقعہ کے طور پر قلمبند کیا ہے لیکن یہی ضمنی واقعہ تاریخی اعتبار سے تمام شگرف نامہ کی جان ہے۔ لارڈ کلائیو کی عیاریاں اکثر و بیشتر معرضِ بحث میں آچکی ہیں اور ہندوستانی و نیز بعض فرانسیسی اور انصاف پسند انگریز مؤرخین نے بھی اس انگریز "ہیرو" کی شرمناک حرکات کا راز طشت از بام کیا ہے لیکن شگرف نامہ میں جس ذلیل حرکت کا بیان ہے غالباً وہ اب تک کسی کی نظر سے نہیں گذرا۔ اس واقعہ کی سچائی اور وزن و اہمیت پر اعتبار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ راوی کے حالات کا مجمل ذکر کیا جائے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ آیا اسکی پوزیشن اور صلاحیت اس درجہ کی تھی، اس کے بیان کو قابلِ اعتبار تسلیم کیا جاسکے۔ قوم انگریز سے اُسے کوئی تعصب تو نہ تھا؟ جو واقعات اس نے سپردِ قلم کئے ہیں وہ سنی سنائی باتوں پر تو مشتمل نہیں؟ کسی جگہ جذبات اور مبالغہ سے تو کام نہیں لیا گیا ہے۔

پوزیشن اور صلاحیت کا اندازہ ان عہدوں سے ہوسکتا ہے جو مؤلف کو مختلف اوقات میں ملتے رہے۔ عمل ناظمی جعفر علی خاں میں یہ شخص سرکار نواب کا میر منشی تھا۔ عمل قاسم علی خاں میں میجر پارک (ایسٹ انڈیا کمپنی) کی ملازمت اختیار کی۔ میجر پارک کی مراجعت انگلستان کے بعد چند ماہ تلاشِ روزگار میں افسرانِ ایسٹ انڈیا کمپنی میں گھومتا پھرا اور بالآخر مسٹر واسٹرس (ڈنسٹیارٹ) کی سرکار میں بسر کردگی کپتان مکس صاحب بعہدۂ بخشیٔ لشکر ممتاز کیا گیا۔ دورانِ جنگ میں قاسم علی خاں میں بھی انگریزوں ہی کا ملازم رہا۔ بعدہٗ مسٹر برڈ میتھ صاحب کے ماتحت پرگنہ قطب پور کی تحصیلداری کے فرائض ایک سال تک انجام دیئے۔ مسٹر ونسیٹارٹ سے اس شخص کو جو عقیدت تھی وہ حسب ذیل الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے

"واسترس صاحب بسیار نیک ذات و عالی ہمت بود۔ بعد فوت آں صاحب یک ماہ آب از دیدہ جاری بود و تا یکسال آہ از دل می کشید و تا حال ہم ہر گاہ نامش بیاد می آید داغ دل تازہ می شود"

نواب شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ سے بمقام جنگ بکسر جو لڑائی ہوئی اور جس میں نواب کو ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ مؤلف کتاب اس جنگ میں بملازمت مسٹر کارناک موجود تھا۔ اختتام جنگ پر میجر منرو کے ہمراہ لکھنؤ پہونچا اور پھر کارناک کے ساتھ روہیلکھنڈ چلا گیا۔ بمقام جنار گڈھ شاہ عالم بادشاہ غازی سے شرف نیاز حاصل ہوا اور انھیں کی ملازمت کرلی۔

مندرجۂ بالا واقعات سے ہر ذی فہم شخص یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ اس شخص کو انگریز قوم سے کوئی تعصب نہ تھا۔ جن عہدوں پر وہ مامور کیا گیا۔ ان سے اس کی قابلیت اور صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض واقعات جو اس سفرنامہ میں اس نے درج کئے ہیں وہ عام تاریخی واقعات سے بہ تمام و کمال ملتے جلتے ہیں۔ جسکے معنی یہ ہوئے کہ اس نے حالات کے بیان کرنے میں دروغگوئی یا مبالغہ کو اختیار نہیں کیا۔ عبارت کا طرز بتاتا ہے کہ کہیں جذبات سے کام نہیں لیا گیا البتہ بعض اس قسم کے اشارے ضرور موجود ہیں جنھیں انگریز مؤرخین یا وقائع نگار سیاسی مصلحتوں کی بنا پر پوشیدہ رکھنے کے عادی ہیں۔

میثاق الہ آباد لارڈ کلائیو کا مایۂ ناز کارنامہ تصور کیا جاتا ہے لیکن اس کی سرگذشت شگرف نامہ کے الفاظ میں تاریخ عالم کی سیاہ ترین دستاویزات میں سے ہے۔ لارڈ کلائیو جب دوبارہ ہندوستان واپس آیا تو اس کے پیشِ نظر داخلی اصلاحات کے علاوہ کمپنی کی سرحد کو مضبوط کرنا بھی تھا، نواب وزیر اودھ جس کی سرحدیں کمپنی کے غلام صوبہ دار بنگال کی سرحدوں سے بہ سمت شمال و مغرب ملتی تھیں۔ اولاً انگریزوں سے برسرِ پیکار رہا لیکن باقتضائے حالات کلائیو سے صلح کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ چنانچہ نواب موصوف کے ساتھ قرارداد صلح پیش

پیش کی گئی۔ صوبۂ الہ آباد کے مداخل ۲۴ لاکھ روپیہ خرچ ملازمان شاہی کے لئے مقرر کئے گئے۔ باقی صوبۂ اودھ ایک کروڑ و پچاس لاکھ اور بنارس و غازی پور ضمیمہ ۱۵ لاکھ روپیہ نواب مذکور کے تصرف میں آئے۔ پچاس لاکھ روپیہ نقد برائے خرچ سپاہ لشکر کمپنی نواب شجاع الدولہ نے کئے۔ صلح نامہ لکھا گیا۔ دستخط و مواہیر کمپنی ثبت کئے گئے۔ لارڈ کلائیو نے نواب کے ہاتھ میں انجیل دی اور نواب نے مصحف مجید خود لیکر اور انجیل مقدس لارڈ کلائیو کو دیکر قرارداد صلح پر قائم رہنے کی قسمیں کھائیں۔ شاہ عالم نے سند نظامت بنام نجم الدولہ پسر جعفر علی خاں اور سند دیوانی بنگال، بہار و اڑیسہ بنام کمپنی انگریز بہادر فرمان بادشاہی کے ساتھ لارڈ کلائیو کو عطا کی۔ یہ صلح نامہ ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۳ء میں لکھا گیا۔ شگرف نامہ میں لارڈ کلائیو اور شاہ عالم بادشاہ غازی کے درمیان جو آخری گفتگو ہوئی وہ بجنسہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

"لارڈ کلینوس (کلائیو) ثابت جنگ بہادر سند دیوانی بنگالہ و بہار و اڑیسہ بنام حاصل ساختہ و سند نظامت بنام نجم الدولہ پسر میر جعفر علی خاں از حضور تیار کنانیدہ رخصت خواست۔ حضرت ظل سبحانی درآنوقت آب در دیدہ گردانیدہ فرمود کہ تمام کار کمپنی خود را خاطر خواہ بانجام رسانیدند و اصلا بکار خدمت ما بدولت و اقبال کہ عبارت از حاضر بودن سپاہ انگریزی بپائے رکاب تا جلوس تخت دہلی و انتظام ممالک محروسہ است نپرداختند و الحال مارا از چہار طرف درمیان دشمنان و نمکحرامان گذاشتہ میروند۔"

لارڈ کلائیو کی بیک وقت سادگی و پرکاری اس جواب سے مترشح ہوتی ہے جو اس نے شاہ عالم کے رقت آمیز سوال پر دیا۔ ملاحظہ ہو۔

"لارڈ کلینوس و جنرل کارناک ازیں معنی خیلے متاثر و منفعل شدہ عرض رسانیدند کہ درباب سہراہی فوج انگریزی بدوں حکم بادشاہ (انگلستان) و عرضی کمپنی اقدام نمیتوانیم نمود مگر آنکہ عرضی نمایم و ہرگاہ از ولایت فرمان رسد بسر انجام لشکر خواہیم پرداخت، تا رسیدن جواب باصواب صلاح دولت آنست کہ خود بدولت در الہ آباد متمکن سریر دولت باشند .... حضرت بدولت اقبال خاطر اقدس بجمع و جوہ مطمئن فرمودہ فدویان را در لوازم بندگی و اطاعت حاضر و غائب یکساں تصور فرمایند"

مذکورہ بالا عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میثاق الہ آباد مرتب ہونے سے قبل شاہ عالم کو یہ سبز باغ دکھایا جا چکا تھا کہ سپاہ انگریزی کی مدد سے تخت دہلی اس خانہ خراب کو واپس دلایا جائیگا۔ لیکن جونہی عہد نامہ تکمیل کو پہونچا کلائیو نے آنکھیں پھیر لیں اور ایک ایسا حیلہ پیش کیا جس کی تردید ۴۷ عالم بیچارگی میں شاہ عالم کی طرف سے ممکن نہ تھی۔ چنانچہ باتفاق رائے منیر الدولہ و راجہ شتاب رائے بہادر مطابق مرضی شاہ عالم ترسیل نامہ شاہی "بشاہ جم جاہ انگلستان" قرار پایا۔ نامہ شاہی کا منشا یہ تھا کہ سپاہ انگریزی بہ سپہ سالاری سرداران انگریز انتظام سلطنت مغلیہ کے لئے برائے امداد و اعانت و کمک عنایت کی جائیں۔ اس سے نہ صرف دونوں بادشاہوں کے درمیان ارتباط محبت و یگانگی میں استحکام ہوگا بلکہ بپاس محبت و اخلاص سند دیوانی بنگال و بہار و اڑیسہ کمپنی بہادر کے حق میں حاصل ہو جائیگی۔ اس خط کے ہمراہ شاہ عالم نے ایک لاکھ روپیہ کی قیمت کے تحائف بھی شاہ انگلستان کے لئے ارسال کئے۔ اس خط کو لارڈ کلائیو نے کلکتہ پہونچ کر باتفاق جنرل کارناک و کپتان سوئین و جارج نسترٹ و نواب منیر الدولہ و راجہ شتاب رائے بے اطلاع کونسلیان دیگر باغ دمدمہ میں مکمل کیا۔ مہر شاہی لگائی گئی اور خریطۂ نامہ ہمایوں کپتان سوئین کے حوالہ کیا گیا۔ کپتان مذکور برسم رسالت از طرف بادشاہ عالم پناہ ہندوستان" بطرف شاہ ولایت انگلستان مع تحائف ایک لاکھ روپیہ روانہ کئے گئے۔ ترقیم و ترسیل نامہ کے دوران میں مؤلف شگرف نامہ خود موجود تھا اور شاہ عالم کا منشا یہ تھا کہ کپتان مذکور کے ہمراہ ایک منشی بادشاہ ہندوستان کا ہونا ضروری ہے تاکہ سیاق کلام اور مقصد نامہ و پیام کی تشریح باحسن وجوہ کر سکے

اس لئے طے پایا کہ مولف شگرف نامہ ہمراہ جائیں۔ مؤلف مذکور کپتان کے ہمراہ جہاز سے ولایت کو روانہ ہو گئے۔ ایک ہفتہ کی راہ طے کرنے کے بعد کپتان نے جو مؤلف سے کہا وہ خود اس کے الفاظ میں سنئے :۔

"نامۂ بادشاہ را لارڈ کلینوس (کلائیو) ازمن کپتان گرفتہ فرار کردہ گفت کہ تحائف مرسلہ حضور (شاہ عالم) از بنارس نرسیدہ صرف نامۂ شاہی را ہمراہ بردن قرین صلاح نباشد سال آئندہ نامہ معہ تحائف ہمراہ من (یعنی کلائیو) خواہد رسید .... بندہ (مولف) بمجرد استماع ایں کلام ہوش از سر رفت و یقین دانست کہ عذر ایں معنی بے علت نخواہد بود۔ مآل کار چندیں محنت و مشقت سفر پرخطر بہ بیجا حاصلی و ناکامی خواہد کشید۔ اگر ازیں پیشتر می دانستم اقدام بریں کار نمی نمودم .... بعد شش ماہ در ولایت انگلستان داخل شد۔ ازاں تاریخ تا مدت بودن آنجا گاہے خاطر بہ نشاطی گرائید۔ چوں در افشائے ایں راز مناہی کپتان مذکور بتاکید تمام بود شگرف حالتے رُو دے نمود کہ نہ یارائے گفتن داشت نہ طاقت صبر"

غالباً قارئین یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہونگے کہ بالآخر نامۂ شاہی اور ایک لاکھ روپیہ کے تحائف کا کیا حشر ہوا۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"القصہ تا یکسال و شش ماہ در انتظار نامہ حضور پُر نور توقف بعمل آمد۔ چوں لارڈ کلینوس (کلائیو) در ولایت رسیدہ برائے پیش آمد خود تحائف مرسلہ حضرت قبلہ عالم را بنام خود بخدمت بیگم بادشاہ انگریز گذرانیدہ، مورد مراحم سلطانی گردید ذکر نامہ و پیام حضرت قبلہ عالم ممدوح اصلاً درمیان نیاورد۔ کپتان مذکور ہم ازیں معنی لب بہ سخن آشنا نساخت زیرا کہ کپتان مذکور بر اعتماد قول و عہد لارڈ کلینوس و پاس قومیت و آشنائی لارڈ مذکور اعتماد تمام بہ خاطر داشت۔ یکبارگی از فریب لارڈ کلینوس مایوس شدہ با حقیر (مولف) گفت آنچہ تما خیال کردہ بودند در آئینۂ شہود صورت گرفت لارڈ کلینوس با من (کپتان) دغا کرد"

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے

جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

نامۂ شاہی کے اخفاء کا سبب شگرف نامہ میں شرح و بسط کے ساتھ نہیں بتایا گیا۔ شاید وہ کماحقہ اس راز سے واقف نہ ہو سکا۔ البتہ اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ کاربرداران کمپنی اور متصدیان شاہی کے درمیان اخذ ملک بنگالہ کے سلسلہ میں تنازعہ ہو گیا تھا۔ شاہ عالم کا یہ خط اراکین سلطنت انگلستان کے حق میں حجت قوی اور دستاویز معتبر ثابت ہوتا۔ لارڈ کلائیو چونکہ کمپنی کا خیر خواہ تھا اس لئے یہ خط تلف کر دیا گیا۔

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس واقعہ کو ذرا غور سے مطالعہ فرمائیں۔ راوی ایک ایسا شخص ہے کہ جو خود تمام اسرار کا حامل ہے انگریز مؤرخین بھی کنایتہً یہ لکھ دیتے ہیں کہ شاہ عالم تخت و تاج دہلی کو واپس حاصل کرنے کیلئے خود انگریزی افسران سے مدد و اعانت کا طالب ہوا تھا اور یہ کہ حالات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس قسم کی امداد ایسٹ انڈیا کمپنی کے امکان سے باہر تھی۔ شاہ عالم کو جو وظیفہ کمپنی کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد بند کر دیا گیا اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شاہ عالم مرہٹوں کی حفاظت میں چلا گیا۔ سوال یہ ہے کہ شاہ عالم نے انگریزوں کی دوستی کو کیوں ترک کیا۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ لارڈ کلائیو اور اس کے ساتھیوں کی عیاری اور دغابازی کا حال جب شاہ عالم کو معلوم ہوا تو برداشتہ خاطر ہو کر عالم یاس میں دوسرے لوگوں کی اعانت و ہمدردی قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے اور صفحات بھی مکر و دغا سے ایسے ہی سیاہ بنائے گئے ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شخص جو اس قسم کے جرائم کا مرتکب ہو "نیشنل ہیرو" کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ سرسری نظر سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ لارڈ کلائیو کا کوئی کیرکٹر نہ تھا۔

حصولِ مقصد کی خاطر وہ پست ترین دنائت کو اختیار کرنے میں پس و پیش نہ کرتا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک پر غلبہ و تصرف حاصل کرنے میں اس نام نہاد نجات دہندہ کمپنی اور اس کے کاربردازان نے کیا کیا ستم توڑے ہوں گے۔ لیکن ان تمام حقائق کی روشنی میں بھی دزدانِ مغرب کی دلاوری کس قدر تعجب خیز ہے جو چراغ بکف دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کی سعی لاحاصل کرتے رہتے ہیں

ایک صاحب فرماتے ہیں :-

"سیزر نے اپنے وطن کی خاطر گال فتح کیا۔ ہانیبال نے تقریباً ۲۵ سال تک روما میں تہلکہ مچایا۔ ولنگٹن نے فرانسیسیوں کو اسپین اور پرتگال سے نکال باہر کیا۔ لیکن کلائیو کے کارنامے ان میں سے ہر شخص کے مقابلہ میں زیادہ شاندار تھے۔ اس شخص نے بحرِ اٹلانٹک کے چھوٹے سے جزیرہ کے لئے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنا ڈالی .... لارڈ اسٹین ہوپ کی رائے میں وہ بڑا آدمی تھا۔ لیکن (حقیقتاً) وہ "بڑے آدمی" کے لقب سے بھی کچھ زیادہ کہلانے کا مستحق تھا۔ جولیس سیزر کی طرح اس میں بھی دو اوصاف متحد ہو گئے تھے۔ وہ ایک زبردست مدبّر اور زبردست سپاہی تھا۔ یعنی آدمی بھی تھا اور عملی بھی .... ایک جملہ میں اس کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ پیدائشی طور پر حکمراں تھا"

"کیوں نہ ہو؟ سراج الدولہ کے ہمراہیوں کو غلط وعدوں سے نمک حرام بنانے والا۔ امین چند کے ساتھ فریب کرنے والا۔ واٹسن کے دستخط بنانے والا۔ شاہ عالم کے خط کو اڑانے والا اور اس کے ایک لاکھ روپیہ کے تحائف کو بادشاہ بیگم انگلستان کی خدمت میں اپنی طرف سے پیش کر کے مورِ مراحم سلطانی ہونے والا۔ اگر زبردست مدبّر کہلانے کا مستحق نہ ہو تو کیا سیزر، یا ہانیبال یا ولنگٹن ہونگے جن کی زندگی میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی نہیں ملتا۔ سپاہیانہ شان بھی کچھ کم قابلِ تعریف نہیں۔ پلاسی اور بکسر کے معرکے یقیناً قابلِ تعریف ہیں جو خود ہی مرا ہوا ہو کر مارا تو کیا مارا

اگر ایک میزان قائم کی جائے اور اس میں کلائیو کے سیاہ و سفید کارناموں کو تولا جائے تو ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ سیاہ کارناموں کا پلڑا زمین سے مل جائے گا۔ اس مضمون میں کسی دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے کہ کلائیو کو ضمیر کی خاموش آواز سننے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا لیکن ضمیر کی آواز ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک غیر محسوس رہے پھر بھی زندگی میں ایک وقت آتا ہے کہ شقی سے شقی انسان بھی اس کے محاسبہ کو محسوس کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ انگلستان کے اس "زبردست مدبّر" اور "زبردست سپاہی" کا انجام اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو کچھ کم عبرتناک نہ تھا۔

لارڈ اسٹین ہوپ لکھتا ہے :-

۷۵ "ایسا اتفاق ہوا کہ ایک نوجوان خاتون جو کلائیو کے گھرانے سے گہرے تعلقات رکھتی تھی اس کے مکان بر کلے اسکوائر میں قیام پذیر تھی۔ ایک دن وہ کسی کمرہ میں خط لکھنے کے لئے بیٹھی۔ اس نے لارڈ کلائیو کو چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھ کر اپنا قلم درست کرانے کے لئے آواز دی۔ لارڈ کلائیو وہاں پہونچا اور قلمتراش چاقو جیب سے نکال کر قلم درست کر دیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے کمرے میں سے گذرتے ہوئے کلائیو نے وہی چاقو اپنے گلے میں بھونک لیا"

یہ تھی ضمیر کی آواز جس نے کلائیو کی زندگی کے آخری ایام کو اتنا تلخ کر دیا تھا کہ اس نے زندگی پر خودکشی کو ترجیح دی ؎

ربودی دل ز جاکِ سینۂ من
بغارت بردۂ گنجینۂ من

مزدور طالب علم

حضرت احسان دانش

جہاں گنگ ہے نصف رات آچکی ہے بشاشت کو افسردگی کھا چکی ہے
ہے بے نور بازار دلداریوں کا مقفّل ہے مقتل ریاکاریوں کا
مسافر نہیں شاہراہوں میں کوئی دیا تک نہیں خانقاہوں میں کوئی
ہے بھرپور تاریکیوں کی جوانی جوانی پہ ہیں انجمِ آسمانی
صدا دور سے بوم کی آرہی ہے غنودہ سماعت کو چونکا رہی ہے
منڈیروں پہ خاموشیاں گا رہی ہیں ستاروں پہ بے چینیاں چھا رہی ہیں
شبِ تار نے زلف کھولی ہوئی ہے سیاہی خموشی میں گھولی ہوئی ہے
مساجد بھی چپ ہیں شوالے بھی چپ ہیں پجاری بھی چپ، بجنے والے بھی چپ ہیں

مگر اک محلّہ کے خستہ سے گھر میں
زمیں کے جگر پر فلک کی نظر میں

اک انساں ادھیڑ عمر گردن جھکائے چراغ اک کنستر کے اوپر جلائے

ترقی کی دھن سے جبیں پر پسینہ　　مقدّس خیالوں سے معمور سینہ
نہیں دیدۂ شوق میں خوابِ راحت　　مشقت کے رُخ پر ہے رنگِ شجاعت
پسینہ میں بھیگا ہوا پیرہن ہے　　بہاروں پہ افلاس کا بانکپن ہے
نصیبوں میں پیدا چمک کر رہا ہے　　سبق یاد اس وقت تک کر رہا ہے

مبارک ہو اے ہند مزدور جاگا
زمانے کا پامال و مقہور جاگا

شہادت کا لختِ جگر چونک اُٹھا　　صداقت کا نورِ نظر چونک اُٹھا
تمدّن کی تقدیر نے آنکھ کھولی　　اندھیرے میں تنویر نے آنکھ کھولی
غبارِ حزیں کو بلندی کی سوجھی　　تنزّل کو رفعت پسندی کی سوجھی

وہ دن اب نہیں دُور جب ہر قدم پر
نچھاور کرے گا فلک لعل و گوہر

تری بزم کی بزم دل شاد ہوگی　　خموشی میں گلبانگ آباد ہوگی
حکومت مسرّت کی ہو گی الم پر　　برس جائینگی رحمتیں چشمِ نم پر
کہ ہیں طاقتیں علم میں ایسی پنہاں　　بنا دیں جو آتشکدوں کو گلستاں

جو کانٹوں کو کلیوں کا ہمسر بنا دیں
جو کنکر کو ہمتاب گوہر بنا دیں

باب عشق

از مرزا فہیم بیگ فہیم چغتائی

راؤ لوک پال سنگھ صاحب چتر کار (گوالیاری) کے پُر معنی دوہے بھاشا بھاشیوں (ہندی اہل زبان) کی ضیافتِ طبع کا بیش بہا ذخیرہ تو ہیں ہی، میرا خیال ہے کہ اردو دانوں کو بھی ایک دلچسپ و نادر تحفہ سے کم ثابت نہ ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے ہم زبانوں کی دلچسپی کیلئے اس قابل قدر کلام کی اشاعت ایک ادبی خدمت سمجھی اور کچھ اجزا اخبار و رسائل میں شائع کیے۔ اور اسی جذبہ کے ماتحت راؤ صاحب موصوف کے چند شہ پارے قارئین "ایشیا" کی نذر کرتا ہوں۔

مرزا فہیم بیگ

دل دادگی

۷۸

پلک پلن ہیرت ہرت پھیرت بھرکُٹ مرور
پھیر نہ درسن دیت کچھ ناگر نیہہ ہلور

पलक पलन हेरत हरत फेरत भरकुद मरोर
फेर न दरशन देत कुछ नागर नेह हलोर ॥

ترجمہ:- پپوٹوں کے پلڑوں میں جانچ کر تُلا لیتی ہے، پھیرتے ہوئے ابروؤں کی جنبش کو۔ پھر کچھ پھیر نہیں سو جھنے دیتی عورت کے عشق کی موج

تشریح:- شاید نظر سے نظر ملانے میں حجاب مانع ہو یا سے

گر تُلے مرے تو زہر کیوں دو

یہ سمجھ کر کہ سودائیوں میں تابِ نظارہ کہاں، ایک لاپروائی سے پپوٹوں کے پلڑوں میں مستور نیم باز آنکھوں سے تول رہے ہیں۔

بہت ممکن تھا کہ اس وقت از خود رفتہ سر نچا کئے کھڑے رہتے لیکن کیا کریں جی نہ مانا انھیں اپنی دھن میں پاکر کچھ جھجکتے جھجکتے کن انکھیوں سے دیکھا۔

کدھر ؟

ترازو کو نہیں، تولنے والے کی طرف !

جونہی اس شرمائی لجائی نظر نے بھوؤں کے پلڑوں سے سودا جانچا اور کمان جیسے کشیدہ ابروخفیف سی جنبش کے ساتھ ذرا پھیرے کہ ؎

کجا می نمائی کجا می زند

بقول کوی ور بہاری لال ؎

تیئے کت کمینتی پڑھی درگ سر بھونہہ کمان

چل چت بیدھو چکت نہیں، بنک بلوکن بان

तिय कित कमयन्ती पढ़ी

द्रग सर भौंह कमान

चल चित बेधहु चकत नहीं

बनक बिलोकन बान ॥

عورت ! تو نے یہ تیر اندازی کہاں سیکھی کہ بھوؤں کی کمان سے خدنگ نگاہ چھوڑ کر دل مضطر جیسے متحرک نشانہ کو چھیدنے میں نہیں چوکتی۔ حالانکہ دیکھنے میں تیر بھی ترچھا ہے۔

یعنی سودا کرتے کرتے کھڑے بک گئے اور خبر نہ ہوئی ...... ہائے دن دھاڑے ...... بھرے بازار میں ؎

دل چرا کر نظر چرائی ہے

لٹ گئے لٹ گئے دہائی ہے مرزا داغ

۶۹

انتظار

چوکھ دیپ سنجوے درگ پنتھ نہار نہار

نس گت پون جھکور سو بجھو بھئے بھنسار

चौमुख दीप संजोए

द्रग पंथ निहार निहार

निस गत पवन झकोर सो

भजो भए भन्सार

ترجمہ :۔ آنکھوں کا چوکھ دیا روشن کر کے راہ دیکھتے دیکھتے، رات بیت گئی آخر صبح ہوتے نسیم کی لپٹ سے وہ گل ہو گیا۔

تشریح :- جابجا پاور ہاؤس قائم ہو گئے، شہروں کے گلی کوچے الیکٹرک لائٹ سے جگمگانے لگے، لیکن دیہاتیوں کی جھونپڑیوں میں اب وہی مٹی کے دیئے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں، اور اپٹوڈیٹ شہریوں کے خلاف ان کے یہاں بجائے بیٹری، لالٹین، ٹارچ وغیرہ کے دیوں سے ہی مہمانوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

علیٰ ہذالقیاس قدامت پسند غریب دیہاتیوں کے علاوہ، شہروں کے عقیدت مند ہندو مسلمان تہواروں پر گھی یا کڑوے میٹھے تیل کے دیوں ہی سے چراغاں کرتے ہیں، مقدس دریاؤں میں مٹی اور آٹے کے دیوں کی ہی دیپ مالائیں بہائی جاتی ہیں۔ درگاہوں، خانقاہوں پر دیئے رکھنے مسجدوں کے طاق بھرنے اور دیوی دیوتاؤں کی آرتی اتارتے وقت ابھی تک دیوں کے استعمال کا ہی رواج چلا آتا ہے۔

علاوہ ازیں جیسا کہ حضرت آتش فرما گئے ہیں

گیا ہوں جوشِ وحشت میں جو اُڑ کر مثلِ پروانہ
چراغِ چشم دکھلائے ہیں غولوں نے بیاباں میں

اس دوہے میں عام دستور کے مطابق صرف "دیا" نہیں "چومکھ دیا" لایا گیا ہے "چومکھ" کہتے ہیں چار منہ والے کو اور چومکھ دیئے سے چار منہ والا چراغ مقصود یعنی عاشق کی آنکھوں کو چومکھ دیئے سے شباہت دی ہے۔ وہ اس لئے کہ چشم براہ مہجور کچھ ایک ہی طرف ٹکٹکی نہیں لگائے رہتا، وفورِ شوق کی دیوانگی سے بیتاب ہو ہو کر کبھی ادھر دیکھتا ہے کبھی ادھر، ابھی سامنے نظر دوڑائی، ابھی مُڑ کر پسِ پشت نگاہ ڈالی۔

گویا اگر فقط لفظ دیا لایا جاتا تو شاعر کا مفہوم کیونکر ادا ہوتا، اور تخیل کی مکمل کیفیت کا صحیح منظر کس طرح پیشِ نظر ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ اس لفظ "چومکھ" نے دوہے کی وسعت معنوی اور تکمیل لفظی کو چار چاند لگا دیئے۔

جس کے خیر مقدم کو اندھیری رات میں مشتاق دید آنکھوں کا چراغ روشن کیا تھا آہ! جس دیوتا کی چومکھ دیئے سے آرتی اتارنی تھی اس نے درشن نہ دیئے حتیٰ کہ شب گذر گئی، جب اس کی آمد کا امکان نہ رہا (کیونکہ وعدہ شب تار کا تھا) آس ٹوٹ گئی اور نسیم کے جھونکے صبح کا پیغام دینے لگے، تو مایوسی نے بینائی کا چراغ بجھا دیا۔

عالم میں ہے گھر گھر خوشی و عیش ہر اُس بن
ماتم کدہ ہمکو نظر آتا ہے گھر اپنا — جرأت

افتراق

درگ جلجات نہ لاج جل، کا سس روپ لجاؤ
سَو سَو سوہیں کر کہا، ہریں ہریں مُسکاؤ

दृग जल जात न लाज, का सोस रूप लजाओ
सो सो सोहें कर कहा, हरें हरें मुसकाओ

ترجمہ :- کنول جیسی آنکھوں سے وہ غیرت کا پانی ڈھل گیا، چاند سے مکھڑے کو کیوں شرمندہ کرتے ہو، سو سو قسمیں کھا کر چپکے چپکے

کیا مسکرا رہے ہو۔ !!

تشریح :- کیوں جناب !

(۱) وہ ہفتہ عشرہ کو شہر سے باہر جانے کے لئے رخصت ہوکر دو دن نہ ملنے کے بعد تیسرے روز گارڈن پارٹی میں کون نظر آیا ؟

(۲) کیا نمائش میں کوئی اور منہ پھیر کر دوسری پٹری سے گذر گیا تھا۔

(۳) اس جیب سے گر جانے والے خط کا کیا جواب ہے ؟

(۴) کون صاحب نظر ملتے ہی جلوس میں غائب ہو گئے تھے۔

(۵) "ابھی آتا ہوں" کہہ کر جو گئے تو اتنے روز کس نے روپوشی اختیار کئے رکھی۔

(۶) دروازے میں جھانک کر کیا میں کھسک گیا تھا اور اچانک سینما میں سامنا ہو جانے پر میں نے بھی الٹے گلے شکوے کئے تھے۔؟

(۷) کس نے زید سے نہ ملنے کا یقین دلایا، اور پھر اس کے ساتھ کار پر جانا دکھائی دیا۔

(۸) دولت خانہ پر حاضری دی تو "کہہ دو ! ہیں نہیں" کس کی آواز تھی۔ ؟

چاند سے کنول کا سمٹنا سب جانتے ہیں، مگر یہاں معاملہ برعکس ہے، یعنی آپ کی کنول جیسی آنکھوں سے غیرت کا پانی ڈھل گیا۔ ایسا شریف جوہر (غیرت) ضائع کر کے آپ اُلٹا جا، جیسی دلفریب صورت کو داغ لگا رہے ہیں، یہ کرتوت اس پر سو سو قسمیں کھا کر ہنسنا . . . بڑے افسوس کی بات ہے۔

بہت درگذر سے کام لیا، اب رو رعایت کی گنجائش نہیں، کان کھول کر سن لیجئے ؎

گر یہی ناز ہیں صاحب کے یہی ہیں انداز ہم نے بھی عہد کیا دل سے کہ اے بندہ نواز
نہ کریں گھر کی طرف تیری کبھی رُو ئے نیاز ہو اگر کعبہ اُدھر کو تو کریں ترک نماز

واں نکل جائیں جہاں کا نہ پتہ ملتا ہو
نہ ملیں ملنے سے تیرے جو خدا ملتا ہو

قطع تعلق

سو سو بدھ گیہہ کی نسی، سرانی چاہ
اب آئے راہیں ملے، الٹ پلٹئے کاہ

सो सो बिध गेह की नसी सरानी चाह ॥
अब आए राहें मिल, उलट पलटिए काह ॥

ترجمہ :- وہ سو سو طرح کا ساز و سامان اور گھر گرہستی کے پرتکلف لوازمات تباہ ہو گئے، محبت بجھ چکی۔ اب ملے ہو ! . . راہ چلتے . . . کیا پلٹیں۔

تشریح :۔ زندگی کا وہ دور جس کا بدل ناممکن ہے، طویل مایوسیوں کی نذر ہو گیا۔ تلخ کامیوں کے تند جھونکوں نے نخلِ آرزو کو جھلسا دیا۔
اور یہاں تک نوبت آئی۔

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ تجھکو ناز تھا وہ دل نہیں رہا

افسوس! اس وقت کرم نہ فرمایا، جب امنگوں کے دن تھے۔ اور جملہ سامانِ عیش فراہم کرکے آمد آمد کی گھڑیاں گنی جا رہی تھیں۔
اب آنکھیں کھلی ہیں، جب مسلسل نامرادیوں نے ہمیں وہاں پہنچا دیا، جہاں دکھ سکھ کا احساس فنا ہو جاتا ہے۔ اور آخری منزل کچھ دور نہیں رہتی
بس! اب بقیہ لمحہ گذارنے کے لئے اس بھولی بھالی صورت کا تصور ہی کافی ہے۔
بس خدا حافظ!

سکون

سن نہ سمجھ آیو کچھو، دھیمے بولو جون
سرس نہارت لکھ پرے بھیو سدا کو مون

सुन न समुझ आयो कछु धीमे बोलो जोन
सुरस निहारत लख परे, भयो सदा को मौन

ترجمہ : سن کر سمجھ میں نہ آیا، وہ جو آہستہ بولا، طیش کھا کر دیکھا تو ہمیشہ کیلئے خاموش تھا۔

تشریح :۔ یہ سرہانے کون آ کھڑا ہوا؟
اس سے پوچھئے جس کے حواس بجا ہوں
چند لمحہ کی مہلت میں خشک ہونٹوں کو خفیف سی جنبش ہوئی۔۔۔ ذرا تھرتھرائے اور رہ گئے
پتھرائی ہوئی آنکھوں پر لاپروائی کا دھوکہ کھانیوالا خاک نہ سمجھا۔
بے نیازی کی عادت سے مجبور، عذر معذرت کا منتظر رہا۔۔۔۔ جب ناکامی ہوئی سخت جھنجھلایا، لال پیلا ہوتا نزدیک آیا۔
اب جو غور کیا تو ارے!
خوشامدیں کر کر کے منانیوالا ہمیشہ کے لئے روٹھ چکا ہے۔

ای شاعرِ رنگیں بیاں

از نواب جعفر علی خاں صاحب اثر بی اے لکھنوی

فطرت تری آواز ہے
فطرت ہی تیرا ساز ہے
فطرت کا تو ہمراز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

جوہر دکھائے عشق کے
دے کر زباں جذبات کو
کیا سحرگیں انداز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

کہسار تیرے منتظر
گلشن کو تیری آرزو
آغوشِ صحرا باز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

ساحل کو ہو لب تشنگی
یا اضطرابِ موج ہو
دونوں کا تو غمّاز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

بالا نشاط و غم سے ہے
بازیچہ گاہِ دہر میں
سب کا مگر دمساز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

نغموں کے گل بکھرا دیئے
سازِ محبّت چھیڑ کے
کیا نغمے ہیں کیا ساز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

اک جنبشِ لب نے تری
گمنام کو نامی کیا

آواز یا اعجاز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

قربانی و ایثار ہیں
زندہ ترے الفاظ ہیں
تو غیب کی آواز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

ہر نالۂ موزوں ترا
تاثیر میں ڈوبا ہوا
اک شاہدِ طنّاز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

تو حسن کا نورِ ضیا
تو عشق کا رنگِ صفا
تو خلوتیٔ راز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

انجام ہر آغاز کا
تجھ پر ہوا ہے منکشف
عالی تری پرواز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

وجداں ترا الہام ہے
پیغام تیرا عشق ہے
دل خوابگاہِ ناز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

شہبازِ عقل و ہوش کے
جلتے ہیں پر جس اوج پر
تیرا وہ پا انداز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

سائنس اور حکمت جہاں
تاریکیاں ہیں جہل کی
تو آئینہ پرداز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

وہ گیت گا وہ سوز بھر
یا جاگ اُٹھے یا جل اُٹھے
دنیا کہ محوِ آز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

سقراط کی موت

"فیڈو"

مرنے سے پہلے اپنے دوستوں سے سقراط اعظم کی گفتگو

(مسلسل)

(مترجمہ:- مہرلال ضیا ایم-اے فتح آبادی)

اور فیڈو اس نے کہا اگر استدلال کا کوئی ایسا طریقہ ہو جو صحیح اور سچا ہو اور جسکو ہمارے دماغ قبول کرسکیں تو یہ بہت رنجدہ ہوگا کہ ایک آدمی چند ایسی دلیلوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو کبھی سچی اور کبھی غلط ثابت ہوئیں آخر کار تنگ آکر بخوشی تمام الزام اپنی ذات یا اپنی کم تعلیمی پر لگانے کی جگہ استدلال پر عاید کرے اور اپنی بقیہ زندگی استدلال سے نفرت اور اس کی مخالفت کرنے میں گذارے اور اس طرح حقیقت کی سچائی سے بے بہرہ رہے۔

یقیناً میں نے کہا یہ بہت افسوسناک ہوگا۔

تو سب سے پہلے اس نے کہا ہمیں احتیاط کرنی چاہئے کہ ہم اپنے دماغ میں اس خیال کو جگہ نہ دیں کہ تمام استدلال بہت ممکن طور پر غیر یقینی ہے۔ بلکہ ہمکو سوچنا چاہئے کہ ہم غیر یقینی ہیں اور ہمکو مردوں کی طرح پختہ بننے کی سعی کرنی چاہئے۔ تم کو میرے دوستو اپنی تمام آیندہ زندگی کی خاطر اور مجھ کو اپنی موت کے لئے کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ اس وقت میں موت کو ایک فلسفی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں ان غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح پُرسکون حالت میں ہوں جو مسئلہ زیر بحث کی حقیقت سمجھنے کی کوشش نہ کرتے ہوئے دوسروں کو اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خود راستی پر ہیں اور میرا خیال ہے کہ آج میں ان سے صرف ایک بات میں اختلاف کروں گا۔ میں آپ کو یہ ماننے پر مجبور نہیں کروں گا کہ میں راستی پر ہوں۔ لیکن میں خود کو ایسا کرنے پر مجبور کرنے کی ضرور کوشش کرونگا۔

دیکھا تم نے میرے دوستو میرا استدلال کتنا خود غرض ہے۔ اگر جو کچھ میں کہتا ہوں صحیح ہے تو اس پر یقین کرنا چاہیے لیکن اگر موت کے بعد کچھ بھی نہیں ہے تو میں کم از کم اپنے دوستوں کو اپنی موت اور اس وقت کے درمیانی حصہ میں اپنی فریادوں سے تکلیف نہیں پہونچاؤں گا اور یہ لاعلمی ہمیشہ نہیں رہے گی، ایسا نہ ہونا اک زبردست نعمت ہے، وہ جلدی ختم ہو جائیگی اب سمیاس اور سیبس میں بحث کرنے کے لئے تیار ہوں اور اگر تم میری بات مانو تو تم سقراط کا نہیں بلکہ سچائی کا خیال کرو اس طرح تم میری باتوں سے متفق ہو سکو گے ورنہ تم اپنی ہر دلیل سے میری مخالفت کرو گے اور یقین رکھو کہ تمکو مطمئن کرنے کے لئے میں خود کو اور تم کو دھوکا دیکر ایک شہد کی مکھی کی طرح اپنا ڈنک اپنے پیچھے نہیں چھوڑ جاؤں گا۔

اب ہمکو آگے بڑھنا چاہیے اُس نے کہا۔ اور سب سے پہلے اگر تم سمجھتے کہ میں تمہاری دلیلیں بھول گیا ہوں تو انہیں دہرادو میرے خیال میں سمیاس کو شک ہے کہ روح ایک توازن کی حیثیت سے جسم سے پہلے فنا ہو سکتی ہے گو وہ جسم سے زیادہ پاک و صاف ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا ہوں تو سیبس روح کو جسم سے زیادہ دیرپا تسلیم کر چکا ہے لیکن اس نے کہا تھا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کئی مرتبہ جسموں کو اختیار کرنے کے بعد روح خود بھی آخری جسم کو چھوڑ کر نہیں مٹ جاتی اور یہ کہ دراصل روح کے اس طرح فنا ہو جانے ہی کو موت نہیں کہتے۔ کیونکہ روح کی فنا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی بات قابل غور ہے سمیاس اور سیبس۔!؟

دونوں متفق تھے کہ ان کے یہی سوالات ہیں۔

کیا تم ان سب نتائج سے انکار کرتے ہو جن پر ہم اب تک پہنچ چکے ہیں یا صرف بعض سے؟ اُس نے دریافت کیا۔

صرف بعض سے انھوں نے جواب دیا۔

بہتر ہے اُس نے کہا تم اس نقطۂ نظر کے متعلق کیا رائے رکھتے ہو کہ علم ایک یادداشت ہے اور یہ ہماری روحیں یقینی طور پر کسی جگہ موجود تھیں پیشتر کہ وہ ہمارے جسموں میں قید کی گئیں

میں سیبس نے جواب دیا اسوقت عجیب طریقہ سے قائل ہو گیا تھا اور اب اس سے زیادہ میں کسی چیز کا قائل نہیں ہوں۔

اور میرا بھی یہی خیال ہے سمیاس نے کہا اور مجھے بڑا تعجب ہوگا اگر میں اپنی اس رائے کو بدل دوں گا۔

لیکن میرے تھیبا کے دوستو تمہیں اسکو بدلنا ہی پڑے گا۔ سقراط نے جواب دیا اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ توازن ایک مرکب کا نام ہے اور کہ روح ایک توازن ہے جو جسم کی مختلف عناصر کی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے تم کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ توازن موجود ہو سکتا ہے۔ ان چیزوں سے بھی پہلے جن سے کہ اس کی تخلیق ہوتی ہے؟ کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟

یقیناً نہیں۔ سقراط

لیکن تم دیکھتے ہو کہ تمہارا استدلال اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جب تم کہتے ہو کہ انسان کے جسم میں آنے سے پیشتر بھی روح موجود تھی حالانکہ وہ اُن عناصر کی ترکیب ہے جو اُس وقت موجود نہیں تھے۔ تمہارا توازن ویسا نہیں ہے جیسا تم اُسے سمجھتے ہو۔ ستار، تاریں اور سُر جو ابھی متوازن نہیں سب سے پہلے وجود میں آتے ہیں اور توازن سب سے بعد میں پیدا ہوتا ہے اور سب سے پہلے مر جاتا ہے۔ تمہارا یہ یقین دوسرے یقین سے کیونکر متفق ہو سکتا ہے؟

ایسا نہیں ہو سکتا سمیاس نے جواب دیا۔

تو بھی اُس نے کہا توازن کی دلیل میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

یقیناً نہیں سمیاس نے کہا۔

تمہاری دلیل میں اختلاف ہے اُس نے کہا۔ تمہیں ان دو نظریوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا چاہیے کہ علم یادداشت ہے یا روح ایک توازن کا نام ہے۔

یقینی طور پر اوّل الذکر سقراط اُس نے جواب دیا۔ آخر الذکر کا میں نے کبھی تجربہ نہیں کیا۔ یہ محض ممکنات میں سے ہے اور یہی وجہ ہے اس نظریے کی شہرت اور عام مقبولیت کی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ نظریے جو ممکنات محض پر قائم ہیں فریبی ہیں اور امکان ہے کہ وہ غلط راستہ پر لے جائیں جیومیٹری کے علاوہ ہر دوسری چیز میں بھی اگر انسان اُن کے خلاف احتیاط نہ کرے۔ لیکن یادداشت اور علم سے متعلق نظریہ حقیقت اور یقین پر مبنی ہے۔ ہم مان چکے ہیں کہ روح جسم میں داخل ہونے سے پیشتر بھی موجود تھی جس طرح وہ حقیقت موجود ہے جس کو حقیقی وجود کہتے ہیں۔ اور میں مجبور

ہوں کہ میں اس حقیقت کو دلائل کے ساتھ تسلیم کروں۔ میرے خیال میں اس
سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ میں خود کہہ سکتا ہوں نہ کسی کو کہنے کا موقع دے سکتا
ہوں کہ روح ایک توازن کا نام ہے ۔

اب سیمیاس اس سوال کو دوسرے رُخ سے دیکھو سقراط نے کہا
کیا تم خیال کرتے ہو کہ توازن یا کوئی دوسری ترکیب اپنے ترکیبی عناصر کے
علاوہ بھی کسی حالت میں موجود ہو سکتی ہے ۔

بالکل نہیں ۔

اور نہ ہی وہ عناصر سے زیادہ یا کم تکلیفیں برداشت کر سکتی ہے ؟

اُس نے اتفاق رائے کی ۔

پس توازن اُن عناصر سے پہلے موجود نہیں ہو سکتا جن سے وہ ترکیب
پاتا ہے بلکہ وہ اُن کے بعد وجود میں آتا ہے ۔

ہاں ہاں ۔

اور نہ وہ اپنے عناصر کے خلاف ہی کوئی حرکت کر سکتا ہے یا آواز بلند
کر سکتا ہے ۔

بہت کم اُس نے جواب دیا ۔

کیا فطرتاً ہر توازن اُس حالت پر قائم نہیں رہتا جس پر اُسے قائم
کیا جائے ؟

میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا اُس نے جواب دیا ۔

اگر یہ ممکن ہو کہ ساز کو زیادہ اچھی طرح درست کیا جائے تو کیا توازن
بھی زیادہ اچھا نہیں ہوگا جب کہ کم درست ہوئے پر اُس کا توازن
بھی کم ہوگا ؟

بالیقین ۔

کیا یہ روح کے متعلق بھی سچ ہے ؟ کیا ایک روح دوسری روح سے
زیادہ یا کم روح ہو سکتی ہے گو وہ فرق غیر معمولی ہی کیوں نہ ہو ؟

بالکل نہیں اُس نے جواب دیا ۔

تو پھر اُس نے جواب دیا ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا ایک روح کے متعلق یہ
نہیں کہا جاتا کہ وہ ذہین پاک اور اچھی ہے جبکہ دوسری بے وقوف
خراب اور بُری ہے ؟ اور کیا یہ صحیح نہیں ؟

ہاں یقیناً ۔

تو پھر نظریۂ توازن میں یقین رکھنے والوں کے خیال میں نیکی اور
بدی جو ہماری روحوں میں پائی جاتی ہیں کیا ہیں ؟ کیا یہ کوئی دوسری
قسم کا توازن اور اختلاف ہے ؟ کیا وہ یہ کہیں گے کہ ایک نیک روح
درست ہونے کی وجہ سے اپنے اندر کوئی توازن نہیں رکھتی ؟

میں سیمیاس نے کہا نہیں بتا سکتا ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسی
ہی بات کہیں گے ۔

لیکن یہ تسلیم کیا جا چکا ہے اُس نے کہا کہ ایک روح دوسری سے بڑی
یا کم نہیں ہوتی ۔ دوسرے لفظوں میں ہم مان چکے ہیں کہ ایک توازن دوسرے
توازن سے کم و بیش نہیں ہوا کرتا ۔ کیا ایسا نہیں ہے ؟

ہاں یقیناً ۔

اور ایک توازن جو کم و بیش توازن نہیں کم و بیش درستی پر مبنی
نہیں کیا جاتا ۔ کیا ایسا ہی ہے ؟

ہاں ۔

اور وہ درستی جو زیادہ ہے نہ کم، کم و بیش توازن کی ضامن ہے یا
یکساں توازن کی ؟

تو پھر ایک روح جو دوسری روح سے کم و بیش نہیں کم یا زیادہ درست
نہیں کی جاتی ۔

ٹھیک ہے ۔

اس لئے اُس میں زیادہ توازن یا اختلاف پیدا نہیں ہوتا ۔

یقیناً نہیں ۔

پس کیا ایک روح دوسری روح سے زیادہ نیک اور بد ہو سکتی ہے
جبکہ نیکی توازن اور بدی اختلاف ہے ؟

کسی طرح نہیں ۔

دوسرے لفظوں میں سیمیاس اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر روح
ایک توازن ہے تو کسی روح میں بدی نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ میرے خیال میں
ایک مکمل توازن میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا

یقیناً نہیں ۔

نہ ایک مکمل روح میں کوئی بدی ہو سکتی ہے ؟
نہیں استدلال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے -
تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام ذی حیات چیزوں کی روحیں یکساں طور پر نیک ہیں اور روحوں کی فطرت ہر جگہ یکساں رہتی ہے -
ہاں میں یہی سمجھتا ہوں سقراط اُس نے کہا -
کیا تم اس کو صحیح سمجھتے ہو اُس نے پوچھا اور کیا ہمارے استدلال کا حشر یہی ہوگا اگر یہ نظریہ کہ روح ایک توازن ہے صحیح ہو ؟
نہیں یقیناً نہیں اُس نے جواب دیا -
کیا اُس نے کہا جسم کے تمام اعضا میں تمہارے خیال میں صرف روح اور وہ بھی عقلمند روح ہی جسم پر حکومت نہیں کرتی ؟
کرتی ہے -
کیا وہ جسمانی خواہشات کے سامنے جھک جاتی ہے یا اُن کا مقابلہ کرتی ہے ؟ میرا مطلب یہ ہے کہ جب جسم گرم اور تشنہ ہو تو کیا روح اُس کو دور لیجا کر پانی پینے سے نہیں روکتی اور جب اُسے بھوک لگتی ہے تو کیا وہ اُسے کھانے سے منع نہیں کرتی ؟ اور کیا اس طرح ہم نہیں دیکھتے کہ روح ہزاروں جسمانی خواہشات کے خلاف چلتی ہے -
ہاں یقیناً -
لیکن ہم اس سے بھی اتفاق رائے کر چکے ہیں کہ اگر وہ ایک توازن ہے تو وہ جزر و مد اور اُتار چڑھاؤ کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھا سکتی اور کہ اُس کو اُن عناصر کا ساتھ دینا پڑتا ہے جن سے وہ مرکب ہے اور کبھی اُن کے خلاف نہیں چل سکتی ؟
ہاں اُس نے جواب دیا ایسا ہی ہے -
اب کیا ہم نہیں دیکھتے ہیں کہ روح اس کے بالکل خلاف چل رہی ہے - اور صرف اُن عناصر کی جن سے کہ اُس کی ترکیب ہوئی ہے رہبری ہی نہیں کرتی بلکہ عمر بھر تقریباً ہر چیز میں اُن کی مخالفت کرتی ہے - ہر طریقہ سے اُن پر حکومت کرتی ہے - اُن کو سزا دیتی ہے جو بعض اوقات بڑی سخت اور تکلیف دہ ہوتی ہے مثلاً ورزش اور معالجہ اور کبھی یہ سزا نرم ہوتی ہے بعض اوقات وہ خواہشات ، ارمان اور خوف کو سزا کا ڈر دیتی ہے گویا وہ اپنے سے ایک جُدا چیز سے مخاطب ہے جس طرح ہومر نے اوڈیسی میں اوڈیسیس کو کرتے ہوئے دکھایا ہے - جب وہ کہتا ہے کہ
"اُس نے اپنی چھاتی پیٹی اور اپنے دل کو ملامت کے طور پر کہا ضبط سے برداشت کر اے دل تو اس سے بھی زیادہ سختیاں سہ چکا ہے"
کیا تم سمجھتے ہو کہ جب ہومر نے یہ الفاظ لکھے تو وہ روح کو ایک توازن سمجھتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ وہ جسمانی خواہشات کی رہبری کرنے کی جگہ اُن کے اشارے پر چلتی ہے اور ایک توازن کی سی غیر ارضی شے ہوتے ہوئے بھی وہ جسم کی محکوم ہے ؟
یقیناً سقراط میں ایسا نہیں سمجھتا -
تو میرے اچھے دوست روح کو ایک توازن کہنا بالکل غلطی ہے - کیونکہ ایسی حالت میں ہم ہومر جیسے الہامی شاعر سے متفق ہوں گے نہ اپنے آپ سے -
یہ سچ ہے اُس نے جواب دیا -
بہت اچھا سقراط نے کہا - میرا خیال ہے کہ ہم اپنے تھیبا کے ہارمونیا کو مطمئن کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں - لیکن کیڈمس کے متعلق کیا کیا جائے سیبیس اُس نے پوچھا - ہم اُس کو کیونکر اور کس دلیل سے مطمئن کریں ؟
میں کہہ سکتا ہوں کہ تم اس کا کوئی ذریعہ نکال سکتے ہو - سیبیس نے کہا تمہاری دلیلوں سے ظاہر ہے کہ روح ایک توازن نہیں ہے وہ دلیلیں جنہوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا - جب سمیاس اپنے اعتراضات پیش کر رہا تھا تو میں اس بات پر متعجب تھا کہ کوئی اُس کے اعتراضات کو کس طرح رد کر دے گا - پس تمہاری تردید کے سامنے اُس کے تمام اعتراضات کو جھکتے ہوئے دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی - مجھے تعجب نہیں ہوگا اگر کیڈمس کے اعتراضات کا بھی یہی حشر ہو -
میرے اچھے دوست سقراط نے کہا حد سے زیادہ خود اعتمادی بہتر نہیں ورنہ کوئی چشم بد اُس دلیل کو جو پیش ہونے والی ہے غلط ثابت نہ کر دے تاہم اس چیز کو خدا پر چھوڑو - آؤ ہم بھی ہومر کے ہیرو کی طرح "بہادری سے آگے بڑھتے ہوئے" دیکھیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو صحیح ہے یا غلط - تمہاری گفتگو کا ماحصل یہ ہے - تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ میں ثابت کروں کہ روح غیر فانی اور ابدی ہے - کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو تم سمجھتے ہو کہ ایک ایسے فلسفی کا اعتماد جو موت پر یقین رکھتا ہے اور جو سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ دوسری دُنیا میں زیادہ بہتر رہے گا اس کی نسبت کہ وہ دُنیا ہی میں کسی دوسری قسم کی

دوسری قسم کی زندگی بسر کرے، بیوقوفی سے کم نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ دکھانا کہ روح زبردست اور دیوتا کی طرح ہے اور وہ ہمارے پیدا ہونے سے پہلے بھی موجود تھی کافی نہیں ہے کیونکہ اس سے اُس کا لافانی ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیرپا ہے اور عرصہ تک قائم رہتی ہے اور کسی گذشتہ حیثیت میں بھی کئی کام کر چکی ہے۔ تاہم اس وجہ سے وہ ابدی نہیں ہوسکتی۔ اُس کا جسم میں داخل ہونا ہی ایک مرض کی طرح اُسکی تخریب کا باعث ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ اس زندگی میں خراب ہوتے ہوتے آخر تباہ و ختم ہو جاتی ہے جس کو ہم موت کہتے ہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ اُسکا ایک یا زیادہ وقتوں میں جسم اختیار کرنا ہمارے لئے کوئی مطلب نہیں رکھتا کیونکہ کوئی بیوقوف ہی موت سے ڈرے گا اگر وہ یہ نہ جانتا ہو اور ثابت نہ کرسکتا ہو کہ وہ لافانی ہے۔ یہ ہے تمہارے اعتراض کا لب لباب میرے خیال میں سیبیس۔ میں اسکو بار بار اس واسطے دوہرا رہا ہوں کہ ہم کوئی بات بھول نہ جائیں اور تم اس میں ترمیم کرسکو اگر تم ایسا کرنا چاہو۔

سیبیس نے جواب دیا۔ نہیں۔ میرا مطلب یہی ہے اور میں اِس وقت کوئی ترمیم نہیں کرنا چاہتا۔

کچھ دیر ٹھہر کر سقراط سوچنے لگا۔ پھر اُس نے کہا تمہارا سوال آسان نہیں ہے۔ سیبیس۔ اس صورت میں ہم کو تخلیق اور تخریب کے تمام اسباب پر غور کرنا ہوگا۔ اگر تم کو ناگوار نہ گذرے تو میں اپنے تجربات بیان کروں اور اگر تم اُن سے اپنے شکوک کو دور کرنے میں کامیاب ہوسکو تو یہ بہت اچھا ہوگا۔

یقیناً سیبیس نے کہا میں تمہارے تجربات سُننا چاہتا ہوں۔

تو سُنو میں تمہیں بتاتا ہوں سیبیس اُس نے جواب دیا۔ عالمِ جوانی میں میری زبردست خواہش تھی کہ میں اُس علم کو حاصل کرلوں جسے [illegible] کہتے ہیں۔ ہر چیز کی علت کو سمجھنا میرے نزدیک بہت بڑی چیز تھا۔ کوئی چیز کیوں پیدا ہوتی ہے۔ کیوں ضائع ہو جاتی ہے اور کیوں موجود رہتی ہے۔ یہ سوالات ہمیشہ مجھے پریشان رکھتے تھے کہ کیا ذی حیات وجود جیسا کہ چند اشخاص کہتے ہیں آب و آتش سے اپنی آخری شکل اختیار کرتے ہیں؟ ہم خون کی مدد سے سوچتے ہیں یا ہوا یا آگ کی مدد سے؟ یا ان کی مدد سے نہیں بلکہ دماغ کی مدد سے جو دیکھنے سُننے اور سونگھنے کی قوتوں کا دینے والا ہے اور کیا یادداشت اور رائے ان قوتوں کا نتیجہ ہے جبکہ علم اس یادداشت اور رائے کی متحدہ کوششوں سے ماخوذ ہے؟ اس کے بعد میں ان چیزوں کی تخریب کے متعلق غور کیا کرتا تھا اور انقلابات کائنات پر بھی تا آنکہ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں اس علم کو حاصل نہیں کرسکتا۔ میں اس بات کو تم پر ثابت کردونگا ان علوم نے مجھے اس قدر کھو دیا تھا کہ میں وہ باتیں بھی بھول گیا جو اس سے پہلے مجھے اور دوسروں کو معلوم تھیں۔ وہ تمام باتیں جن کا علم مجھے ہو چکا تھا میرے دماغ سے محو ہوگئیں اور اُن میں تخلیق انسانی اور اُسکی پرورش بھی شامل تھی۔ پیشتر ازاں مجھے یقین تھا کہ انسانی نشو و نما کا انحصار کھانے پینے پر ہے کیونکہ کھانے پینے سے گوشت اور ہڈیاں بڑھتی ہیں اور جسم کے تمام حصوں کو تقویت پہنچتی ہے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ چھوٹا جثہ بڑی شکل اختیار کرلیتا ہے اور اس طرح ایک لڑکا ایک آدمی بن جاتا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں میرا یقین قابل تسلیم نہیں تھا؟

تھا۔ سیبیس نے کہا۔

اب میں تمہیں اپنا دوسرا تجربہ بتاتا ہوں۔ جب میں ایک لانبے آدمی کو ایک پست قد آدمی کے ساتھ کھڑے ہوئے دیکھتا تھا تو مجھے یقینی طور پر محسوس ہوتا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ اوّل الذکر مؤخر الذکر سے ایک سر کے قریب اونچا ہو۔ یا اسی طرح ایک گھوڑا دوسرے گھوڑے سے بڑا ہو۔ اس سے بھی زیادہ یقین مجھے اس بات پر تھا کہ دس اور آٹھ میں دو کا فرق ہے اور ایک چیز جس کی لمبائی دو ہاتھ ہو ایک ہاتھ لمبی چیز سے دوگنی بڑی ہے۔

اور تم اب کیا خیال کرتے ہو؟ سیبیس نے دریافت کیا۔

اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے ان میں سے کسی کی علت کے متعلق کچھ علم نہیں۔ جب تم ایک میں ایک کا اضافہ کرتے ہو تو مجھے یقین نہیں کہ وہ ایک جس میں ایک جمع کیا گیا ہے دو بن گیا ہے یا جمع کیا گیا ایک اور جس میں ایک جمع کیا گیا ہے اس اضافے سے دو بن گئے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُن کو جمع کرنے یا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھ دینے سے وہ دو بن جاتے ہیں جب کہ جدا گانہ طور پر دونوں ایک ایک تھے اور دو نہ تھے اسی طرح اگر ایک کو تم دو میں تقسیم کردو تو میں مطمئن نہیں ہوسکتا کہ یہ تقسیم

اُس کے ڈوب جانے کا باعث ہے کیونکہ ایک چیز جب ڈوبتی ہے تو
اُس کی وجہ کچھ اور ہی ہوتی ہے پہلی مثال کی وجہ تو یہ ہے کہ دو ایک
ایک چیزیں ایک دوسرے سے ملا دی گئی تھیں اور ایک کو دوسرے
میں جمع کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کو جُدا
کر دیا گیا ہے اور ایک کو دوسرے سے الگ کر دیا ہے نہ ہی میں یہ
سمجھ سکتا ہوں کہ ایک چیز دوسری چیز سے کیونکر پیدا ہوتی ہے مختصراً
یہ طریقہ مجھے نہیں بتا سکتا کہ ہر چیز کی تخلیق یا تخریب یا وجود کا کیا
سبب ہے۔ میرے دماغ میں ایک دوسرے طریقہ کا دھندلا سا تصوّر
ہے لیکن میں اِس کو اِس وقت تسلیم نہیں کر سکتا۔

لیکن ایک دن ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ وہ اناکسیگورس
(Anaxagoras) کی ایک کتاب میں سے پڑھ رہا تھا کہ دماغ
ہی ہے جو حکم دیتا ہے اور تمام چیزوں کا مبدا ہے۔ اس نظریہ کو معلوم
کر کے میں بہت خوش ہوا۔ یہ مجھے صحیح معلوم ہوتا تھا کہ دماغ تمام چیزوں
کی اصل ہے اور میں نے غور کیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو دماغ ہر چیز کو
بہترین ترکیب دیگا۔ پس اگر ہم تخلیق، تخریب یا وجود کی وجہ معلوم
کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں معلوم کرنا چاہئے کہ وہ چیز کس طرح بہترین
طریقہ سے موجود رہ سکتی ہے یا کام کر سکتی ہے، یا اس پر کام کیا جا سکتا
ہے پس آدمی کو یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس کے لئے کون سی
بات بہترین اور قابل ترین ہے۔ اس کا یقینی نتیجہ نکلے گا کہ اُسے
معلوم ہو جائے گا کہ کون سی چیز بُری ہے کیونکہ دونوں باتیں اسی
علم میں شامل ہیں۔ ان خیالات نے میری خوشی میں اضافہ کر دیا۔
میں نے خیال کیا کہ اناکسیگورس میں مجھے ایسا اُستاد مل گیا ہے
جو میرے خیال کے مطابق مجھے وجود کی علّت سمجھا سکتا ہے۔ اور میں
سمجھتا تھا کہ سب سے پہلے وہ مجھے بتائے گا کہ زمین گول ہے یا ہموار
اور پھر ثابت کرے گا کہ اس کی علت و ضرورت کیا ہے۔ اور زمین
کے لئے کونسی صورت بہترین ہے، اگر وہ کہتا کہ زمین کائنات کے
مرکزی حصّے میں واقع ہے تو میرے خیال میں وہ وضاحت سے بیان
کرتا کہ اس کے لئے ایسا ہونا ہی بہترین اور واجب تھا۔ اور اگر وہ
مجھ پر یہ بات روشن کر دیتا تو میں مطمئن ہو جاتا، اسی طرح میں سورج
چاند، ستارے اور اُن کی متعلقہ رفتار، گردش اور تبدیلیاں بھی
دریافت کرنا چاہتا تھا یہ سننے کے لئے کہ ان کے لئے کونسی بات
اور کام بہترین ہے میں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا جب اُس
نے کہا کہ دماغ تمام چیزوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے علاوہ بھی کوئی
وجہ بتائے گا کہ اُن کا ایسا ہونا ہی بہترین ہے، میرا خیال تھا کہ وہ
ہر چیز کو کسی علّت سے منسوب کرے گا، اور کائنات سے ایک علت
کو اور پھر بتائے گا کہ ہر چیز کے لئے بہتر کیا ہے اور سب میں اچھا کیا
ہے بے تاب ہو کر میں نے اس کی کتابوں کو اُٹھایا اور بڑے انہماک
اور تیزی سے اُن سب کو پڑھا تاکہ میں یہ جان سکوں کہ بہترین
کیا ہے اور بدترین کیا ہے۔

میری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں میرے دوست! جب
مطالعہ نے مجھ پر ظاہر کر دیا کہ مصنف نے دماغ کا ذکر ہی نہیں کیا۔
اور چیزوں سے متعلق کوئی دلیل پیش نہیں کی، اُس کی علتیں ہوا
فضا اور پانی جیسی عجیب چیزیں تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ کوئی
ایسا آدمی ہوگا جو یہ کہکر اپنا بیان شروع کرے گا کہ سقراط وہی کرتا
ہے جو دماغ کرتا ہے اور جو میرے اعمال کی وجوہ ظاہر کرتے ہوئے
یہ کہیگا کہ میں اب یہاں اس واسطے بیٹھا ہوں کہ میرا جسم نسوں اور
ہڈیوں کا مجموعہ ہے اور ہڈیاں سخت ہیں اور جوڑوں سے وابستہ
ہیں، جبکہ نسیں کھینچ سکتی ہیں اور پھیل سکتی ہیں اور ان کے ساتھ ہی وہ
گوشت جو اُن کو ترتیب میں رکھنے کے علاوہ ہڈیوں کو چھپائے
ہوئے ہے کھینچتا اور پھیلتا ہے۔ چنانچہ جب ہڈیاں اپنی جگہ سے
حرکت کرتی ہیں نسوں کا کھنچاؤ اور پھیلاؤ میرے لئے یہ ممکن بنا دیتا
ہے کہ میں اپنے اعضا کو جھکا سکوں پس اپنی ٹانگوں کو موڑ کر بیٹھنے
کی یہی وجہ ہے۔ اسی طرح وہ بتائے گا کہ میں تم سے کیوں باتیں
کر رہا ہوں اس کی وجوہ وہ آواز، ہوا، سماعت، غرضکہ ایسی
ہزاروں چیزوں کو ثابت کرے گا۔ لیکن وہ اس اصلی علّت کو
نظر انداز کر دے گا کہ جب سے اہل ایتھنز نے مجھ کو مجرم ٹھیرایا ہے

میں نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ یہاں بیٹھا رہوں اور ان کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں۔ کیونکہ سگ مصر کی قسم ہے کہ اگر میرے خیال میں ریاست کی مجوزہ سزا کو برداشت کرنا ہی بہترین اور باعزت نہ ہوتا تو یہ ہڈیاں اور نسیں بہت مدت سے میگارا یا بوشیا میں پہنچ چکی ہوتیں لیکن ان چیزوں کو علت بنانا سخت جہالت ہے، اگر یہ کہا جاتا کہ ہڈیوں نسوں اور جسم کے دوسرے حصوں کے بغیر میں اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوتا تو صحیح تھا لیکن یہ کہنا کہ میری حرکات کی بنا ہی یہی ہیں اور کہ اس طرح میں دماغ کی مدد سے کام کر رہا ہوں نہ کہ اس قوت سے جو نیک و بد میں امتیاز کرتی ہے لاپروائی اور بے بضاعتی کا ثبوت دینا ہے اس سے ظاہر ہے کہ آدمی اصلی علت کو اُس علت سے جُدا نہیں کر سکتا جو تمام علتوں کی علت ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق میرے خیال میں ہر وہ شخص گفتگو کرتا ہے جو تاریکی میں راستہ ٹٹولتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کا صحیح نام کیا ہے، اسی طرح ایک شخص کہتا ہے کہ زمین ایک مرکزی ستون پر قایم ہے جس کو آسمان سہارا دئے ہوئے ہیں، دوسرا کہتا ہے کہ زمین چپٹی ہے اور ہوا پر قایم ہے لیکن ان میں سے کوئی یہ معلوم کرنے کی سعی نہیں کرتا کہ ان دونوں کاموں کے پس پشت کون سی طاقت کام کر رہی ہے۔ نہ ہی وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ طاقت غیر ارضی ہے۔ بلکہ وہ اطلس کی تلاش کرتے ہیں جو اتنا مضبوط اور عقلمند ہے کہ دُنیا کو اپنے کاندھوں پر اٹھا سکے اور وہ ایک لمحہ بھی اس خیال پر صرف نہیں کرتے کہ یہ نیکی کی قوت جذب ہے جو تمام چیزوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر کوئی شخص اس قسم کی دلیل میرے سامنے پیش کرے لیکن میں خود یا کسی کی مدد سے ابھی تک اس دلیل کو نہیں پا سکا ہوں تاہم میں نے دوسرا طریقۂ کار اختیار کیا ہے اور میرا خیال ہے سیبیس کہ تم جاننا چاہتے ہو کہ وہ طریقۂ کار کیا ہے

یقیناً میں اُسے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے جواب دیا۔

91

نعرۂ قلندر

کہوں کیا کہ چیز کیا ہے تری ملتفت نگاہی
جو ملے تو پادشاہی نہ ملے تو روسیاہی

ہے کمالِ رقصِ صوفی بھی نشاطِ پادشاہی
بڑی مدتوں میں ٹوٹا یہ فریبِ خانقاہی

یہی امتیاز مجھ کو نہ کرے کہیں نمایاں
نہ ہو گر مری جبیں پر نہیں داغِ بے گناہی

ہے عجیب طرزِ سادہ مرا مسلکِ جنوں بھی
نہ اصولِ پادشاہی نہ طریقِ خانقاہی

مجھے کیوں ہو فکرِ شاہد کہ معاملہ ہے روشن
میں تری کھلی شہادت تو مری کھلی گواہی

میں ہوں نوجواں قلندر نہیں گدائے میکدہ ہوں
مری ٹھوکروں میں ساغر ہے غرورِ کجکلاہی

نعیم

اک تارا

دھیرے دھیرے چھیڑ مغنّی دھیرے دھیرے چھیڑ

(ایک نامکمّل نظم کے دو بند)

جھَن سے نہ دھرتی پر آ ٹوٹے جھِل مِل کرتا تارا
اوشا[1] کے ماتھے کی بندی پوشن[2] کا گھوارا
پڑا کمل پر سُپنا دیکھے جوبن رَس متوارا
مدن بان کی کلیوں میں ہے خوشبو کی اِک دھارا
دیکھ ترے راگوں کی دھمک سے کھیل نہ بگڑے سارا
دھیرے دھیرے چھیڑ مغنّی دھیرے دھیرے چھیڑ

میں دیوگن بے چاری ٹھیری من ماروں کا مارا
من ماروں کا مارا ہے تو سارا جگ دُکھیارا
نیّا میری ٹوٹی پھوٹی کوسوں دور کنارا
آشا کا اِک تارا ہے اِک تارے کی کیا سارا!؟
دیکھ ترے راگوں کی دھمک سے کھیل نہ بگڑے سارا
دھیرے دھیرے چھیڑ مغنّی دھیرے دھیرے چھیڑ

[1] صبح کی دیوی۔ [2] سورج دیوتا کی طرح ایک دیوتا۔

دُنیا کے فضلاء و اُمراء کے سنینِ وفات

(از ملفوظاتِ حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری مرحوم)

ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ

نام عبداللہ ابوالخیر۔ مشہور بہ ابوالخیر بن حضرت شاہ محمد عمر مدفون رام پور بن حضرت مولانا عبدالرشید صاحب مجددی نقشبندی دہلی میں جمعہ کے دن ۲۹ رجمادی الثانی ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۲۳ء انتقال فرمایا۔

بیدل۔ سید حامد حسین شاہجہاں پوری

شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے۔ رسالہ مخزن کے مدیر رہے۔ کلکتہ سے کلیم نامی رسالہ جاری کرنے کا قصد تھا۔ کلکتہ میں بیمار ہوئے۔ پانچ چھ مہینہ بھوپال میں سل و دق میں مبتلا رہ کر دہیں ۲۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو انتقال فرمایا۔ مرحوم کے خاندان میں سوائے ایک بڑی بہن کے جو لپنے گھر کی ہیں اور کوئی موجود نہیں ہے (ہمدرد دہلی ۵ فروری ۱۹۲۶ء)

مرزا بلاق

امیر الملک مرزا بلاق چشم و چراغ خاندان مغلیہ نے ۱۲ مارچ ۱۹۲۶ء کو بروز جمعہ ایک بجے دن کے دہلی میں انتقال کیا۔ صوفی منش صاحب حال و قال تھے۔ دیوان ــــــــ طبع ہو چکا ہے۔ نظام حیدر آباد کے ذلیفہ خوار تھے۔ کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی۔ (ہمدرد ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء دہلی)

حکیم محمد اجمل خاں دہلوی۔ مسیح الملک

ولد حکیم محمود خاں صاحب۔ ولادت ۱۸۶۶ء۔ رامپور میں خاص باغ کی کوٹھی میں قلب کے درد سے دسمبر کی ۲۸ تاریخ گزر کر رات کے اڑھائی بجے انتقال کیا۔ جنازہ موٹر پر دہلی بھیجا گیا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قاضی محمد عبدالغنی صاحب

ساکن منگلور۔ ضلع سہارن پور۔ یو۔ پی صاحب طریقت و رئیس اعظم تھے۔ ۲۷ رجب ۱۳۴۶ھ کو وطن میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالسلام عباسی پانی پتی

۲۳ شوال ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۹۲۸ء دن کے سوا بارہ بجے پانی پت میں انتقال ہوا۔ عربی، فارسی اُردو کے ادیب اور صاحب ثروت تھے۔ قاری عبدالرحمن صاحب محدث پانی پتی کے شاگرد رشید اور قاری صاحب مرحوم کا سلسلہ درس اُن کی ذات سے قایم تھا۔

عباس علی خاں صاحب

والد محمود علی خانصاحب مرحوم۔ فوج میں جمعداری رسالہ پنجم سے لیکر مختلف عہدوں پر رام پور میں ملازم رہے۔ عہدہ نظامت سے علیحدہ ہو کر خانہ نشین ہوگئے۔ میرے چچازاد بھائی تھے میری حقیقی بڑی بہن سے شادی ہوئی تھی۔ عرصہ سے مرض نقرس میں مبتلا تھے۔ آٹھ مہینہ صاحب فراش رہے۔ مجھ سے تین برس بڑے تھے۔ ۹ راگست ۱۹۲۹ء کو رات کو ساڑھے دس بجے انتقال

ہوا۔ اخیر وقت تک ہوش درست تھے۔ مگر زبان بند تھی قل ہو اللہ
پڑھی جاتی تھی۔ اور سکرات میں احدیت پر انگلی سے اشارہ کرتے
تھے۔ ۱۰ اگست کو میاں امیر شاہ صاحب کے احاطہ میں بموجب
وصیت حافظ بہادر علی خاں صاحب مرحوم کی پائنتی دفن ہوئے۔

مرزا بشیر الدین احمد خاں

ولد نواب علاؤ الدین احمد خاں
برادر خورد نواب فرخ مرزا
صاحب رئیس لوہارو۔ تھوڑی استعداد عربی کی تھی۔ فارسی کے ماہر
ایرانی سے فارسی پڑھی تھی۔ گوالیار اور انگریزی میں ملازم رہے۔
جے پور میں ڈیڑھ سو روپے ماہانہ منصب تھا۔ ریاست رامپور میں بھی کئی
سال مصاحبت میں رہے۔ فارسی میں نسیمی تخلص کے ساتھ نظم لکھتے تھے
باخدا۔ مرنجان مرنج اور دوست نواز تھے۔ ۲۲ر جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کو دہلی
میں انتقال فرمایا۔ اہل حدیث سے اُلفت تھی۔

میر باقر علی داستان گو

ساکن دہلی۔ محلہ کھجلا پہاڑی
داستان گوئی میں بے مثل
تھے۔ زبان اُردو کے ماہر۔ بات چیت میں پھول برساتے تھے۔ ان
کے مضامین ہمدرد اخبار دہلی میں نکلتے تھے۔ کانا باتی وغیرہ چند رسالہ
ان کی تصنیف سے ہیں۔ ۲۶ر جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔

شیخ عبد العزیز شاویش

۲۹ر جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کو
قاہرہ میں انتقال ہوا۔
یہ انگریزوں کے خلاف تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں مصر میں قید ہوگئے تھے۔
قسطنطنیہ۔ ماسکو۔ اور برلن میں ان کے تعلقات کی وجہ سے مصر کا
داخلہ بند تھا۔ مگر مصر میں وہ آئے اور ابتدائی تعلیم کے نگراں مقرر ہوئے
اخیر میں سیاسیات کو چھوڑ کر خانہ نشین ہوگئے تھے۔

جسٹس محمد رفیق صاحب جج ہائیکورٹ

و ممبر پریوی کونسل کا انتقال دہلی میں بتاریخ ۸ر فروری سنہ ۱۹۲۹ء حرکت قلب بند ہونے سے ہوا

مولوی عطاء اللہ خاں

عرصہ تک مڈل اسکول رامپور
کے ہیڈ مدرس رہے۔ اخیر میں

علی گڑھ یونیورسٹی میں دینیات کے مدرس تھے ۱۲ر نومبر سنہ ۱۹۲۸ء
کو رامپور میں انتقال ہوا۔ عربی کے عالم تھے، انگریزی میں بی اے
تک تعلیم تھی۔

سیدی محمد الحبیب ٹونس بک

۱۱ر فروری سنہ ۱۹۲۹ء
کو ٹونس میں انتقال
ہوا۔ اکہتر سال کی عمر ہوئی۔ اور سنہ ۱۹۲۲ء میں ٹونس کے فرماں روا
ہوئے تھے۔ سیدی محمد الحبیب ولد سیدی محمد المامون ابن سیدی
حسین ہیں۔ سیدی حسین سنہ ۱۸۵۵ء سے سنہ ۱۸۵۹ء تک ٹونس کے
فرماں روا تھے۔ یہ خاندان ترکی نژاد ہے۔ ان کے آباؤ اجداد
ترکی سپاہی تھے جنہوں نے قبرص فتح کیا تھا۔ سیدی مرحوم فنون لطیفہ
کے بڑے استاد تھے۔ شاعر بھی تھے۔ حال میں جب مولائی یوسف
سلطان مراکش پیرس گئے تھے تو اُن کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا
جو بہت مشہور ہوا۔ ان کی جگہ اب سیدی محمد الہادی کے چھوٹے بھائی
اور سیدی حسین کے صاحبزادہ حکمراں ہوئے ہیں جو سنہ ۱۸۸۲ء سے
سنہ ۱۹۰۲ء تک فرمانروا تھے۔ ان ہی کے بھائی محمد الصادق نے سنہ ۱۸۸۱ء
میں فرانسیسی سیادت قبول کی تھی۔ محمد الحبیب کے صاحبزادہ کا نام
سیدی محمود ہے جو اب حکمراں ہوئے ہیں۔

(از ہمدرد ۸ر مارچ سنہ ۱۹۱۹ء)

داؤد ایپسن

ایڈیٹر مسلم آوٹ لک کا انتقال بعارضہ نمونیا
۱۹ر فروری سنہ ۱۹۲۹ء کو ہوا۔ یہ خود مسلمان
ہوگئے تھے اور مسلمانوں کے طرفدار تھے۔ اخبار کیپٹل۔ انڈیپنڈنٹ
نیشن انگریزی اخبارات کے بھی ایڈیٹر رہے۔

حمید اللہ ولد مولوی بشارت اللہ

ابن مولوی سعد اللہ
انتقال بعارضہ اسہال
بتاریخ ۲۶ر اپریل سنہ ۱۹۲۹ء شب میں ہوا۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا
غیر کفو قوم سے چھوڑا۔

محمدی بیگم

بنت صاحبزادہ سجاد علی خاں مرحوم از بطن
صاحبزادی نواب سید محمد حامد علی خاں بہادر

کا انتقال بعارضہ دق یکم مئی ۱۹۲۹ء کو ہوا۔ مقبرہ جناب عالیہ میں مصطفٰے علی خاں کی قبر کی پائنتی دفن ہوئیں۔

صاحبزادہ امجد علی خاں

ولد نواب احمد علی خاں رئیس مالیر کوٹلہ کا انتقال ۲۱ مئی ۱۹۲۹ء کو مالیر کوٹلہ میں بعارضہ موتی جھرہ ہوا۔ اس لڑکے کا نکاح ۱۹۲۸ء میں بمقام دہرہ دون صاحبزادی لبنی بیگم صاحبہ بنت جناب نواب سید حامد علی خانصاحب بہادر دام ملکہم از بطن فرخی بیگم صاحبہ ہوا تھا۔

بدری نارائن (پنڈت) چودھری پریم گاون

رئیس مرزا پور۔ پرانے رسم و رواج کے پابند۔ ایڈیٹر ہندی رسالہ آنند کدم بینی۔ ڈرامہ نویس۔ پریسیڈنٹ ہندی سہتیا سمیلن کلکتہ ہندی کے مشہور شاعر۔ بھارتندو ہریش چندر کے دوست کا ۱۴ فروری ۱۹۲۳ء کو انتقال اپنے وطن میں ہوا۔ ایک لڑکا یادگار چھوڑا۔ ہندی نظم و نثر کے بڑے ادیب تھے۔

تاتار خاں

قوم کا ترک تھا۔ خراسان کا کوئی بادشاہ مع حاملہ بیوی کے ملتان اور دیپالپور پر حملہ آور ہوا۔ وہیں بچہ پیدا ہوا۔ پیدائش کے روز سلطان تغلق نے اُس پر حملہ کیا۔ بادشاہ فرار ہوگیا۔ یہ بچہ سلطان تغلق نے پایا۔ اور اس کو پرورش کیا۔ اور تاتار ملک نام رکھا۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں جوان ہوگیا۔ نہایت شجاع اور بہادر تھا۔ علم و فضل میں کامل تھا۔ تخلص تتار تھا۔ سلطان محمد تغلق ایک دفعہ ناراض ہوگیا تو تتار خاں نے یہ غزل بھیجی اور عفو حضور ہوگیا۔

دہ ندانم از کجا رنجیدۂ   بے سبب از دوستاں ببریدۂ

تفسیر تاتارخانی نہایت اہتمام سے لکھی اور فتاوائے تاتارخانی مرتب کیا۔ یہ فتاویٰ تیس جلدوں میں مرتب ہوا تھا۔ حج بھی کیا۔ سلطان فیروزشاہ (المتوفی ۷۹۰ھ) کے ابتدائی عہد حکومت میں انتقال کیا۔ نہایت دیندار وزیر تھا (تاریخ فیروزشاہی شمس سراج عفیف صفحہ ۳۸۸ مطبوعہ)

عبدالمجید خاں (کرنل)

سابق وزیر خارجیہ ریاست پٹیالہ انتقال وسط ۱۹۱۲ء۔ ٹرسٹی علی گڑھ کالج۔ ہمدرد قوم۔ علی گڑھ کالج سے بہت الفت تھی۔ مسلمان راجپوتوں میں راجپوت کانفرنس قایم کی۔ اپنا بہت روپیہ اور وقت اس کام میں خرچ کیا۔ باپ کا نام کرنل غلام رسول خاں تھا۔ وہ بھی پٹیالہ کے سردار تھے۔

عین الملک مولف ترسلی عین الملکی

مشہور عین ماہرو کے نام سے تھا۔ سلطان فیروزشاہ (المتوفی ۷۹۰ھ) آغاز جلوس میں دیوان وزارت بنایا۔ علم و فضل میں کامل تھا۔ اس کے بھائیوں کی حرکات ناشائستہ سے سلطان محمد تغلق نے کچھ دنوں نظر سے دور رکھا تھا۔ پھر سلطان نے بحال کردیا۔ سلطان فیروزشاہ کے عہد میں خان جہاں وزیر سے عین الملک کو کاوش تھی۔ اخیر کو معزول ہوا اور ملتان کا صوبہ دیا گیا مگر دیوان وزارت سے اس کو جدا کردیا (تاریخ فیروزشاہی شمس سراج صفحہ ۴۰۶ مطبوعہ)

خان جہاں وزیر کا انتقال ۷۷۰ھ میں ہوا اور شاہ نظام الدین محبوب الٰہی کے پاس دفن ہوا۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی

ابن مولوی عبدالوہاب

ابن مولوی عبدالرزاق ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء ۵ رجب ۱۳۴۴ھ بعارضہ فالج لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ صاحب تصانیف کثیرہ۔ نہایت خلیق۔ نیک نہاد متواضع تھے۔

خان بہادر منشی رضا حسین

قوم کنبوہ ساکن بریلی انگریزی اور فارسی میں معقول استعداد تھی۔ گورنمنٹ ممالک متحدہ کے میر منشی اور پریسیڈنٹ گورنمنٹ پریس رہے۔ دیانت اور نیک نیتی میں ضرب المثل تھے۔ جوان ہونہار بیٹا زہر کھاکر مرگیا۔ صبر و شکر سے زندگی بسر کی۔ ۷ اپریل ۱۹۲۱ء کو بعمر ستر سال بریلی میں

انتقال کیا۔ مرحوم کے عزیز اقبال حسین صاحب سے مجھے بھی خصوصیت تھی۔ ان کے ساتھ مرحوم کا بچہ بھی میرے ہاں ملنے کے لئے آیا تھا۔

بھگوتی پرشاد سنگھ بہادر کے۔ سی۔ آئی۔ ای

والئی ریاست بلرام پور۔ مہاراجہ اور سر کا خطاب تھا ۱۹ ؍جولائی ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۹۴ء میں مہاراجہ سر دگنج سنگھ نے بوجہ لاولدی متبنیٰ کیا۔ ۱۸۹۴ء میں بجائے سر دگنج سنگھ مسند نشین ہوئے۔ جولائی ۱۹۰۰ء میں اختیارات ریاست حاصل ہوئے ایک سال سے علیل تھے ۴ ؍مئی ۱۹۲۱ء کو لاولد انتقال کیا۔ بیالیس سال کی عمر ہوئی۔ کنور کم بہادر شاہ کو متبنیٰ کر لیا ہے۔ یہ راجہ زمیندار ہیں۔ بہت بڑی آمدنی زمینداری کی ہے کہتے ہیں ساٹھ لاکھ سال کی آمدنی ہے۔ کروروں روپے جمع ہیں اختیارات دیوانی و فوجداری بالکل نہیں ہیں۔

جیمس لاٹوش (سر)

لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ (ہندوستان)

ولادت دسمبر ۱۸۴۴ء قوم آئرش تھی۔ ۱۸۶۷ء میں ہندوستان آئے۔ مختلف عہدوں پر کام کیا۔ ۱۹۰۱ء میں لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ ہوئے۔ اور ۱۹۰۶ء تک اسی عہدہ پر رہے ۱۹۰۷ء سے تا ۱۹۱۴ء سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کے ممبر رہے ستتر برس کی عمر پاکر ۶ ؍اکتوبر ۱۹۲۱ء کو مر گئے۔

حسین رضا خاں حاکم صدر

ولد علی رضا خاں ساکن رامپور محلہ گھیر نجو خاں۔ قوم پٹھان۔ ہمیشہ سے معزز خاندان ہے۔ نجو خاں جو جنگ دوجوڑہ میں مارے گئے۔ ان کے خاندان سے ہیں۔ نوشت و خواند بہت معمولی اُردو کی ہے۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے انتقال (۱۸۸۷ء) کے بعد جنرل اعظم الدین خاں کا اقبال یاور ہوا۔ ان کو جمعدار رسالہ میں کر دیا۔ چند روز کے بعد ترک تعلق کیا عالیجناب نواب محمد حامد علی خاں بہادر نے ان کے فرزند اکبر کو شرف دامادی عطا فرمایا۔ اور یہ شرط ٹھیری کہ شیعہ مذہب پر تربیت ہوگی ان کو تحصیلدار کیا۔ پھر حاکم صدر مقرر ہوئے۔ مال کثیر جمع کیا۔ تاجران شہر سے ہر گاؤں میں نفع کی شرکت تھی۔ لاکھوں روپیہ آگیا۔ چند سال سے ذیابیطس کا عارضہ تھا۔ چھ مہینہ تک امراض کی شدت رہی ۲۶ ؍اپریل ۱۹۲۱ء کو منگل کے دن انتقال ہوا۔ نواب محمد حامد علی خاں بہادر خود تشریف لے گئے۔ اعزہ کی تسلی فرمائی۔ آنریری عہدہ میجر کا تھا۔ دفن کے وقت فوجی ماتمی جلوس بھی تھا ۲۷ ؍اپریل کو اس رنج میں تعطیل دفاتر دی گئی۔ اپنے گھر کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ فرزند اکبر نواب دولہ صاحب داماد دربار رامپور ہیں۔ فرزند اصغر کا نام حامد رضا خاں ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

رحمت اللہ ابراہیم کریم بھائی بمبئی

۲ ؍مئی ۱۹۲۱ء کو بعارضہ نمونیا انتقال ہوا۔ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر تھے۔ جمعہ کے دن تک اپنے کارخانہ کریم بھائی ابراہیم اینڈ کمپنی میں کام کیا۔ شنبہ کے دن بخار ہوا۔ دوشنبہ کے دن انتقال ہوا۔ ان کے مرنے سے ایک قومی کام کرنے والے کی کمی ہوگئی۔ میونسپل کارپوریشن میں خوب کام کیا۔ ۱۹-۱۹۱۸ء میں میونسپل کارپوریشن کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ اور کارخانہ داران انجمن کی ایسوسی ایشن کے چیرمین منتخب ہوئے۔ چیرمینی سے علیحدہ ہونے کے وقت نہایت زبردست تقریر متعلق کارخانہ جات صنعت و حرفت کی تھی۔

شمس الدین اعجاز رقم

نہایت اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بہت سے شاگرد ہیں۔ کاپی نویسی میں خوب شہرت پائی اور ان کے شاگردوں نے اعجاز رقم کے لقب سے مشہور کیا۔ نول کشور کے لکھنؤ کے مطبع میں ملازم تھے۔ ۱۵ ؍جولائی ۱۹۲۱ء کو انتقال ہوا۔

سب رس

اردو شاعری کی شاہکار کتابیں

باده مشرق .... مصنفہ ساغر نظامی قیمت صہ علاوہ محصول
صبوحی ...... (غزلیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″
سرودِ شباب (رباعیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت عہ ″
صبح نو ...... (نظمیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۱۲ر ″
ہدیۂ روح ..... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″
پیامِ سروش ... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″
حریم فطرت ..... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″
نقوشِ باقی ..... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″
صنم کدۂ حیات ... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″
حدیثِ گل ...... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″
غنچہ زار ...... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″
رموزِ میکدہ و روحِ بادہ (رباعیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″
جرعۂ آخریں .... (نظمیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″
ساغرستان .... (غزلیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۱۲ر ″
کارِ امروز (نظمیات) مصنفہ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی قیمت عہ ″

کلیم عجم (غزلیات) مصنفہ حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی قیمت ... عہ علاوہ محصول
اثرستان (غزلیات) مصنفہ نواب جعفر علی خانصاحب اثر بی۔اے۔ قیمت ... عہ ″
نقش و نگار (نظمیات) مصنفہ حضرت جوش ملیح آبادی قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ ″
شعلہ و شبنم (نظمیات) مصنفہ حضرت جوش ملیح آبادی قیمت ... ہے ″
فکر و نشاط (نظمیات) مصنفہ حضرت جوش ملیح آبادی قیمت ... عہ ″
شعلۂ طور (غزلیات) مصنفہ حضرت جگر مرادآبادی قیمت ... ہے ″
ضربِ کلیم (نظمیات) مصنفہ علامہ ڈاکٹر سر اقبال قیمت ... عہ ″
باقیاتِ فانی (غزلیات) مصنفہ حضرت فانی بدایونی قیمت عہ و عہ ″
سرودِ زندگی (غزلیات) مصنفہ حضرت اصغر گونڈوی قیمت ... عہ ″
بانگِ درا (نظم و غزل) مصنفہ ڈاکٹر سر اقبال قیمت عہ و ہے ″
اسرار و رموز (نظم) ″ ″ قیمت عہ مجلد عہ ″
پیامِ مشرق (نظم) ″ ″ قیمت ... ہے ″
جاوید نامہ ″ ″ ″ قیمت مجلد للعہ ″
خضرِ راہ ″ ″ ″ قیمت ... ۴ر ″
شکوہ و جواب شکوہ ″ ″ ″ قیمت ۴ر و ۶ر ″

شاہنامۂ اسلام (نظم) مصنفہ ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری۔ قیمت ہر دو جلد سے م علاوہ محصول

ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

اِرشاداتِ عالیہ

اعلیٰ حضرت ہز ہائینس نواب حافظ محمد سعادت علی خان بہادر بالقابہ فرمانروائے ٹونک

میری نیازمندانہ عرضداشت پر اعلیٰ حضرت نے اپنے ارشاداتِ عالیہ صفحاتِ ایشیا کے لئے عطا فرمائے ہیں۔ اس عطائے عالی پر ادارۂ ایشیا مجسم شکریہ ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ذوقِ شعری جس قدر بلند، لطیف اور دلنواز ہے اس کی ستائش کم از کم مجھ سے ممکن نہیں، مگر ہاں میں اس مصرعہ پر برسوں سر دُھن سکتا ہوں؟

"جو بھول کر یاد آگیا ہیں تو یاد کر کے بُھلا رہے ہیں"

ساغر

جو آہ و زاری سے وقتِ رخصت لگی ہوئی ہم بُجھا رہے ہیں
تسلّیوں سے تشفّیوں سے بُجھی ہوئی وہ لگا رہے ہیں

ابھی وہ آئے نہیں ہیں لیکن بندھا ہوا ہے خیالِ رخصت
تصوّر آنے کا اُن کے مجھ کو بتا رہا ہے کہ جا رہے ہیں

ہے اُن کا پہلے پہل یہ آنا خوشی کا حیرت کا کیا ٹھکانا
بجا ہے بیجا نہیں ہے جانا جو میرے اوسان جا رہے ہیں

وہی تو ایمانِ معرفت ہیں وہی تو جانِ عبودیّت ہیں
خودی کو اپنی جو کھو رہے ہیں جو خود کو تم پر مٹا رہے ہیں

خدا ہی جانے مآل کیا ہو پیامی تیرا خیال کیا ہو
ہم آپ اپنے کو کھو رہے ہیں پتہ تجھے کیا بتا رہے ہیں

بلا کے عیّار ۔ شوخ چنچل ۔ بلا کے ضدّی بلا کے چالی
کہ بات بگڑی ہوئی جو دیکھی تو اب بگڑ کر بنا رہے ہیں

یہ اُن کی آنکھوں سے مل رہی ہے، وہ اُن کے عارض سے مل رہا ہے
کھٹک رہی ہے نظر میں نرگس تو گُل پہ ہم خار کھا رہے ہیں

خیال میں جو بسے ہوئے ہیں اُنہیں نے دیوانہ کر دیا ہے
اُنہیں نے اندھا بنا دیا ہے نگاہ میں جو سما رہے ہیں

نہ وعدہ آنے کا کر گئے وہ نہ ہم کو گھر ہی بُلا گئے وہ
یہ کہہ گئے ہیں خدا کو سونپا تو ہم بھی دُنیا سے جا رہے ہیں

عزیز و ہمدم سے کوئی پوچھے اس آہ و زاری سے مدّعا کیا
ہم اپنی میعاد ختم کر کے جہاں سے آئے تھے جا رہے ہیں

کہا سعیدؔ اور پھر کہا یوں یہ نام کس کا ہے ہم نہ سمجھے!؟
جو بھول کر یاد آگیا ہیں تو یاد کر کے بُھلا رہے ہیں

ایشیا اور اُردو ادب کے سرپرست عالی جناب شیخ عبدالخالق بی اے ولی عہد بہادر ریاست مانگرول دام اقبالہ نے بطورِ خاص صفحات ایشیا کے لئے اپنی یہ تازہ غزل عطا فرمائی ہے۔ میں اس لطف و کرم کا بیحد شکر گذار ہوں۔ غزل کی بے ساختگی شوخی اور لطافت دلنوازہی نہیں دلدوز بھی ہے۔

(ساغر نظامی)

تری چشمِ سرور آگیں کو ہم میخانہ کہتے ہیں ۔۔۔ لبِ رنگیں کو ہم دو آتشیں پیمانہ کہتے ہیں

ہو تو ہی مدعا جس کا اُسے مستانہ کہتے ہیں ۔۔۔ قصور و حور جو چاہے اُسے دیوانہ کہتے ہیں

شکستِ کاسۂ دل کی جو میں فریاد کرتا ہوں ۔۔۔ تو ہنس کر قیس اور لیلےٰ کا وہ افسانہ کہتے ہیں

ہماری عشق بازی پر ہے واعظ معترض لیکن ۔۔۔ نہو جس دل میں یہ جذبہ اُسے ویرانہ کہتے ہیں

جو ہو نا آشنا اندازِ ایثار و محبت سے ۔۔۔ اُسے اسرارِ لطفِ زیست سے بیگانہ کہتے ہیں

ہوں انساں جانتے ہیں اور پھر بھی آزماتے ہیں ۔۔۔ اسی انداز کو اندازِ معشوقانہ کہتے ہیں

سُنی تم نے بھی خالقؔ حضرتِ واعظ کی بے ربطی

جوانی میں جحیم و خلد کا افسانہ کہتے ہیں

جب کوئی دوست جذبات کا پجاری ہو کر حُسن و عشق کی خلوتوں میں داد عیش دینے لگے تو امن پسند بندگانِ اخلاص کے لئے دوستانہ تشدد کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، ــــــ اب آپ اس کو دوستی کی سپر اندازی کہہ لیجئے، یا تعلق کی تہذیب و شرافت۔ بہرحال جس کے ہاتھ حُسن کی شانہ گیری میں مصروف ہوں، اس سے دست و گریباں ہونے کی کس میں طاقت ہے، ــــــ ! ؟

ایک مشہور میرٹھی شاعر دوست جب یوں ہاتھ سے جاتا رہا تو اس کی تلافی اسی طرح ہوسکتی تھی کہ اسکے اور اپنے ایک دوسرے ہم پیشہ و ہم ذوق دوست کو خلوت سے کھینچ نکالا جائے اور ثابت کر دیا جائے آپ اپنی بُت گری و بُت پرستی پر اس درجہ نازاں کیوں ہیں، کنارِ آذر ہی سے ابراہیم پیدا ہوتے ہیں،۔

"کہ خاکستر ہی کرتی ہے بالآخر اک شرر پیدا"

یہ چند اشعار جو بلیغ فکر، وسیع جذب اور گہرے لطیف کیف کے حامل ہیں میرے لئے مخصوص تھے مگر آپ جانتے ہیں میں بخیل نہیں اس لئے آپ کو بھی شریک لطف کرتا ہوں، یہ اُسی بانسری کے نغمے ہیں جو ابھی اپنے خیال میں محض شنیدہ نے ہے۔ اے کاش لَے نواز محسوس کرسکتا کہ اُس کا سینہ تو سوزِ فطرت کے نغموں سے کبھی کا پھنک چکا ہے۔

ساغر

خود اپنی پرستش کرتے ہیں کچھ دیر و حرم سے کام نہیں ۔۔۔ وہ طرزِ نیازِ خاص ہے یہ جو کفر نہیں اسلام نہیں

ہے جوشِ عطائے ساقی بھی کب وجہِ سکونِ تشنہ لبی ۔۔۔ یا جام بقدرِ بادہ نہیں یا بادہ بقدرِ جام نہیں

ہم توڑ دیں قیدِ ہستی بھی یہ قیدِ قفس تو چیز ہے کیا ۔۔۔ اک جنبشِ قلبِ مضطر میں یا ہم ہی نہیں یا دام نہیں

ہمت ہی نہیں کی ورنہ ابھی اک جست میں منزل جا لیتے ۔۔۔ کٹتی ہے کہیں یوں راہِ طلب دو گام چلے دو گام نہیں

آزاد رہے ناکام جیئے پابند بھلا کیا شاد رہیں

ہو صحنِ چمن یا کنجِ قفس ہم کو تو کہیں آرام نہیں

پروفیسر حبیب الرحمٰن صدیقی ایم اے
(میرٹھی)

فردوسِ ریاض

(از قاضی محمد ریاض الدین انصاری ریاض ایم۔اے۔بی ٹی (علیگ) لشکر)

مولانا حالیؔ کے زمانے سے اب تک اک شور ہے کہ شاعری کو اصلاحی جذبات کا حامل ہونا چاہئے۔ مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ اسکے لئے شاعری میں یا اسکے اصناف وآئین میں انقلاب کی ضرورت نہیں ہے۔ اسکے لئے تو ذہنی اور قلبی انقلاب کی ضرورت ہے، یعنی وہ سانچہ بالکل بدل جانا چاہئے جس میں اس وقت تک فکر و احساس ڈھلتے رہے، ہر با فکر کیلئے آج ذہنیت اور نقطۂ نگاہ میں تغیر لابدی ہے، مگر اسکے باوجود میں شاعری میں بالواسطہ تو عیظ وتلقین کا قطعی قائل نہیں اور بے روح وبے اصل تغزل کو دفن کردینے کے قابل سمجھتا ہوں، ول اقبال کو دیکھ کر الفاظ اور "مومنیت" کے نقال تو بن جاتے ہیں مگر کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ہمیں ایسا کیوں کرنا چاہئے۔ لوگ غلط خیال کررہے ہیں؛ اقبال اس وقت شاعری اور شعریت کے آخری مرکز پر نہیں ہے بلکہ فکر اور اپنے فلسفۂ خودی کی چوٹی پر ہے، جہاں پہنچکر جذبات کی حیثیت ختم ہوجاتی ہے مگر کاروبارِ حیات محض فلسفے سے نہیں چل سکتا زیادہ تر اس کے لئے جذبات کی ضرورت ہے، جہاں تک جذبات محبت کا تعلق ہے انسان پتھر کا بھی ہوجائے تو ان سے بچ نہیں سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعری نے کہاں تک ان جذبات کی صحیح خدمت کی ہے جو لوگ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے اس کو دیکھنے کے عادی ہیں ان کا یہی اعتراض ہے کہ اُردو تغزل میں بہت کم "رومانی وجودیت"

پائی جاتی ہے۔ یہ "رومانی وجودیت" زندگی کو نہ سمجھنے غلط احساس اور رکھو کھلے معاشری نظام کے غلام بنے رہنے کی وجہ سے شاعری میں پیدا نہیں ہوسکی۔ شاعری کو امراء کی نشاط انگیزی اور بزم آرائیوں کا کھلونا بنا دینے کی وجہ سے بلندافکاری کی منزل نصیب نہ ہوئی۔ ہم نوابوں کے دماغوں سے سوچتے تھے اور ہمارے سینوں میں نوابوں کے دل رکھے ہوئے تھے۔ دماغی طور پر شاعر فروخت ہوچکا تھا اور اسکے عوض محاورات اور الفاظ کی بازی گری اس کو حاصل ہوگئی تھی۔

اب ہر چیز نے کروٹ لی ہے اور نقطۂ نگاہ میں انقلاب پیدا ہوا ہے، بعض لوگ شعر کو "مذہب" کا درجہ دینے لگے ہیں، یہ اس ماحول سے کتنا مختلف ہے کہ ایک زمانے میں بزرگوں کے سامنے شعر پڑھنا، مخربِ اخلاق خیال کیا جاتا تھا۔

گو قاضی ریاض الدین انصاری ایم۔اے نے قدیم شاعرانہ "اسکول" کی آغوش میں پرورش پائی ہے، مگر ان کا کلام "رومانی حقیقت نگاری" کا آئینہ دار ہے، اور لذتیت، تاثیر کی بے ساختہ شہد آفرینی، ان کے دل اور ان کی روح کے ارتقاء وتکمیل کا پتہ دیتی ہے۔

دنیا میں اگر میں ڈرتا ہوں تو "دوست" سے کہ اس سے زیادہ خطرناک مخلوق افریقہ کے کسی جنگل میں بھی نہ پائی جاتی ہوگی اس لئے میں ایسا خطرناک خطاب تو ریاض کو نہیں دے سکتا مگر ان کے مداحوں میں ضرور ہوں، وہ ایک سلیم الطبع، گوشہ گیر اور من موہن انسان ہیں۔

ساغر

غزل

جاتی نہیں ہے اُن کی محبّت کو کیا کروں
اللہ اپنے دل کو، طبیعت کو کیا کروں

کرتا ہوں اُن سے ملنے کی تدبیر گو ہزار
قسمت ہی جب بُری ہو تو قسمت کو کیا کروں

روزِ ازل سے حُسن طبیعت کو ہے پسند
اِس حُسنِ ذوق، حُسنِ طبیعت کو کیا کروں

دنیا پڑی ہے میری تو ناصح خطا معاف
میں تیری پندِ ترکِ محبّت کو کیا کروں

محتاط ہے ہزار مرا عشقِ سادہ دل
حُسنِ فریب کار کی فطرت کو کیا کروں

اوّل تو ترکِ عشق پہ راضی نہیں ہے دل
دل پھر بھی مان جائے طبیعت کو کیا کروں

خود کو تو روک لوں گلۂ جور سے مگر
یہ کہیئے دل کی خوئے شکایت کو کیا کروں

گو واقفِ مصائبِ انجام ہوں مگر
آغازِ دلفریبِ محبّت کو کیا کروں

مانوس عشق میں تو نہیں اپنی ذات سے
لیکن اداشناسیٔ فطرت کو کیا کروں

مانا کہ مستحق وہ وفا کے نہیں مگر
پابندیٔ رسومِ محبّت کو کیا کروں

اس کو سُنا تو اُن کے بھی آنسو نکل پڑے
پُر دردیٔ بیانِ محبّت کو کیا کروں

ہر چند اب بدل گئی طرزِ غزل ریاضؔ
میں اپنے ذوق و رنگِ طبیعت کو کیا کروں

مسلسل غزل

آ کہ میری زندگی ناکام ہے تیرے بغیر — دل بہت بے چین، بے آرام ہے تیرے بغیر

آ کہ ہر لحظہ ترقّی پر ہے درد و اضطراب — ہر نَفَس اِک موت کا پیغام ہے تیرے بغیر

آ کہ مٹتا جا رہا ہے اب سکونِ زندگی — چَین کے بدلے خدا کا نام ہے تیرے بغیر

آ کہ بڑھتی جا رہی ہیں رات دِن مایوسیاں — ہر گھڑی اک نزع کا ہنگام ہے تیرے بغیر

آ کہ اب بے کیف سی رہنے لگی ہے زندگی — صبحِ لطف و عیش غم کی شام ہے تیرے بغیر

آ کہ مٹتا جا رہا ہے لُطفِ احساسِ وجود — زندگی یعنی برائے نام ہے تیرے بغیر

آ کہ اب دل کو کسی پہلو نہیں صبر و قرار — جان وقفِ حسرت و آلام ہے تیرے بغیر

آ کہ ہیں بے لُطف بزمِ عیش کی رنگینیاں — کِس قدر بے کیف دَورِ جام ہے تیرے بغیر

آ کہ تکمیلِ وفا کے واسطے مضطر ہے دل — عشق اک آغاز بے انجام ہے تیرے بغیر

اب نہ وہ اگلی سی راتیں، اب نہ وہ پہلے سے دِن — اب نہ صبح و شام صبح و شام ہے تیرے بغیر

آرزوئے زیست، شوقِ دید، ارمانِ وصال

دل کی جو حسرت ہے، وہ ناکام ہے تیرے بغیر

افکارِ رزمی

ستمبر ۱۹۴۳ء نمبر میں "گفتار و کردار" کے عنوان سے حضرت رزمی صدیقی کی ایک نظم شائع کی جا چکی ہے۔ یہ نظم اصلاحی خیالات سے معمور تھی۔ اصلاحی نظم میں میرے خیال سے کسی شاعر کی اصلی جودت اور صحیح وجدان کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ "آپ بیتی" میں شاعر کے جوہر کھلتے ہیں۔ اور جو "جگ بیتی" کے بیان کرنے پر بھی قادر ہو، اسکے کیا ہی کہنے۔ زیر نظر "ایشیا" میں رزمی صاحب کی دو غزلیں "آپ بیتی" اور "جگ بیتی" کے عنوان سے شائع کی جا رہی ہیں۔ جس میں تغزل، قدرت کلام اور فکر کی تیز روح پائی جاتی ہے۔

میری نہ نبھی برہمن عہد شکن سے! — بُت سے بھی وہ پھرتا نہیں بھولا ہیں خدا کو

کیا شبابِ فکر ہے، سیاسیات پر کیسا شاعرانہ انتقاد ہے۔

برہم وہ ہوئے عاشقِ مشرک مجھے سمجھے — طنزاً بخدا میں نے پکارا تھا خدا کو

اڈیٹر

"جگ بیتی"

آدابِ خرام اب میں سکھاؤں گا صبا کو — روندا تو ہے اس نے ترے نقشِ کفِ پا کو

آہ، سرد پسینہ مرے ماتھے کا سُکھا دے — پہنچی ہے دوا بھی کہیں دامن کی ہوا کو

کرتی ہے مرے در سے ترا نقشِ قدم محو — گیسو کی ترے بُو نہ ملے موجِ صبا کو

ظلمت میں شبِ ہجر کی جگنو بھی نہ چمکے — زینت ہے حرام آج مرے گھر کی فضا کو

فرمایا مرے سر سے قدم اپنے ہٹا کر — ہم خوب سمجھتے ہیں تری لغزشِ پا کو

برہم ہوئے وہ عاشقِ مشرک مجھے سمجھے طنزاً بخدا میں نے پکارا تھا قضا کو

آپ بیتی

جینا ہو تو ملحوظ رکھ آئینِ بقا کو مرنا ہو تو رسوا نہ کر آدابِ فنا کو

کوئی نہ مرے قافلے والوں کو جگائے سُن کر ابھی سوئے ہیں یہ آوازِ درا کو

میری نہ نبھی برہمنِ عہد شکن سے بُت سے بھی وہ پھرتا نہیں بھولا میں خدا کو

نیکی کا یقیں، جُرم کی لذّت ہے خطر میں اللہ بدل دے خبرِ روزِ جزا کو!

پُر چاک ہیں پتّے جو ہوا میں متحرّک یہ شانے ہیں کیا گیسوئے امواجِ ہوا کو

کافر میں خدا سے ترا شکوہ نہیں کرتا رونے دے بغاوت نہ سمجھ یادِ خدا کو

صیّاد مری قوّتِ پرواز سے انکار!؟ اب جب میں ترسنے لگا آزاد ہوا کو

دُکھا ہوا دل، ضبط، کی حد، آہ کی نیّت یارب! یہ پُرانے ہیں سنبھال ارض و سما کو

رسوائی میں اتنی نہ تھی ایذائے ندامت اِس تیری خطا پوشی سے پہنچا میں سزا کو

ہر بات میں لب ملتے ہیں اُٹھ جاتے ہیں ہاتھ
رزمی کبھی تم وہم سمجھتے تھے دُعا کو

عذرا کی آمد

(حضرت نازؔ انصاری سہارنپوری)

آیشیا کو یہ فخر ہے کہ وہ "جدت" کا ناشر ہے۔ اور اس کا مقصد زندگی کے تمام کاروبار میں ایک انقلاب آفرینی ہے۔ ہر قوم میں ادبی انقلاب ہی قومی زندگی کی تعمیر و حیات کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اس وقت قومی زندگی کے اُن خشک ستونوں سے بحث نہیں ہے جو معاشری اور سیاسی وزن کو اٹھاتے ہیں۔ اس وقت بحث ہے اُن جزوی محرکات سے جو کسی قوم میں نئی حیات پیدا کرتے ہیں۔ شاعری نئی زندگی کا آئیڈیل پیش کر سکتی ہے۔ ہم بہت دنوں تک شاعری کو "گناہ" سمجھتے رہے ہیں۔ یہ مروجہ معاشرت کی سیہ کاری کا نتیجہ تھا۔ ہم نے سماج میں دو طبقے مقرر کئے، ایک طبقہ عورتوں کا اور دوسرا مردوں کا، اسکے بعد قوم میں غلط اور ٹیک رہا "لٹریچر پیش کیا گیا"، جو ہماری اپنی مردوں کی خود غرضی کا انتہائی کریہہ نمونہ تھا، مردوں کی لائبریری عورتوں کے دیکھنے کے قابل نہیں ہے، کیونکہ انسانی طور پر ہم نے حقیقی مخلوط زندگی کو اختیار ہی نہیں کیا۔

اب یہ دور ختم ہو جانے والا ہے۔ اسی لئے شاعر کے رومانی نقطۂ نگاہ میں انقلاب فطری اور لابدی ہے۔ یہ نظم ان نظموں سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے جو اس سے قبل آیشیا میں شائع کی گئیں۔ خصوصاً ریحانہ جو صابر امرتسری کی نہایت رنگین نظم ہے۔ بہرحال نازؔ کی یہ نظم شباب اور کیف و مستی کی آئینہ دار ہے۔ اس میں جوانی پائی جاتی ہے۔ لکھنؤ اور قدیم طرز کے اردو شعرا کی المناکی کا یہ بہترین طرز عمل ہے۔ خصوصاً اس کا آخری بند۔

ساغرؔ

بہارِ حُسن سے پھولوں کو شرماتی ہوئی آئی
ادا سے مسکراتی نور برساتی ہوئی آئی
جوانی کے نشے میں چور لہراتی ہوئی آئی

وہ لہراتی ہوئی آئی وہ اٹھلاتی ہوئی آئی
وہ دیکھو! میری عذرا پھول برساتی ہوئی آئی

نوائے مدہوش

(شیخ علی بخش صاحب مدہوش گوالیاری)

مشکل ہے تو ایک ہماری دار کا خطرہ رہتا ہے ، ورنہ موجودات کا ذرّہ ذرّہ انا الحق کہتا ہے

اشکِ الم کیا چیز ہے اے غمخوار اسے تو کیا سمجھے ، آہ یہ میرا دل ہے جو پانی ہو ہو کر بہتا ہے

عشق والم میں گریۂ غم کی پوچھتے کیا ہو غمخوارو ، دل جب بھر آتا ہے پہروں مینہ سا برستا رہتا ہے

شکوہ شکایت ننگِ وفا ہے وہ یہ بھی تو سوچینگے ، آخر کچھ تو بات ہے یہ جو ظلم ہمارے سہتا ہے

لوگ یہ کہتے ہیں کہ عبث کیوں جان گھلاتے رہتے ہو ، اشک بہاتے رہنے سے کچھ جی تو ہلکا رہتا ہے

آخر کب تک بسترِ غم پر مُنہ ڈھانپے روتے رہیے ، کون بچا ہے رسوائی سے کس کا پردہ رہتا ہے

مست بقا مدہوش ہی یا منصور ہی پر موقوف نہیں
دریا میں مل جائے جو قطرہ وہ کب قطرہ رہتا ہے

محبّت کا سفر

(مجید احمد صاحب تاثیر (متعلم طبیہ کالج دہلی)

نگاہوں میں آئی ہوئی تیرگی ہے　　خیالوں پہ چھائی ہوئی بیکسی ہے
بہت روز سوچا یہ کیا زندگی ہے　　کہاں تک اب اس سوچ میں کھپائیں

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

وہی شام و شب ہے وہی ہے سحر بھی　　وہی ہیں پُرانے سے دیوار و در بھی
طبیعت بھی اُکتا گئی ہے نظر بھی　　نگاہوں کو دُنیا نئی اک دکھائیں

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

یہ کھیتوں کے اُس پار ندّی پہ جانا　　نہانا، اُچھلنا، اُچھلنا، نہانا
خوشی سے گذرتا تو ہے گو زمانہ　　مگر آج کچھ اور خوشیاں منائیں

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

یہ کیا راگ چھیڑا ہے بادِ صبا نے   یہ کیا کر دیا مجھ کو موجِ ہوا نے

بہت دور سے آئی ہیں یہ صدائیں   نہیں، اس جہاں کے نہیں یہ ترانے

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

جہاں ابتدا انتہا کچھ نہیں ہے   جہاں یہ فنا یہ بقا کچھ نہیں ہے

اُسی دیس میں پریم کے گیت گائیں   محبّت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

نہیں واں چمکتی ہوئی بجلیاں ہی   نہیں واں لرزتے ہوئے آشیاں ہی

نہ چھائی ہوئی رنج و غم کی گھٹائیں   نہ ہے یہ زمیں ہی نہ یہ آسماں ہی

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

یہ مانا کہ رستے میں دشواریاں ہیں   یہ مانا کہ ہم بے جرس کارواں ہیں

مگر ہم چراغِ محبّت جلائیں   یہ مانا کہ ہر سمت تاریکیاں ہیں

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

بہت خوشنما بقعۂ نور وادی   ہے وہ جو یہاں سے بہت دور وادی

چلو اُس کے پھولوں میں مسکن بنائیں   مسرّت کے پھولوں سے معمور وادی

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

ستارہ ہوں میں اور ہو آسماں تم مجھے چھوڑ کر جا سکو گے کہاں تم
جہاں تم وہاں میں جہاں میں وہاں تم من و تو کے یہ تفرقے سب مٹائیں

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

فلک کی بلندی کو پستی بنا کر مہ و مہر انجم سے بھی دور جا کر
وجود و عدم راستے سے ہٹا کر بہت دور جائیں بہت دور جائیں

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

نغمۂ ناتمام

(محترمہ خورشید اقبال صاحبہ حجاب میرٹھی)

جو تھی وجہِ سرور و عشرتِ دل ہے تصور میں وہ بہار ہنوز
حُسن کی کم نگاہیاں ہیں وہی ہے وفا عشق کا شعار ہنوز
آرزو کی کھٹک سی باقی ہے دِل میں پیوست ہے، یہ خار ہنوز
ہے اُسی شان سے تصور میں تابشِ حُسنِ سحر کار ہنوز
وہ نہ آئیں گے ہے یقین۔ مگر روح کو ہے اِک انتظار ہنوز
اُن کے جلوے کی تابشیں، اللہ! روح ہے میری طور زار ہنوز
میری دُنیا میں انقلاب نہیں میں ہوں، اور ایک اضطرار ہنوز
مجھ پہ طاری ہے بیخودی اب تک اُن کا جلوہ ہے کامگار ہنوز

ہو گئی دِل کی کائنات اُداس
روح پھر بھی ہے بے قرار ہنوز

حدیثِ میکدہ

(از جناب مشرف الحق دھلوی)

تا کجا انجام بینی تا بکے وہمِ زیاں
لا پلا پیرِ مغاں جامِ شرابِ ارغواں

دیکھتا ہوں میں کہ ہے ہر چیز کی غایت عذاب
ایک دھوکا ہے نظر میں میری امیدِ ثواب

بسکہ غم نے کر دیا ہے شیشۂ دل چور چور
دل میں اب باقی نہیں ہے خواہشِ غلمان و حور

کوثر و تسنیم کا جویا نہیں ہے دل مرا
لا پلا پیرِ مغاں صہبائے انگوری پلا

چھا رہی ہیں میکدہ پر عشرتوں کی بدلیاں
جس طرف دیکھو برستی ہیں فضا سے مستیاں

آ رہی ہے کان میں شیریں صدائے چنگ و نے
ڈھل رہی ہے جام میں سیّال مستی یعنی مے

ہر کوئی مسرور و شاداں ہے کوئی خنداں جبیں
دہر میں فردوس کا نقشہ ہے میخانہ نہیں

مردہ دل کرتے ہیں آ کر اکتسابِ زندگی
ضو فگن ہے اس زمیں پر آفتابِ زندگی

ساغرِ دل میں سمو کر مستئ جامِ شراب
پھونک دی جاتی ہے رگ رگ میں بہارِ روحِ شباب

خاک ہو جاتی ہیں قصرِ غم کی بنیادیں یہاں
ٹھوکریں کھاتی ہیں اہلِ زر کی بیدادیں یہاں

پوچھا جاتا ہے یہاں حرماں نصیبی کا مزاج
کر دیا جاتا ہے دم بھر میں غریبی کا علاج

اِس جگہ آکر فنا ہوتے ہیں انسانوں کے روگ
جنّتِ ارضی ہے جس کو میکدہ کہتے ہیں لوگ

میکدہ پیرِ مغاں ہے ایک دُنیائے سرور
کیف و مستی سے فضائیں جسکی ہیں معمورِ نور

تیرے شیشہ میں نظر آتی ہے صہبائے حیات
رقص کرتی ہے ترے ساغر میں رُوحِ کائنات

تیرا مینا جامِ جم آئینۂ اسکندری
تیری صہبا آبِ حیواں، آفتابِ کوثری

دو گھڑی آلامِ انسانی بُھلا دیتی ہے یہ
مفلسوں کو تختِ شاہی پر بٹھا دیتی ہے یہ

نور ہے سیّال اک صہبا جسے کہتا ہے تو
جامِ جم ہے بیخبر ساغر جسے سمجھا ہے تو

ہاں مجھے معلوم ہے شیریں نہیں یہ جامِ جم
تلخ ہے لیکن غمِ ایّام کی تلخی سے کم

گر غمِ ایّام کی تلخی کے بدلے ہیں مِلے
یہ تو مے ہے زہر کی تلخی گوارا ہے مجھے

ظلم و جورِ آسماں آفاتِ دُنیائے دنی
سرد مہریِ زمانہ دوستوں کی دشمنی

تیرہ بختی، کم نصیبی، آفتیں، فکرِ معاش
دشمنوں کے درمیاں ہمدرد صورت کی تلاش

اہلِ دانش پر ستم رانیِ چرخِ دوں نواز
جاہلوں کے بالمقابل نازوالوں کا نیاز

بھول جانے دے مجھے سب بھول جانے دے مجھے
دو گھڑی بھر خدا آرام پانے دے مجھے

ترنمِ رُوح

امیدوار و شبِ انتظار کیا کہنا — خیالِ یار و دلِ بیقرار کیا کہنا
جنوں نوازیٔ افتادِ دل خدا کی پناہ — فسوں طرازیٔ اندازِ یار کیا کہنا
تکلّمِ لبِ سحر آفریں معاذ اللہ — تبسّمِ نگہِ شرمسار کیا کہنا
تخیلات کی رنگینیاں پناہ پناہ — تصوّرات کے نقش و نگار کیا کہنا
نگاہ و محشرِ امید و بیم یا اللہ — نیاز و ناز کے قول و قرار کیا کہنا
دلِ فسردہ نے کھینچی ہے غم کی اک تصویر — پریدہ رنگ کے نقش و نگار کیا کہنا
حسابِ ساعتِ امید و بیم یا اللہ — کتابِ قدرتِ پروردگار کیا کہنا
بعشوہ عشوہ نگاہے بہ ناز ناز کرم — بجرعہ جرعہ مئے خوشگوار کیا کہنا
چمن میں جوشِ نمو کی بہار ارے توبہ — دل و دماغ و نظر کا فشار کیا کہنا
ترقیٔ اثرِ وحشت و جنوں توبہ — تلوّنِ نگہِ نازِ یار کیا کہنا
ہر ایک رگ میں لہو برق بنکے دوڑا ہے — ادائے جنبشِ مژگانِ یار کیا کہنا

سُناؤ ایک سخنور کو ہاشمی یہ کلام
ترنّمِ دلِ آشفتہ کار کیا کہنا

(از چودھری رحم علی ہاشمی ایم اے)

جرسِ منزل

(سنہ ۱۹۳۶ء)

طاقِ حرم و کرسی و منبر سے گذر جا — دیوار سے محراب سے اور در سے گذر جا

تسبیح کے ہر حلقۂ انور سے گذر جا — سر رشتۂ زنّار کے چکّر سے گذر جا

دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو جہنّم ہو کہ جنّت — ہر جادہ و ہر منزل و ہر در سے گذر جا

پرتو ہے شب و روز ترا اے مہ و خورشید — اس عالمِ تاریک و منوّر سے گذر جا

ہر منزلِ پُر نور گذرگاہ ہے تیری — ہر دائرۂ انجم و اختر سے گذر جا

"ظلمات" تو ہے منزلِ یک جادۂ مقصود — اے نورِ اتم حدِّ سکندر سے گذر جا

ہر راہ میں قزاق ہیں ہر گام پہ رہزن — بچنا ہے تو جذبات کے محشر سے گذر جا

غم بھی کوئی منزل ہے رہِ عشق و جنوں میں
آلام کے امواج سمندر سے گذر جا

سایہ ہے تخیل کا توہم کا ہے پرتو
نیکی سے گذر کارگہِ شر سے گذر جا

جل بجھنے سے بہتر ہے چمک ایک گھڑی کی
اے سوزِ تڑپ اور درِ مجمر سے گذر جا

تو مشعلِ جاوید رہِ ہستی و مستی!
حدِ اثرِ ہادی و رہبر سے گذر جا

کوئی تری منزل نہیں اے جلوۂ رعنا
چشم و نگہ و ناظر و منظر سے گذر جا

گرداب میں کیوں قید ہے اے موجۂ سیلاب!
گر موجۂ سیلاب ہے، تو سر سے گذر جا

کب تک نگۂ ساقیٔ کمسن کی غلامی!
میخانہ و جام و مے و ساغر سے گذر جا

یہ بھی تری منزل نہیں اے مردِ مسافر!
وحشت کدۂ گنبدِ بے در سے گذر جا

آواز بصد نور ہو قندیلِ بقا کی
محراب سے گر چور ہو، اور در سے گذر جا

یہ منزلِ آخر تو نہیں تیرے جنوں کی
ہنستا ہوا گاتا ہوا محشر سے گذر جا

مستی ہے تو ہستی ہے جنوں ہے تو فسوں ہے
موقع جو لگے پیشیٔ داور سے گذر جا

اِس بھیڑ میں کیوں تیرے قدم اُٹھ نہیں سکتے
منظر سے نہیں تو پسِ منظر سے گذر جا

ساغر نظامی

افکار آزاد

(حکیم الطاف احمد صاحب آزاد - انصاری)

اندھیر تو دیکھو کہ جو دشمن ہے جفا کا   قسمت سے وہی مرجع اربابِ وفا ہے

بیگانۂ ہر راحتِ دنیا ہوں تو غم کیا   خوش ہوں کہ ترا درد مقدّر میں لکھا ہے

دل جس جگہ فرمائے ٹھہر جاؤ، ٹھہر جاؤ   اتنا ہی فقط منزلِ جاناں کا پتہ ہے

ابتک تو مرا خبطِ طلب ہی ہے مرا دوست   ابتک تو یہ رہزن ہی مرا راہنما ہے

دل اور یہ سودا کہ مجھے پھر وہیں لے چل   میں اور یہ دھوکا کہ مرا بخت رسا ہے

معلوم نہ تھا عشق کے احکام کی رو سے   ناکردہ گناہی کی سزا سخت سزا ہے

اے شیخ خبر بھی ہے ہم آزاد ہیں آزاد

جو کچھ تجھے جائز نہیں وہ ہم کو روا ہے

مجاہد

(حضرت امین حزیں۔ بہاولپور)

تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
جہاں پر زندگی رقص آفریں ہے
جہاں کا پیکرِ ہستی حسیں ہے
جہاں کا ہر نفس رنگیں تریں ہے
تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
جہاں پر کفر ہے سرمایہ داری
جہاں پر ظلم ہے بیروزگاری
جہاں محکومیت کا نام بھاری
تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
جہاں معصوم آوارہ نہیں ہیں
جہاں بیوائیں بیچارہ نہیں ہیں
جہاں انسان ناکارہ نہیں ہیں

تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
نہیں ہمت شکن تقدیرِ ہستی
نہیں انساں میں انساں پرستی
نہیں ہر کم نظر کو زعمِ مستی!
تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
شرر افشاں ہے ذوقِ جستجو بھی
فسوں انگیز ہے جوشِ نمو بھی
مقدّس ہے وطن کی آرزو بھی!
تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
وطن کی وادیاں جب یاد آئیں
وہ جب بیتے ہوئے دن مسکرائیں
وہ جب سوکھے ہوئے لب تھرتھرائیں

فقط اک سانس لینا اور کہنا
"وطن کے نام پر مرنا ہے جینا"

داستانیں

کتاب	مصنف	قیمت	
کہکشاں	مصنفہ ساغر نظامی	قیمت عمر	علاوہ محصول
کیمیاگر	″ پروفیسر مجیب بی اے	″ عہ ر	″
فسانۂ جوش	″ سلطان حیدر جوش	″ عہ ر	″
عجیب	″ قاضی عبد الغفار	″ عہ ر	″
جوشِ فکر	″ سلطان حیدر جوش	″ عمر	″
تلاشِ راز	″ مولانا نیاز فتحپوری	″ ۶ر	″
نگارستان	″ ″ ″	″ عاہ ر	″
شہاب کی سرگزشت	″ ″ ″	″ عہ ر	″
تہذیب کی سرگزشت	″ ساغر نظامی	″ عہ ر	″
لیلےٰ مجنوں	″ سجاد حیدر یلدرم	″ عمر	″
پرانا خواب اور دوسرے افسانے	″ ″	″ عمر	″
۱۳۲ پرانا خواب	″ ″	″ ۱۰ر	″
اصنامِ خیالی	″ جلیل احمد قدوائی بی اے	″ عاہ ر	″
سیرِ گل	″ ″	″ عمر	″
خاکِ پروانہ	″ منشی پریم چند	″ عہ ر	″
غبن	″ ″ (دونوں حصّہ)	عاہ ر	″
بے گناہ مجرم	″ سدرشن جی	قیمت عہ ر	″
صبحِ وطن	″ سدرشن	″ عہ ر	″
حجابِ زندگی	″ سید عابد علی بی اے	″ ۱۲ر	″

کتاب	مصنف	قیمت	
افسانہ ہائے عشق	حامد علی خاں صاحب ایڈیٹر "ہمایوں"	قیمت عہ ر	علاوہ محصول
چینی وجاپانی افسانے		″ ۹ر	″
مصری افسانے	ترجمہ حضرت سجاد میرٹھی	″ ۸ر	″
معیاری افسانے	مرتبہ حضرت حفیظ جالندھری	″ عاہ ر	″
ہفت پیکر	مصنفہ ″ ″	″ عہ ر	″
فرانسیسی افسانے	″ ″ ″	″ ۱۲ر	″
فاؤسٹ	ترجمہ المانوی شاعر گوئٹے	″ للعہ ر	″
پردۂ غفلت	″ ڈاکٹر عابد حسین	″ عہ ر	″
انجام	″ پروفیسر محمد مجیب	″ ۱۲ر	″
کھیتی	″	″ ۶ر	″
گناہ کی دیوار	اشتیاق حسین قریشی	″ ۸ر	″
نیم شب		″ ۸ر	″
چند ڈرامے	محمد عمر نور الٰہی	″ ۸ر	″
زود پشیماں	عبد الماجد دریا آبادی	″	″
جلال الدین خوارزم شاہ	ترجمہ از ترکی سجاد حیدر یلدرم	″ عہ ر	″
جنگ وجدال	″ ″	″ ۱۲ر	″
آغازِ ہستی	برنارڈ شا مجنوں گورکھپوری	″ عہ ر	″
آرٹسٹ	آسکر وائلڈ تمکین کاظمی	″ عمر	″
اسیرِ بابل	گولڈ اسمتھ شرر	″ ۴ر	″

فریبِ عمل جان گالزوردی روآں مرحوم قیمت عاہ ر علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

جوانی کا خواب

(ادیب گرامی لطیف الدین احمد اکبر آبادی)

تماشہ دیکھنے والوں کی بھیڑ میں جو تھیٹر میں داخل ہو رہی تھی ایک بلند و بالا لڑکی بھی تھی۔ اس کے چہرہ کی وضع قطع کچھ زیادہ نظر فریب نہ تھی۔ لیکن "ہال" کی روشنیاں اس کے گالوں کی لوحوں کو چھو کر پلاسٹک محسوس ہوتی تھیں۔ اس کی آنکھیں بھی وہی تھیں جو ہر بنگالی لڑکی کو ہرنی بنا دیتی ہیں۔ لیکن ان آنکھوں کی جوت؟ یہ شاید کبھی کوئی شاعر ہی بیان کر سکے گا!

اس بنگالی اَبلا کی نوجوانی میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔ لیکن اس کے خد و خال سے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر کی نسوانی روح ابھی سوئی ہوئی ہے۔ اس بیدار دوشیزہ کی یہ خوابیدگی سمجھنے سمجھانے کی چیز نہ تھی —— بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا "حال" اس کی خوابیدگی کو، اور خوابیدگی اس کے "حال" کو زیادہ پُر اسرار بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔

بنگالی کلچر کا لوچ اور قدیم یونانیوں کی بن دیوی ڈائنا کے رخسار —— ایک عجیب طلسم تھا۔ مچھلی کی طرح صحرائی چشموں میں چہلیں، اور ہوا کی طرح اپنے شکار کا تعاقب کرنے والی دیوی کے اندر —— تہذیب و تمدن کی لطیف روح زندگی بن کر سرایت کر گئی تھی۔

اسٹیج پر رومیوں کی عشق بیانیوں اور جولیٹ کی محبت انشائیوں نے فضا کو تھرتھرا دیا تھا۔ تھیٹر میں سناٹا تھا۔ تماشائی بالکل خموش تھے۔ "ہال" کا ماحول ایک مندر کا ماحول بن گیا تھا —— کہ اس سناٹے میں پاکیزگی تھی، اس خموشی میں احترام تھا!

آج موسیقی جولیٹ نے رومیو کی نگاہوں کے لئے ایک نئی زمین اور نیا آسمان، ایک ایسی جنت پیش کر دی تھی جس کا ذکر کسی مذہبی کتاب میں بھی نہیں ملتا! کامدیو روپ رومیو نے جولیٹ کے خواب جوانی کی وہ تعبیر سنا دی تھی جس کے تعاقب میں انسان کی شاعرانہ تخیل آج تک معروف پرواز ہے!

سچی جوانی کی سچی محبت نے یوں تو ہر دیکھنے والے کو متاثر کیا تھا، لیکن اس ہجوم کے حیات سے بالکل جداطور پر اس لڑکی کی روح ایک انگڑائی لیکر جاگ پڑی، جوانی کی سوئی ہوئی آتما رنگ جذبات سے شرابور ہو گئی: اب وہ پو پھٹتی دیکھ رہی تھی —— اسے ایک چمکیلا دن نکلتا معلوم ہونے لگا تھا!

(۲)

نوبت نقاروں اور باجے گاجوں کی آوازیں کیسی بے ہنگم ہوتی ہیں: شادی کے ان ترانوں کے اندر اکثر ایک بدخواہ آواز بھی آتی ہے، مگر وہ اتنی مدھم ہوتی ہے کہ اسے بس ایک کلبی (cynic) ہی سُن سکتا ہے۔

وہ لڑکی جس کی استری آتما تھیٹر میں جاگی تھی، بیاہی جا رہی تھی۔ اب اس کی جوان تمناؤں کے خوابوں کی تعبیر نکلنے کا وقت آ گیا تھا —— شادیانے بج رہے تھے اور خوشیاں ہو رہی تھیں۔

عین اس حال میں کہ ابھی اس کی خوشیاں غیر منظم تھیں، اس لڑکی کے دل میں اچانک ایک وسوسہ پیدا ہوا جسے اس نے بہت جلد اور سمجھنے کی کوشش کئے بغیر رفع بھی کر دیا۔

کامرانی کی صورت جب سامنے دکھائی دینے لگتی ہے تو خطرات کا وجود کالعدم ہوتا ہے۔ اس کے اس نہایت ہی معمولی احساس کو خوف کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کا یہ احساس اتنا ہی خفیف تھا جتنی کہ شادی کی شہنائیوں میں وہ بدخواہ آواز مدھم ہوتی ہے۔

(۳)

لیکن یہ کیسا غضب ہے؟ اس لڑکی کی مرگ جال آنکھیں تو آنسو بہا رہی ہیں! دن کی مسرور روشنیوں میں غسل کرنے کے بدلے اس پر رات کا خوفناک اندھیرا غالب ہے!

اس کی حسین آرزوئیں ڈراؤنے خوابوں سے بدل گئی ہیں! اب وہ پریم کا لفظ سُن کر ہی کانپ جاتی ہے؟ اور شادی کی نوبت و شہنائی کے خوفناک نغمے ہر وقت اس کے کانوں میں بجتے اور اس کا مُنہ چڑھاتے رہتے ہیں۔ محبت کے جس منظر نے اس کے حسیات کو جگا دیا تھا وہ نقلی تھا؟ محبت کے جس نغمے نے اس کی روح کو بیدار کر دیا تھا وہ جھوٹا تھا —— جھوٹ ہے یہ سب کچھ جھوٹ ہے!

(۴)

سنگھار اور سنوار نے اسے ایک شاندار اور شوق آفریں عورت

۱۲۴

بنا دیا تھا۔ اس کے خدوخال میں، اس کی چال ڈھال میں، خواہش پروری سانسیں لیتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ لذت اور عشرت کے شوالے کی پجارن —— ایک بلاس موہنی معلوم ہوتی تھی: ڈائنا نے وینس کا چولا بدل لیا تھا!

(۵)

بڑے شہروں میں آدھی رات کا گھنٹا ذرا گمبھیر معلوم ہوتا ہے جس وقت وہ بجتا ہے اس وقت ایک دن مرتا ہے۔ دوسرا جنم لیتا ہے۔ اور "دن مرگیا، دن زندہ باد!" کی صدا کو گھنٹے کی وہ آواز محلوں اور جھونپڑیوں میں یکساں طور پر پہنچا دیتی ہے۔ اس کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ اس وقت اندھیرا اور اُجالا، سکوت اور شور، دست و بغل ہیں —— شہر مر بھی گیا ہے اور شہر جیتا بھی ہے!

آدھی رات کے سناٹے میں، ندی کے پل پر ایک عورت کھڑی ہے؛ اس کی شکل بدروپ ہے۔ اس کی آنکھوں میں نہ آس ہے اور نہ نراس! نیم شبی گھنٹے کی آواز اسے اپنی شادی کے شادیانوں کی یاد دلا کر اس کا مونہہ چڑھا رہی ہے۔ مگر کس سے پوچھا جائے کہ گھنٹہ کی یہ راگنی وقت کی ہے کہ بے وقت کی!

لیکن حیرت ہے! اس کے خیال میں ایک عزم قایم ہونے کے ساتھ وہ وہی پریم کتھا، وہی پریم راگ پھر سُنتی ہے جو اس نے برسیں ہوئیں تھیٹر میں سُنا تھا، اور جس نے اس سے ایک نورانی دن کے نکلنے کا وعدہ کیا تھا!

اور تعجب ہے! وہ گھر سے نراس چلی، پل پر پہنچ کر نراس نہ رہی، بلکہ جس منظر اور نغمہ نے اس کی جوانی کی آتما کو جگا دیا تھا، اب وہ اُسی نغمے کے بازوؤں پر سوار ہو کر صوتِ سرمدی سے ملنے جا رہی تھی!

ایک دھماکا، ایک زور کا چھپکا، اور پھر کچھ بھی نہ تھا!

آل احمد

ذات باہر

(اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی علیگ)

(۲)

بہار کی پہلی پورن ماشی تھی نسیم جنوب کے نرم نرم جھونکے آم کے مور کی خوشبو پھیلا رہے تھے۔ باغ میں چشمے کے کنارے نیچی کے درخت کی گھنی پتیوں میں چھپی ہوئی بیگانۂ خواب کوئل کی ان تھک کوک ہیما نتا کے شبستان بیداری کے کھلے ہوئے دریچہ میں سے آ رہی تھی۔

بہار کا ہیجان ہیما نتا پر بھی طاری تھا، کبھی اپنی بیوی کے جوڑے کی لٹ کھول کر اپنی انگلیوں پر لپیٹتا کبھی اس کی چوڑیوں کو بجاتا۔ کبھی اس کے سر کے گرد لپٹی ہوئی چنبیلی کی پھول مالا کو کھینچتا یہاں تک کہ وہ ڈھیلی ہو کر سہرے کی طرح اس کے ابروؤں پر لٹک آتی۔ باہر مست ہوائیں پھولوں کو ہلکی ہلکی جنبش دے کر ان میں احساس حسن بیدار کر رہی تھیں۔ یہی عالم ہیما نتا کا تھا۔

لیکن اس کی بیوی کسم بے حس و حرکت سیج کنارے کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی اس کی گہری نظریں چاندنی سے روشن خلا میں کھوئی ہوئی تھیں۔ شوہر کی ترغیبات پنہاں کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔ آخر ہیما نتا نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک مضطربانہ حرکت دی اور کہا۔ "کہاں ہو کسم! تم تو اتنی دور معلوم ہوتی ہو کہ دوربین سے بھی دیکھو تو ایک دھندلا سا نشان نظر آئے۔ آج میں تم کو اپنے بہت قریب چاہتا ہوں دیکھو کیسا پیارا سماں ہے۔"

کسم نے کھوئی ہوئی نظریں آسمان سے ہٹا کر شوہر کے چہرے پر جما دیں اور زیر لب کہا۔ "میں ایک منتر جانتی ہوں جس کے اثر سے یہ بہار، یہ چاندنی، یہ تمام حسن لمحہ بھر میں معدوم ہو سکتا ہے۔"

"یہ بات ہے! تو تم ایسا مت کرنا ہاں اگر کوئی جادو تمہیں ایسا آتا ہو کہ ہفتہ میں تین چار اتوار آ جایا کریں یا رات طویل ہو کر اگلی شام سے جا ملے تو ضرور کرامت دکھاؤ۔" یہ کہکر ہیما نتا نے بیوی کو اپنے سے قریب تر کھینچنے کی کوشش کی۔

کسم نے اس کے آغوش سے بچ کر کہا۔ "آج میں تم سے وہ بات کہنا چاہتی ہوں جس کو مرتے وقت ظاہر کرنے کا ارادہ تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب میرے لئے سزا بھگتنی آسان ہو گی۔"

اس کا شوہر سزا کے مضمون پر جے دیو کی عاشقانہ غزلوں میں سے کوئی شعر پڑھ کر اس کی سنجیدگی کو ہنسی میں اڑا دینے والا تھا کہ زینہ پر کسی کی کھڑاؤں پہنے جلدی جلدی کمرے کی جانب آنے کی آہٹ ہوئی۔

ہیما نتا اپنے ضعیف باپ ہری ہر مکرجی کے اس طرح غصہ میں آنے کی آواز پہچان کر اس طرح چونک پڑا جیسے کسی بدشگونی پر۔

دروازہ پر پہنچکر ہری ہر نے کرخت آواز میں ڈانٹ کر کہا۔ "ہیما نتا! تم فوراً اپنی بیوی کو گھر سے نکال دو۔"

ہیما نتا نے حیران ہو کر کسم کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر تعجب کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس نے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا تھا گویا چاہتی تھی کہ زمین پھٹے اور میں سما جاؤں۔

کوئل کی آواز کھڑکی میں سے آ رہی تھی لیکن کسی کو توجہ نہ تھی یہ دنیا کتنی حسین ہے! لیکن اس کا حسن کتنی جلدی زائل ہوتا ہے!!

"کیا یہ سچ ہے؟" ہیما نتا نے باپ کے پاس سے واپس آکر پوچھا
"بالکل سچ ہے" کُسُم نے کہا
"تم نے اب تک مجھ سے کیوں نہیں کہا؟"
"کوشش تو کئی دفعہ کی لیکن ہمت نہ پڑی۔ میں ایسی پاپن ہوں"۔
"اچھا تو اب مجھے ساری باتیں بتا دو"۔

اور کُسُم نے اس طرح اطمینان اور سکون کے ساتھ سارا قصہ کہہ سُنایا جیسے آگ پر چلنے والا دہکتے ہوئے کوئلوں پر بچے تلے قدم رکھتا ہے۔ اس تذکرہ سے اس کو کتنی تکلیف اور سوزش ہو رہی تھی اس کی کوئی علامت ظاہر نہ ہونے پائی۔

ہیما نتا نے ساری داستان سُنی اور کچھ کہے بغیر اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔ کُسُم کو محسوس ہوا کہ پریتم چلے گئے اور اب کبھی نہ ملیں گے۔ اُسے کوئی تعجب نہ تھا گویا جو کچھ پیش آیا تھا وہ بھی ان کی روزانہ زندگی کا ایک معمول تھا۔ وہ اس قدر بے حس ہو گئی تھی۔ ہاں دُنیا اُسے سونی نظر آتی تھی محبت سے ہر شے سے خالی!

ہیما نتا کے اظہار التفات کی یاد نے اس کے لبوں پر ایک ہلکا سا خشک، محروم طرب تبسم پیدا کیا جیسے نشتر کا زخم ہو۔ وہ تمام محبت جس کی گہرائی کو وہ اتھاہ سمجھتی تھی جس کی کیفیت کو وہ لاانتہا تصور کرتی تھی جس میں ذرا سی جدائی بھی اس قدر دلگداز ہوتی تھی جس میں ہر ملاقات اس قدر کیف تمام پیدا کرتی تھی۔ جو زبان و مکان کے تعینات سے آزاد معلوم ہوتی تھی۔ جس کے اگلے جنم میں بھی ختم ہونے کا تصور نہ ہوتا تھا۔ اس ساری محبت کی یہی کائنات تھی! اتنا نازک رشتہ تھا!! سماجی مظالم کے ایک اشارے نے اس کو تہس نہس کر دیا۔ اس کی ساری وسعت کو خاک میں ملا دیا!!! تھوڑی دیر ہوئی ہیما نتا نے محبت سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا "کیسی جادو بھری رات ہے" رات تو وہی باقی تھی۔ اسی کوئل کی کوک سُنائی دے رہی تھی ہوا بھی مسہری کے پردوں کو اُڑا رہی تھی، چاندنی بھی کسی محروم التفات حسینہ کی طرح سیج کے کنارے پڑی تھی — اور یہ سب فریب نظر تھا!!! یہ محبت تو مجھ سے بھی زیادہ قول اور فعل کی بے اعتبار نکلی!

کُسُم نے محسوس کیا۔

(۳)

اگلے روز علی الصباح ہیما نتا رات بھر جاگا ہوا، پریشان بال، وحشیوں کی سی شکل، بوڑھے پیارے گھوشال کے گھر پہنچا۔

پیارے نے نرمی سے پوچھا "کیوں کیا خبر لائے"؟

انگاروں پر لوٹتے ہوئے غصہ کے مارے تھرتھراتے ہوئے ہیما نتا یہ کہہ سکا "تم نے ہماری ذات بگاڑ دی تم نے ہمارا گھر تباہ کر دیا تم لوگوں کو اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑے گا" اس کے بعد شدت جذبات نے گلوگیر ہو کر اس کو خاموش کر دیا۔

پیارے مُسکرایا "اور تم لوگوں نے؟ تم نے میری ذات بنا دی؟ مجھے سماج میں رہنے دیا؟ تم نے ہمارے گھر پر امرت برسایا۔ تم بھی تو میری پریشانیوں میں اتنے ہی ہمدرد اتنے ہی مہربان رہے ہو!"

اگر ہیما نتا کے غصہ میں بھی وہی اثر ہوتا جو پُرانے زمانے میں برہمنوں کے سراپ میں ہوتا تھا تو پیارے بھسم ہو جاتا لیکن اب تو غصہ کی آگ اندر ہی اندر اس نوجوان کے دل کو پھونک رہی تھی۔ اور یہ بوڑھا مزے سے مسکرا رہا تھا۔

ہیما نتا نے رُک رُک کر کہا "میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

پیارے نے کہا "یہ تو مجھے پوچھنا چاہئے کہ میری بیٹی نے میری اکلوتی بچی نے جو میری سب کچھ تھی اس غریب لڑکی نے تمہارے باپ کا کیا بگاڑا تھا۔

میں سمجھا۔ تمہیں معلوم نہیں۔ اچھا تو بیٹھ جاؤ اور بیٹا جس قدر سکون سے ممکن ہو۔ سُنو۔ میں بتاتا ہوں۔ قصہ طویل ہے لیکن دلچسپی سے خالی نہیں۔

جب میرا داماد اپنی بیوی کا زیور لیکر انگلستان چلا گیا تھا تم بچہ سے تھے۔ لیکن شاید تمہیں وہ ہنگامہ یاد ہوگا جو پانچ برس بعد اس کے بیرسٹر ہوکر واپس آنے پر گانوں میں برپا ہوا تھا۔ تم یہاں کلکتہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ تمہارے باپ نے برادری کو جمع کیا۔ خود لیڈر بنا اور فیصلہ سُنایا۔ "اگر تم اپنی بیٹی کو اس کے سوامی کے پاس بھیجنا

چاہتے۔ تو پھر اس سے کوئی سروکار نہ رکھنا۔" میں نے اس سے کیسی
کیسی التجائیں کیں کہ ایک دفعہ ہمیں معاف کردو۔ میں نے کیا کیا ذلتیں
سہیں اور کہا کہ اگر تم ذات میں ملا لو تو میں اپنے داماد کو پرائشچت پر آمادہ
کرلوں گا لیکن تمہارا باپ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں اپنی عزیز بچی کو ہمیشہ
کے لئے چھوڑنے پر تیار نہ ہو سکا۔ ذات چھوڑ دی اور آکر کلکتہ میں رہنے
لگا لیکن سماج کے مظالم نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا میرے بھتیجے کی منگنی
ہوئی تو تمہارے باپ نے لڑکی والوں سے جاکر کہدیا اور نسبت
فسخ کرادی۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے قسم کھائی کہ
برہمن نہیں اگر انتقام نہ لیا ہو۔

اب تو معاملہ سمجھے؟ لیکن ٹھیرو۔ افسانہ کا بقیہ حصہ اور بھی
دلچسپ ہے۔

جب تم کالج میں داخل ہوئے تو ہیرآداس جنہیں ہم لوگ چچا کہتے
تھے۔ افسوس غریب اب زندہ نہیں ہیں۔ تمہاری قیام گاہ کے برابر ہی
رہتے تھے۔ انہوں نے ایک نوجوان کایستھ لڑکی کُسُم کو جو بچپن میں بیوہ
ہو گئی تھی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ کُسُم اس بلا کی حسین تھی کہ ہیرآداس
کو کالج کے لڑکوں کی توجہات سے اس کی حفاظت کرنے میں بڑی دشواریاں
پیش آتی تھیں لیکن ایک نوجوان لڑکی کے لئے بوڑھے آدمی کی نظر بچانا
کیا مشکل ہے۔ اکثر اسے کوٹھے پر ہوا لگانے یا اور کوئی کام کرنے جانا
پڑتا تھا ادھر معلوم ہوتا تھا کہ تمہارا جی بھی سوائے برابر والے بالاخانہ کے
کہیں پڑھنے میں نہیں لگتا۔ کوٹھوں ہی کوٹھوں پر تم دونوں میں کیا گزرتی
تھی یہ تو تمہیں جانتے ہو۔ لیکن نیچے گھر میں لڑکی کی حالت سے ہیرآداس
کو شبہ ہوا ہو گا۔ گھر کے کام کاج میں اس کی فراموش کاری بڑھ گئی۔
بھوک کم ہو گئی۔ تندرستی کی بشاشت جاتی رہی اور ایک دن انہوں نے
اُسے بلا سبب روتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ بالآخر ان پر تمہارے بالائی
پیام سلام ظاہر ہو گئے انہیں معلوم ہو گیا کہ تمہیں تنہائی میں پڑھنے
کا شوق بڑھ گیا ہے۔ کالج سے اکثر غیر حاضر رہنے لگے ہو اور اپنے بالاخانہ
کے زینہ پر تنہا کتابیں لئے بیٹھے رہتے ہو۔

جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہیرآداس نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے
رائے دی۔" دیکھو چچا تم ایک عرصہ سے تارک الدنیا ہو کر بنارس
جا رہنے کا ارادہ کر رہے ہو۔ بہتر ہے اب یہ ارادہ پورا کرلو۔ لڑکی کی
دیکھ بھال میرے ذمہ رہی۔"

وہ تو شکر گزار ہو کر یاترا کو چلے گئے اور میں نے کسم کے رہنے کا
انتظام اپنے بے تکلف دوست چٹرجی کے یہاں کر دیا جو وہیں پڑوس
میں رہتے تھے اور یہ ظاہر کیا کہ کُسُم اُن کی سگی بیٹی ہے۔ اس کا جو نتیجہ
ہوا وہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ بہرحال یہ تمام پچھلے واقعات دُہرانے
سے مجھے خوشی ہوئی۔ ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے لکھنا نہیں آتا
ورنہ پڑھنے میں بھی افسانہ معلوم ہوتا۔ میرے بھتیجے کا رجحان البتہ اس طرف
ہے اس سے کہوں گا کہ وہ اسے قلمبند کرنے کی کوشش کرے۔ ہاں اگر
ہم تم دونوں مل کر کوشش کریں تو ہم سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا انجام
ابھی مجھے بھی معلوم نہیں ہے؟

ہیمانتا نے پیارے کے آخری فقروں پر توجہ نہ کی تھی۔ اس نے
اپنے سلسلۂ خیال کے مطابق پوچھا۔" کیا کُسُم نے ایسی شادی پر
کوئی اعتراض نہیں کیا؟

پیارے نے کہا۔" یہ سوال آسان نہیں ہے۔ تمہیں تو تجربہ ہو گیا
ہے اور تم جانتے ہو کہ عورت کیا چیز ہے۔ جب وہ 'نہیں' کہتی ہے تو مقصد
'ہاں' ہوتا ہے۔ کُسُم نئے مکان میں آئی اور تمہارا روزانہ دیدار موقوف
ہوا تو وہ اپنے آپے میں نہ رہی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ تم نے
اس کا پتہ لگا لیا ہے۔ تم بھی کالج کا راستہ بھولنے لگے چٹرجی کے دروازے
کے سامنے کتابیں ہاتھ میں لئے ٹھیر جاتے گویا کوئی کھوئی ہوئی چیز
ڈھونڈھ رہے ہو۔ میں یہ تو سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ تمہیں کالج کے راستہ
کی تلاش ہے کیونکہ ایک معزز شخص کی کھڑکی میں ہو کر راستہ پُر دار
کیڑوں یا محبت بھرے دلوں ہی کے لئے مخصوص ہے بہرحال مجھے
لڑکی کی بپتا اور تمہاری تعلیم کا اس قدر ہرج دیکھ کر بہت افسوس
ہوتا تھا۔

آخر ایک دن میں وہاں گیا اور کُسُم کو علیحدہ لیجا کر کہا۔" دیکھو
اپنے چچا سے شرم نہ کرو۔ بیٹی میں جانتا ہوں تمہارے دل میں کس کی لگن

ہے۔ وہی سامنے والا لڑکا۔ اس کی بھی حالت اچھی نہیں ہے۔ میں خوشی سے تمہارے سمبندھ کی کوشش کروں گا۔"

کُسم جواب دینے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور وہاں سے بھاگ گئی۔ میں نے اپنی آمد و رفت جاری رکھی اور تمہارا ذکر کرتا رہا۔ بالآخر اُس کی شرم مجھ سے کھل گئی اور میں نے اس کے دل پر یہ بات نقش کر دی کہ صرف شادی ہی سے یہ مشکل حل ہو سکتی ہے پھر بھی اُسے اصرار تھا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ جب ہم ایک دوسرے سے موافق اور مخالف بحث کر چکے تو کُسم نے مجھ سے تمہاری رائے دریافت کرنے کو کہا۔ میں نے اس کی مخالفت کی۔" وہ غریب اپنے ہوش حواس میں کب ہے اُسے اس الجھن میں ڈالنے سے کیا فائدہ؟ دوسروں پر اس راز کے ظاہر ہونے کا تو کوئی امکان ہی نہیں پھر اُسے عمر بھر کے لئے کیوں رنج دیا جائے۔" میں تو سمجھ نہیں سکا کہ کُسم کی سمجھ میں یہ بات آئی یا نہ آئی۔ وہ خاموش روتی رہی اور جب آخر میں میں نے کہا کہ بس یوں ہی رہنے دو تو وہ بالکل پھوٹ پڑی معاملات یہاں تک پہنچ گئے تھے جب میں نے چٹرجی کو تمہارے پاس پیام دے کر بھیجا اور جیسا کہ مجھے بعد میں اطلاع ملی تم نے بلا تامل منظوری بھجوا دی۔

مقررہ دن سے کچھ عرصہ قبل کُسم اس تجویز کی مخالف ہو گئی۔ اس نے مجھ سے التجا کی۔" اچھے چچا ہاتھ جوڑتی ہوں اس کو روک دیجئے۔" میں نے کہا کیا فضول بکتی ہو۔ اب تو سب کچھ طے ہو گیا۔ آخر میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں گا۔" اس نے مجھ سے کہا" مجھے کہیں بھیج دو۔ اُن سے کہہ دینا کہ وہ مر گئی۔" میں نے اعتراض کیا۔" اور اس غریب لڑکے کا کیا حشر ہوگا اس کے خوابوں کی تعبیر ظہور میں آنے والی ہے وہ تو ساتویں آسمان پر ہے اور میں اس سے کہہ دوں کہ تم مر گئیں۔ اس کے بعد مجھے تمہیں اس کی موت کی خبر دینا ہوگی اور جواب میں تمہاری سنائی آئے گی۔ تم اس بڑھاپے میں میرے سر برہمن ہتیا اور استری ہتیا کا کلنک لگاؤ گی۔

آخر ایک روز سعید اور ساعت نیک میں تمہارا بیاہ ہو گیا اور یوں میری قسم پوری ہوئی۔ باقی حال تم خود جانتے ہو۔

"تمہیں جو کچھ ہمارے ساتھ کرنا تھا جب تم کر چکے تھے تو پھر تم نے یہ راز ظاہر کیوں کیا۔" ہیمانتا نے آزردہ ہو کر پوچھا۔

"جب کچھ دن ہوئے مجھے تمہاری بہن کی نسبت طے ہو جانے کا حال معلوم ہوا تو میرے ضمیر نے مجھے ملامت کرنا شروع کیا ایک برہمن کی ذات تو مجھے یوں بگاڑنی پڑی کہ میں نے ایک فرض اپنے اوپر عاید کر لیا تھا۔ اب ایک دوسرے معصوم برہمن کی ذات پر دھبہ نہ آنے دینا بھی میں فرض سے کم نہ سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے اُن کو لکھ دیا کہ میرے پاس ہیمانتا مکرجی کی بیوی کے شودر ہونے کا ثبوت موجود ہے۔"

ہیمانتا اپنے اُبلتے ہوئے جذبات کو بدقت روک سکا اور لکنت سے کہا۔" اب اگر میں چھوڑ دوں تو اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔ کون اس کی خبر لے گا۔"

" میرا جو فرض تھا میں نے کر دیا۔ لوگوں کی چھوڑی ہوئی بیویوں کو پناہ دینا میرا کام نہیں ہے۔"

"یہاں آؤ۔" پیارے نے نوکر کو آواز دی۔" ہیمانتا بابو کے لئے ایک گلاس برفاب لاؤ۔ جلدی۔"

لیکن ہیمانتا نے اس کی ٹھنڈی تواضع کا انتظار نہیں کیا۔

(۴)

پورنماشی کے بعد پانچویں رات تھی۔ کوئل کی کوک سنائی نہ دیتی تھی۔ چشمہ کے کنارے لیچی کا درخت سیاہ پس منظر پر روشنائی کا داغ معلوم ہوتا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ لیکن اندھیری رات میں اسکی سائیں سائیں پر آسیب کا گمان ہوتا تھا۔ تارے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ گویا تاریکی کو چیر کر کسی خفیہ راز کا پتہ لگانا چاہتے ہیں۔

ہیمانتا کی خواب گاہ میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ وہ پلنگ پر کھڑکی کے نزدیک بیٹھا ہوا باہر کی طرف اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ فرش پر اس کے قدموں میں کُسم سر جھکائے بیٹھی تھی۔

تقدیر کے مصور نے ابدی رات کی وصلی پر جذبات کے گرد باد میں گھری ہوئی دو خاموش ہستیوں کی ایک تصویر بنائی تھی جن میں سے ایک دادرس تھا اور ایک دادخواہ۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو مشتاقانہ نظروں سے دیکھنے کے لئے خود وقت کی رفتار ساکت ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی سمندر یک لخت ساکن ہو جائے۔

(ٹیگور)

یکایک پھر کھڑاؤں کی آواز آئی۔ ہری ہر کے بھاری قدموں کی چاپ باہر سے کمرے میں سنائی دی

"تم کب تک اس عورت کو گھر سے نکالو گے۔ میں یہ حیلے حوالے پسند نہیں کرتا۔"

ہری ہر کی آواز سُنی تو کُسم تڑپ کر ہیما نتا کے قدموں سے لپٹ گئی۔ آخری الفاظ سُن کر اس نے رخصت کا سلام کیا۔ قدموں کی خاک چھوئی اور ان کو چھوڑ کر جانے کے لئے اٹھی۔

ہیما نتا نے باپ کو جواب دیا "میں اپنی بیوی کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

ہری ہر چلّایا "تو تم ہماری ذات خراب کر دگے۔"

ہیما نتا نے جواب دیا "میں ذات پات کو نہیں مانتا۔"

"تو نکلو دونوں یہاں سے۔"

(ٹیگور)

(ضیاء الدین احمد سلہری)

میرے خالق! مجھے رحمتیں نہ دے، اور نہ مجھے برکتوں سے مالا مال کر۔ میں تجھ سے، اور تیری نظر سے، اُس نظر سے، جو ہزاروں اندھیروں میں سیاہ مورِ ناتواں کو رینگتا ہوا دیکھ لیتی ہے، محض ایک شعاع چاہتا ہوں، تاکہ میں، اُن سازشوں کو، جو غریبوں کو پیسنے کیلئے، سرمایہ داری کے سینے میں مستور ہیں، دیکھ سکوں ــــ!

رحمتیں مجھے نہ درکار نہیں، برکتیں میرے لئے بیکار ہیں، میرے آقا! میں تو صرف اُس تڑپ سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہوں، جو مجھے ــــ زندگی کی خوفناک کشاکش سے مٹے ہوئے، ضعیف و ناتواں جسموں کو، جن کی روحیں، فلاکت کے گہرے دھبوں سے سیاہ پڑ گئی ہیں ــــ ایک جذبۂ انسانی دینے کیلئے بیقرار کر دے۔

نیکیاں مجھے نہ چاہئیں، ثواب سے میں بے نیاز ہوں، میرے بے نیاز ــــ! تو مجھے صرف اک "آہ" دیدے، جس سے میں اُس ماں کے آنسوؤں کو، جس کے نوزائیدہ بچے کے لئے اس کی چھاتیوں میں دودھ نہیں رہا، خشک کر سکوں۔

رحمتیں! برکتیں! اور تیرے موعودہ احسانات، میرے خالق! مجھے ایک سوال پر مجبور کر رہے ہیں، اور میرا دستِ دُعا تیری طرف، یہی پوچھنے کیلئے اُٹھ رہا ہے، کہ آخر وہ کون سے مقاصد کبیر ہیں، جن کے لئے دُنیا افلاس و نکبت کو جنم دئے جا رہی ہے، رحمتیں و برکتیں کیوں انہی کے کاشانوں پر نازل ہو رہی ہیں، جو تیری رحمتوں و برکتوں سے، ایسے ہی بالا ہیں، جیسے بلند آسمان۔

اے منبعِ فیض، سرنگوں ہونے کے بجائے، میری آنکھوں کو تر ہونے کی قوت دیدے، اپنی رحمت سے، تو میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں بارش کر دے، اور میری آنکھوں کے خشک چشموں کو، آنسوؤں سے لبریز! میرے مالک! غریب و بیکس کے زخم، بس ہمدردی کے دو آنسوؤں سے مندمل ہو سکتے ہیں، میں تیرے بخشے ہوئے آنسوؤں سے، زندگی سے دھتکارے ہوئے بندوں کے، چٹیل و سخت قلوب، جن کو ظلم و ستم کی آندھیوں نے، بنجر کر دیا، پھر سرسبز کر دوں گا، اور اس طرح میرے رب، اس مقصدِ عظیم کو تیرے قریب کر دوں گا، جس نے تجھے، دُنیا کی تخلیق پر آمادہ کیا تھا۔

(طبعزاد)

ضیاء الدین احمد سلہری

ناکام

(حضرت امین حزیں)

"بلیک گارڈ" سینکڑوں انسانی زندگیوں کو اپنی آغوش میں لئے ایک بپھرے ہوئے دیو کی طرح سمندر کے سینے کو چیرتے ہوئے ساحلِ ہندوستان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بلند لہریں ہانپتے ہوئے مگرمچھوں کی طرح اٹھتیں اور سورج کی روشنی میں پارے کی طرح چمکتے ہوئے لہرا کر سطحِ سمندر پر پھیل جاتی تھیں۔ آسمان پر کہیں کہیں پریشان بادلوں کے ٹکڑے بھٹک رہے تھے۔ جو کبھی کبھی سورج پر حاوی ہو کر اس کی روشنی کو مدھم اور افسردہ سا بنا دیتے تھے۔ ہوا بھی خلاف معمول بہت تیز چل رہی تھی ——— جیسے کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی ——— موجوں کا تلاطم جہاز کی "بھک بھک" کے ساتھ مل کر ایک غیر دلچسپ اور تکلیف دہ لا انتہا ہی شور پیدا کر رہا تھا۔ جہاز کی اندرونی زندگی میں حرکت اور مسرت کی فراوانی تھی۔ اگرچہ "ہنگام ہستی" جو طلوع آفتاب کے ہمراہ پیدا ہوتا ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اب کافی دن ڈھل چکنے کی وجہ سے اپنے پورے زور پر نہیں رہا تھا۔

اس دُنیائے ہاؤ ہو سے بے نیاز حمید ڈیک کے ایک تنہا حصّہ میں اپنا سر نیچے کئے ٹہل رہا تھا ——— جیسے وہ اپنے پریشان خیالات کا کوئی حل تلاش کرنے کے لئے جہاز کی پُرشور زندگی کو خیرباد کہہ چکا تھا ——— وہ ایک عجیب کشمکش میں تھا۔ اس کا چہرہ اس کے دلی اندوہ کی آئینہ داری کر رہا تھا۔ وہ بعض وقت ٹہلتے ٹہلتے یکدم ٹھہر جاتا اور جوش میں اپنی مٹھیاں بند کر لیتا ——— ایک دیوانے کی طرح جو کسی سے گتھم گتھا ہونے کے لئے بیتاب ہو ——— اور پھر غیر ارادی طور پر اس کا لرزتا ہوا قدم آگے اُٹھتا اور وہ ایک غیر مبہم آواز میں اپنے آپ سے بڑبڑانا شروع کر دیتا۔

میں آخر اس عورت کو اپنے ہمراہ کیوں لئے جا رہا ہوں؟ وہ مغربی عورت ہے! میں اس کے چال چلن، وطن اور والدین سے مکمل واقفیت نہیں رکھتا ہوں! کیا میں اس پر اعتبار کر لوں؟ اور کیا اس کا اس قدر کہنا میرے لئے کافی ہے کہ "میں تم سے محبت کرتی ہوں اور میرا جینا تمہارے بغیر محال ہے"؟

لیکن پھر انہی خیالات کی مخالفت میں اس کا دماغ کچھ اور اختراع کر رہا تھا۔

"اس نے میری خاطر اپنا پاسپورٹ بدلوایا ہے؟ وہ لنکا میں اپنے چچا کے پاس جا رہی تھی .... جو وہاں گورنر ہے ——— ایک بہت بڑا آدمی! ——— کیا وہ میرے ساتھ اس لئے آ رہی ہے کہ میں اسے اُس کے بھائی سے زیادہ آسائش اور امن دے سکوں گا؟ .... نہیں! .... اُسے واقعی مجھ سے ...."

لیکن پھر خیال آتا کہ

"عورت ہر ایک کو اپنی توجہات کا مرکز اتنی آسانی سے نہیں بنا لیتی۔"

جہاز میں ایک بڑا سا ہچکولا آیا۔ اور حمید ٹھٹھک کر خاموش ہو گیا۔

"ہماری زندگی میں بہت سے واقعات ایسے آتے ہیں جن کے حل ہماری دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔" اس نے پھر اپنے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس معمّہ کو اس بہتر وقت کیلئے چھوڑ دینا

چاہئے، جبکہ اس کا خود بخود کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا، .... بہت سے پریشان کن معاملات اپنے مناسب وقت پر خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔"

دُنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو رکاوٹوں کے ایسے غیر متوقع ظہور سے گھبرا جاتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ کوئی آسمانی ہاتھ ان کو فوراً دور کر کے رکھدے، حمید بھی ایسے ہی انسانوں میں سے تھا لیکن اس میں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی متانت اور سنجیدہ مسکراہٹ کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا تھا۔ جس سے اس کے ہر ملنے والے یا دیکھنے والے کو یہ گمان تک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی پریشانی یا گھبراہٹ میں ہے۔ اس لئے جب مس فرگوس اس کے پاس آئی تو وہ مسکراتے ہوئے اس سے اس طرح مخاطب ہوا۔ جیسے وہ انتہائی دلچسپی سے کائنات کی رنگینیوں کا جویا ہے

"میں یہاں سمندر کے نظارے کے لئے آگیا تھا ..... ہاں تو آپ ٹینس کھیل آئیں؟"

"جی ہاں! لیکن جہاز پر ہمیں کچھ اچھے کھلاڑی نہیں مل سکتے"

"لیکن جہاز کے تلخ اور صبر آزما سفر میں ایسے کھیل مصروفیت اور دلچسپی کے لحاظ سے بہترین ہیں۔"

"ہاں یہ درست ہے!"

"اس لئے ہمیں ایسے ماحول میں ان کے معیار کو جانچنا غیر مناسب ہے۔" اس نے اپنے کندھے ہلاتے ہوئے تقریباً نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔

مس فرگوس کچھ جھینپ سی گئی، جیسے اس نے ایک عورت کی فطرت سے مجبور ہو کر اپنے کھیل کی قابلیت اور پھرتی کا غیر مناسب رعب حمید پر بٹھانا چاہا تھا،

حمید پُر امن صورت بنائے اطمینان سے نزدیک پڑے ہوئے ایک بنچ پر سمندر کی طرف رُخ کر کے بیٹھ گیا۔

مس فرگوس تاسف اور مسرت کے درمیانی جذبہ میں حمید کو تک رہی تھی۔

"میرے لئے ہندوستان جانے کا یہ پہلا موقع ہے میرا بھائی کیپٹن سٹروک جو پچھلے دنوں سرحدی حملوں میں مارا گیا ہے مجھے ہندوستان آنے کی کئی بار دعوت دیتا رہا .... وہ یہاں کی عجیب اور شاندار زندگی میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔"

"عجیب اور شاندار | اور ہندوستانی زندگی؟" حمید نے ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔

مس فرگوس اُسے حیرت اور پریشانی سے اپنی کبودی نگاہوں کو مٹکاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

"کیوں ہندوستان تو ...." وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر حمید کی انتہائی خاموشی اور پژمردگی نے اسے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

حمید نے مُنہ پھیر کر سمندر کی بے چین موجوں پر اپنی نگاہیں ڈال دیں، جیسے ہندوستان کے نام سے اس کے سینے میں کسی نے نشتر چبھو دیا ہے اور جیسے وہ اپنی اذیت اور اندوہ کا اظہار بھی قابل نفرت سمجھتا ہے۔

دونوں نہ جانے کتنی دیر تک خاموش رہے اور یہ [illegible] اگرچہ دونوں کے نزدیک خلاف توقع اور خلاف موقع تھی تاہم کسی [illegible] بھی گفتگو میں پہل کی ضرورت نہ سمجھی۔

←—— (۲) ——→

حمید جامعہ ازہر مصر سے۔ اخلاق، فلاسفی، اور سیاسیات پر اپنی تعلیم ختم کر کے چھ سال کے بعد گھر واپس آ رہا تھا۔ اگرچہ بی اے پاس کرنے کے فوراً بعد ہی اسے والدین نے جامعہ ازہر بھیجدیا تھا، تاہم چھ سال کی مکمل سادہ، پاکیزہ اور مصروف زندگی نے اسے اس قدر بلند اخلاق اور شریف النفس بنا دیا تھا، کہ گزشتہ "مکروہ" ہندوستانی اطوار و عادات کا اب اس پر ذرہ بھر بھی تسلط نہیں رہا تھا۔ اور ہمیں یقین کرنا چاہئے کہ مس فرگوس کے پیار اور محبت میں بھی اس کی "طبعی شرافت اور نیک عادت" کو بڑا دخل تھا۔

وہ اگرچہ اپنے بھائی کیپٹن سٹروک کے خطوط میں "ہندوستانی

غلاموں کی بے حسی، افلاس اور جاہلیت کے متعلق کافی کچھ پڑھ چکی تھی مگر اس نوجوان حمید کی چند روزہ دوستی سے وہ ہندوستان کے متعلق اپنے نظریوں پر ـــــ جس کی بے ہودگی اور بے بنیادی میں اس کے شبہات ہر لحظہ بڑھتے جا رہے تھے ـــــ نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئی تھی اور آخر کار اس کا نتیجہ اور فیصلہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ "حمید بہر حال ایک قابل پرستش نوجوان ہے۔"

لیکن حمید پر بھی مس فرگوس کی عقیدتوں اور اظہار محبت کے باوجود اگرچہ اخلاق اور پاکیزگی کا اتنا سخت اور کڑا قبضہ تھا اور اس لئے وہ مس فرگوس کی خود ستائیوں اور آزادانہ اظہار محبت کا جواب سوائے ایک غیر مبہم مسکراہٹ کے اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن اس کے دل اور دماغ میں ایک ایسی کش مکش شروع ہو گئی تھی جس کی شدت اور تلخی کو تو وہ محسوس کر سکتا تھا۔ مگر اس سے نجات حاصل کرنا ہر لحہ اس کی دسترس سے باہر ہو رہا تھا۔

اس کے لئے مس فرگوس ایک ایسا لقمہ تھا جس کو وہ نہ پھینکنا چاہتا تھا اور نہ نگل سکتا تھا۔ اس نے اس کے جدا ہونے کی کئی تدبیروں پر غور کیا (جن میں سے بعض انتہائی خطرناک تھیں) لیکن اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک نغمہ تھا جو اگرچہ بہت مدھم تھا تاہم اس کے لطیف سُر لحظہ بہ لحظہ تیز سے تیز تر ہو رہے تھے اور اسے اس حقیقت کا بھی مکمل اعتراف تھا کہ اس نغمہ کی بقا کا انحصار مس فرگوس سے دوستی پر ہے لیکن وہ اسے اپنے ہمراہ لے جانے میں بھی کئی خطرات اور مشکلات کے ہیبت ناک دیوؤں کو منہ پھاڑ کر اپنے سامنے ناچتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اس کا تمام خاندان شریعت پسند اور مشرقی رسم و رواج اور مذہب کی پابندیوں میں بہت سختی سے جکڑا ہوا تھا اس لئے اس کے رشتہ دار وغیرہ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے گھروں میں ایک مغربی مس صاحبہ ـــــ جو موجودہ زمانہ کی نام نہاد "تہذیب" اور بے حیائیوں سے مکمل طور پر آراستہ ہو کر سڑکوں پر لہراتی پھرے اور کلبوں میں ناچتی پھرے ـــــ رونق افروز ہو۔

اسے ایک دم خیال آیا جس سے اس کے چہرہ پر غیر معمولی مسرت کے آثار پیدا ہو گئے ...... جیسے اس نے اپنی پریشانی کا حل تلاش کر لیا ہے۔

"میں اسے حبیب کے پاس ٹھہراؤں گا ـــــ والدین کے رضامند ہو جانے تک۔" وہ مسرت اور نیم مدہوشی کے عالم میں سوچ رہا تھا۔

حبیب جو ابھی ابھی انگلستان سے انجنیئرنگ کی تعلیم سے فارغ ہو کر آیا تھا، اس دنیا میں تنہا تھا۔ اس کا باپ اس کے لئے بہت کافی سرمایہ اور جائداد چھوڑ گیا تھا۔ اس لئے وہ نہایت شاندار طریق پر مکمل مغربی طرز اور معیار پر زندگی بسر کر رہا تھا۔ حمید کا اس وسیع دنیا میں صرف یہی دوست تھا جس پر اسے مکمل اعتبار تھا کہ "وہ اس نازک مرحلہ پر ضرور اس کی امداد کرے گا۔"

حمید چھ سال کے طویل عرصہ میں اسے کبھی نہیں بھولا تھا۔ اگرچہ آپس میں ان کے رجحانات اور خیالات کا بہت زیادہ اختلاف تھا لیکن یہ اختلاف ان کے دلوں میں غیریت اور بیگانگی پیدا کرنے سے قطعاً قاصر تھا ـــــ ان کے درمیان خط و کتابت بہت عجیب اور دلچسپ ہوتی تھی، ایک کی زندگی مذہب اور خدا کے متعلق شبہات سے بھرپور، دوسرے کی زندگی ایمان، استقامت اور یقین سے پُرامن اور پُرسکون۔ ایک کا ماحول بالکل مادی اور بے ثبات، دوسرے کا روحانی، الہیاتی اور پائدار۔ ایک زندگی کو ناقابل برداشت سمجھ کر اس سے نجات کا قائل۔ دوسرا اسے خدا کی طرف ایک عظیم ترین بخشش اور حسین ترین عطیہ سمجھ کر اسے نیکی اور پاکیزگی میں بسر کرنے کا حامی، ایک دنیا کی ہر چیز سے بیزار، تنگ مزاج اور بے چین دماغ، دوسرا قانع روح اور پُرامن دل کا مالک ـــــ غرض ان کے خطوط میں شاید ہی کوئی ایسا خط ہو جس میں دنیا، زندگی اور مذہب پر بحث نہ ہو۔

(۳)

دوسرے دن حمید بہت سویرے اٹھا، اگرچہ مس فرگوس کے متعلق اس کی پریشانی قدرے کم ہونی چاہئے تھی، مگر اس کی بجائے اتفاقات کی غیر یقینی نے اس کے دل و دماغ کو تمام رات پریشان اور متردد رکھا

اس کا چہرہ انتہائی سنجیدہ اور تھکا ہوا تھا، جس سے معلوم ہو رہا تھا کہ تخیلات کی کشمکش نے تمام رات اسے بیدار رکھا ہے اور وہ آخر کار دماغی کوفت سے بیزار ہو کر بہت سویرے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔

دن چڑھنے میں ابھی بہت دیر تھی، چاند اپنی مجروح زردی کے ساتھ افق مغرب میں گم ہو رہا تھا، اس نے مشرق کی طرف اپنی نیم وا نگاہوں سے نظر دوڑائی ـــــ جیسے وہ سورج کے طلوع کا بیتابی سے منتظر ہے، شاید آفتاب کے ہمراہ جہاز اور اس کی محدود دُنیا کا ہنگام اس کی دماغی تنگ و دو سے زیادہ قوی ثابت ہو کر اسے اس سے نجات دلا دے، اور وہ اس نئی زندگی اور اس کی رنگینیوں میں دلچسپی لینے لگے؟

لیکن پھر انہی پریشان خیالات کا انبوہ اس کے دماغ پر ٹوٹ پڑا اور وہ سوچنے لگا۔

"میں جب بندرگاہ پر اس کے ہمراہ اتروں گا، تو میرے اقربا اس کو میرے ہمراہ دیکھ کر کیا کہیں گے؟ ـــ اور حبیب؟" وہ قدرے ٹھٹکا "اگرچہ میں نے اسے مصر سے بوقت روانگی مطلع کر دیا تھا، لیکن کیا وہ یقینی طور پر مجھ سے ملنے کے لئے آیا ہو گا؟ مستقبل پر کسے اعتماد ہے؟ ...... کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل میں تقدیر ہمیشہ واقعات کی تشکیل ایسے ہی کرتی ہے، جیسے ہم چاہتے ہیں؟ اگر وہ نہ آیا ہو گا ـــ تو ـــ میں کیا کروں گا؟ کیا بہانے تراشوں گا؟ ...... کس کس کو جواب دوں گا؟ میرے اخلاق اور کیریکٹر پر بدگمانیاں ہوں گی ـــــ اعتراضات ہوں گے! اور میری بدنامی ...... میں کس کس کے سامنے اپنی صفائی پیش کروں گا؟ اور ان میں سے کتنے ایسے انسان ہوں گے جو میرے الفاظ پر یقین کرنے کو تیار ہوں گے؟"

"خدایا! میں کیسا خوش قسمت ہوں گا، اگر حبیب بندرگاہ پر آ جائے گا؟!" اس نے آخر کار دبی ہوئی آواز میں اپنے آپ سے کہا۔

اس نے اپنی گھڑی پر نگاہ کی، "سات بج کر بیس منٹ" اس نے کافی بلند آواز میں کہا، "جہاز تقریباً دس بجے ساحلِ ہندوستان پر پہنچے گا؟"

اتنا وقت! ایسے تلخ لمحات اور اس قدر بے تابی! ـــــ وہ ڈیک کا جنگلہ کافی دیر تک پکڑے کھڑا رہا ...... اس کی نگاہیں سمندر کی بے چین امواج میں کچھ تلاش کر رہی تھیں ـــــ ایک راز ـــ سمندر کی لاانتہا گہرائی سے بھی زیادہ عمیق اور گہرا راز ـــــ اس کی نگاہوں سے کئی دفعہ بیتاب اور مچلتے ہوئے آنسو گرے اور بے پناہ موجوں میں بے حقیقت قطروں کی طرح جذب ہو کر رہ گئے، وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر خود فراموشانہ حالت میں نہ جانے وہاں کتنی دیر تک ٹھہرا رہا۔ حتیٰ کہ جب مس فرگوسن نے عقب سے آ کر مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، تو وہ اچانک مڑا ـــ جیسے وہ کسی آسمانی خواب سے جگا دیا گیا ہے ـــ اور مس فرگوسن کی طرف پہلے تیز اور ترش نگاہوں سے اور پھر مصنوعی مسکراہٹ سے دیکھنے لگا، ـــ جیسے وہ اپنے پریشان اور روح فرسا تخیلات کی تنہا دُنیا میں کسی انسان کے آنے کی توقع ہی نہیں رکھتا تھا۔

"آداب! آپ آ گئیں۔" اس نے اپنی پلکوں میں سے دیکھتے ہوئے پُر معنی الفاظ میں کہا۔

"ہاں! ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے اور ہم ہندوستان پہنچ جائیں گے ڈیر حمید!" فرگوسن نے عمداً اس کی اس عجیب اور غیر معمولی پریشانی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اب جلدی سامان وغیرہ باندھنا چاہیئے۔"

حمید ایک کلوے سے حرکت کرتے ہوئے آدمی کی طرح اس کے ہمراہ چل پڑا۔

ـــــــ

بمبئی کی بندرگاہ نظر آنے لگی تھی۔ تمام جہاز میں انتہا درجہ کا شور وغل تھا۔ ہر شخص جہاز میں کوئی بلند جگہ تلاش کر رہا تھا تاکہ وہ سب سے پہلے اپنے عزیز وطن اور اس کی رنگین سرزمین کا نظارہ کر سکے، کئی آدمی تو ابھی سے مسرت اور جوش میں رومال ہلا رہے تھے، حسینوں کے

قہقہے فضا میں بلند ہو کر "دل پھینک" انسانوں کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے' ہر ایک نے تقریباً اپنے سامان کی دیکھ بھال شروع کر دی تھی' ہر ایک کے چہرے پر مسرت' محبت اور بے تابی رقصاں تھی' ہر دل سمندر کی غیر دلچسپ یکسانیت اور تکلیف دہ سفر سے نجات پا کر اپنے "پیارے ملک" میں جانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

زرق برق ریشمی ساڑھیوں میں لپٹی ہوئی نازک اور بلوریں نازنین پھدک پھدک کر ایک دوسرے سے لپٹ رہی تھیں' مذہب پرست بزرگ اپنی "صحیح و سلامت واپسی پر" تقدیر اور خدا کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ غرض جہاز کی تمام زندگی میں ایک ایسی حرکت پیدا ہو گئی تھی' جیسے خدا نے دُنیا کو شادمانی اور محبت سونپ کر اس سے افسردگی اور تفکرات واپس لے لئے ہیں۔

لیکن اس امید اور محبت کی رنگین دُنیا اور اس کے ہنگام میں ایک نوجوان ایسا بھی تھا' جو بارہ نمبر کمرے کے سامنے اپنے بستروں اور سوٹ کیسوں وغیرہ کے انبار کے پاس سنجیدہ اور خاموش بیٹھا تھا ـــــ زندگی اور اس کی تمام حرکتوں سے بے نیاز' اپنے ہاتھوں میں اپنا نصف چہرہ چھپائے ہوئے ـــــ وہ اپنی نیم وا نگاہوں سے دور ـــــ بہت دور جہاں سمندر اور آسمان کی حد و ایک ہو جاتی ہیں ـــــ دیکھ رہا تھا' اس کی روح یاس اور امید کے درمیان بھٹک رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا اس دُنیائے حرکت و برکت میں کوئی پُرساں حال نہیں رہا۔

مس فرگوس جہاز کے کپتان کے پاس چند ضروری امور کے تصفیہ کے لئے گئی تھی' اور اس کی غیر حاضری میں حمید خصوصاً اس وقت یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ تمام مشکلات اور معاملات کی پیچیدگی اسے مس فرگوسن سے بلاکم و کاست کہہ دینی چاہئے تھی اور اب تک ایسا نہ کرنے سے اس نے اپنی غلطی کو اور بھی زیادہ پُرخطر بنا دیا ہے۔

اب جہاز ساحل کے قریب تھا' تمام لوگوں میں ایک طوفانی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی' مس فرگوس بھی اس پریشان ہجوم سے گزر کر تیزی سے حمید کے پاس آئی' اور اس کی پژمردگی بے حسی اور خاموشی پر اظہار نفرت کئے بغیر اس کا کندھا پکڑ کر ـــــ جیسے وہ اسے نیند سے بیدار کر رہی ہے ـــــ کہنے لگی۔

"چلئے! بندرگاہ آ پہنچی"

اس نے پہلے حیرت سے اس کے چہرہ پر نگاہ کی اور پھر اپنی کاہلی اور بے دلی پر نادم ہوتے ہوئے اپنی پتلون جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔

جہاز بندرگاہ پر لگ گیا تھا' اور مسافر دھڑا دھڑ اُترنے شروع ہو گئے تھے۔ مس فرگوس نے بھی قلیوں سے اسباب اٹھوایا۔ اور حمید کی معیت میں چل پڑی' لیکن وہ اب خلاف توقع بیتابی سے بہت جلد جلد قدم اُٹھا رہا تھا۔ جس سے مس فرگوس اور قلیوں کو ـــــ جو بوجھ کے نیچے سسک سسک کر چل رہے تھے ـــــ اس کثیر ہجوم میں بڑی دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔ اگرچہ ساحل پر قدم رکھتے ہی اس کے قدموں کی تیزی میں فرق پڑ گیا تھا۔ اور وہ اپنے اعضا میں ایک جمود روح میں سردی اور دماغ میں ایک تکان محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس کی نگاہوں کی تیزی اور پریشانی میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ چاروں طرف کسی کی تلاش میں انہیں شدت سے جھپکا رہا تھا۔

اک ساتھ اس کی نگاہ حبیب پر پڑی۔ جو ابھی نچلی سیڑھیوں پر تھا اور جس نے اگرچہ حمید کو دیکھا نہیں تھا' لیکن دیوانہ وار اس کی تلاش کے لئے بے پناہ ہجوم کو چیر رہا تھا۔

حمید اپنی خوش قسمتی اور واقعات کی ایسی عجیب مطابقت پر کھلکھلا اٹھا' اس نے اپنا رومال ہلاتے ہوئے اپنی انتہائی بلند آواز سے حبیب کو آواز دی۔ حبیب کچھ دیر ٹھٹکا اور پھر حمید کو پہچان کر نئی اُمنگ اور تازہ جوش کے ساتھ اس تک پہنچا۔

لیکن حمید کی خوشی اور اشتیاق حبیب سے مختلف تھا' اس کا چہرہ نہایت سنجیدہ اور پر امن تھا' اور وہ سب سے پہلے کم سے کم وقت میں اپنے اس "نہایت اہم معاملہ" پر گفتگو کرنا چاہتا تھا' حبیب اپنی امید اور توقع کے خلاف اس کے یہ طرز سلوک کو گہری اور مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا' اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنے شبہات کا اظہار کرتا حمید

اپنی آنکھیں پھاڑتے ہوئے اپنا منہ رازدارانہ طریق پر اس کے کان
کے نزدیک لے گیا، اور مدھم مگر تیز آواز میں بڑبڑانے لگا۔

"حبیب بھائی! مجھے اُمید ہے کہ تم ...... میری اس نازک
وقت پر ...... امداد ...... امداد کرو گے، ہاں! جہاز میں میری
اس سے" اور اس نے کانپتے ہوئے انگوٹھے سے مس فرگوسن کی
طرف اشارہ کیا "دوستی ہوگئی ہے ــــ اور ...... وہ میرے
ہمراہ .... میں بہت پریشان ہوں، حبیب! ...... جب
تک میں والدین کو رضامند کرلوں ...... اسے آپ مہمان .....
سمجھیے! .... ہاں! معاملہ بہت اہم ہے!"

"فکر نہ کرو حمید!" حبیب نے مسکراتے ہوئے کہا جیسے وہ
سب معاملہ سمجھ چکا ہے اور اسے بہت ہی معمولی سمجھتا ہے سب کچھ
ٹھیک ہوجائے گا ...... فکر نہ کرو"

"آپ مس فرگوسن ہیں" اس نے حبیب سے اس کا تعارف
کرتے ہوئے کہا "اور آپ" وہ حبیب کی طرف پھرتی سے اشارہ
کرتے ہوئے بولا "اور آپ میرے عزیز ترین دوست مسٹر حبیب
...... آپ" وہ اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے مس فرگوسن سے مخاطب
ہوا۔ "آپ ان کے ہمراہ تشریف لے جائیں، بس وہیں ان کی کوٹھی
پر آپ سے ملوں گا۔"

مس فرگوسن قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کے ہمراہ
روانہ ہوگئی۔

مسٹر حبیب اور مس فرگوسن کو مغربی تہذیب و تمدن کا شکر گزار
ہونا چاہیئے کہ دو دن کی دوستی میں انہوں نے نہ صرف ایک دوسرے
کی حقیقی فطرت اور قابلیت کا مکمل جائزہ لے لیا، بلکہ ایک دوسرے
کی عادات اور طرزِ سلوک کے بھی مداح ہوگئے ــــ جیسے وہ
پہلے ہی سے آپس میں جان پہچان رکھتے تھے۔

لہٰذا یہ مسٹر حبیب کے لئے کوئی حیرت انگیز یا غیر معمولی بات
نہیں تھی، جب مس فرگوسن نے مسلسل تین دن کی معیت میں حمید
کا ذکر تک ہی نہ کیا (بلکہ اگر وہ خود بھی کبھی ایسی "غلطی" کا مرتکب
ہوا تو مس فرگوسن نے فوراً موضوع گفتگو بدل کر اسے نظر انداز کرنے
کی کوشش کی ــــ جیسے اب حمید کی محبت اس کے لئے ناقابلِ
قبول ہے اور وہ اس سے دور رہنا ہی بہتر سمجھتی ہے) شاید یہ اس
وجہ سے تھا کہ حبیب مغربی زندگی اور مغربی عورتوں کی محبت اور
وفاداری سے مکمل واقفیت رکھتا تھا! یا شاید اس وجہ سے تھا، کہ
وہ "پہلی رات کے واقعہ" سے اپنے دل میں قدرتاً ایک ندامت محسوس
کرتا تھا! ــــ جس سے بعض اوقات وہ اپنی گردن نیچے ڈال دیتا
اور غیر ارادی طور پر ایک طویل خاموشی اختیار کرلیتا تھا۔

اب ہر شام اس "پہلی رات کے واقعہ" کے اعادہ نے اس کی
رہی سہی شرم کو بھی خاکستر کردیا تھا۔

اس کا دماغ طرح طرح کے "قبیح خیالات" کی آماجگاہ تھا! .....
اس کا یہ اعتقاد کہ "عورت صرف شہوانی خواہشات کی تشفی کے لئے پیدا
ہوئی ہے" ــ روز بروز مضبوط ہو رہا تھا ــــ جس کے نتائج
سے اگرچہ وہ خود مکمل واقفیت رکھتا تھا۔ تاہم اس سے بچنے یا اسے
تبدیل کرنے کی صلاحیت اس کا دماغ آئے دن کھو رہا تھا ...... اس
لئے اس کے دل سے حمید کی مس فرگوسن سے "پاکیزہ محبت" کی اہمیت
زائل ہو رہی تھی، وہ حمید کی بیوقوفی پر حیران تھا کہ اس نے کس طرح
کسی "گہرے تعلق" کے بغیر مس فرگوسن کے "حسین وعدوں" پر اعتبار
کرلیا ہے؟ ــــ

اس کے نزدیک ایک مرد کا ایک عورت کو سوائے اس "قبیح فعل"
کے اپنے قابو میں رکھنا ناممکن تھا،

اس کے لئے وہ اپنے مغربی فلسفے کو کام میں لا رہا تھا۔

"اخلاق اور اس کی پابندیاں کیا ہیں؟ کیا یہ سب اس لئے نہیں
کہ سب گناہ منظم طریق پر کئے جائیں، اور انسان سے ان "گناہوں" کے
انتخاب کا حق اور محبت کی آزادی چھین لی جائے؟ لیکن دنیا میں کتنے
ایسے انسان ہیں جو ان اخلاقی قوانین کے پورے پورے پابند ہیں؟
کیا صرف زبانی طور پر ان کی اہمیت کا اعتراف ان کے استحکام کیلئے

کافی ہوسکتا ہے؟ کونسا ایسا اخلاقی قانون ہے جس کے خلاف
سینکڑوں دفعہ بغاوت نہ ہوچکی ہو؟ پھر دُنیا کیوں بیوقوفی سے ہر
اس انسان کو گردن زدنی قرار دے دیتی ہے جو علانیہ طور پر ان سے
انحراف کرتا ہے اور اس کو اسی قدر زیادہ نیک، بزرگ اور انسانیت
کا خیرخواہ سمجھنے لگتی ہے جس قدر زیادہ پوشیدہ طریق سے وہ ان کی
خلاف ورزی کرتا رہتا ہے، دُنیا کی ذہنیت کیسی عجیب اور غلامانہ
ہے کہ بعض انسانوں کی رہنمائی اور عظمت کا جادو اس پر مسلط ہوچکا
ہے، کس طرح سمجھے اور سوچے بغیر ان کی ہر بات کی پیروی میں اپنی
نجات سمجھ رہی ہے؟ اور بھیڑوں کی طرح ان کے آگے چلی جارہی ہے
جس طرف "مذہب کے ڈنڈے" سے وہ اسے ہانکے لئے جارہے ہیں!

حبیب اپنی کوٹھی کے وسیع باغ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا
تھا اور ان ہی خیالات کی رو میں بہا جارہا تھا۔ یکایک مس فرگوسن
دبے پاؤں اس کے پاس آکر ٹھیر گئی۔ جب اس کی نیم بے ہوشی کو
کافی وقت گزر گیا اور مس فرگوسن محسوس کرنے لگی کہ اس کی موجودگی
بھی اس کو اپنے خوابوں سے جگانے میں ناکام ہوئی ہے تو اس نے
استکراہانہ انداز میں ایک بلند قہقہہ لگایا ——— جیسے وہ ایسی مدہوشی
کی حبیب سے توقع نہیں رکھنا چاہتی،

۱۴۶

"آپ کے تخیلات کی رنگین دُنیا!" اور وہ پھرتی سے اپنے
کندھے خوشی میں نچاتے ہوئے اس کے بالمقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

حبیب ٹھٹک کر رہ گیا، اور پریشانی اور حیرت میں مس فرگوسن
کو دیکھنے لگا۔

"پیاری فرگوسن!" اس نے اپنی خفت ایک خفیف مسکراہٹ
سے دور کرتے ہوئے کہا۔

مرد کے سامنے عورت کو اپنے حسن کا مظاہرہ کرنے کا طریقہ
خوب آتا ہے، اور دُنیا میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو مرد کی زبان سے
اپنے لئے تعریفی الفاظ سننے کی خواہشمند نہ ہو، بعض عورتیں اپنے
حسن کی تعریف اپنی زبان سے کرتی ہیں۔ اور بعض جاذب نظر لباسوں
سے بعض مردوں کے سامنے اچھلنے کودنے اور اپنی طراری کا مظاہرہ
کرنے سے اور بعض فوٹوگرافروں اور اخبارات کے مدیروں کو اپنے
حسن کی "اشتہار بازی" کے لئے آلہ کار بنانے سے اپنا مقصد نکالتی
ہیں۔

ہندوستان میں اکثر عورتیں اپنے حسن کا مظاہرہ خاموش رہ کر
کرتی ہیں جب تک کہ مرد خود بخود ان کے حسن کی تعریف میں رطب اللسان
نہیں ہوجاتے، بعض کسرنفسی سے مرد کے سامنے اپنے حسن کی تعریف
میں کسی دوسرے کے الفاظ دہراتے ہوئے، جیسے "دیکھو نا، امجد کے
ابا! موئی نجم اب بھی کہتی ہے کہ امجد کی شادی کی تقریب پر تمام عورتوں
میں میرا حسن ہیرے کی طرح چمک رہا تھا! بھلا، چھ مہینہ تو رہی
میں بیمار! — اب کہاں ہیرا اور کہاں میں؟"

"نہیں نعیمہ! میری آنکھوں سے دیکھو! اب بھی سینکڑوں
سے اچھی ہو۔"

بعض عورتیں جب کبھی تنہا نہ ہوں تو ایک دوسرے کی
جا و بیجا تعریف اور توصیف کرتی ہیں، جس کے در پردہ تکلّفات
کی آڑ میں اپنے اپنے حسن کے متعلق نئے روشن اور رنگین خیالات
پیدا کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

لیکن مس فرگوسن ان مغربی عورتوں میں سے تھی، جو نمائشی
کھیلوں میں حصّہ لینے اور اپنی نصف عریانی سے اپنے سڈول اور
حسین "جسم" کا مظاہرہ کرنے اور اس طرح کئی نوجوانوں کی توجہ کا
مرکز بننے میں دلچسپی لیتی ہیں۔

اور یہی وجہ تھی کہ مس فرگوسن اگرچہ پہلے بھی حبیب کی زبان
سے اپنی مضبوط اور سڈول جسامت اور ٹینس میں مہارت کی کئی
بار تعریف سن چکی تھی لیکن اس وقت بھی اس نے اس کے سامنے
بیٹھتے ہی ورزش وغیرہ کا موضوع زیربحث لانا مناسب سمجھا
جس میں اگرچہ اسے احساس تھا کہ حبیب اس قدر دلچسپی لیگا،
جتنی اس کے نزدیک اسے لینی چاہئے،

"ورزش سے جسم بہت شاندار ہوتا ہے، حبیب!" اس نے
انتہائی مسرت سے کہا۔

"ہاں! لیکن یہاں تو عورتوں کو چاردیواری میں حیوانوں کی طرح محبوس رکھا جاتا ہے جیسے کسی سازش کے قیدی ہوں۔"

حبیب اگرچہ کافی عرصہ انگلستان میں گزارنے کی وجہ سے مغربی عورتوں اور ان کے حسن کی نمائشوں سے کافی واقفیت حاصل کر چکا تھا اور اس کے لئے ایک عورت کا اپنے حسن کی تعریف میں اگرچہ کئی کتابیں بھی لکھ دینا جائز تھا، لیکن اس وقت وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا ......

اس کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ جس موضوع کی طرف حبیب گفتگو کا رخ موڑنا چاہتا تھا، مس فرگوسن اس سے بے نیاز ہو کر اپنی گفتگو جاری رکھنا چاہتی تھی —— شاید اس لئے کہ اس موضوع میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی خصوصاً جبکہ حبیب بھی کئی بار اس کے متعلق اپنی نفرت کا اظہار کر چکا تھا .... یعنی ہندوستان کا ناقابل برداشت ماحول (جو انگلینڈ سے سو فیصدی پست تھا) اور اس کی جاہلیت، مفلسی اور غلامی (جن سے نفرت اس لئے نہیں تھی کہ ایسی اور اس قسم کی خرابیاں بالکل دور نہیں ہو سکتیں بلکہ اس وجہ سے کہ اس کے انگلستان سے واپس آنے پر یہ سب دور کیوں نہیں ہوئیں! یعنی اس کی واپسی پر ہندوستان اس کے لئے تین سال میں یکایک انگلستان کیوں نہیں بن گیا!)

مرد کی یہ ازل سے خوش قسمتی یا بدقسمتی چلی آتی ہے کہ جب بھی وہ اپنے آپ کو عورت کے ساتھ پاتا ہے۔ تو اپنی انفرادی ذہنیت اور حیثیت بالکل معدوم کر دیتا ہے، اس طرح حبیب بھی صرف اس مسکراہٹ کے بعد دلچسپی اور سنجیدگی سے اس کی گفتگو پر دھیان دینے کو مجبور ہو گیا تھا۔

وہ ایک فصیح مقرر کی طرح اپنے حسن اور مشاغل پر روشنی ڈالتی رہی، بعض اوقات اپنی گفتگو کو زیادہ پُر اثر بنانے کے لئے اپنے دائیں ہاتھ کو زور سے جنبش دے دیتی اور کبھی اپنے لبوں کو زور سے بھینچتے ہوئے اپنے مردہ الفاظ میں زندگی پھونک دیتی۔ غرض کافی دیر "باتیں بنانے" کے بعد اس کی گفتگو فلمی صنعت پر آ کر رکی۔

"مجھے بھی ایک امریکن ڈائرکٹر نے اس صنعت کی "خدمت" کے لئے مدعو کیا تھا۔"

"تو پھر آپ گئیں کیوں نہیں......"

"مجھے ایسی زندگی ناپسند ہے۔"

"خوب!" حبیب نے داد دیتے ہوئے جیسے اس کی مس صاحبہ بہت شریف ہیں اور ایکٹروں جیسی "مکروہ" زندگی سے نفرت کرتی ہیں۔

"آج یہاں کون سا کھیل چل رہا ہے؟" اس نے حبیب کی داد کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "آج تو کوئی ہندوستانی فلم دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

"ہندوستانی فلم!" حبیب نے انتہائی بیزاری سے کہا۔ "میں تو ہندوستانی فلم دیکھنا ایک ناقابل معافی گناہ سمجھتا ہوں....... ہندوستان نے بس ایک فلم تیار کیا ہے جس کا میں دل سے مداح ہوں۔"

"کون سا؟"

"کرما" حبیب نے باچھیں کھلاتے ہوئے کہا۔ "اسے میں نے "ولایت" میں دیکھا تھا"

"اچھا تو انگلش پکچر سہی" فرگوسن نے اپنے اس غیر معمولی قومی افتخار پر مسکراتے ہوئے کہا۔

"پومپائی کا انجام" رٹز میں چل رہا ہے۔ اور میں اگرچہ اسے کئی بار دیکھ چکا ہوں، لیکن پھر بھی آپ کے ہمراہ ضرور دیکھوں گا۔"

چنانچہ اس باہمی فیصلے پر "فوراً ہی عملدرآمد" ہونا شروع ہو گیا۔

دوسرے دن وہ بہت سویرے اٹھے اور اپنے اپنے بستروں میں پڑے پڑے ہی پچھلی رات کی فلم پر تنقید اور تبصرے کرنے لگے، فرگوسن کا چہرہ خمار آلود تھا جس میں اس کے بے تکلف اور آوارگی کی حد تک پہنچے ہوئے آزاد رخ پر حجاب اور سنجیدگی رقص کر رہی تھی، اس لئے حبیب کی نگاہوں کے لئے آج اس حسین چہرے میں "رومانیت" اور غیر معمولی رعنائی کی جھلک تھی، .... اور وہ اپنی تمام توجہات سے اسے بار بار تک رہا تھا۔ اور اپنی خوش قسمتی پر دل ہی دل میں

نازاں ہو رہا تھا۔

وہ اپنی رائے کا اظہار فصیح اور بلیغ اور مناسب الفاظ میں — جیساکہ وہ عام طور پر علمی اور ادبی مجلسوں میں کیا کرتا تھا — نہیں کر رہا تھا، بلکہ ٹوٹے پھوٹے بے جوڑ الفاظ میں، جس سے صاف معلوم ہو رہا تھا، کہ اس کا دماغ کسی اور شاہراہ پر چل رہا ہے، اور وہ زیر بحث فلم کی بجائے کسی اور تخیلی ڈرامہ کی فلم دیکھ رہا ہے،

فرگوسن حبیب کی اس ہیئت پر دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی اور اس کی نیم بے ہوشی کے باوجود اپنے خیالات کا اظہار برابر اسی زور اور شور سے کر رہی تھی، چنانچہ جب گھنٹی بجی اور تھوڑی دیر بعد نوکر داخل ہوا تو اُسے نہایت افسوس اور بادلِ ناخواستہ طور پر مجبوراً اپنی گفتگو بند کر دینی پڑی۔

"کیا ہے؟" حبیب نے اپنے تخیل کی مدہوشی سے جاگ کر ایک ترش آواز میں پوچھا،

"حضور!" نوکر نے مودبانہ انداز میں کہا۔ "حمید صاحب تشریف لائے ہیں۔"

"اچھا!" حبیب نے استکراہانہ آواز میں کہا "بلاؤ!"

فرگوسن حمید کے نام پر حبیب کو معنی خیز اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی، جس کے چہرے سے نفرت اور تصنع اس طرح ٹپک رہا تھا، جیسے وہ ایک بیوقوف انسان سے ملاقات کرنے اور اپنا وقت ضائع کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اور جیسے "بلاؤ" کا لفظ اس نے غیر ارادی طور پر کہا ہے اور اسے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا!

"اسلام علیکم" حمید نے اندر آکر ایک خوش آہنگ آواز میں خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے سے کہا۔

لیکن جب اس نے اُن کے چہروں پر نگاہ کی تو ان میں نفرت اور بیگانگی کے آثار دیکھ کر وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا، جیسے اس پر ایک بجلی گر پڑی ہے، اور ایسے سلوک کی امید وہ خصوصاً حبیب سے کبھی نہیں رکھتا تھا۔

وہ ایک نیم مجروح انسان کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے ان کے سامنے ایک کرسی پر آہستہ سے بیٹھ گیا،

وہ ابھی تک اپنے سلام کے جواب کا منتظر تھا، لیکن اول تو شاید حبیب نے اس کے سلام کا جواب ہی نہیں دیا تھا، اور اگر دیا تھا تو اس قدر مدھم آواز میں کہ حمید اسے سُن ہی نہیں سکا تھا۔

"سُنائیے! آپ کے والدین راضی ہو گئے؟" حبیب نے مخالف طرف مُنہ پھیرتے ہوئے کہا، جیسے وہ عام طور پر اپنے نوکروں سے کیا کرتا تھا۔

"ہاں! اور انہوں نے شادی کی بھی بخوشی اجازت دیدی ہے" حمید نے تقریباً بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"شادی!" مس فرگوسن قہقہہ مار کر ہنسی۔

حمید حیرت اور اندوہ سے دیوانہ وار مُنہ پھاڑ کر رہ گیا، اس کی آنکھوں کے آگے ایک سفیدی سی چھا گئی، جس میں زندگی کی تمام شکلیں اسے بہت ہی مدھم نظر آنے لگیں۔

"کیوں؟" اس نے سسکتی ہوئی مجروح آواز میں پوچھا

"ان سے دریافت فرمائیے آپ!" حبیب نے طنزاً آواز میں مسکراتے ہوئے مس فرگوسن کی طرف اشارہ کیا اور اپنی آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے بے نیازانہ انداز میں نزدیک پڑی ہوئی میز پر سے ایک کتاب اٹھا کر دیکھنے لگ گیا۔

"یعنی آپ اپنے خوابوں کو پریشان اور بے تعبیر سمجھیے" فرگوسن نے تقریباً نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔

حمید بغیر کچھ کہے انتہائی ملول اور برہم چہرے لئے اُٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔

"پاگل ہو گیا ہے حمید!" حبیب نے اپنا افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"شاید کسی بھوت کا اثر ہو گیا ہے" فرگوسن بھی اس کی ہمنوا ہوئی۔

پھر دونوں مل کر بلند قہقہے لگانے لگے۔

ہاماگوچی

ایک سچّا اور نادر واقعہ

تاریخ شاہد ہے کہ جاپان ہمیشہ سے زلزلوں اور طغیانیوں کا شکار ہوتا چلا آیا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی شدید جھٹکے کی وجہ سے ہزاروں جانیں ضائع ہوگئیں۔ جزیرہ ہونے کی وجہ سے آئے دن یہاں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ۱۷ جون ۱۸۹۶ء کی شام کو ایک ایسا ہی شدید جھٹکا محسوس ہوا جس میں تقریباً تیس ہزار جانیں ضائع ہوئیں۔ ذیل کا جو واقعہ میں بیان کرنے والا ہوں وہ بھی ہو بہو اسی طرح کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔

لوگ اسے ہاماگوچی کا ہٹی کہا کرتے تھے، لیکن عام طور پر وہ صرف ہاماگوچی کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ایک گاؤں میں رہا کرتا تھا اور اپنے گاؤں کا سب سے معمر شخص تھا۔ اس لئے لوگ اس کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ مالی حالت کے لحاظ سے بھی وہ سب سے اچھا تھا۔ ہاماگوچی نے اپنی آنکھوں سے اپنے بال بچّوں کو زلزلے کا شکار ہوتے دیکھا تھا۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں اس خاندان کے دو رکن رہ گئے تھے۔ ایک وہ اور ایک اس کا آٹھ دس سال کا کمسن پوتا۔ اور اسی ایک مرکز پر ہاماگوچی کی امیدوں کی دُنیا قائم تھی۔ لڑکے کا نام ٹاڈا تھا۔ ہاماگوچی اپنے گاؤں کا سردار بھی تھا۔ وہ ہر وقت اسی دھن میں مگن رہتا تھا کہ اپنے آدمیوں کو ممکن سے ممکن آسانیاں بہم پہنچا سکے۔ وہ لوگوں کو نصائح و پند کرتا۔ اور ضرورت کے وقت مالی امداد دینے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ وہ ایک کاشتکار تھا۔ اور اس کی کل جائداد صرف اس کے کھیت تھے۔ انہیں وہ سُونے سے بڑھ کر چاہتا تھا۔

ان تمام خصوصیات کے علاوہ وہ پنچایت کا چودھری بھی تھا اور اکثر بڑی خوش اسلوبی سے وہ گاؤں کے جھگڑوں کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ یہ گاؤں نوّے گھروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اور اس گاؤں کے آدمی نیک اور خوش مزاج تھے۔

ہاماگوچی کی جھونپڑی ایک ٹیلے پر واقع تھی اور باقی جھونپڑیاں ٹیلے سے نیچے ایک میدان میں تھیں۔ ہر ایک جھونپڑی سے ملحق مالک مکان کا کھیت تھا۔ اور اس میدان سے تقریباً دو تین میل دور سمندر کا کنارہ۔ ہاماگوچی کا کھیت تین سمتوں سے جنگل سے گھرا ہوا تھا۔ صرف ایک سمت جگہ خالی تھی جہاں سے سمندر نظر آتا تھا۔ ہاماگوچی کے گھر سے کچھ فاصلے پر جاپانیوں کا مندر تھا جہاں قصبے کے لوگ اپنے دیوتاؤں کو نظریں دیا کرتے تھے۔ مندر میں ایک گھنٹہ لٹکا ہوا تھا جو خطرے کا الارم تھا۔ لوگوں کا یہ معمول تھا کہ فصل کٹ جانے پر سمندر کے کنارے جاکر خوشی مناتے اور تھوڑی دیر کے لئے دُنیا و مافیہا کو بھول جاتے تھے

فصل کٹ چکی ہے اور آدمی جوق در جوق سمندر کے کنارے جا رہے ہیں۔ صرف دو متنفس آج اس تقریب میں شامل نہ ہوسکے

ایک تو ہاماگوچی اور ایک ٹاڈا۔ ہاماگوچی آج کچھ علیل ہے، اس لئے
اس نے ٹاڈا کو بھی اس تقریب میں شامل ہونے سے روک دیا ہے
بار بار اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ گاؤں کے دوسرے
لوگ اس کے متعلق کیا خیال کریں گے۔ کبھی اس جذبہ سے مغلوب
ہو کر وہ چاہتا ہے کہ اس جشن میں جا کر حصہ لے کبھی علالت اس جذبہ
اور ارادہ پر حاوی ہو جاتی ہے۔

اسی الجھن میں وہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اور کھڑا ہو کر
میلے کی طرف دیکھنے لگا۔ گھروں کی چھتوں اور راستوں پر جھنڈیاں
ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن پھر بھی فضا
میں وہ خنکی نہیں جو ہونی چاہیئے۔ فضا میں اب بھی ویسی ہی گرمی ہے
جو زلزلے کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک معمولی
جھٹکا محسوس ہوا۔ پھر سکون چھا گیا۔ زلزلہ بالکل معمولی تھا۔ لیکن
ہاماگوچی کے نزدیک اس کی اہمیت تھی۔ نہ معلوم اس نے ایسے کتنے
جھٹکے دیکھے تھے۔ پھر بھی ہاماگوچی اس سے خائف ہو رہا تھا۔ اسی اثناء
میں اچانک اس کی نگاہ سمندر کی طرف گئی۔ سمندر عجیب طوفانی حالت
میں تھا۔ اب اس کے رہے سہے شکوک بھی جاتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے
سمندر کنارے سے اُدھر ہٹنا شروع ہوا۔ گو ہوا بالکل مخالف تھی لیکن
پانی سمندر کے کنارے کے خلاف ہٹتا جا رہا تھا۔ اب وہ اس خطرے
کو پوری طرح سمجھ گیا۔ ادھر سمندر موجزن تھا ادھر اس کے دل میں انسانی
ہمدردی کا طوفان۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان آدمیوں کی جان بچا لے
مندر پر پہنچنا بھی آسان نہ تھا، اور مندر تک پہونچنے کے لئے کسی فوری
تدبیر کی ضرورت تھی۔ اسی خیال میں وہ کھویا ہوا تھا کہ اچانک کہنے
لگا۔ "ٹاڈا۔ مجھے ایک مشعل جلا دو۔"

میلے کے زمانہ میں رات کو مشعلیں جلائی جاتی تھیں جس میں کپڑا
ٹھونس کر کپڑے کے اندر تیل ڈالا جاتا تھا۔ لڑکے نے فوراً حکم کی تعمیل
کی۔ ہاماگوچی مشعل لئے ہوئے کھیت کی طرف دوڑا۔ فصل بالکل سوکھ
چکی تھی اور یہی اس کی پونجی تھی۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ہاماگوچی
نے کھیت میں پہونچ کر ایک طرف سے آگ لگانی شروع کی۔ اور دیکھتے ہی
دیکھتے آگ کے بڑے بڑے شعلے اٹھنے لگے۔ ٹاڈا فرطِ حیرت سے دیکھ
رہا تھا اور اس کے معصوم چہرے سے اندرونی کشمکش ظاہر تھی۔ ہاماگوچی
کو اتنی مہلت نہ تھی کہ وہ لڑکے کو تمام باتیں سمجھا سکتا۔ مندر کے پجاری
نے جب آگ کے شعلے دیکھے فوراً خطرہ کا گھنٹہ بجانا شروع کیا۔ لوگوں
نے گھنٹہ کی آواز سُنی اور آگ کی طرف دوڑے۔

سُورج غروب ہو رہا تھا اور ابھی تک سمندر ساحل کی مخالف سمت
میں بہا جا رہا تھا۔ ہاماگوچی کے دیکھتے ہی دیکھتے آدمی آنے شروع
ہو گئے۔ آنے والے لوگ آگ بجھانے کی فکر میں تھے۔ مگر ہاماگوچی نے
منع کر دیا۔ آنے والے اس کے مُنہ کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔
انہوں نے ہاماگوچی سے پوچھا "آگ کیونکر لگی" اس سے پہلے کہ ہاماگوچی
جواب دے ٹاڈا نے بڑھ کر کہا "آگ تو اوجی سام نے خود ہی لگائی ہے
میں نے خود دیکھا ہے۔" یہ سُنکر لوگ اسے سچ مچ پاگل خیال کرنے
لگے۔

گاؤں کی کل آبادی جو کہ چار سو افراد پر مشتمل تھی جب ٹیلے پر پہنچ
گئی۔ اس وقت ہاماگوچی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور باآواز بلند کہنے
لگا "ہاں۔ آگ کے متعلق لڑکا بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ آگ خود میں
نے ہی لگائی ہے۔ لیکن کیوں لگائی ہے یہ تم ابھی دیکھ لوگے۔ میں
پاگل نہیں ہوں اور نہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھے پاگل سمجھیں۔ یہ کہتے
ہوئے اس نے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔ دیکھو سمندر کی طرف دیکھو
اور کہو کہ کیا میں واقعی مختل الحواس ہوں۔" لوگوں نے اس طرف
دیکھا۔ پانی کی لہریں پہاڑوں کی طرح گاؤں کی طرف امنڈی چلی
آتی تھیں۔ لوگ یہ منظر دیکھ کر خائف ہو گئے۔ اور اکثر ایسے بھی تھے جنہوں
نے خوف کی وجہ سے چیخنا شروع کر دیا۔ سمندر اسی طرح امنڈا چلا آ رہا
تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی گاؤں میں آگیا۔ اور بڑے زور و شور سے
گاؤں پر حملہ کیا۔ اسی طرح پانچ چھ مرتبہ لگاتار حملہ ہوتا رہا لیکن ہر بار
کم تیزی کے ساتھ۔ حتیٰ کہ اس کا زور بالکل گھٹ گیا اور پانی اپنی
جگہ پر ساکن ہو گیا۔ ہاماگوچی کا ٹیلہ بالکل سلامت رہا۔ لوگ خوف
کی وجہ سے بوکھلائے جا رہے تھے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کا گاؤں

تباہ ہوگیا۔ جہاں لہلہاتے کھیت نظر آتے تھے وہاں صاف میدان تھا۔" میں نے آگ اسی لئے لگائی تھی۔" ہاماگوچی نے کہا

لوگوں کے دلوں میں اس کی وقعت دوچند ہوگئی۔ ہاماگوچی اب فقیر تھا۔ یہ اپنی تمام پونجی برباد کر چکا تھا۔ لیکن پھر بھی خوش تھا ٹاٹا دوڑ کر اپنے دادا کے قدموں پر گر پڑا۔ لوگ جو اب اپنے پورے ہوش میں آگئے تھے۔ ہاماگوچی کے سامنے ایسے جھک گئے جیسے کسی دیوتا کے سامنے جھکا کرتے ہیں۔

ہاماگوچی کی آنکھوں سے چند قطرے ٹپک کر زمین میں جذب ہو گئے۔ لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ "میرا گھر تمہارا اپنا گھر ہے آپ یہاں بڑی خوشی سے رہ سکتے ہیں۔ باقی جو ہیں مندر میں گزارہ کر سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر ہاماگوچی گھر کی طرف ہو لیا۔ لوگ بھی اس کے پیچھے چلے جارہے تھے۔

چونکہ اس زمانہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ مدد پہونچانی بہت مشکل تھی۔ اس لئے یہ مصیبت لوگوں پر بہت دنوں رہی جب خوش حالی کا زمانہ آیا۔ لوگوں نے گھر از سر نو تعمیر کئے لیکن ہاماگوچی اب بھی اسی جھونپڑی میں پڑا رہتا۔ اسے اب دنیا کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ لوگ اس کے احسان کا بدلہ تو کسی صورت سے بھی ادا نہ کر سکتے تھے۔ پھر بھی اپنی دانست میں انہوں نے ہاماگوچی کیلئے بہت کچھ کیا۔ ہاماگوچی کے نام پر ایک مندر بنوا دیا۔ جس میں اس کا نام سونے کے حرفوں میں لکھا گیا۔ لوگ اسے دیوتا سمجھنے لگے۔ اور اس کے مندر میں اسی کی مورت کی پوجا کرنے لگے۔ لیکن ہاماگوچی اپنی جھونپڑی میں پڑا رہتا۔ وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز تھا۔

ہاماگوچی پر اس کا کچھ اثر ہوا یا نہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ ہاں میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہاماگوچی کو مرے ہوئے ڈیڑھ سو سال ہو گئے ہیں۔ لیکن اب بھی اس کا نام زندہ ہے۔ اب بھی اس کا مندر موجود ہے۔ اور اب بھی عقیدت مند وہاں جا کر مصیبت کے وقت اس کی روح سے دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

(ترجمہ)

یوسف کوٹلوی

(از شیلانگ)

"کہکشاں"[1] کی ایک کہانی ڈرامہ کی صورت میں

پیاروں کی امانت

(اثر ساغر نظامی)

ڈرامے کے افراد

لطیفہ خانم .... ایک متوسط خاندان کی ماں
یاسمین .... ایک بلّی
شاہجہان .... نفیسہ کی بیٹی
سکندر .... نفیسہ کا بیٹا
حمیدہ خانم .... لطیفہ کی ماں
ماجد .... لطیفہ کا چھوٹا بھائی
محلّہ والے اور عزیز ....
اختر .... لطیفہ کا شوہر

---

[1] ساغر نظامی کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت مجلد ۸عہ غیر مجلد عہ ۔ مکتبۂ ساغر میرٹھ

پہلا منظر

(ایک گھرانہ ملازمت کے تبادلے کے سلسلے میں ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ اسباب کے کچھ بنڈلے بے ترتیبی سے پڑے ہوئے ہیں۔ اور کچھ گاڑی پر لائے جا رہے ہیں۔ اسی انبار میں ایک طرف لطیفہ کی بیٹی شاہجہان کی ہفت رنگ بلی یاسمین اپنے بچوں کو چاٹ رہی ہے۔ ان بچوں کو دنیا میں آئے ہوئے محض بارہ گھنٹے ہوئے ہیں۔)

حمیدہ۔ (لطیفہ کی گردن میں باہیں ڈال کر روتے ہوئے) ساری عمر گزر گئی اب بڑھاپے میں چھوڑ کر تو مجھے کہاں جا رہی ہے!؟

لطیفہ۔ (دھاڑیں مار کر) بُوا!

حمیدہ۔ بیٹی! سو منہ تو ایسا دور نہ تھا۔ مگر میرٹھ تو یہاں سے کالے کوسوں ہے۔

لطیفہ۔ اب کاہے کو میں علی گڑھ لوٹ کر آسکوں گی اس بھرے پرے محلہ میں بوڑھی ہو کر بھی بچی کی طرح تھی۔ دن میں کبھی شاہد آتا تھا کبھی ساجد۔ کبھی اختر کبھی احسانہ۔ کبھی وہ مسکراتا آ گیا کبھی وہ ہنستی چلی گئی۔ لاکھ مصیبتیں تھیں مگر گھر کا خیال سب سے بڑا آرام تھا۔ اللہ کیا میری قسمت میں علی گڑھ کی مٹی نہیں ہے؟

محلہ کی عورتیں۔ بی بی ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو' اللہ رکھے تم کو جہاں رہو خوش رہو۔ تمہارا سہاگ قایم رہے۔ اپنے بچوں کا بیاہ شادی دیکھو۔ جا رہی ہو تو کوئی عمر بھر کے لئے تھوڑے ہی جا رہی ہو۔

(ماں بیٹیوں کو علیحدہ کرتی ہیں سکندر آتا ہے)

سکندر۔ ہائیں! یہ رونا دھونا کیسا؟ علی گڑھ سے میرٹھ جانے کے لئے ایسا رویا جا رہا ہے گویا سمندر پار کا سفر کرنا ہے، کوئی تم ہجرت کر رہی ہو، مجھے خوف ہے کہ گاڑی کا وقت کہیں ان آنسوؤں میں نہ بہہ جائے۔ یہ مشرقیت ترقی کی راہ میں کیسی شدید روک ہے۔ زندگی کی جدوجہد کے بازو توڑ دیتی ہے۔

(رُخ پھیر کر دل کی بے تابی پر قابو پا کر)

سکندر۔ (خود) تیرا کیا حال ہے۔ کیا در و دیوار کی گردن میں باہیں ڈالکر تو نہیں رونا چاہتا، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وطن سے ہمیشہ کیلئے چھٹتا ہے، یہ مشرقیت' آہ یہ آنسو' ان سے زیادہ قیمتی چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔ اگر میں ان موتیوں کو سمیٹ سکتا تو سمیٹ کر عمر بھر کے لئے گلے کا ہار بنا لیتا۔ زندگی کی ہر دوڑ دھوپ سے یہ سوکھ جانے والے موتی قیمتی ہیں۔

(شاہجہان سامنے آ کر)

شاہجہان۔ (الّھڑ پن مگر آنسو بھری آنکھوں سے) تو بھائی جان! یہ یاسمین یہیں رہ جائے گی' اور یہ اس کے ننھے ننھے بچے بھی؟!؟

(سکندر چپ ہے لطیفہ آنسو پونچھتے ہوئے کہتی ہے)

لطیفہ۔ ہاں بہن' کیا کریں' "ان" کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔

شاہجہاں (روہانسے ہو کر) اونہہ' ہونہہ ہم تو لے چلیں گے' اس گھر میں پیدا ہوئی' ساری عمر ساتھ رہی' اب کیوں —— ہم تو یاسمین کو ضرور لے چلیں گے۔

لطیفہ۔ سچ ہے' یہیں پلی' یہیں جوان ہوئی' یہیں ماں بنی۔

سکندر۔ (مڑ کر تاثر کو چھپاتے ہوئے) اس وقت کوئی ضد نہ کرو۔ کچھ دن بعد ہم خود آئیں گے، یاسمین کو مع اس کے بچوں کے لے جائینگے رات ہی تو اس نے بچے دئے ہیں۔ چند گھنٹے کے بچوں کو لیجانا کیسی مشکل بات ہے۔ سوچو تو ان کی تو آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں۔ پھر ایک دو ہوں تو لے بھی چلیں وہ تو سات ہیں سات'۔

شاہجہاں۔ (بات کاٹ کر) بھائی جان! ساتوں کیسے خوبصورت ہیں دیکھئے، کوئی سُرخ ہے تو کوئی کالا' اور ایک تو سات رنگ کا ہے —— بھائی جان لے بھی چلو —— لے بھی چلو۔

لطیفہ۔ ضدن تو تم ہمیشہ کی ہو۔ لو چلو "وہ" بھی آ گئے، گھوڑا گاڑی تیار ہے۔

(اختر آتا ہے)

اختر۔ ۸ بجکر ۴۵ منٹ ہو گئے۔ اب کیوں دیر ہو رہی ہے۔

(حمیدہ اپنے داماد سے لپٹ جاتی ہے)

اختر۔ (بُردبارانہ انداز میں) ارے! ریلوں نے تو دور دراز مقامات

کو بہت قریب کر دیا ہے، سب آتے جاتے رہیں گے۔

محلّے کی عورت۔ یہ ٹھیک ہے مگر اختر میاں ماں کی مامتا بڑی چیز ہے۔

لطیفہ کی ہندو سہیلی۔ پردیسی کی ریت کو سب کا من للچائے
ادگن دا میں ایک ہے رہے نہ سنگ لیجائے

(سب لوگ کھڑے تھے کہ یاسمین چیخی)

یاسمین (بلّی) "میاؤں" ـــــ "میاؤں"!

(اس کی آواز میں مخلصانہ درد اور بے لوث
محبّت کی چنگاری تھی سکندر اپنے تاثرات پر
قابو نہ پاسکا)

سکندر۔ محبت کی چنگاری سے انسانی دل یوں خالی! اور حیوانی سینہ یوں روشن! میری پیاری چنبیلی! تو میرے وطن کے تمام عزیزوں اور دوستوں سے پاک و مقدس ہے، تیرا دل حیوان ہو کر آدمی کی محبّت سے لبریز ہے، جن لوگوں کے لئے میں خاک ہوا، جن کے لئے میں نے سب کچھ کیا، جن کے لئے میں نے اپنی زندگی تج دی وہ سب مجھ سے دور، دور ہیں، کیوں نہ دور رہیں، دوست ہیں، عزیز ہیں، اور "انسان ہیں"۔ مگر تو حیوان ہو کر اپنی دردناک آواز سے میرا دامن پکڑتی ہے، اے میری رنگوں کی گیند تجھے یہ معلوم نہیں کہ محبّت کرنا سب سے بڑا جرم ہے۔ وہ لوگ جو صبح سے شام تک میرے قصیدہ خواں تھے آہ اُن میں سے ایک نہیں جو مجھ سے سچّائی کے ساتھ کہے ـــــ تم کیوں جا رہے ہو؟ یہ دُنیا، یہ انسان! میری نظر سے اس لمحہ میں ایک بڑے مینار کی چھتری کی طرح گر گئی ہے۔

(یاسمین کو گود میں اٹھا کر)

اُمیری بلّی! میں اپنے آنسو تیرے بالوں میں جذب کر دوں۔ یہ دوستوں کے رومال، عزیزوں کے دامنوں، اور بہنوں کے ڈوپٹوں سے زیادہ سچے اور پاک ہیں، دوستوں کی پوشیدہ نیش زنی، اور منافق کی چھپی ہوئی نشتر زنی تیرے تیز پنجوں اور مہلک دانتوں سے زیادہ خطرناک ہے۔

(بلّی کو بوسہ دے کر)

اپنے تنفس کی موسیقی کو میرے بہرے کانوں سے قریب کر دے۔ یہ دُنیا اور انسان کے حیوانی سلوک سے پتھر ہوگئے ہیں انکو اپنے سانسوں سے ذی حس بنا دے۔ میرے پیارے چوپائے۔ رشکِ آدم چوپائے۔ میں زندگی کی اس منزل پر ہوں کہ مجھے انسانی رخساروں آوازوں، اور چلتے پھرتے دوپایہ جانوروں سے زیادہ تیری غیر پاکیزہ مونچھوں کے بالوں اور کرخت تنفّس میں شانتی محسوس ہوتی ہے۔

(ماں کی جدائی پر یکایک یاسمین کے بچے کلبلائے
یاسمین کبھی سکندر کو دیکھتی تھی کبھی بچّوں کو آخر
سکندر نے یاسمین کو اس کے بچّوں میں چھوڑ دیا
جن میں سے ایک کو وہ چاٹنے لگی)

سکندر۔ اگر دل کی کوئی زبان ہے تو کیا یاسمین نے سب کچھ نہیں سُنا ہوگا؟ جب وہ بے زبان ہو کر سب کچھ کہہ سکتی ہے تو سُن کیوں نہیں سکتی؟

(یاسمین بولی)

میاؤں ـــــ میاؤں ـــــ میاؤں

(اور سکندر کے قدموں میں لوٹنے لگی۔ گویا
وہ یہ کہہ رہی تھی)

جاڑے کی راتوں میں قومی شمعوں کی روشنی میں جگمگاتے ہوئے تاروں کی پاک گود میں، تم بیٹھے ہوئے گنگنایا کرتے تھے۔ پیارے انسان! تم میری سانسوں کی دھوکنی کی بھی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے تمہارا گرم لحاف میری پناہ تھا۔ میں تمہارے گیتوں کی اتنی اسیر ہوگئی تھی کہ میں نے شکار بھی چھوڑ دیا تھا جب تم گاتے تھے تو میں پڑی ہوئی سُنا کرتی تھی۔ میں کچھ نہیں سمجھتی تھی، مگر میرا بال بال کانپتا تھا، میری حیوانی روح، میرے لمبے لمبے بالوں والی کھال کے شامیانے تلے ناچتی تھی۔ جانے تم کس کے لئے گیت کہتے اور گاتے تھے۔ وہ گیت مجھے اب کون سُنائے گا؟ میں تو بلّی ہوں، حیوان ہوں، انسان اپنے دسترخوان کی جھوٹی ہڈیوں سے میری دعوت

کرتے ہیں۔ تمہاری طرح اپنے ساتھ بیٹھ کر کون مجھے محبوبہ کی طرح کھانا دیگا۔ ابھی تک میرے ایک ایک بال میں تمہارے بوسوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ ابھی تک میری پیٹھ پر تمہاری لمبی لمبی انگلیوں کے لمس کی حرارت اور کیفیت نہ دکھائی دینے والے نشان چھوڑ گئی ہے آہ! میرے انسان! تمہارا حیوان اب کس مخلوق کی گود میں پناہ لے۔

(سکندر کی آنکھوں میں آنسو اور آنکھیں
یاسمین کی آنکھوں میں گڑی ہوئی ہیں۔)

تم اب جا رہے ہو۔ اور ابدی طور پر جا رہے ہو۔ یہ ویران گھر یہ اجڑا ہوا گھر، گویا مجھے جاگیر دئے جا رہے ہو، وہ میری آرامگاہ تمہاری پتو کی چُنی ہوئی پیازی چندریا، وہ اب اس ویرانے میں کبھی نظر نہ آئے گی۔ راتوں کو میرے نوزائیدہ بچوں کی نگرانی اس گھر کی کاٹنے والی تاریکی اور تنہائی کریگی اور میرے بچے بلّوں کی غذا ہو جائیں گے ——— میں اپنی نگاہوں سے تمہارا دامن پکڑ لوں گی ——— کیسے جاؤ گے میرے انسان! ——— لے چلو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو ——— میاؤں ——— میاؤں ——— میا ——— کیوں لے چلو گے میں نگوڑی کس کام کی ہوں، ایک میری جان ہوتی تو تم شاید ضرور لے چلتے، میں تندرست ہوتی تو تم مجھے حسین اسباب ہی سمجھ کر ساتھ لے لیتے۔ مگر میں ایک رات کی زچہ ہوں، میرے سات بچے ہیں، میاؤں ——— ——— میاؤں ——— لے چلو۔

صبّو کے دودھ میں سے تھوڑا سا میرے بچوں کو دیدیا کرنا تم تو بڑے فیاض اور دل والے ہو۔ سُنتی ہوں تمہاری جنس کو فیاضی کا بڑا دعویٰ ہے، مگر تم بخیل کب سے ہو گئے!؟ کیا وقت کا سایہ پڑ گیا؟ ایک بچے کو ——— نہیں دو کو میں مُنہ میں دبا لوں گی۔ ان کو گاڑی میں بٹھا دوں گی اور پھر اسی طرح ساتوں کو لے جاؤں گی، نہیں تو مجھے اور میرے بچوں کو ایک ٹوکری میں رکھدو، ایسا ہی کرو میرے خوبصورت انسان! سچ جانو، میں تم بن نہیں جی سکتی، پھر کون اس مکان میں آئے، کون جائے، میری آنکھیں در و دیوار میں تم کو گاتے ہوئے دیکھیں گی، مگر نہ پائیں گی۔ نہ پائیں گی اور میں پتھروں سے سر ماروں گی۔ میرے لمبے بال تمہارے بوسوں کے عادی ہو گئے ہیں۔ یہ چھتوں کی گھنی گھاس اور در بدر گھسٹتے گھسٹتے بدبودار اور بے نور ہو جائیں گے۔ تمہاری سانسوں کا عطر میں کہاں سے حاصل کروں گی۔ تم جانتے نہیں ہو میں حیوان ہوں، میری کوئی قیمت نہیں ہے، میں بلّی ہوں میرا حُسن گونگا، اور میری سجاوٹ خاک کی طرح بیکار ہے۔ تم نے اس حُسن کو زبان بخشی، اور اس سجاوٹ کو عروج دیا۔ اب مجھے نظر سے کیوں گراتے ہو ——— لے بھی چلو، میں تمہارے ساتھ چلوں گی (دردناک آواز میں) ——— میاؤں!

(یاسمین نے مُنہ میں دو بچے دبائے اور دروازے
سے نکلنے کو تھی کہ سکندر نے کمرہ بند کر دیا
اور کنڈی لگا کر باہر کھڑا ہو گیا)

سکندر: یہ میں نے کیا سُنا، یاسمین لڑکیوں کی طرح بول رہی تھی، نہیں بول رہی تھی، تعلّق نے زبان عطا کر دی، محبت نے نُطق بخش دیا، ایک بلّی کو، ایک چوپایہ کو، اور یہ میرے دل میں نرم نرم، ٹھنڈے ٹھنڈے کس کے پوروئے محسوس ہو رہے ہیں۔ میرے خیالوں میں کون مظلوم بنی کھڑی ہوئی ہے؟ اس کی آنکھیں میرے خیال کی فضا پر چھائی جا رہی ہیں حسرت بھری نگاہ دل ہلائے دیتی ہے۔ یہ کوئی اشرف المخلوق کی نسل سے ہے، نہیں یاسمین! ایک بلّی ——— ایک چوپایہ اور اس کے بند آنکھوں والے بچے!

(اختر برآمدے میں آتا ہے)

اختر۔ سکندر کیا سوچ رہے ہو ——— کیا کوئی چیز رہ گئی؟

سکندر: جی ہاں!

اختر۔ کیا رہ گیا؟

سکندر۔ کچھ نہیں ـــــ مگر ـــــ سب کچھ، حیوان! ـــــ مگر انسان!

(بات کاٹ کر)

اختر۔ خیر، کچھ لوگ رخصت کرنے کے لئے باہر تمہارے منتظر ہیں

سکندر۔ انسان؟! ـــــ مگر حیوان!

تھوڑی دیر کے بعد کھڑکیوں اور دروازوں میں جھکی ہوئی لڑکیوں اور بوڑھی عورتوں کی ملکی ملکی چیخوں اور تیزی سے بہتے ہوئے آنسوؤں میں لطیفہ کی گاڑی روانہ ہوگئی۔ چلتے چلتے سکندر نے حمیدہ بانو ... اپنی نانی سے کہا

سکندر۔ نانی، پیاروں کی امانت تمہارے سپرد ہے۔

حمیدہ۔ اچھا پیارے!

دوسرا منظر

لطیفہ کا ویران مکان (یاسمین اور اس کے بچے ایک کمرہ میں بند ہیں، کمرہ کے اندر یاسمین دوڑتی پھرتی ہے حمیدہ اپنے چھوٹے بیٹے کو لے کر کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ یاسمین کے منہ میں ایک بچہ دبا ہوا ہے)

یاسمین۔ (بچوں کو چھوڑ کر) میاؤں! (دُم کو حمیدہ کی ٹانگوں میں اُلجھاتی ہے)

حمیدہ۔ چھوڑ گئے، تجھے سب چھوڑ گئے، یہ کمرہ تصویروں اور سامانوں سے کیسا سجا ہوا تھا۔ آہ کسے خبر تھی کہ چٹی دیوار پر صرف کیلوں کے منحوس نشان ہنستے ہوئے ماضی کی یادگار رہ جائیں گے کون جانتا تھا کہ میرے پیچھے سکندر کے گیتوں کی بجائے یہ سناٹا ہوگا۔ ہولناک سناٹا۔ خوفناک سناٹا ـــــ ـــــ الٰہی میرے پیارے کیوں چلے گئے!؟

(سسکیاں بھرتی ہے)

ماجد۔ سکندر صاحب راضی نہ ہوتے تو کوئی بھی یہاں سے نہ جاتا۔

حمیدہ۔ بھیّا اسی کا دل اکھڑ گیا تھا۔

بلی۔ میاؤں ـــــ میاؤں ـــــ میاؤں!!!

حمیدہ۔ اری دکھیا! غم میں گھلی جاتی ہے۔ دیکھ تو ماجد! بچاری کا کیسا منہ اُتر گیا ہے!؟

یاسمین۔ میاؤں ـــــ میاؤں ـــــ میاؤں!

حمیدہ۔ مت رو، پوسی! میری پوسی!

ماجد۔ صاف کہہ رہی ہے "میاں!" ـــــ ارے میاں اب رکھتے ہیں، میرٹھ بھی پہنچ لئے۔

حمیدہ۔ جنّت بھی کیا بُری بَلا ہے، اس میں آدم زاد اور حیوان کی شرط نہیں ـــــ ہائے صبیّو سے کھیلا کرتی تھی، ارے سکندر اسے اپنے پاس سُلاتا تھا!

ماجد۔ اچھا مجھے تو ذرا جانا ہے، بیڈمنٹن کا میچ ہے، نسیما کو بھیجتا ہوں وہ اس کے بچوں وچوں گھر لے جائے گی۔

بلّی۔ میاؤں ـــــ!

ماجد۔ کیوں غل مچاتی ہے، میں کہیں نہیں جاتا، میری قسمت مجھ میں اور میں علی گڑھ میں عمر بھر کے لئے قید ہوں۔

حمیدہ۔ تم بھی چلے جاؤ، تمہیں بڑا شوق ہے ہوا خوری کا، ارے جس کے دل پر بیتتی ہے وہی خوب جانتا ہے سبق لو اس بے زبان جانور سے ـــــ کیسا چہرہ اتر گیا ہے (یاسمین سے) نانا میری پوسی، سکندر آئیگا اور تجھے لے جائیگا (بچوں پر ہاتھ پھیر کر) ہائے کیسے منّے منّے ہیں، پیارے پیارے، سب ان کے لئے روتے چلے گئے، شجو باپ کے ڈر سے کچھ نہ کہہ سکی، دل پر پتھر رکھ کر چلی گئی، اس کی تو زندہ گڑیا تھی۔ یہ بلّی۔ یہ بے زبان "عورت"!

(بلی حمیدہ کی نگاہوں میں حسرت بھری نگاہیں گاڑے ہوئے ہے)

حمیدہ۔ مجھ سے کیا کہتی ہے، میرے پیاروں کی نشانی، کوئی میں نے

تجھے روک لیا، چل میں تجھے پیاروں کی امانت سمجھ کر پالوں گی
میرے پیاروں کی یادگار، جیتی جاگتی یادگار۔
(نسیما آتی ہے ٹوکری اس کے ہاتھ میں ہے)
نسیما۔ لو بُوا! (ٹوکری پاس رکھتے ہوئے) ایک نہ دو، دو نہ چار، سات
اب کے تو اس نے گھر ہی بھر دیا۔
حمیدہ۔ (نسیما کو بازو سے دھکا دیتے ہوئے) چل تیری آنکھوں میں خاک
کیا تیرے اولاد نہیں ہے۔ پوتے، نواسوں والی ہو کر ایسے کلمے
زبان سے نکالتی ہے، جانور ہو یا آدمی اللہ نے جان سب کو
دی ہے یہ تو سوچا ہوتا کہ ان کے لئے میرے پیارے بسورتے
ہوئے چلے گئے، ڈائن کہیں کی چل اُٹھا ٹوکری کو۔
(دونوں جاتی ہیں)

تیسرا منظر

(ریل تیزی کے ساتھ جا رہی ہے سکندر کھڑکی
کے سہارے بیٹھا ہوا ہے)
سکندر۔ وہ کوٹھری میں بند ہوگی، چلا رہی ہوگی، چیخ رہی ہوگی چھوٹی
کھڑکی کی سلاخ کو توڑ دینا چاہتی ہوگی۔ اس اکیلی کوٹھری
میں جہاں ویرانی کی بدبو ہوگی اور یکسانہ گھٹن، اس کو تنہا
دیکھ کر زہرا کی روح تڑپ گئی ہوگی۔ یہ اس کی یادگار تھی
میں اس کو چھوڑ آیا، اتنا بے حواس ہو گیا کہ زہرا کی یادگار
کو چھوڑ آیا۔
اختر۔ (سکندر سے) کہہ آئے بوا سے! بچوں کو اور سنبیلی کو
لیجائیں اپنے گھر۔
شاہجہاں میاں جی! تم نے اُسے ہم سے چھڑا یا ہے۔ اگر آپ کے سینے
کا ڈر نہ ہوتا تو میں اس کو اپنی ڈوپٹیا میں باندھ لیتی۔
اختر۔ واہ، اور سات بچوں کے ٹکٹ کون دیتا!؟
نفیسہ۔ یوں جو کہو چند روپیوں کی خاطر، خاندانی بلی کو ہمیشہ کے لئے

ہاتھ سے کھو دیا، خدا جانے بچاری کا کیا حشر ہوگا۔
اختر۔ کچھ حشر نہیں ہوگا۔ سکندر علی گڑھ آئیں گے تو لیجائیں گے
سکندر۔ (ڈبے سے فضا کی طرف گردن نکالتے ہوئے دانت بھینچ کر)
سو، اگر انسان! مصلحت اور زر کا غلام، غلام اور غلام
ساز، مادّہ کا پجاری، روح کا دشمن ——— اور اگر
قبلہ بجائے آدمی کے بلی ہوتے!! ——— اور یوں بے بسی
کے عالم میں چھوڑ دئے جاتے۔
نفیسہ سکندر کے دوست آذر کی بہن زہرا نے باپ اور بھائی
سے لڑ کر یہ بچہ سکندر کو دیا تھا۔ بیٹی! میں وہ دن بھولی
نہیں ہوں، جس دن دُکھیا زہرا کو ۱۰۴ بخار تھا اور ہم سب
دیکھنے گئے تھے۔ اس کے بستر پر یہ بچہ پڑا ہوا تھا۔ سفید
موتیوں کی خوبصورت کنٹھی اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھی
سکندر نے یاسمین کو پیار کیا اور بولا، ایسی خوبصورت بلی
میں نے تو دیکھی نہیں، یہ سنتے ہی زہرا نے کہا تھا
کہ سکندر ہے میرے مرنے کے بعد یہ میری یادگار، اور پھر
وہ ہماری طرف دیکھ کر رونے لگی تھی۔ نہ وہ رہی نہ اُس
کی یادگار (بات کاٹ کر اور بے تاب ہو کر)
سکندر۔ بوا جی، خدا کے لئے چپ ہو جائیے۔
نفیسہ (نہیں بیٹا! میں تو بات کہہ رہی ہوں، خیر اب تم اس کو لے آنا اور
سکندر خط لکھتے رہنا، بوا اس کو حفاظت سے رکھیں گی، آدمی اسی چیز کی حفاظت
کرتا ہے جو اس کے لئے مفید ہو اور بے چاری یاسمین، وہ بلی وہ بے زبان
حیوان! اس کو کون پوچھے گا، کیوں پوچھے گا، ان کے گھر میں تو بے
ہی نہیں ہیں۔
(پھر فضا کو دیکھ کر)
دنیا کے دوسرے انسانوں کی طرح میں بھی بانی ہوں، غدار ہوں میرے
کوٹ کی جیبیں، بچوں سے مجنونانہ طور پر بھری ہونی چاہئیں تھیں،
اور میری گود میں یاسمین ——— سب چھوڑ آئے! مگر میں کیوں

چھوڑ آیا' زہری کی یادگار' آج میرا دل یہ حقیقت اگلے دیتا ہے کہ میں یاسمین کو زہری کی طرح پیار کرتا تھا۔ اس کا تنفس مجھے اکثر زہری کا تنفس معلوم ہوتا تھا راتوں کو نیم غنودگی کے عالم میں میرے بستر میں اس کی کلبلاہٹ مجھے دھوکا ہو جاتا تھا کہ نازک زہری میری آغوش میں ہے' اب میرا کمرہ میری خوابگاہ' میرا بستر سب تاریک ہو گیا۔ (کھڑکی پر سر رکھ دیتا ہے)

چوتھا منظر

(حمیدہ خانم اور ماجد بیٹھے ہیں۔ یاسمین ایک چھوٹے کمرہ میں معہ اپنے بچوں کے بند ہے)

(حمیدہ چٹخنی کھول کر کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں اس کے پہونچتے ہی یاسمین چیخیں مارتی ہے)

یاسمین میاؤں ——— میاؤں ——— میاؤں!

حمیدہ۔ کیا کہتی ہے اری دُکھیا ابرہ کی ماری (ماجد سے) دیکھو تو ماجد میرے پیاروں کے دھیان میں اپنے کل کے پیدا ہونے والے بچوں کو کبھی تو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔ اری نگوڑی تجھے کیا ہو گیا!

یاسمین۔ (بلی نے ایک نگاہ حمیدہ پر ڈالی' گویا وہ کہہ رہی تھی) مجھے روگ ہے

محبت کا جسکو تم متمدن اور ناطق حیوان! مصلحت اندیشی اور جنسی تقاضوں سے تعبیر کرتے ہو' تمہارے احساس جدائی پر تمہارے پیار دل کا ایک خط شانتی کی بارش کر دیگا' اور جب تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ تمہارے پیارے ترقی اور زندگی کی نئی دُنیا میں خوش و خرم ہیں' تمہاری تڑپ ختم ہو جائے گی' مگر میری وہ تڑپ جس کی میں نمایش بھی نہیں کر سکتی میرے حیوانی قلب میں پاؤں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیگی۔ تم خیال کرتی ہو گی کہ میں تازہ گوشت کے ٹکڑوں اور دودھ کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ تو کیا ڈ ... وئی ہیں موجودہ عصر کی بیوی ہوں جو مکھن' توش اور چائے کی دیوانی ہوتی ہے' نانی! تم خیال کرتی ہو کہ میں گرم لحاف اور سفید چادروں کے لے رو رہی ہوں' ہوش کی ہواؤ ہکوئی میں ماڈرن گرل ——— ....

.. .. ہوں جو اونچی ایڑی کے جوتوں اور زریں ساریوں کی غلام ہے۔ تم جو میری تڑپ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے میری آنکھوں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی ہو' تو آخر کیوں؟ میں موجودہ زمانہ کی بلی ضرور ہوں' مگر عصر حاضر کی انسان نہیں' جسے ویدانت' بودھ ازم' عیسائیت' اسلام اور الحاد تک انسان نہ بنا سکا' میں تو محض بلی ہوں اور تڑپ رہی ہوں' میں کس لئے تڑپ رہی ہوں' ....

اس نامعلوم شے کے لئے جس کو انسان معلوم کرنے کے بعد بھی نہیں تڑپتا اور ہر حقیقت کو امتداد کی کارفرمائیوں سے مدد لے کر مٹا دیتا ہے!

نانی تم جانتی ہو' امتداد گو خارجی شے ہے مگر انسان کے احساس میں داخل ہے' کل تمہارے آنسوؤں میں جو روانی تھی وہ آج نہیں ہے' گو تمہارے پیارے آدھے راستہ سے لوٹ کر نہیں آ گئے پھر تم کیوں کل کی حالت میں نہیں ہو!؟ اس کی پہلی وجہ یہی ہے نا کہ احساس کی چنگاری سرد پڑنے لگی' امتداد کو کیوں دوش دیتی ہو' خارج کا اس میں کیا قصور' یہ تو داخل ہی کی جادوگری ہے' انسانوں کی دُنیا کی حقیقت ہو تو ہو' ہم بلیوں کی دنیا کی یہ کہاوت نہیں کہ "وقت دل کے زخموں کا مرہم ہے" نانی جی! زمان و مکان دل کی کائنات سے خارج ہیں' یہ تو دل ہی ہے جو اپنے زخموں پر خود پھائے رکھتا ہے؟! امتداد کیسا؟!

انسان اشرف المخلوق ہے' ناطق ہے' متبسم ہے' اس لئے اس کے مرد

فلسفہ وضع کرکے بیان کر سکتے ہیں اور اس کی عورتیں مردوں کے فلسفوں کو مکاتیب محبت میں زیب داستان کے طور پر نقل کر سکتی .... ہیں ہنس سکتی ہیں ہنسا سکتی ہیں' رو سکتی ہیں' رُلا سکتی ہیں' خود تڑپنے کی مشق کر سکتی ہیں اور تڑپانے میں اُن کو ید طولےٰ حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر ہم بلیاں' ہم ادنیٰ مخلوق جنہیں "فیاض فطرت" نے بے زبانی اور انسانی مرد و عورتوں سے سب کچھ مختلف ساز و سامانِ شعور دیا ہے فلسفوں کے سہارے نہیں جیتیں' ہم تو اس "روگ" کے سہارے زندہ ہیں جو مجھے اس وقت تڑپا رہا ہے! نانی جی اب فیصلہ کرو کہ قدرت کے عظیم ترین اور عجیب تر عطیہ کی حفاظت ہم بلیوں نے کی ہے یا اس چمن عالم کے بھونروں اور تتلیوں نے!؟

میاؤں —— میاؤں —— میاؤں!!!

ماجد۔ کیوں میاؤں میاؤں کئے جاتی ہے' قیام سے حرکت بہرحال بہتر ہے'

حمیدہ۔ جاؤ' تم بھی

ماجد۔ بُوا! تم اس کی طرح نہیں تڑپ سکتیں؛ اوّل تو جاتے وقت ہی دامن پکڑ لو گی اور دبک کر بھاگ بھی گیا تو سر پکڑ کر رونے لگو گی

حمیدہ۔ چل شریر کہیں کا ——!

ماجد۔ سچ' شرارت کی بات نہیں' آدمی کی قوتِ نطق ہی نے اس کو بے عصمت اور بے مایہ کر دیا' چنبیلی کی تڑپ اس کے وجود میں مقید ہے' اس سے تڑپا ہے۔ شمع جس وقت تک روشن نہیں کی جاتی نور کا مخزن ہے مینا جس وقت تک سر بند ہے محض شراب ہے' کلی جس وقت تک کھلی نہیں چمن کا بھید ہے' جوانی جب تک خرچ نہ ہو' جوانی ہے' اور محبت جس وقت تک بیان نہ ہو محبت ہے" محفوظ طاقت کا اخراج'

انتشار کا مقدمہ اور انتشار فنا اور فنا طاقت کی موت ہے۔

اگر کوئی سائنسداں بحیرۂ روم کی امواج اور اتھاہ آبی طاقت کو نہروں ندیوں اور نالوں میں تقسیم کر دے تو اس کی انفرادی بحری طاقت کیونکر باقی رہ سکتی ہے' اس کی موجیں ہزار دس ٹن وزن رکھنے والے جہازوں کو تنکے کی طرح کیوں ادھر سے ادھر پھینک سکتی ہیں' محض اس لئے کہ وہ عمیق ہے' وسیع ہے' عریض ہے' اور اپنے عرض و طول کے باوجود مقید ہے۔

حمیدہ۔ اوہو' بڑے آئے علامہ! یہ تو دیکھتا نہیں کہ بے چاری نے کل سے کچھ کھایا نہیں۔

(دودھ پلاتی ہے مگر یاسمین نہیں پیتی)

پانچواں منظر

سکندر کا غربت کدہ

سکندر کا خاندان اپنے وطن سے باہر جا کر زندگی کے شب و روز گزار رہا ہے۔ سکندر اپنی کتابیں تصویریں اور سامان سجا رہا ہے۔ طوطے بیچنے والے کی آواز آتی ہے۔)

طوطے بیچنے والے کی آواز۔ مٹھو لے لو مٹھو

(صباحت آتا ہے)

صباحت۔ اوہو، بھائی جان، ذرا جھانک کر دیکھئے، یاقوت کی گردن معلوم ہوتی ہے یاقوت کی سبز پری ہے، ——— وہ کہتا ہے جانِ عالم کے طوطے کی طرح بولیگا، بہادر شاہ کے تاریخی طوطے کی طرح بولے گا۔ ہمالہ کی چوٹی کے اوپر سے پکڑ کر لایا ہے، بڑا ہی خوبصورت ہے ——— بھائی جان دلا دیجئے ——— دلا بھی دیجئے۔

سکندر (ہنس کر) اچھا ——— ! بلاؤ۔

(طوطے والے سے ایک طوطا خرید لیا جاتا ہے، شاہ جہاں آتی ہے)

شاہجہاں۔ کتنے میں لیا صباحت، اوہو، اس کے گلے میں تو بڑا زبردست کنٹھا ہے، مگر سنو بھی، طوطے کا کیا پالنا، طوطا پالیں طوطا چشم (سکندر سے) بھائی جان اس شہر میں کوئی بلّی بیچنے والا نہیں آتا ——— !؟ صباحت کو طوطا دلایا ہم کو بلّی دلا دیجئے۔ یا ——— ؟

دیکایک سکندر کو یاسمین کا خیال آیا اور "میاؤں" کی آواز ہاں، یا ——— یاسمین کو علی گڑھ سے لا دیجئے۔

انسان کا شعورِ نفسی اس کے لئے کس قدر مصیبت ہے، اے میری رشکِ آدم بلّی! تو ایک ثانیہ میں میری روح سے آکر لپٹ گئی، بظاہر قریب نہیں ہے مگر میرے دماغ و دل میں اپنے تمام رنگوں اور تیز پنجوں کے ساتھ چل پھر رہی ہے، ان تیز پنجوں کے ساتھ جو روئی سے بھی زیادہ نرم ہیں، میں سمجھتا ہوں پیاری یاسمین! تو شکوہ گزار ہے انسان کی بے وفا سرشت کی، تو گلہ کوش ہے آدم کے بے مروّت بیٹوں کی، مگر تو نہیں جانتی کہ اشرف المخلوق کا اُن اشیا کی طرف توجہ کرنا جو لذتِ کام و دہن پیدا نہ کر سکیں اس کی "شرافتِ خلقی" اور ناٸبِ نیابتِ الٰہی کی توہین ہے! ——— اے کاش تو بلّی نہ ہوتی ——— "مرغی" ہوتی !؟

(عالمِ خیال میں پھر آواز آتی ہے) میاؤں ——— میاؤں ——— میاؤں آہ کب تک پکارے جائے گی، اے بے زبان! تو میرے گیتوں کی رسیا ہے، اری وہ تو انسانوں کے ایک فرقہ کی زبان میں لکھے جاتے ہیں، اُن انسانوں کے ایک فرقہ کی زبان میں جن کی فرقہ پرستی کا یہ کمال ہے کہ ملکوں کا تو ذکر ہی کیا ہر ۵۰ کوس کے بعد زبان میں بعد المشرقین اور زمین آسمان کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور تو، تو اُس عظیم الشان قوم سے تعلق رکھتی ہے جس نے نسل و قوم اور زبان و رسم الخط کی تمیز و تعیّن ہی پیدا نہیں کی۔ بے زبانی ہر جگہ بے زبانی ہے، میں نے تو نہیں سُنا کہ قطبِ شمالی کی بلّی گاتی ہے اور چین کی بلّی باتیں کرتی ہے، تیری قوم نے وحدانیتِ درندگی قایم رکھی، میری جنس کی حیوانیت دیکھ کہ وہ اشرف ہونے کا دعویٰ کرتی ہے مگر وحدتِ انسانیت قائم نہیں کر سکی، بلّی ہر جگہ بلّی ہے اور انسان کہیں انگریز ہے کہیں ہندوستانی، کہیں مغربی ہے کہیں مشرقی، کہیں ہندو ہے کہیں مسلمان، انگریز لڑکی ہندوستانی نوجوان سے محبت نہیں کر سکتی کہ حاکم و محکوم کی عظیم خلیج ان کے درمیان حائل ہے، مسلم نوجوان ہندو کماری سے محبت نہیں کر سکتا کہ قومیت اور مذہبیت عہد نامۂ محبت پر مہرِ توثیق ثبت کرنے کے لئے تیار نہیں، مگر تو میری نسل و قومیت معلوم کئے بغیر مجھ سے محبت کرتی ہے۔!!

مجھے خوف ہے میری بلّی! تم میرے شیریں خون اور تلخ گوشت کے لئے تو محبت نہیں کرتیں! اگر سوتے میں میری جنس کی طرح تم اپنے دانتوں کے تیز خنجر میرے حلقوم میں پیوست کر دو تو ایک ہفتہ کے لئے محفوظ غذا حاصل کر سکتی ہو! مگر میری بلّی! تم نے گوشت خور ہونے کے باوجود کبھی ایسا نہیں کیا۔ آؤ میرے تصور کے اس رنگ محل میں آؤ جہاں کسی انسانی دوشیزہ کو آنے کی اجازت نہیں ہے، بیٹھ جاؤ اور سنو! نوعِ انسانی "اہنسا" جیسا عظیم فلسفہ مدوّن کرتی ہے۔ ہر ذی روح کو تکلیف پہنچانا جرم قرار دیتی ہے مگر دوسری طرف ایک قوم دوسری قوم کو ہڑپ کر جانے کے لئے ہر وقت بےچین ہے لیکن مجھے معلوم ہے تمہارے تیز دانت نہ صرف میرے ملائم گوشت کے مقابلہ میں پانی ہو گئے بلکہ مجھے یاد ہے تم نے میرے کبوتروں پر بھی کبھی حملہ نہیں کیا، میں جانتا ہوں کہ تم کو محبت کے نامحسوس و فطری

اثرات نے براہ راست سمجھا دیا کہ کبوتر اور بلی ایک ہی خاندان "روح" سے تعلق رکھتے ہیں، اور آخر کار تمہارے قدرتی "شبر پنجہ" ان پروں کی گیندوں کے سامنے موم ہو کر رہ گئے۔

آدمی نے اپنی "خلقی درندگی" کو تمدن و معاشرت کے اوزاروں سے تراشا مگر وہ جتنی تراشی گئی اس کی دھار تیز ہوتی گئی، اور آج اس کی حیثیت ایک زہریلے خنجر کی ہے جس کا دوسرا نام "بدنسل درندگی" ہے مگر تم نے اے رشک آدم بلی! اپنی درندگی کی عصمت کو محفوظ رکھا، "تم" بے تیا اسپات" ہو اور آدمی "ڈھلا ہوا خنجر"۔

آتا ہوں اے رشکِ آدم بلی! میں "خنجر" سے بچ کر تیرے ہی پاس آتا ہوں، تو نے اپنی درندگی کو بدنسل و بے عصمت نہیں کیا ہے۔"

چھٹا منظر

رات میں حمیدہ کا مکان

(یاسمین پلنگ کے ایک پائے سے بندھی ہوئی ہے، رسی کا حلقہ اس کی گردن میں پڑا ہے، بچے پاس ہی ایک بڑے ٹوکرے میں گدگدے بستر پر کلبلا رہے ہیں، حمیدہ پان بناتی جاتی ہے اور روتی جاتی ہے۔ یاسمین رسی کو توڑنا چاہتی ہے اور میاؤں میاؤں کا شور مچا رہی ہے۔)

حمیدہ۔ (خود ہی) کون یقین کرے گا، کس کی سمجھ میں آئیگا" اک بے زبان اِک جانور یوں مچھلی کی طرح آدمی کے لئے تڑپے، دن کا تو ذکر ہی کیا، روز رات کو رسی سے باندھتی ہوں، اور روز رسی توڑ بچوں کو چھوڑ نفیسہ کے ویران بنگلہ میں بھاگ جاتی ہے، سکندر کے کمرہ میں جاکر پاگلوں کی طرح زمین کھودتی ہے، درو دیوار سے سر ٹکراتی ہے، مگر میرے پیارے اس کو نہیں ملتے، خدا معلوم اس دکھیا کو وہ کیوں چھوڑ گئے۔

(یاسمین کو چمکارتے اور اس کے نرم و دراز بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے۔)

سو جا میری پوسی، تیری بے خوابی میرے دُکھ کی بیداری ہے سو جا، میں نے کل ہی خواب دیکھا ہے، سکندر تجھے لینے آرہا ہے، تو خواب نہیں دیکھتی، خواب دیکھا کر، خواب و خیال "حقیقت" سے کہیں زیادہ میٹھی چیزیں ہیں، انسان کی زندگی میں ہر حقیقت خواب و خیال بننے ہی کے لئے حقیقت کا لباس پہنتی ہے، میرے پیارے جو چلتی پھرتی حقیقت تھے، دور ہو کر خواب و خیال ہو گئے، زندگی میں دوری اور مرنے کے بعد دوری، دونوں میں کچھ ایسا فرق تھوڑے ہی ہے دونوں عدم کی حدیں ہیں، اور دونوں کو ہم دیکھ سکتے ہیں، لیکن ذرا دیکھو اس آدم زاد کی بے بصری، جہاں تک نظر جاتی ہے اس کا نام حدود و مناظر رکھا ہے، اور جہاں نظر نہیں پہنچ سکتی اس کا نام عدم، اور موت رکھ دیا، اگر موت و عدم نادیدنی چیزیں ہوتیں تو آدمی خواب کیوں دیکھتا، اور اپنے مرحوم بڑے بوڑھوں، عزیز اقربا سے خواب میں باتیں کیوں کرتا، اور خواب ہی نہیں، خیال کرنے سے عاری ہو جاتا، جو باتیں عقل میں نہ آئیں اُن کا نام عدم اور جو زبان سمجھی نہ جا سکے اُس کا نام "میری پوسی کی زبان بتا دینا" اچھی سقراطیت ہے۔

ماجد۔ (جاگ کر) ارے صاحب! آپا کیا گئیں آپ کا دماغ خراب ہو گیا ایک وہ پاگل بلی ہے اور ایک آپ ہیں، اس کی چیخوں نے اور آپ کے دن رات کے ذکر و اذکار نے میرا تو خواب و خور حرام کر دیا ہے، خدا کے لئے اب سو جائیے۔

حمیدہ۔ بیٹا سو جاؤں گی تو یاسمین رسی توڑ کر پھر نفیسہ کے بنگلے بھاگ جائے گی۔

ماجد۔ بھاگ جائے گی تو کیا آسمان ٹوٹ پڑے گا، صبح پھر آ جائے گی — خدا کے لئے سو جاؤ۔ میں صبح اس کو پکڑ لاؤں گا۔

(حمیدہ لیٹ جاتی ہے)

یاسمین

(نصف رات گزر جانے کے بعد یاسمین نے رسی توڑ دی اور چھپتوں چھپتوں نفیسہ کے بنگلہ کی طرف روانہ ہو گئی، اس کے گلے میں رسی لٹک رہی تھی۔ مگر ایک طاقت تھی کہ اسے

کھینچے لئے جا رہی تھی!)

(وہ جا رہی تھی اور غالباً یہ سوچ رہی تھی)

یاسمین۔ اب تو شجو اور سکندر آ گئے ہوں گے، کوئی عمر بھر کے لئے تھوڑے ہی گئے ہیں، آ گئے ہوں گے تو میں اپنے بچوں کو پھر اُٹھائے جاؤنگی، میرے بچوں کو ملاحت، صباحت اپنی گود میں اُٹھائے اُٹھائے پھریں گے! پھر وہی کافوری شمع ہوگی اور سکندر کی خاموش و پُرسکون خواب گاہ، پھر آدھی رات ہوگی اور بھیرویں کی تانیں، جاڑوں کی دھوپ میں شجو کی رضائی کے قریب میں سورج کی شعاعوں سے پھر اسی طرح کھیلوں گی! انسانی آغوش کی گرمی، میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کچھ بھی ہو، نسل انسانی بڑی شیلی ہے! دلدوز ہے، اب کے اگر مجھے میرے شاعر کا معطر لحاف مل گیا تو میں ابدی نیند سو جاؤں گی

ساتواں منظر

"سکندر"

(ریل میں بیٹھا ہوا ہے اور دل ہی دل میں باتیں کر رہا ہے)

سکندر۔ انسان، رنگ و نسل کی بنیادوں پر محبت کی عمارت کھڑی کرتے ہیں، خواہش اور فطری تقاضات کی بنا پر ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، حالانکہ محبت تمام تعینات اور شرائط سے اونچی شے ہے

آٹھواں منظر

(ایک مکان، مکان کے ایک گوشہ میں استادہ بلیاں یاسمین)

(وہ غالباً ان خیالات میں ڈوبی ہوئی جا رہی تھی)

کہاں ہو شجو، کدھر ہو بچو! مجھے چھیڑتے نہیں، مجھے مارتے نہیں، مُنے مُنے ہاتھوں سے، اور تم کہاں ہو! میرے سکندر! آؤ میں تمہیں اپنے تنفس کی کریہہ موسیقی کے ہونٹوں سے پیار کروں، میرا بے زبان بے نشان بے منزل تجسس تمہیں کیونکر پائے!؟

(یکایک منڈیر سے گزرتے ہوئے اس کی رسّی ایک بلّی میں الجھی اور اس کو پوری قوت سے جھٹکا لگا، جھٹکے کے ساتھ وہ بلّی میں لٹک کر رہ گئی، مکین و مکان، زمین و آسمان سب سو رہے تھے اور پیاروں کی امانت سولی پر لٹکی ہوئی تھی!)

نواں منظر

حمیدہ کا مکان

صبح کا وقت

(بلّی کی پھانسی سورج کی پہلی شعاع کے ساتھ محلہ میں مشہور ہوگئی! حمیدہ دھاڑیں مار کر رو رہی تھی کہ سکندر مکان میں داخل ہوا!)

سکندر۔ (ماجد سے) خیر تو ہے ——— ارے تم بھی رو رہے ہو ——— نانی!؟

حمیدہ (لپٹ کر) بیٹا! تیری امانت ——— "یاسمین"!!

سکندر۔ مر گئی؟ ——— یاسمین مر گئی!؟ یاسمین!!

(محلہ والے رسّی میں مردہ بلّی کو لاتے ہیں اور زمین پر رکھنا چاہتے ہیں)

سکندر۔ ہائیں! ایسی بے ادبی! یہ لاش زہرہ و مشتری کے دوش پر رکھنے کے قابل ہے۔ یہ اُس جانور کی لاش ہے جس نے روح انسانیت سے بازی جیت لی! یہ میری زہرہ کی یادگار!!

(سینہ سے لپٹا لیتا ہے اور گر پڑتا ہے)

ساغر (نظامی)

تبصرے

شرح و تفصیل

کتب، رسائل، اور اخبارات کی تفصیل، جن پر اس نمبر میں اظہار رائے کیا گیا

کتابیں:-

(۱) آفتاب رسالت
(۲) دختران ہند سے
(۳) بحران عصر
(۴) حسن انتخاب۔ بہار مظہر
(۵) آخری رسول
(۶) عرض اخلاص
(۷) شان رسالت
(۸) ذکر حبیب
(۹) منادی کا سالنامہ
(۱۰) تحریک اتحاد اسلامی
(۱۱) کلام لطف
(۱۲) امارت سخن
(۱۳) خطبۂ صدارت اجلاس علمائے کانفرنس بدایوں
(۱۴) یادگار رشیون
(۱۵) آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا شعبۂ اطلاعات
(۱۶) بنیادی حقوق و فرائض اور کانگریس کا اقتصادی پروگرام۔
(۱۷) منروا فلم کمپنی بمبئی

رسائل:-

(۱۸) ہندوستانی ماہنامہ
(۱۹) عارف
(۲۰) خضر راہ

اخبارات:-

(۲۱) بالتصویر "ترقی" ہفتہ وار

دفتر "ایشیا" میں جس قدر جدید مطبوعات، رسائل و اخبارات ریویو کے لئے آئے تھے اُن سب کے متعلق میں نے اسی نمبر میں اظہار رائے کرنیکا عزم کیا تھا۔ لیکن عدم گنجائش کی وجہ سے کل ریویوز شائع نہیں ہوسکتے۔ پھر بھی موجودہ نمبر کا باب انتقاد مکمل ایک جزو پر مشتمل ہے اور شاید یہ کافی ہے۔ باقی مضمون آئندہ نمبر جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع کیا جائے گا

ساغر

آفتاب رسالت

مُصنّفہ راؤ بہادر حاجی محمد عبد الحمید خان صاحب منظر باغپتی رئیس باغپت
ملنے کا پتہ :- باغپت ضلع میرٹھ ۔ قیمت فی جلد ۸ ر علاوہ محصول
حجم ۱۱۴ صفحات سائز $\frac{۲۰\times۲۶}{۱۶}$

سیرۃ رسولؐ اکرم پر ایک منظوم خوبصورت کتاب ہے۔ منظر صاحب کے شاعرانہ ذوق اور محبّت رسولؐ کا ایک حسین مظاہرہ ہے۔ لیفٹیننٹ نواب جمشید علی خان بہادر اور آن کے برادر عزیز منظر صاحب باغپتی اپنے ذوقِ ادب کے لئے مشہور ہیں اور عملی طور پر بھی اُردو ادب کی سرپرستی سے گریز نہیں فرماتے۔

یہ تصنیف جس طرح اپنے موضوع کے لحاظ سے مقدس ہے اسی طرح اس کی نسبت بھی ایک مقدس ذات سے ہے۔ منظر صاحب نے اپنی مادر مشفقہ کے نام اس کا انتساب کیا ہے۔ اس کے بعد وجہ تصنیف کے عنوان سے مصنف نے اس کتاب کی ضرورت و اشاعت پر روشنی ڈالی ہے جس کی اوّلین سطور میں تحریر کیا گیا ہے :-

"مسلمان اور خصوصًا مغرب زدہ مسلمان برابر اپنے مذہب سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور مغربی تعلیم نے یہاں تک اپنا اثر کیا کہ مذہبی کتب کا مطالعہ بھی قریب قریب ترک ہوتا جا رہا ہے"

کوئی شک نہیں کہ مغربیت بہت کچھ موثر ہوئی ہے۔ لیکن اذہان میں یہ تصور بھی پرورش پا رہا ہے کہ انسان کا شعور دماغی اُن منازل سے گزر گیا جہاں "مذہب" کا کچھ وزن تھا۔ اشتراکیت کے جدید نظریہ نیز اس کے اثرات اور دوسرے اقتصادی حقائق نے انسانی ذہن کو زیادہ تر سیاسی بنا دیا ہے۔ مذہب دراصل "پیٹ" اور "بھوک" کے بعد کی چیز تصور کیا جانے لگا۔ یہ انسانی بدبختی ہے مگر کیا کیجئے!؟
وجہ تصنیف کے بعد "تعارفِ مصنّف" کے عنوان سے محشر صدیقی صاحب نے دو صفحے تحریر فرمائے ہیں بظاہر یہ اختصار خود کسی حسن کا آئینہ دار معلوم ہوتا ہے مگر واقعی طور پر یہ دونوں صفحے سخت پھُس پھُسے ہیں۔
"لیجئے" اور "دیکھئے" کی غیر شاعرانہ نثاری اس کتاب کے وزن کو کم کرتی ہے۔ وجہ تصنیف میں منظر صاحب نے مقدمہ نگاری کی مخالفت کی ہے مگر صفحہ اُلٹتے ہی "تعارف" نظر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فطرتِ عجز کے تو یہ بھی منافی ہے۔
بہر حال مجموعی طور پر یہ کتاب مذہبی شاعری کو پسند کرنیوالوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ بزم میلاد شریف اور قومی جلسوں میں اس نظم کا پڑھنا مسلمانوں کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ کہیں کہیں نظر گذر کے لئے ایک آدھ غلطی بھی پائی جاتی ہے، اُمید ہے کہ راؤ بہادر دوسرے ایڈیشن میں ان اغلاط کی تصحیح فرما دیں گے۔

دختران ہند سے

مصنفہ میاں حسن لطیفی بی۔اے۔ ملنے کا پتہ دفتر شاطو لدھیانہ پنجاب۔ یہ ایک مختصر نظم ہے جو ہمارے دوست نے کاوش سے تحریر فرمائی ہے۔ اس کا انتساب ایک گمنام ہریجن عورت کے نام ہے۔ یہ "عنوانیہ"

یعنی (Dedication) یقیناً بجد جدید و نادر ہے۔ نظم کا اولین شعر

نوریاں دیتی ہیں شب کو جو سرِ بالینِ خواب
وہ گرج سے اپنی کر سکتی ہیں پیدا انقلاب

ذی حیات شعر ہے مگر اس نظم میں جا بجا غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً
صفحہ ۲ پر ایک مصرع ہے

بعض کنواری لڑکیاں کہتی رہیں پہیلیاں

"کنواری" کا صحیح تلفظ اس مصرع میں باقی نہیں رہتا۔
صفحہ ۳ پر ایک مصرع ہے۔

طبقۂ پائمال نسوانِ عفیف!! انقلاب!

اس مصرع کو اس طرح "طبقۂ پائمال نِس، وانِ عفیف انقلاب" پڑھا جائے تو بحر میں آتا ہے یعنی لفظ نسواں اپنی حقیقی شکل و صورت میں مصرع میں نہیں آتا یہ نہ صحت ہے نہ حسن۔ بالکل یہی مثال صفحہ ۴ پر اس مصرع کی ہے

روحِ نسائیت کی انگڑائی کا ہے یہ ولولہ

انگ۔ ڑائی

اس بند کا دوسرا مصرع ہے اور اس میں بھی یہی عیب ہے۔

ہو طلب عمل سے سر۔ شار ہر ایک طالبہ

آگے چل کر ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ ؎

تم کبھی معبدوں میں تھیں حریتوں کی دیویاں

حریتوں۔ یعنی حریت کی جمع بنا کر اس کا اس طرح استعمال پہلی مرتبہ صرف لطیفی صاحب کے یہاں دیکھا گیا ہے۔

مژدۂ انقلاب دو کے ٹکڑے کا بار بار اعادہ ہوا ہے۔ اعادہ ضرور نظم میں ایک حسن اور زور پیدا کرتا ہے لیکن اعادہ ہونے والے ٹکڑے یا مصرعہ کو نہایت حادی اور بنیادی طور پر مضبوط و موثر ہونا چاہیے جنسِ نازک کو مخاطب کر کے اُن سے مژدہ کا مطالبہ کرنا مرد کے لئے کہاں تک مناسب ہے۔

صفحہ ۸ پر پہلے بند کا دوسرا مصرع ہے۔

جوہرِ جان سوز کی رسم بھی تم نے کی ادا

اضافت کی حالت میں اعلانِ نون قطعی غلط ہے۔ "جوہرِ جاں سوز" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۱ پر پھر وہی غلطی ہوتی ہے جو اس سے پہلے کئی مصرعوں میں ہو چکی ہے

ایسی زنِ غلام و غمّاز سے کوئی بھی بہن

غم۔ ماز

اس مصرع کو جب تک ہم اس طرح نہ پڑھیں کہ "ایسی زنِ غلام و غم۔ ماز سے کوئی بھی بہن"، مصرع بحر میں نہیں پڑھا جا سکتا
ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ

پھول بچھائیں قدرداں یا کہ بکھیر دیں ببول

ببول کے کانٹے یا ببول کے پھول بکھیرے جا سکتے ہیں۔ محض ببول کے متعلق بکھیرا جانا نہیں لکھا جا سکتا۔
ایک جگہ عورتوں سے خطاب کرتے کرتے ہمارے دلچسپ دوست لکھنوی ہو گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

دخترک "منش" کے میل سے بھی گریز اک ذری (بمعنی ذرا)

اس لفظ کا استعمال یہاں نہ صرف بھونڈا ہے بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ ان اغلاط کے ساتھ ہی صفحہ ۱۲ پر دوسرے بند میں دو نادر اور زوردار مصرعے بھی نظر پڑتے ہیں

اپنے برادروں کو دو ہمت و عزم کا پیام
اپنے منگیتروں کو دو غزوہ و رزم کا پیام

لیکن ذرا غور کرتے ہیں تو ایہام سے دونوں خالی نظر نہیں آتے۔ حیرت ہوتی ہے کہ لطیفی کو کیا ہو گیا ہے۔ صفحہ ۱۳ پر دوسرے بند کا آخری مصرع ہے۔

جیش کے ساتھ ساتھ ساتھ جھنڈیاں لیکے جاؤ گی

"ساتھ ساتھ" دو مرتبہ استعمال ہوتے دیکھا ہے تیسرا "ساتھ" بالکل لطیفی صاحب کی ایجاد ہے۔

کچھ بھی ہو ہم اپنے دوست کی خاص الخاص ذہنیت کے ضرور قائل ہیں۔ گو آپ متاہل زندگی بسر کرتے ہیں مگر ارشاد ہوتا ہے کہ ؎

زندگی لطیفی خستہ ہے ایک تشنہ نغمہ | دلکشی سے بجھ رہا ہے یہ لطیف نابغہ
کاش ہو سوز میں شریک کوئی نگارِ آتشہ | سوختہ ہو دو آتشہ

"عورتو" کے بجائے اگر "دیویو" لکھا جاتا تو شعریت کے عناصر میں توازن پیدا ہو جاتا
میرے وطن کی عورتو مژدۂ انقلاب دو

Tragedy دوشیزہ

نظم کے ختم ہونے کے بعد آغاز، تشکیل، تسوید، تکمیل اور اشاعتِ اوّل کے سنین بھی دئے گئے ہیں گویا یہ نظم " دولتِ لطیفی" اور" حکومتِ صنفِ نازک،، کے مابین کسی تاریخی معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے !؟

فلک سو سال چکّر کھائے تب ایسا سخنور ہو

اے کاش اِس ذہین شخص کو خود انتقادی کی دولت بھی نصیب ہوئی ہوتی تو کوئی شک نہیں کہ اِس کی ذہانت قوم کو مالا مال اور اُردو ادب کو سرفراز کردیتی۔

بحرانِ عصر

المعروف

"دکھی دنیا،،

مصنفہ لطیفی صاحب (لدھیانہ) ملنے کا پتہ ادارۂ شاطو لدھیانہ۔ یہ ایک چھوٹی سی نظم ہے جس کو خود لطیفی صاحب نے ۳۰x۲۰/۱۶ سائز پر سفید کاغذ پر سلیقہ سے

شائع کیا ہے۔ جو شخص لطیفی صاحب کی شاعرانہ جدوجہد کا مطالعہ کرتا رہا ہے وہ اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ جوہر اِن میں بدرجۂ اتم موجود ہیں مگر وہ اِس جوہر کے اجزائے ترکیبی میں توازن پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اُن کے کلام میں صحت و یکسانیت اور ثبات کی کمی ہے۔

صفحہ نمبر ۴   بُرائی سے کہیں بدنام ہے اب نام اچھائی کا

صفحہ نمبر ۸   وہی دنیا کہ جس کا انحصار اصلی روپے پر ہے

اچھائی بغیر تشدید اور روپیہ بغیر "ے" کے لکھنا غلط ہے۔

معاشری اطمینان حاصل ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ کہتے ہیں اور تمام کا تمام برابر شائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ نظم دنیا کی ہر جزیہ کو محیط ہے مگر بس نظم ہے اِس کے مطالعہ کا حاصل نہ" نشاط و حرکت "ہے نہ" الم و جمود" دنیا کی ہر بات پر لعنت کرنے کے بعد آخری شعر ارشاد ہوتا ہے ؎

اُسے کرنے دے کام اُسکا تو اپنا کام کرتا جا

مسلسل خدمتِ اسلام تا انجام کرتا جا

ہر شاعر آج مومن بننے کے بعد" اقبال" کی تقلید کرتا ہے اور شاعری کی بنیاد مذہبی تاثر پر رکھتا ہے۔ حالانکہ شاعری اور مذہب دو متضاد چیزیں ہیں۔ مذہب ایک قسم کی "تعین" ہے اور شاعری "کامل آزادی" میرے خیال سے شاعری کو "اسلامی" اور" غیر اسلامی" نہیں ہونا چاہئے۔

شاعری فطرت کی نمائندگی کا نام ہے نہ کہ اصولوں کے پرچار کا !

میرے دوست حسن لطیفی فطری شاعر ہیں۔ مگر کبھی اُنھوں نے اپنی خودی میں اپنی شاعری کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اُن کو جستجو کرنی چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے

حسن انتخاب

المعروف بہ

بہارِ مظہر

مولفہ و مرتبہ سید مظہر علیم فرید آبادی بی۔ اے (علیگ) ملنے کا پتہ قصبہ فرید آباد متصل دہلی سائز ۲۶x۲۰/۸ طباعت و کاغذ متوسط۔

مولف نے کتاب کو نواب حیدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب حسرت شروانی رئیس اعظم ریاست حبیب گنج و بھیکم پور و علی گڈھ کے نام معنون کیا ہے۔

یہ نسبت اِس لحاظ سے نہایت موزوں ہے کہ نواب صدر یار جنگ بہادر ایک حقیقی ادیب و سخن سنج ہیں۔ مقدمہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے تحریر فرمایا ہے،

یہ انتخاب اِس لحاظ سے بہت بڑا درجہ رکھتا ہے کہ اُردو شعرائے قدیم کے کلام کا انتخاب مضامین و مطالب کے لحاظ سے کیا گیا ہے تقریباً ستر عنوانات کے ماتحت ہر موضوع پر بہترین اشعار جمع کر دئے گئے ہیں۔ شعر زندگی کے اعلیٰ ترین ذوق کا دوسرا نام ہے جو شخص شاعر ہے وہ اعلیٰ ترین انسان ہے اور جو انسان اچھے اور بُرے شعر میں تمیز کرسکتا ہے اُس کے جوہری ہونے میں کوئی شک نہیں۔ سید مظہر علیم نے اِن قیمتی موتیوں کی سچی پرکھ کا ثبوت دیکر اپنے جوہری ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

مقدمہ کے بعد مختصر دیباچہ مرتب ہے اِس کے بعد صفحہ ۱ سے صفحہ ۱۶۰ تک منتخب اشعار کا سلسلہ، جن کی رنگا رنگی اور ہمہ گیری ناظرین کو لاکھوں دنیاؤں میں گم کردیتی ہے۔ یقیناً ایسا انتخاب ہر اہل ذوق کے میز کی زینت بننا چاہئے۔ آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شاعری کی کتاب کبھی اتنی غیر شاعرانہ طبع نہیں ہونی چاہئے۔ یہ نظم کی کتاب ہے مگر " راہِ نجات،، کی طرح طبع ہوئی ہے۔ آخر میں جو قطعہ ہائے تاریخی ہیں وہ بھی ایک فرسودہ رسم ہے

اور اب اِس کی تقلید کی ضرورت نہیں۔

آخری رسول

مصنفہٗ مولانا ماہر القادری ناشر خواجہ بہاؤ الدین حیدر آبادی مکتبۂ علمیہ حیدر آباد دکن، حجم ۱۰۴ صفحات سائز ۲۶×۲۰/۱۶ قیمت ۸؍

"زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا" ——— ہمارے دوست ماہر صاحب متضاد صفات کا ایک عجائب مجموعہ ہیں۔ جب انھیں شاعر کے روپ میں دیکھتے ہیں تو مولویّت سے ذوق رکھتے معلوم ہوتے ہیں اور جب "مولوی" کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ ان کو شاعر یقین کیا جائے ہم ان کی دونوں حالتوں سے لطف اندوز ہونے والوں میں سے ہیں تاہم یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہوسکا ہے کہ وہ بیک وقت مولوی ہیں یا شاعر یا بیک وقت مولوی و شاعر دونوں ہیں —— !؟

لیکن بہر حال مولویّت ہی سہی ماہر کی اہلیت ادبی سے کون انکار کرسکتا ہے جس طرف وہ نکل جاتے ہیں خواہ صحرا ہو یا گلشن واپسی میں ہم اُن کے ہاتھ میں لالہ و گل ہی دیکھتے ہیں۔ یہ کتاب جو بہترین کاغذ پر نفیس طبع ہوئی ہے انھیں کی تالیف ہے جو جناب رسول کریم کی سوانح حیات پر مشتمل ہے اس تالیف میں واقعات کو صحت و طرز بیان کی سلاست و سادگی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے غزوات کو ذرا پھیلا کر بیان کیا ہے۔ خواجہ صاحب کو اِسی قسم کی مختصر سوانح حیات ماہر صاحب سے اور لکھانی چاہئیں۔

آخر میں ہم مکتبۂ علمیہ حیدر آباد دکن کے متعلق اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ سلطنت آصفیہ میں یہ ایک مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جو خاموشی سے اردو زبان کی خدمات انجام دے رہا ہے جو مصنفین و مولفین حیدر آباد میں اپنی تصنیفات کی اشاعت اور ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہیں وہ خواجہ بہاؤ الدین حیدر آبادی مالک مکتبہ علمیہ چار مینار حیدر آباد سے تجارتی تعلقات اُستوار کریں۔

عرض اخلاص

کتابوں کے ملنے کا پتہ۔ مینجر شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی روشن و صاف، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی رئیس حبیب گنج و بھیکم پور کے ذوق ادبی اور تبحرّ علمی کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہے گویا ہم کسی مصدقہ حقیقت کو محض دہرائیں "عرض اخلاص" وہ یادگار تقریر ہے جو صدر کی حیثیت سے مدرسۃ البنات (جالندھر) کے اجلاس سالانہ ۱۹۳۶ء میں فرمائی۔ تعلیم نسواں کے متعلق اِس تقریر میں گہری معلومات اور دلچسپ اشارے ہیں۔ تقریر کا رنگ مذہبی ہے مگر منقولات کے ساتھ معقولات سے بھی بحث کی گئی ہے۔

شانِ رسالت

یہ بھی نواب صدر یار جنگ بہادر کی ایک تقریر ہے جو خود حبیب گنج کی محفل مبارک میں گیارہ ربیع الآخر ۱۳۵۳ھ میں فرمائی۔ لفظ "شاکلتہ" کو بنیاد بنا کر تمام موضوع پر معرکتہ الآرا بیان ہے۔ امام بیضاوی نے "شاکلتہ" کے معنی "علی جوہر روحہ" تحریر کئے ہیں۔ تقریر کی نوعیت کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ اس پر نواب صاحب کا اسلوب بیان، سبحان اللہ، عالمانہ شان کے ساتھ ساتھ ادیبانہ تکمیل کے وہ مناظر نظر آتے ہیں کہ روح جھومتی ہے اور دماغ تقریر کو قبول کرتا ہے۔

صفحہ ۱۴ پر صحابۂ کرام کا شاکلہ، آنحضرت کا شاکلہ، آخرین کے متعلق رؤف رحیم کا شاکلہ، اِن تینوں پر اظہار رائے کرنے کے بعد "خود ہمارا شاکلہ" کے عنوان سے بیان ہے یہاں نواب صاحب موصوف کی شان خطیبانہ پورے جوش پر آجاتی ہے۔ غرضکہ تقریر پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہے۔

ذکرِ حبیب

یہ وہ یادگار بیان ہے جو ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ کو حیدر آباد میں گیارھویں شریف کے موقع پر فرمایا۔ حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانی رح کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ بیان گو مختصر ہے مگر موضوع کے تمام متعلقات پر حاوی ہے اور مسرت کی بات یہ ہے کہ محض عقیدتی بیان نہیں ہے۔ اِس کے مطالعہ سے غوثِ اعظم کے متعلق ایک مسلمان کو تمام معلومات ہوجاتی ہیں۔

منادی کا سالنامہ ۱۹۲۷ء

دفتر منادی دہلی درگاہ نظام الدین اولیا قیمت ۸؍

دو سال سے حضرت خواجہ حسن نظامی کے مشہور اخبار نے بھی ہر سال اپنا سالنامہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ گزشتہ سال بھی منادی نے اپنا سالنامہ شائع کیا تھا اور اِس سال بھی ۹۰ صفحات پر مشتمل

ریڈر سائز پر اپنا سالنامہ شائع کیا ہے جس میں مسجدوں، عمارتوں، مشائخ وخلفائے سلسلۂ نظامیہ، بادشاہ، والیان ریاست، امراء، وزراء، مشاہیر، احباب، اخوان، تسلیم اطفال کے متعلق ۱۰۱ تصاویر ہیں۔ مضامین کی فہرست میں ایک ادبی ذوق رکھنے والے کے لئے خواجہ صاحب کے مضامین جاذب توجہ اور دلکش ہیں۔ اُردو اخبارات و رسائل کے نام کی فہرست لکھ کر اور ان کے اصول کو (یعنی وہ کانگرسی ہیں یا غیر کانگرسی، احراری ہیں یا فرقہ پرست، حکومت پرست ہیں یا قوم پرست) تحریر فرما کر یہ بھی واضح کیا ہے کہ ملک سے ۲۹ اخبار غیر کانگرسی اور ۱۵ اخبار کانگرسی شائع ہوتے ہیں۔ غالباً اس فہرست کی اشاعت سے ایڈیٹر صاحب کا یہ مقصد ہے کہ اُردو پریس پر کانگریس کا اثر نہیں ہے اگر حق و باطل کا انحصار اعداد و شمار ہی پر فرض کرلیا جائے تو تاریخ کے بہت سے عظیم الشان حقائق کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ سالنامہ میں سب سے زیادہ قیمتی شے خود خواجہ صاحب کے مضامین کا انتخاب اور روزنامچہ ہے اس لئے سالنامہ ہر شخص کو ضرور خریدنا چاہئے۔ باوجود اس قدر حجم اور مصور ہونے کے قیمت حیرتناک طور پر کم ہے۔

تحریک اتحاد اسلامی

حصۂ سوم

ملنے کا پتہ، سیرت آفس مکان نمبر ۲۵ اسپارکس اسٹریٹ رنگون

یہ چھوٹی سی کتاب مختصر مختصر مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔ ہر مضمون میں کشفی شاہ صاحب نظامی نے مسلمانوں کو اتحاد کی تعلیم دی ہے لیکن تمام کتاب پڑھنے کے بعد بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مسلمان کس مرکز پر متحد ہوں اور کس مقصد کے لئے متحد ہوں! ؟

تمام کتاب میں "آزادی" کا ایک لفظ نہیں اور نہ کوئی اتحادی پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"پھر دیکھو ایک ایک دن میں کئی علاقے مسخر ہوتے ہیں اور دنیا کے وارث تم ہی بنتے ہو" (!؟!)

حیرت ہے کہ کشفی شاہ نظامی غلام اور بے بس مسلمانوں کو "مرد مجاہد" تصور کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ سامنے مرہٹوں کی ایک فوج ہے اور پانی پت کا میدان! ؟ مضامین کا لہجہ قدیم خطابت کا چربہ ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

"مسلمان میدان عمل میں آچکے ہیں۔ مجاہد صف بندی میں مشغول ہیں"

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تمام کارواں غافل ہے نہ میر کارواں ہے نہ بانگ درا۔ یہ عالم قوم محکومیت کے جس ارذل درجہ پر آگئی وہ حیرتناک ہے۔ اس غلامی اور بے بسی کے عالم میں غریب و غلام مسلمان سے اس قسم کی باتیں کرنا اُس کا مذاق اُڑانا ہے۔

جو لیڈر، جو صوفی، جو مولوی، جو شاعر، اور جو ادیب مسلمانوں کو دنیا میں باعزت دیکھنا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں ایک زندہ اور ذی وقار قوم کی حیثیت سے زندہ رکھنا چاہتا ہے اُس کا سب سے اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ بنیادی محکومیت اور غلامی کی زنجیروں کو کاٹے۔ گول مول باتوں سے اب کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا اور مسلمانوں سے اب تجارت بھی نہیں کی جاسکتی مسلمان مجبور رہیں۔ لیکن ۴۰ برس قبل کی طرح بے وقوف نہیں رہے۔ اس لئے ہر شخص کو جو بزعم خود مسلمانوں کا لیڈر بننا چاہتا ہے صاف اور واضح پروگرام قوم کے سامنے رکھنا چاہئے جس کو ہرگز انفرادی اور جماعتی نہیں ہونا چاہئے اگر وہ اسلام اور ہندوستان کی مطابقت میں ہوا تو قبول کیا جائے گا۔ ورنہ اس کا انجام ظاہر!

کشفی شاہ نظامی کو اپنا پروگرام اور اُس کی منتہا متعین کرنی چاہئے فی الحال ہم اُن سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ حکومت برطانیہ کی غلامی سے مسلمانوں کو آزاد کرانے کے لئے کوئی اسکیم پیش کریں۔

کلام لطف

مرتبۂ محمد بدرالدین علوی۔ قیمت نامعلوم، غالباً دار المصنفین اعظم گڑھ سے مل سکتا ہے۔

اس کتاب پر اظہار رائے کرنا نہ صرف ادبی فرض ہے بلکہ وطنی فرض کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ علی گڑھ کبھی اس عظیم الشان شخصیت کو فراموش نہیں کرسکتا جس کی ذات تمام ہندوستان کے لئے سرچشمۂ فیض تھی۔ میری مراد استاذ العلما حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحب رحمۃ سے ہے جن کی دولتسرا علی گڑھ میں میرے مکان سے ۵۰ گز کے فاصلے پر ہے۔ یہ کتاب مولانا رح کے اُردو و فارسی کلام کا مجموعہ ہے جس کو مولانا محمد بدرالدین علوی استاذ ادبیات شعبۂ عربی مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ نے کمال سنجیدگی و صحت کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔

ذوقِ شعری اُستاذ العلماء کو ورثہ میں ملا تھا۔ مولانا کا اصلی وطن پلکھنہ تھا جو علی گڑھ کے ضلع میں ایک قصبہ ہے۔ آپ کے والد مولوی اسداللہ صاحب مضطر بھی شاعر تھے اور اِس درجہ کے شاعر تھے کہ جب مرزا غالب کو اُن کا یہ مطلع سنایا گیا ؎

لے اُڑی طرزِ فغاں بلبلِ نالاں ہم سے
گُل نے سیکھی روشِ چاکِ گریباں ہم سے

تو بہت پسند آیا اور پوچھا کس کا ہے؟ سنانے والے نے اسداللہ نام بتایا تو مرزا نے کہا کیوں نہو نام کا کمال ہے (مرزا کا نام بھی اسداللہ تھا) فارسی اور اُردو دونوں میں کہیں "ذرّہ" اور کہیں "لطف" تخلص فرماتے تھے۔ ایک بہتر سخن گو ہونے کے ساتھ ہی وہ ایک مبصّر اور نقادِ سخن بھی تھے اور شاعری سے باوجود مولوی ہونے کے پورا ذوق تھا۔ اِن کے کلام میں فصاحت و بلاغت، سلاست اور روانی، بے ساختگی اور آمد پائی جاتی ہے اور اُستادانہ انداز نمایاں ہے زیادہ تر فارسی میں فرماتے تھے۔ شاگردوں کو منظوم خط اور قطعہ ہائے تاریخ بھی بے ساختہ نظم فرماتے تھے۔

میرے بزرگ دوست مولوی بدرالدین صاحب علوی نے کتاب کی ترتیب مندرجۂ ذیل رکھی ہے۔

(۱) نعت (۲) مناجات (۳) مدح (۴) عشقیہ کلام (جو حروفِ تہجی کے لحاظ سے مرتب ہے) (۵) مراثی، تاریخیں جنکی ترتیب باعتبارِ زمان و سنین ہے آخر میں متفرقات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ جن میں اوّل طویل نظمیں ہیں بعد میں مختصرات جن میں ترتیبِ حروف کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اب ہم مولانا کے کلام کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

اُردو کلام کا نمونہ

کس لئے مجھ سے بدگماں ہو تم — میں کبھی تم سے بدگماں نہوا

مصیبت ہے اے یار تیری جدائی — مجھے کھائے جاتی ہیں راتیں اندھیری

ہوتی ہے بُری وہ آشنائی — ہو جس سے ملی ہوئی جدائی

فارسی کلام کا نمونہ

ساقیا ما زمئے عشق صنم مدہوشیم — ماچہ دانیم کہ میناست کجا جام کجاست

کجا نصیب کہ آں ماہ در بزم آید — ہمیں بس است کہ گہ گاہ بردرم آید

دمکے بر سرِ بالین من از ناز بیا — ایکہ خورشید غلام است بر بشارت جور

قدیم اردو کی تقلید کے طور پر اردو فارسی کا مخلوط شعر

چو دیدم آں چشمِ سرمگینش رواں شدم سیلِ خوں ز دیدہ
سجن کی انکھوں نے مجھ کو مارا، دہائی ساری خدائی کی ہے

مراثی کا نمونہ

استاذ العلماء کے کلام میں جو قدرتِ کلام پائی جاتی ہے اُس کا نمونہ اس مرثیہ میں ملاحظہ کیجئے۔ جو نواب تراب علی خان بہادر سالارجنگ اول وزیر اعظم دولت آصفیہ کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔

مرکزِ اقبال و دولت سرورِ عالی ہمم — تاجدار و تاج بخش و عزت افزائے جہاں
مجمعِ فضل و کمال و مرجعِ جاہ و جلال — منبعِ بذل و نوال و اخترِ ہندوستاں
مرجعِ عالم وزیرِ اعظمِ ملکِ دکن
صاحبِ سیف و قلم فرزانۂ آصف مکاں

مرثیہ میں جذبات نگاری کا کمال دیکھئے۔ اپنے صاحبزادے مولوی کرامت اللہ صاحب کی یاد میں قبرستان ہی میں یہ رباعی موزوں کی ؎

دل از غمِ فرقتِ کرامت خون است — جاں بے رُخِ او بصد الم مقرون است
اے سبزۂ تو از زیرِ زمیں می آئی — برگو کہ عزیزِ من کرامت چون است

چوتھے مصرع میں جذبات کی چاشنی کے ساتھ اک بے مثال حسنِ تعبیر بھی پایا جاتا ہے۔

مولانا لطف اللہ رح کو تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ برجستگی، آمد اور شعریت ہر سہ عناصر متوازن رہتے تھے ورنہ قطعات تاریخی اکثر بے کیف اور بھرتی ہی کے ہوتے ہیں۔

ملہ "کلام لطف" صفحہ ۴

مولوی عنایت اللہ صاحب راوی اور روایت کے ناقل مولوی بدرالدین علوی تحریر فرماتے ہیں کہ "اپنے ہم زلف قاضی فضل علی کو برجستہ یہ مصرع خط میں لکھا جو واقعہ ہونے کے ساتھ تاریخ پر بھی مشتمل ہے:

خوب بارش ہوئی ہے اب کی سال

۱۲ ھ ۷۱

استاذ العلماء کے استاد مفتی عنایت اللہ صاحب جب جزیرۂ شور سے واپس ہو کر کاکوری تشریف لائے تو اشتیاق ملاقات میں یہ رباعی لکھ کر انھیں ارسال فرمائی ؎

بہلاؤں کہاں تک دلِ ناشاد کو میں — کب تک کروں ضبط آہ و فریاد کو میں
انشاء اللہ ایک ہفتے کے بعد — آتا ہوں قدم بوسیِ استاد کو میں

۱۲ ھ ۷۷

بہر حال ہم اس کتاب کی اشاعت پر مولوی بدرالدین صاحب علوی کو مبارکباد دیتے ہیں۔ حقِ شاگردی یونہی ادا ہوا کرتا ہے۔ استاذ العلماء کے اُن تمام شاگردوں کو جو ہندوستان بھر میں پائے جاتے ہیں۔ اس کتاب کو اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیے۔

امارتِ سخن

مصنفہ حاجی محمد اسحاق خاں صاحب مائل شروانی رئیس برلہ علی گڑھ۔ قیمت فی جلد ۲ عہ کتاب مصنف کے پتے سے مل سکتی ہے۔

وطن عزیز ضلع علی گڑھ کے مشہور شاعر و ادیب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب مائل شروانی کے کلام کا مجموعہ ہے حضرت مائل ایک شریف النفس، خوش گو، قادر الکلام اور خوش مذاق شروانی خاندان کے رئیس ہیں جب میں ۱۹۳۰ء میں اپنے وطن میں مقیم تھا تو کئی بار مائل صاحب کا کلام مشاعروں میں خود اُن کی زبانِ مبارک سے سننے کا اتفاق ہوا۔

اس دیوان کو جدید شاعری کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا غلطی ہے۔ قدیم اسلوبِ بیان اور استعارات و تصورات کے لحاظ سے ایک جامع دیوان ہے۔ مولوی سلامت اللہ صاحب رشک پلکھنوی مدظلہٗ نے صفحہ ۱۴۲ پر تحریر فرمایا ہے:۔

"میرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، داغؔ کا طرزِ بیان نظر انداز کر کے شاعری اب ترانے بھجن ٹھمری میں مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ بہت کم سنا جاتا ہے کہ کسی نے مستقل دیوان ردیف وار پیش کر کے شعرا متقدمین کی روحانی افزائش ذوق میں حصہ لیا ہو"

میں مولوی صاحب کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ ردیف وار دیوان مرتب کیا جائے اور عزیز ترین اوقات حیات کو اس غیر فطری سعی کی نذر کر دیا جائے۔ سوائے مشق کے اس کا کچھ حاصل نہیں ہے اور مشق نہیں بلکہ دنیا کے سامنے "حاصلِ مشق" پیش ہونا چاہیئے۔ رہے ترانے بھجن ٹھمری، سو ان اصنافِ سخن کو شاعری میں شمار نہ کرنا اور ان کی اہمیت سے انکار کرنا بھی میرے نزدیک تنگ دلی ہے۔ اُردو غزل سرا اور حقیقی شاعری سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ اگر مولانا پورب میں گائی جانے والی کجری سُن لیں تو اُن جیسا اہلِ دل دیوانہ ہو جائے۔ شاعری کی حقیقی روح جذبات کے سادہ اظہارِ بیان میں مضمر ہے۔ ایامِ جاہلیت کی عربی شاعری انھیں خصوصیات کی بنا پر تمام زبانوں کی شاعری سے آج بھی افضل خیال کی جاتی ہے۔

کبیر داس کا تمام کلام بھجن ہے۔ مگر کون ہے جو اس کے فلسفۂ توحید اور اس کی شاعری کی فلسفیانہ بلندی اور اس کے بھجنوں کے عمق و تاثیر سے انکار کر سکے۔ کہتا ہے ؎

ہر سے کبیرا بھلا ہوا، مورے سر سے ٹلی بلائے

ہر مرے تو ہم مرے اور ہم ری مرے بلائے
سانچے گرو کا بالکہ مرے نہ مارا جائے

ہر بے کبیرا بھلا ہوا،

حد حد کر کے سب گئے اور انحد گیا نہ کوئے
انحد کے میدان میں رہا کبیرا سوئے

ہر بے کبیرا بھلا ہوا،

در اصل فارسی شاعری سے اردو شاعری کے متاثر و متعلق ہونے ہی سے اس کی پیدا ہونے والی انفرادیت کو شدید نقصان پہنچایا۔ اب قدرتی

طور پر اس نقصان کی تلافی ہوگی اور ہونی چاہئے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ نئے نئے اسالیب اور رموز پیدا کر رہا ہے اور لوگ اُس کو قبول کر رہے ہیں۔ لیکن بہرحال، اتل صاحب اور اُن کے کلام کو ہم اُسی دائرہ کے اندر دیکھیں گے جو اُن کے کلام کا مقرّرہ دائرہ ہے اور اس دائرہ کے حدود میں وہ خوب فرماتے ہیں ؎

جذبۂ عشق باندازۂ مقدور گیا ۔ عرش پر کوئی گیا کوئی سرِطور گیا

قفس کہیں یہ کسی شاخ گل پہ لٹکا دے ۔ لئے پھرے گا مجھے تو کہاں کہاں صیاد

نکل کے جا نہیں سکتا ہزار چاہوں میں ۔ ہجوم ناز میں اس طرح گھر گیا ہوں میں

خطبۂ صدارت اجلاس علماء کانفرنس

منعقدہ ۲۰ مئی ۱۹۳۷ء بدایوں

یہ وہ یادگار خطبۂ صدارت

ہے جو شیخ وحید احمد صاحب ایم۔ ایل۔ سی نے علماء کانفرنس منعقدہ ۲۰ مئی ۱۹۳۷ء بدایوں میں ارشاد فرمایا۔ خطبہ کی زبان ادیبانہ مدبرانہ ہے۔ پہلے ہی صفحہ میں ایک نہایت مدبرانہ اور گہری بات شیخ صاحب نے فرمائی ہے اور یہی بات ان کے تمام خطبۂ صدارت کی بنیاد ہے۔ ۱۶

"جس طرح یہ صحیح ہے کہ حقیقی اسلامی تعلیم کی رُو سے سیاست اور مذہب کو دو جداگانہ متضاد شعبوں میں تقسیم کرنا ناممکن تھا اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ اب دورِ حاضر کی سیاست اور اسلامی سیاست کو باہم متحد کرنا ناممکن ہے"

اس تمہید کے بعد رسمی طور پر بدایوں کی آفاقی و تاریخی تشریح ہے اس کے بعد یورپ کی سیاست پر نہایت گہرا تبصرہ ہے۔

"یورپ کے میدانِ سیاست کا ہر راہرو "میکاویلی" کے نقش قدم پر چلنے والا اور اُسی کی ضمیر فروش، کینہ پرور، حیلہ باز اور فتنہ پرداز تعلیم پر عامل ہے۔ ہر جائز و ناجائز وسیلہ سے طلب منفعت، حصول دولت اور غصب حکومت یورپ کی داخلی و خارجی سیاست کے مقاصد عالیہ میں سے ہے"

اس تبصرے کے بعد علماء، مذہب اور سیاسیات" کے متعلق ایک بات خوب کہی ہے :-

"ملک کی سیاسی زندگی میں ہمارے علماء نے اب تک جس حیثیت سے شرکت فرمائی ہے وہ اُن اجیر سپاہیوں کی سی ہے جو کسی زمانے میں دوسروں کے مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی جانیں بیچ ڈالتے تھے۔"

آگے چل کر علماء کو جنرل مونرو اور امیر خاں کے پنڈاریوں سے مثال دی ہے اس کے بعد دیہات کے مسلمانوں، اُن کے کلچر اور اُن کے مذہبی حالات کا نقشہ دلکش الفاظ میں کھینچا ہے۔ جس کے آخر میں شیخ صاحب نے فرمایا ہے:

"کیا سیاست کے میدان میں آنے کے لئے ہیٹوں اور طربوشوں کا قحط تھا کہ مقدس جبّہ کو تکلیف کرنا پڑی"

یعنی سیاسیات میں علماء کی شرکت شیخ صاحب کے نزدیک قطعی "جرم" ہے اور اُن کے تمام خطبہ کا لب لباب یہ معلوم ہوتا ہے کہ علماء مذہب کی خدمت کرنے کے لئے ہیں نہ کہ سیاسیات کی، چنانچہ وہ آخر میں فرماتے ہیں۔

"میں دیکھ نہیں سکتا کہ رسول اللہ کی مسندِ مقدس پر بیٹھنے والوں کے متبرک قدم جو ہماری گردنوں پر رہنے کے قابل ہیں عہدِ حاضر کی گندگیوں میں لتھڑے ہوئے نظر آئیں"

شیخ صاحب کا یہ جذبۂ احترام اپنی جگہ قابلِ قدر ضرور ہے۔ مگر جہاں تک ایشیا کا تعلق ہے وہ ابھی تک مذہبی معتقدات سے متأثر ہے اور گو ان کے زاویۂ نگاہ سے یہ غلط ہو مگر مسلمان اُسی وقت کسی تحریک میں شریک ہو سکتے ہیں جب کہ "جمعیۃ العلماء" اس پر مذہبی نقطۂ نگاہ سے جائز ہونے کی مہر ثبت کر دے۔

ایسے ملک میں جہاں ہر چیز مذہب کی کسوٹی پر کسی جاتی ہو یہ کیونکر ممکن ہے کہ علمبرداران مذہب سیاسیات سے علیحدہ رہ سکیں، ان کا سیاسیات سے علیحدہ رہنا جمود پیدا کرنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ مسلمانوں میں ابھی اس درجہ سیاسی شعور پیدا نہیں ہوا ہے کہ وہ سیاسی اور مذہبی فرائض میں تقسیم و تمیز پیدا کر سکیں یعنی بہ حیثیت مسلمان وہ خالص مذہبی ظاہر ہوں، اور

سیاسی جماعت کی حیثیت سے خود کو مغربی ثابت کریں۔

آپ کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے سیاست داں تقلید مغرب کے طور پر چاہے جس قدر ڈپلومیٹک ہو جائیں مگر علما کو اس سے حذر کرنا چاہئے۔ یعنی میر کارواں سیدھے راستہ پہ چلے اور کارواں بھٹک جائے!؟

میری رائے میں یہ تضاد ہرگز قابل عمل نہیں ہے۔ مسلمانوں کو ایک مرکز عمل پر آنا چاہئے اور سیاست داں سے لے کر عالم دین تک کا فرض یہ اور صرف یہ ہونا چاہئے کہ وہ اسلام اور ہندوستان کو آزاد کرائے، یہی ایک راستہ ہے جس پر گام زن ہو کر ہم منزل مقصود پر پہنچ سکتے ہیں اور یورپ کے پنجۂ حرص و آز سے نہ صرف ہندوستان و عالم اسلامی کو بچا سکتے ہیں بلکہ کُل دنیا میں امن و مسرّت قائم کر سکتے ہیں۔

منروا فلم کمپنی

یادش بخیر سیٹھ عبد علی صاحب مرحوم نے جو بنیاد رکھی تھی وہ اب ایک شاندار عمارت ہو چکی ہے۔ منروا فلم کمپنی جس کے ڈائرکٹر مسٹر سہراب مودی ہیں اپنے آرٹ اور کام میں برابر ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ اپنی جدّ و جہد سے پبلک کو آگاہ کرنے کے لئے اس نے اپنے اسٹیڈیو میں ایک پبلسٹی ڈپارٹمینٹ بھی قائم کیا ہے جو منروا فلم کمپنی کی فلمی جدوجہد سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتی رہتی ہے۔

منروا نے "آتمہ ترنگ" تصویر بنا کر اپنی خوش ذوقی اور آرٹ کی خدمت گزاری کا ثبوت دیا ہے جس میں ہندوستانی صنعت فلم سازی اور آرٹ کا بلند ترین معیار پیش کیا گیا ہے۔ بیرونی مناظر ناسک پور، ندیر جبلپور اور حیدرآباد میں لئے گئے۔ منروا کمپنی نے ہندوستانی زبان ہی میں پروڈکشن نہیں کیا اس کی توجہات مرہٹی کلچر اور زبان کی طرف بھی مبذول رہتی۔ چنانچہ "نامدیو" مرہٹی تصویر ہے جو منروا نے خاص توجہ سے پروڈیکٹ کی "نامدیو" باپو راؤ آپیٹے کے ڈائرکشن میں تیار ہوا۔ اور مرہٹی زبان میں منروا کے اولین شاہکار نے لوگوں کو حیران کر دیا۔ اور بھی کئی تصویریں منروا فلم کمپنی نے اپنے اہتمام میں تیار کیں جو مقبول اور مشہور ہوئیں۔

گو منروا کو اس دوران میں آفات ارضی و سماوی کا مقابلہ بھی کرنا پڑا لیکن مسٹر سہراب مودی اور اُن کے برادرِ محترم کے حسن انتظام نے ان آفات کا مقابلہ کیا اور اپنے عملی توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بہر حال ہم مسٹر سہراب مودی کو اُن کی کامیابیوں پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور ہماری آرزو ہے کہ منروا آرٹ اور فلم کی خدمت گزاری میں ہندوستان کی مشہور ترین کمپنیوں کی صفِ اوّل میں شمار کی جائے اور پھر اس درجہ ترقی کرے کہ وہ خود ہی اپنی صفِ اوّل ہو۔

آخر میں یہ کہے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ ہر کام میں گنجائش اور تنقید کی کافی امکانات ہیں۔ - - - منروا کو کبھی یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ اُنکا پروڈکشن رائے زنی سے بالا ہو سکتا ہے۔ اس لئے منروا کے ذمہ دار اصحاب کا فرض ہے کہ وہ خود اپنے محتسب اور نقّاد بنے رہیں۔ خود احتسابی اور خود انتقادی ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔

یادگارِ شیون

یہ امرتسر کے مقبول و مشہور شاعر مرزا شجاع خان شیون ایرانی مرحوم کے فارسی اور اُردو کلام کا مجموعہ ہے۔ جسے اُن کے بھائی مرزا بیضا خان نے مرتب کیا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے مرزا شجاع کو ۱۹۲۵ء میں ایک بار امرتسر ہی میں دیکھا تھا وہ اُردو فارسی کے ایک نہایت خوشگو شاعر تھے اور غزل خوب کہتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں غالب کے نام سے مرزا نے ایک رسالہ بھی شائع کیا تھا۔ یادگار شیون میں سب سے اوّل شجاع کی تصویر رعنا ہے اس کے بعد اُن کے کلام فارسی پر عرشی صاحب کا تبصرہ، پھر مرزا مرحوم کی سوانح حیات، اس کے بعد فارسی و اُردو کلام۔ مرزا شجاع ایک خلیق ذہین، ذکی، سلیم الطبع، عالی حوصلہ اور سیر چشم نوجوان تھے شاعری سے فطری طور پر ذوق تھا۔ ۷ - ۸ سال بیمار رہ کر عین شباب کے عالم میں ۶ جون ۱۹۳۱ء کو انتقال فرمایا۔ فارسی میں خوب کہتے تھے۔ تخلص جوشی کرتے

میخانہ نقش بیخودیٔ جلوہ گاہ کیست

تابِ شراب عکسِ رُخِ رشکِ ماہ کیست

خونم بخاک ریختہ بیجرم وایں عجب — بے خوف می خرامد و بیباک می رود

بادہ تلخ ریز در جامم — تا حلاوت برد لب و کامم

شامِ من گریہ از پئے صبحم — صبح من نالہ از پئے شامم

سایۂ مہر نیست در صحنم   تابشِ ماہ نیست بر بامم

حق سے فروغِ رونقِ میخانہ چاہئے   رندوں کی آرزو بھی تو رندانہ چاہئے

انتقال سے کچھ دن قبل آخری غزل کا ایک شعر یادگار رہ گیا ہے

اسیرانِ ستم کو تھا پیامِ عیدِ آزادی   مرا جوشِ رہائی میں قفس بردوش ہو جانا

آل انڈیا کانگریس کمیٹی الہ آباد کا شعبۂ اطلاعات

انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کے دور اندیش اور دوربین دماغ نے کانگریس کی جانب سے ایک مضبوط "پبلسٹی ڈپارٹمنٹ" قائم کر کے بہت بڑی کمی کو پورا کیا۔ جس دن کانگریس کے شعبۂ اطلاعات نے اپنا کام جاری کیا اُسی دن سے ملک کے فرقہ پرست عناصر نسبتاً کمزور پڑ گئے۔ پہلے ہر بات کے لئے کانگریس کا نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کے لئے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ مگر اب ہر بات کے متعلق فوراً کانگریس کی پالیسی کی وضاحت بہت سی غلط فہمیوں کا سدِّ باب کر دیتی ہے اور یہ حکومت ہند کے پبلک انفارمیشن بیورو کا نہایت موزوں و مناسب جواب ہے۔ جہاں سے کمال ہوشیاری کے ساتھ ہندوستانی مفاد کے خلاف پروپگنڈا ہوتا رہتا ہے۔

بنیادی حقوق و فرائض اور کانگریس کا اقتصادی پروگرام

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۸ ر اگست ۱۹۳۱ء کو بمبئی میں فنڈامنٹل رائٹس کے متعلق جو قرارداد پاس کی تھی اس کا اعادہ ایسے وقت میں یقینی ضروری تھا جبکہ جدید انڈیا ایکٹ پر نفاذ ہو رہا ہے اور کانگریس نے وزارتوں کو محض اس لئے قبول کر لیا ہے کہ وہ نئے قانون کو بیکار و نکمّا ثابت کر دیں اور وہ شئے مقصود حاصل کریں جو ہندوستان کے غریب و مفلس باشندوں کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ چنانچہ "بنیادی حقوق و فرائض اور کانگریس کا اقتصادی پروگرام" میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ:-

"ہندوستان کی اصلی نکبت و فلاکت دُور کرنے کیلئے یہ بہت ضروری ہے کہ سیاسی آزادی میں فاقہ کش کروڑہا اہلِ ملک کی اقتصادی آزادی داخل سمجھی جائے۔ بلکہ اُن کا ایک جزوِ ضروری قرار پائے"

اس وجہ سے کانگریس اعلان کرتی ہے کہ کوئی کانسٹی ٹیوشن (ملکی قوانین و آئین) جو اس کی طرف سے طے پائے یا جو اس کے وسیلے سے سوراج گورنمنٹ تیار کرے اس میں امورِ ذیل کا ہونا لازم ہے۔

بنیادی حقوق و فرائض

(۱) ہر باشندۂ ہندوستان کو حقوقِ ذیل حاصل ہوں گے یعنی اپنی رائے آزادی سے ظاہر کرنا، اور اشتراکِ عمل و باہمی اختلاط میں مکمّل آزادی اور امن کے ساتھ بغیر اسلحہ کے ایسی اغراض کے واسطے مجتمع ہونا جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہوں۔

(۲) ہر باشندۂ ہندوستان کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی سے کر سکیگا اور اپنے مذہب کے فرائض و رسوم آزادی سے برت سکیگا۔ بشرطیکہ اس سے انتظامِ عامّہ اور اخلاق میں کوئی نقص واقع ہو۔

(۳) ملک کی اقلیتوں کے تمدّن اور اُن کی زبان اور رسمِ تحریر محفوظ ہوں گے۔ نیز ملک کے وہ مختلف رقبے جو باعتبارِ اختلافِ زبان کے قائم ہیں اُن کا تحفظ ہوگا۔

(۴) تمام باشندگانِ ہندوستان بلا امتیازِ مذہب و مسلک یا ذات و قوم یا جنسیت کے قانون کی نظر میں برابر ہوں گے۔

(۵) کوئی باشندۂ ہندوستان خواہ مرد ہو یا عورت بوجہ اپنے مذہب یا ذات یا جنسیت کے کسی پبلک ملازمت یا عہدے یا اعزاز سے یا کسی تجارت و پیشہ سے ممنوع نہیں سمجھا جائے گا۔

(۶) تمام باشندگانِ ہندوستان کو متعلق استعمال آبِ چاہ اور تالابوں

کے نیز تعلیم گاہوں اور مقامات تفریح عامہ کے استعمال کے متعلق کہ جنکی
برقراری اور انتظام اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے یا لوکل فنڈ
(ڈسٹرکٹ میونسپل بورڈ) سے ہوتا ہو یا جن کو پرائیویٹ اشخاص نے
پبلک کے فائدے کے واسطے مخصوص کر دیا ہو مساوی حقوق حاصل ہونگے
(۷) ہر باشندۂ ہندوستان کو ہتھیار رکھنے اور لگانے کا حق، اُن قواعد
اور ضوابط کے تحت میں جو اس بارہ میں مقرر کردئے جائیں حاصل ہوگا۔
(۸) کسی شخص سے اُس کا حق آزادی چھینا نہیں جاسکتا اور نہ اُس کے کسی
مکان یا جائداد میں مداخلت کی جاسکتی ہے اور نہ وہ ضبط اور قرق کی جاسکتی
ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ قانون کے مطابق ہو۔
(۹) مذہب کے معاملہ میں اسٹیٹ (حکومت وقت) غیر جانب دار ہوگی۔
(۱۰) حق رائے دہندگی ہر عاقل و بالغ کو حاصل ہوگا۔
(۱۱) مفت جبری ابتدائی تعلیم کا انتظام اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے ہوگا
(۱۲) اسٹیٹ (حکومت وقت) کی جانب سے کوئی خطاب نہیں ملیگا۔
(۱۳) ہر باشندۂ ملک کو حق حاصل ہوگا کہ ملک بھر میں جہاں اُس کا جی چاہے
جائے نیز یہ کہ جہاں اُس کا جی چاہے سکونت اختیار کرے۔ جائداد حاصل
کرے یا کوئی تجارت یا پیشہ وہاں کرے اور اُس کے خلاف قانونی کارروائی
یا اُس کا قانونی تحفظ ہندوستان کے ہر حصہ میں مساوی طور پر ہوگا۔

مزدوری پیشہ اشخاص

(۱) الف۔ مزدوری پیشہ جماعتوں کا اقتصادی نظام اصول انصاف کے
مطابق ہوگا جس کی سب سے بڑی غرض یہ ہوگی کہ ایسے اشخاص کے طرز
رہائش کا معیار بہت بہتر ہو جائے۔
ب۔ اسٹیٹ (حکومت وقت) کارخانوں میں کام کرنیوالے مزدوروں
کے حقوق کی حفاظت کرتی رہے گی اس طور پر کہ مناسب قوانین کے ذریعہ
سے نیز اُن کے سوا دوسرے ذرائع سے اُن لوگوں کے لئے ایک معقول
مزدوری، اُن کی صحت کا مناسب انتظام، کام کرنے کے مقررہ گھنٹے
اور مناسب انتظام درصورت نزاع درمیان مالکان کارخانہ اور کام کرنے
والوں کے منضبط ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ بڑھاپے، بیماری اور بیکاری کی
صورت میں ایسے لوگوں کی امداد کس طریقے سے کی جائے گی۔

(۲) بیگاری اور ایسی مزدوری کہ جو بیگاری کے قریب ہو بالکل بند
کردی جائے گی۔
(۳) مزدور عورتوں کے تحفظ کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ علی الخصوص زمانہ
زچگی کی رخصت کا خاص انتظام کیا جائے گا۔
(۴) تعلیمی سن کے بچے کانوں اور کارخانوں میں کام کرنے سے مستثنیٰ ہونگے
(۵) کسانوں اور دیگر مزدوری پیشہ لوگوں کو پورا حق حاصل ہوگا کہ اپنے حقوق
کی حفاظت کے واسطے یونین (اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے انجمنیں)
قائم کریں۔

ادائی ٹیکس اور اخراجات

(۱) طریقۂ قبضۂ اراضی اور تشخیص مالگذاری و لگان کی اصلاح کردی
جائے گی۔ اور زراعتی اراضی کے بارہ کا ایک منصفانہ انتظام کیا جائے گا
جس سے چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو فوری نفع پہونچیگا۔ بذریعہ معقول تخفیف
لگان اور مالگذاری کے جو وہ بالفعل ادا کرتے ہیں۔ اور درصورت غیر نفع
بخش کاشتوں کے لگان معاف کردیا جائے گا۔ جب تک کہ اس کی ضرورت
سمجھی جائے گی اور اُن چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے فائدے کا جن کا اس ۱۶۵
قسم کی معافی یا تخفیف لگان سے نقصان ہوتا ہو خیال رکھا جائے گا اور
اسی غرض سے ایک درجہ وار ٹیکس ایک معقول مقررہ رقم سے زیادہ کی آمدنی
آراضی پر قائم کیا جائے گا۔
(۲) ایک مقررہ رقم سے زیادہ کی جائداد پر ایک تدریجی محصول جانشینی
(Death Duty) مقرر کیا جائے گا۔
(۳) فوجی اخراجات میں بہت بڑی تخفیف عمل میں آئیگی اور وہ موجودہ
اخراجات سے تقریباً نصف رکھے جائیں گے۔
(۴) سول ڈپارٹمنٹ کے اخراجات اور تنخواہ ملازمین میں بھی معتدبہ
تخفیف کی جائے گی۔ اسٹیٹ (حکومت وقت) کا کوئی ملازم سوائے اُن
لوگوں کے جنکا تقرر بطور اکسپرٹ (ماہر فن) وغیرہ کے کیا جائے ایک مقررہ
رقم سے زیادہ تنخواہ نہیں پائے گا اور یہ مقررہ رقم معمولاً پانچسو روپیہ ماہوار
سے متجاوز نہوگی۔
(۵) اپنے نمک پر جو ہندوستان میں بنایا جائے کوئی محصول نہیں لگے گا۔

ہندوستان کے لئے مفید نہیں ہوسکتا۔

(۲) ہٹ دھرمی، غلامی، فرقہ پرستی اور "ابوجہلیت" کا کوئی علاج نہیں لیکن جس شخص میں ذرا بھی عقل ہے وہ اعتراف کرے گا کہ اس بنیادی علان کے بعد کوئی گنجائش شک وشبہ کی رہ نہیں جاتی۔ کسی ملک کی داخلی اور کسی قوم کی قومی آزادی کے لئے اس سے زیادہ کیا آزادی دیجاسکتی ہے کہ ہر شخص کو ضمیر کی آزادی حاصل ہو۔ کانگریس بنیادی حقوق میں اس مقدس حق کو سب سے اوّل درجہ دیتی ہے اور ضمیر کی آزادی نہیں بلکہ وہ کہتی ہے کہ:-

" اور وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی سے کرسکیگا اور اپنے مذہب کے فرائض ورسوم آزادی سے برت سکیگا "

جو فرقہ پرست ہندوستان پر برطانی تسلط کی لعنت کو طاری وحادی دیکھنا مذہبی فرض سے زیادہ مقدس خیال کرتے ہیں اور بات بات میں مذہب کا نام تجارتی طور پر لے کر شور مچاتے ہیں کہ آزادی حاصل ہوجانے کے بعد مذہب خطرے میں پڑجائیگا یا مذہبی آزادی باقی نہیں رہیگی، میں اُن سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا وہ ایمانداری کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں۔ کیا اس کی وضاحت کے بعد کوئی حقیقت ان کے اندیشے کی باقی رہ جاتی ہے؟ دوسروں کا ذکر نہیں لیکن مسلمان اگر ایسا خیال کریں تو مجھے اُن پر رونا آئیگا کیونکہ میرے خیال سے مسلمانوں کا یہ "اندیشہ" ایک ہی معنی رکھ سکتا ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کو بھول گئے اور اُن کی "روحِ یقین" سرد پڑگئی۔ مسلمان کا تو مذہب ہی آزادی ہے۔ جو شخص آزادی کے خلاف ہے وہ اسلام کے خلاف ہے۔ بہرحال مسلمان ہوں یا ہندو، عیسائی ہوں یا پارسی، اچھوت ہوں یا کوئی دوسری ہندوستانی قوم، قانون ہر ایک کے لئے ایک سا اور قومی حکومت کا ہر قانون حکومت کی غرض سے وضع نہیں کیا جاتا بلکہ قومی ضرورت کی بنیاد پر بنایا جاتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ کانگریس کے "بنیادی حقوق وفرائض" ہندوستان کے باشندوں کے مشکلات و مصائب کا حل ہیں۔ یعنی کوئی آئین خواہ وہ حکومت کی طرف سے بنے یا اس کی طرف سے یا مشترکہ مندرجۂ بالا بنیادی حقوق وفرائض سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ حقوق کانگریس کا بنیادی مقصود ہیں۔

اقتصادی اور سوشل پروگرام

نمبر ۱

اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے دیسی کپڑے کی حفاظت کی جائیگی اور اس غرض سے بیرونی کپڑے اور بیرونی تاگے کے ملک سے اخراج کی پالیسی پر عمل کیا جائے گا اور اس کے علاوہ اور بھی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں جو ضروری سمجھی جائیں۔ دیسی کپڑے کے علاوہ اور دیسی دستکاریوں کا تحفظ بمقابلہ اُسی قسم کی بیرونی دستکاریوں کے اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے عمل میں آئیگا۔ جب کبھی اس کی ضرورت واقع ہوگی۔

نمبر ۲

نشہ آور اشیاء اور ادویہ کی قطعی ممانعت ہوگی سوائے اس کے کہ طبی اغراض کے لئے اُن کے استعمال کی ضرورت ہو۔

نمبر ۳

کرنسی (سکۂ رائج الوقت) اور ایکسچینج (بٹاون) کا نرخ قومی مفاد کے اعتبار سے مقرر ہوگا۔

نمبر ۴

تمام کلیدی صنعتیں (Key Industries) کانیں، ریلوے، آبی راستے، جہاز رانی اور دیگر ذرائع آمدورفت اسٹیٹ کی ملک ہوں گی۔ اور اسٹیٹ (حکومتِ وقت) ہی کے قبضہ میں رہیں گی۔

نمبر ۵

زراعتی قرضوں کی تخفیف اور سود کی کمی کا انتظام کیا جائے گا۔

نمبر ۶

اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے باشندگان ملک کی فوجی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ تاکہ باقاعدہ فوج کے علاوہ (National Defence) ملک کی مدافعت کے واسطے والنٹیروں کے دستے عند الضرورت تیار رہیں۔

یہ ہیں وہ "بنیادی حقوق وفرائض" جو ہندوستان کو آزادی اور ترقی کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کے افلاس اور غلامی کا حقیقی علاج ہیں اور جو قانون و آئین ان بنیادی حقوق وفرائض سے خالی ہوگا یقیناً

(۲) مسلم لیگ جو آجکل مقابلہ کے طور پر شورش انگیز ہے اس کے حامی اور دوسرے فرقہ پرست اور تن آسان رجعت پسندوں کے "باتونی" اس خدشہ کو بھی بیان کرتے ہیں کہ اگر ملک کو آزادی حاصل ہوگئی تو ہندو قوم ہمارے تمدن، ہماری زبان، اور رسم تحریر کو ہڑپ کر جائے گی۔

تمام خدشات کو پیش کرنے کی نوعیت ہمیشہ یہ دیکھی گئی (اور نہ کبھی جاتی تو ثابت ہوتی) کہ یا تو ان جماعتوں کو اپنی طاقت اور عملی قوتوں پر بھروسہ نہیں ہے یا یہ سراسر آزادی اور ملک کی فلاح کے دشمن ہیں۔ میں ایسے تمام افراد اور ایسی جماعتوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی اکثریت کی حکومت اس قسم کا تصور اپنے مفاد و قیام کی خاطر بھی گوارا نہیں کرسکتی۔ ہر ذی فہم جانتا ہے کہ کسی فرقہ کی اپنی کمزوری اس کو تباہ کرسکتی ہے نہ کہ دوسروں کی طاقت!؟ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے کانگریس اس باب میں نہایت وضاحت کیساتھ بنیادی حقوق کا اعلان اپنی طرف سے تجویز کی صورت میں کرتی ہے

(۳) "ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور ان کی زبان اور رسم تحریر محفوظ ہوں گے۔ نیز ملک کے وہ مختلف رقبے باعتبار اختلاف زبان قائم ہیں ان کا تحفظ ہوگا"

اک برسر اقتدار آنیوالی یا پوری قوم ہندوستانی کی فلاح و آزادی کی خاطر جدوجہد کرنے والی جماعت سے متحدہ مقصد کے متعلق جو توقع کی جاسکتی ہے وہ اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے۔ پھر اس کے ذمہ دار صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے اس مسئلہ پر جتنی بار اور جس قدر واضح اظہار خیال کیا ہے اس کے بعد شک و اتہام کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

رسالہ "ہمایوں" میں عطاء اللہ صاحب پالوی نے ایک طویل مضمون میں میرے متعلق لکھا ہے کہ ساغر صاحب نے پنڈت جواہر لال کی پوزیشن صاف کرنا چاہی ہے مگر افسوس کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے" اس کے بعد انھوں نے پرشد کے اجلاس میں پنڈت جی کی موجودگی اور خموشی کے متعلق شکایت کی ہے۔ اُن کو معلوم ہونا چاہئے کہ پنڈت جواہر لال کی پوزیشن سورج کی طرح روشن ہے زبان کے مسئلہ پر انھوں نے جس قدر وضاحت اور دیانت داری سے اظہار خیال کیا ہے کسی نے نہیں کیا اور وہ صداقت کیساتھ اُردو کے حامی ہیں۔

مجھ سے اس مسئلہ پر زبانی تبادلۂ خیال کے دوران میں اُنھوں نے کہا کہ پرشد میں میری خاموشی کی یہ تعبیر غلط ہے۔ بلکہ میں مسئلۂ زیر بحث کو سمجھ کر اظہار خیال کرنا چاہتا تھا۔

لیکن بہرحال یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ ان مسائل کو کانگریس نظر انداز کرتی۔ چنانچہ بنیادی حقوق و فرائض میں اُس نے ۱۹۳۱ء ہی میں ان کی اہمیت پر روشنی ڈال دی تھی۔

وہ لوگ جن کو سیاسی شعور حاصل نہیں ہوا ہے وہ ایک دن اس نعمت سے ضرور بہرہ ور ہوں گے۔ لیکن ترقی یافتہ جماعتوں کی جدوجہد کو تنگدلی، شک، اور فرقہ پرستی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا نہ صرف نامناسب ہے، بلکہ مفید نہیں ہے۔ ہر شخص کو یہ جاننا چاہئے کہ ہندوستان لحہ بہ لحہ انقلاب سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ فرسودگی، سستی، کاہلی، قدامت پرستی اور قدیم الخیالی کے زنگ آلود ہتھیاروں سے اس انقلاب کا مقابلہ ناممکن ہے۔ اس کے مقابلہ کے لئے نقطۂ نگاہ کو تبدیل کرنا پڑے گا۔ تبدیل ہی نہیں وسیع بھی کرنا ہوگا ورنہ نتیجہ وہی ہوگا جو تھکے سپاہی کا ہوا کرتا ہے۔

بہرحال کانگریس کے نزدیک فنڈامنٹل رائٹس کی جتنی اہمیت ہے اُس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے ان کو دوبارہ کئی زبانوں میں شائع کیا اور یہ اعادہ اس بات کی بین شہادت ہے کہ کانگریس نئے کانسٹی ٹیوشن میں ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق و فرائض و نیز اپنے اقتصادی اور سوشیل پروگرام کو ہرگز نظر انداز نہیں کرسکتی۔ اپنے اقتصادی اور سوشیل پروگرام میں اُس نے جو کچھ طے کیا ہے وہ عام ہندوستانیوں کے معمولی ترین مفاد تک پر حاوی ہے اور کامل آزادی کا تصور لئے ہوئے ہے کیونکہ کرنسی (سکہ رائج الوقت) اور اکسچینج (تبادلہ) کا نرخ قومی مفاد کے اعتبار سے مقرر ہونا حکومت ہند یا برطانوی پارلیمنٹ کب برداشت کرسکتی ہے۔ ان تمام چیزوں پر اقتدار حاصل ہو جانے کے معنی "کامل آزادی" کی بنیادی منزل تک پہونچ جانا ہے۔

ہندوستانی ماہنامہ
مدیر مسئول:۔ رشید کمالی ایم۔اے۔ زیر سرپرستی سر محمد یعقوب
سالانہ چندہ ۳ء ششماہی ۲ء فی پرچہ ۴ر دارالاشاعت عزیز منزل مرادآباد

یہ ایک نیا ادبی رسالہ ہے جو مراد آباد سے شائع ہونا شروع ہوا ہے اور جس کا دوسرا نمبر پیش نظر ہے۔ رسالہ کی لکھائی چھپائی متوسط درجہ کی خوشنما ہے لیکن جا بجا لیتھو کی نقاشی نے سادگی و خوش ذوقی کا خون کر دیا ہے۔ کاغذ سفید اور چکنا لگایا گیا ہے۔ مضامین اچھے ہیں زیر نظر نمبر بھی ہمارے دوست شبیر احمد صاحب صدیقی کا مضمون ہندوستانی بہت اچھا ہے۔ دوسرا مضمون "جگر اور شراب" بھی خوب ہے۔ لیکن مضمون نگار کی اس صوفیانہ رائے سے میں اتفاق نہیں کرتا کہ ہمارے دوست کی بادہ نوشی النسانوں کی عادت یا ارض انسان کی رسم کے علاوہ کوئی "عرشی لٹک" ہے۔ جگر کا شعر بجائے خود "شراب" ہے۔ رسالہ مجموعی طور پر اچھا ہے۔ رشید صاحب کو اس کی طرف مزید توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور انھیں کو نہیں بلکہ ہر اردو داں کو آج ہندوستانی زبان کی ترقی و ثبات کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہر شخص اس کی خدمت کو ضروریات زندگی میں شریک کرلے۔

عارف لاہور

مقام اشاعت ہل روڈ لاہور، اڈیٹر عبدالرحمن صاحب شوق، سالانہ چندہ عہ،

یہ ایک مذہبی رسالہ ہے جس کا "معین" نمبر پیش نظر ہے۔ اس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کے مفصل حالات درج ہیں۔ تنقیدی حصہ بالکل نہیں ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔

خضر راہ

چیف اڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن، اڈیٹر یعسوب حسن
قیمت سالانہ لکائی پرچہ ۳ر

یہ بھی نیا رسالہ ہے اور ہمارے قدیم دوست حکیم محمد یوسف حسن صاحب اڈیٹر "نیرنگ خیال" نے جاری کیا ہے۔ سرورق نہایت دیدہ زیب سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۹۶ صفحات، مضامین عام فہم دلچسپ اور ادبی۔ "وینس کی پیدائش" کے عنوان سے جو تصویر اس رسالہ میں شائع ہوئی ہے وہ آرٹ کا شاہکار ہے اور بھی تصویریں خوب ہیں۔ رسالہ مجموعی طور پر خریدنے اور پڑھنے کے قابل ہے حکیم یوسف حسن صاحب نے اردو ادب کی جتنی خدمت کی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ان کے اس جدید رسالے کو قوم زیادہ سے زیادہ تعداد میں خریدے۔

باتصویر ہفتہ وار ترقی لکھنؤ

کسی اخبار کی اشاعت بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ مگر اخبار ہی ایک ایسا کام ہے جس کو ہم ہندوستانی انتہائی غیر ذمہ داری سے انجام دیتے ہیں۔ اس کی اصلی وجہ خود ہمارے کردار میں پوشیدہ ہے۔ ہم زندگی کو ذمہ دارانہ نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے تو اس کے جزئیات کو کیا اہمیت دے سکتے ہیں؟ انھیں خیالات کی وجہ سے جب کوئی نیا اخبار یا رسالہ مدیر ایشیا کو وصول ہوتا ہے تو اس کی وجہ اشاعت پر غور کرنے لگتا ہے۔ اخبار یا تو رائے عامّہ کا نمائندہ ہوتا ہے یا اس کا کام کسی خاص ملکی و قومی مقصد کے لئے رائے عامّہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یا وہ جدت پسند طبقوں کی نمائندگی کا ذلیل فرض ادا کرتا ہے۔ یا وہ آزاد طبقوں کے گیت گا کر ان کے حق میں فضا پیدا کرتا ہے۔ بہر حال اخبار ایک نہایت اہم شے ہے۔ جس کی تمام تر ذمہ داری اس کے ادارۂ تحریر ——— پر ہوتی ہے اور انسانی نسل کی ذہنی و دماغی رجحانات کو مٹانا یا ابھارنا ذمہ دار مدیر سے تعلق رکھتا ہے ترقی، حال ہی میں لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ اس کا نام ہی اس کے کام کا اعلان ہے یہ سید تبارک حسین صاحب جعفری کی سرپرستی اور لکھنؤ کے نوجوان شاعر حضرت عمر انصاری کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔ سرورق دبیز آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے اور سرورق کے بلاک کے علاوہ پانچ تصویریں ہیں جو فلم کے مناظر سے تعلق رکھتی ہیں۔ کاغذ ۲۰×۲۶/۲۴ ۲۰ پونڈ ہے "شاعر کے مدارج حیات"، مولوی عبدالباری آسی کا مضمون اپنی نوعیت کا نہایت دلچسپ اور انوکھا مضمون ہے۔ ایک خاص ترتیب کے ساتھ غالب کے اشعار کی تعبیر و تفسیر کی گئی ہے اور باقی چیزیں بھی خوب ہیں لیکن وہ جو نمائندگی کا فرض ہے وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کا سیاسی مسلک کیا ہے اور کسی سیاسی بحث پر عدم اظہار اس شک میں مبتلا کرتا ہے کہ ترقی سیاسی اخبار ہے بھی کہ نہیں۔ البتہ دل پر یہ اثر ضرور ہوتا ہے کہ زمانے کے تقاضات کے مطابق فلمی عنصر اس میں زیادہ ہے میرے خیال سے ادبی رسائل بھی سیاسی بیداری اور مباحث حاضرہ سے آنکھ بند نہیں کرسکتے تو کیونکر ہفتہ وار اخبار کو ہم اس عنصر سے آزاد خیال کریں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ترقی اپنے سیاسی مسلک کو قائم کرے اور پھر اسی کے مطابق تمام ملکی و قومی معاملات پر رائے دے کر ملک و قوم کی رہبری کرے۔

ترقی کے اندر چند ہی ہفتوں میں مذہبی عنصر کی زیادتی ہوگئی ہے اور ادارے میں بھی کچھ انقلاب ہوا ہے۔ بہر کیف مجموعی طور پر ترقی خاصا اخبار ہے۔

(ساغر نظامی)

بقیہ مضمون صفحہ ۱۶

زبان کا مسئلہ اور اُس کا حل

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۶ء کے بعد سے اردو دنیا میں ایک نئی بیداری پیدا ہوگئی۔ مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن کی مسلسل اور مستقل جدوجہد نے تمام ادارہ ہائے خیال کو متحد کردیا۔ اور کل اُردو دنیا خواب سے چونک پڑی۔

اس جدوجہد اور بیداری کا تعلق محض ادبی حلقوں سے نہیں رہا بلکہ سیاسی ذمہ دار ہستیوں تک کو اس مسئلہ سے دلچسپی لینی پڑی اور اس دلچسپی کا نتیجہ یہ ہو کہ خودغرضی اور قومی عصبیت کے لئے اس مسئلہ میں گنجائش باقی نہیں رہی اور بالآخر دونوں قوموں اور دونوں زبانوں کے ماہرین کو ایک مرکز پر جمع ہونا پڑا۔

اس سلسلے میں "بہار اردو کمیٹی" کی طرف سے پٹنہ میں ایک اجلاس ۲۸ راگست ۱۹۳۷ء کو ہوا۔ جس کے بعد بابو راجندر پرشاد جی اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے نے ایک متفقہ بیان شائع کیا ہے جو ذیل میں درج ہے۔

"۲۸ راگست کو "بہار اردو کمیٹی" کے اجلاس میں ہمیں ہندوستانی زبان کے سوال پر چند دوستوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ اس بارے میں بدقسمتی سے جو غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے اسے دُور کرنے کے لئے ہم سبھی مضطرب اور فکرمند تھے اور ہیں۔ یہ اعلان کرتے ہوئے بیحد خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس گفتگو کے نتیجہ کے طور پر ہمیں معلوم ہوا کہ اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر ہم سب ایک بہت بڑی حد تک ہم رائے ہیں۔ یعنی ہم سب کی یہ متفقہ رائے تھی کہ "ہندوستانی" کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کا درجہ حاصل ہونا چاہیے اور یہ اُردو نیز ناگری دونوں حروف میں لکھی جانی چاہیے جن کا سرکاری و تعلیمی مقصد کے لئے یکساں درجہ تسلیم کیا جائے۔ "ہندوستانی" سے ہمارا مطلب اُس وسیع ترین اور عالمگیر زبان سے ہے جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہے۔ اور ہمارا یہ یقین ہے کہ اس کے الفاظ کے انتخاب و استعمال کا معیار وہی ہونا چاہیے جو اس وقت عام طور پر زیرِعمل ہے۔ ہماری یہ بھی رائے ہے کہ اردو اور ہندی دونوں کو علمی زبانوں کی حیثیت سے درجۂ کمال تک نشوونما کرنے کے پورے پورے موقع حاصل ہونے چاہئیں۔

اس لئے ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ اُردو و ہندی علماء کے باہمی تعاون سے ایک ایسی لغات تیار کی جائے جس میں وہ تمام الفاظ درج ہوجائیں جو مشترکہ طور پر اُردو و ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔

ایک ایسی لغت کی تیاری کے لئے نیز مختلف نمایاں سوالات مثلاً علمی اور ٹیکنیکل اصطلاحات کا انتخاب وغیرہ کے حل کرنے کے لئے ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ ایک نمائندہ کمیٹی مقرر کی جائے جس میں اُردو و ہندی کے وہ بارسوخ حامی شامل ہوں جو دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب ترین لاکر ہندوستانی زبان کو نشوونما دینے کی تجویز میں کامل یقین رکھتے ہوں اور اس طرح دونوں زبانوں کے حامیوں میں باہمی خیراندیشی اور ہم خیالی پیدا کرنے کے خواہاں ہوں"۔

گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں "دل پسند اقدام" کے عنوان سے اس بیان پر اظہارِ استحسان کیا ہے اور اُن کی تجویز ہے کہ کمیٹی کے ممبران کی تعداد کم سے کم ہونی چاہیے تاکہ کام میں وسیع اختلاف اور تاخیر پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

مسئلہ زبان کا یہ حل ایسا عجیب نہیں ہے کہ مندرجہ بالا اعلان کے مصنف و مشتہر اس کی اہمیت و عامیت سے واقف نہ تھے مگر جب تک خوب آویزش نہ ہولی اس سے قبل اس مسئلہ کا حل پیدا نہ ہوسکا۔ قصّہ دراصل یہ ہے کہ ؎

ہے گراں سیرِ غمِ راحلہ و زاد سے تو　　کوہ و دریا سے گزر سکتے ہیں مانندِ نسیم

زبان کا مسئلہ اور صدر انڈین نیشنل کانگریس

پنڈت جواہرلال نہرو نے "زبان کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک نہایت اہم مقالہ شائع کیا ہے "ہندوستانی" زبان کی تعریف کرتے ہوئے پنڈت جی لکھتے ہیں :-

"ہندوستانی" کی جیسا کہ وہ شمالی اور وسطی ہندوستان
کے مختلف حصّوں میں بولی اور لکھی جاتی ہے،
بہت سی مختلف صورتیں ہیں جن سے کئی چھوٹی
چھوٹی بولیاں پیدا ہوگئی ہیں مگر یہ تعلیم کی کمی کے لازمی نتائج ہیں اور جمہور میں تعلیم کے عام ہونے سے یہ غائب ہوجائیں گی اور
صحتِ زبان کا ایک معیار قائم ہوجائے گا۔
رہا رسم الخط، تو دیوناگری اور اُردو طرزِ تحریر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں کہ ان میں سے ایک رسم الخط دوسرے کو جذب کرلے گا۔ اس لئے ہم نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم رہیں اور پھولیں پھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس صورت میں اُن لوگوں پر جو دونوں زبانیں سیکھنا چاہیں گے ایک زائد بار پڑے گا اور ایک حد تک جُداگانہ ذہنیت کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی۔ لیکن ہمیں یہ قباحتیں برداشت ہی کرنی پڑیں گی۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں ہے دونوں رسم الخط ہماری زبان کی مخصوص طبیعت کے حصّے ہیں اور اِن کے گرد نہ صرف اِن سے مخصوص ادبیات جمع ہوگئی ہیں بلکہ جذبات کے ایسے زبردست حصار کھنچ گئے ہیں جن کی شکست و ریخت ناممکن ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مستقبل بعید ہمارے لئے کیا کچھ لائے گا لیکن اسوقت تو دونوں کو جُوں کا تُوں رکھنا پڑے گا۔"

۱۷۰

رسوم الخط کے متعلق پنڈت جی تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"ہمارے رسوم الخط ہماری ادبیات کے لازمی حصّے ہیں۔ اُن کے بغیر ہم اپنی قدیم روایات سے بالکل جدا ہوجائیں گے۔"

اُردو کی تدریجی اور تاریخی حقیقت و تاریخ بیان کرتے ہوئے جواہرلال جی نے بالکل درست لکھا ہے کہ :-

"۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک اُردو کے معنی رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی ہی سمجھے جاتے تھے۔ یہ اُنیسویں صدی کے وسطِ آخر کا ذکر ہے کہ ہندی اور اُردو کے الفاظ کے دو مختلف معنی لئے جانے لگے اور یہ اختلاف روز بروز بڑھتا گیا۔"

یہ مقالہ اپنے موضوع پر نہایت وسیع اور عالمانہ ہے .. لفظ لفظ سے صرف مسائل کے حل کی اسپرٹ ظاہر ہوتی ہے۔ یہ حیرتناک بات ہے کہ جو شخص عملی سیاسیات میں تمام عمر گزار دے وہ ادبی مسائل پر چلتے پھرتے اس قدر بہتر سوچ سکتا ہے اور سوچ کر اتنا بہتر لکھ سکتا ہے۔ زبان اور حکومت کی پالیسی کے متعلق جواہرلال جی تحریر فرماتے ہیں :-

"ہر صوبہ میں حکومت کے امور وہاں کی مقامی زبان میں سرانجام پانے چاہئیں لیکن ہر صوبہ میں "ہندوستانی" کی آل انڈیا حیثیت کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ ہندوستانی بولنے والے صوبوں میں دونوں رسوم الخط کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا لازمی ہے"

بہت ممکن ہے کہ اس مسئلہ کے ذمہ دار عالموں کے پاس اس سے بہتر کوئی حل ہو لیکن پنڈت جواہرلال نہرو نے جو حل پیش کیا ہے وہ اپنے موضوع کے تمام ضروری امور کو گھیرے ہوئے ہے اور میرے نزدیک کوئی راستہ سوائے اس کے ممکن نہیں،

اب ہم ذیل میں اُن کی تجاویز کو نقل کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ زبان کے مسئلہ کو ہر قوم کے نقطۂ نگاہ سے سلجھانے کے لئے بہترین راہ نکالی گئی ہے۔

گیارھویں شق میں پنڈت جی نے "بنیادی انگریزی" کے طرز پر بنیادی ہندوستانی کی جو تجویز پیش کی ہے وہ بھی ماہرین زبان کے لئے خاص چیز ہے اور دعوتِ فکر دیتی ہے۔

(۱) ہمارے پبلک کام اور سرکاری تعلیم کے لئے ہر لسانی رقبہ کی مخصوص زبان استعمال ہونی چاہئے اور اس رقبہ میں اُس زبان کو باقی زبانوں پر فوقیت حاصل ہونی چاہئے۔ اِس مطلب کے لئے ہندوستان میں مندرجۂ ذیل زبانوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے۔
ہندوستانی (اُردو اور ہندی دونوں) بنگالی۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ تامل۔ تلوگو۔ کناری۔ ملیالم۔ آڑیا۔ آسامی۔ سندھی اور کسی حد تک پشتو اور پنجابی۔

(۲) ہندوستانی بولنے والے رقبوں میں اُردو ہندی دونوں اپنے جدا جدا رسم الخط کے ساتھ سرکاری طور پر تسلیم کی جانی چاہئیں۔ پبلک اعلانات دونوں رسوم میں جاری ہونے لازمی ہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہو کہ عدالتوں اور دفاتر کے ساتھ معاملات کرنے میں دونوں میں سے ایک رسم الخط کو چُن لے اور اُسے یہ مجبوری نہیں ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے رسم الخط میں اپنی تحریر کی نقل داخل کرے۔

(۳) ہندوستانی رقبہ میں ہندوستانی ذریعۂ تعلیم ہوگی اور تعلیم دونوں رسوم الخط میں دی جائے گی اور دونوں کو تسلیم کیا جائے گا طلبا یا اُن کے والدین دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حق رکھیں گے۔ طلبا پر دونوں رسوم الخط سیکھنے لازم نہیں ہوں گے۔ اگرچہ ثانوی مدارس میں دوسرا رسوم الخط سیکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

(۴) ہندوستانی کو (مع اپنے دونوں رسوم الخط کے) سرکاری طور پر آل انڈیا زبان تسلیم کیا جائے گا اور اس لحاظ سے ہر شخص مجاز ہوگا کہ وہ ہندوستان کے کسی دفتر یا عدالت کے ساتھ ہندوستانی میں معاملہ کرے اور تحریریں دونوں میں سے کوئی ایک رسوم الخط اختیار کرے اور اُس پر لازم نہیں ہوگا کہ اپنی تحریر کی نقل دوسرے رسوم الخط میں مہیا کرے۔

(۵) دیوناگری۔ بنگالی۔ گجراتی اور مرہٹی رسوم الخط کو متحد کرنے اور ایک ایسا مخلوط رسم الخط مقرر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو چھاپے۔ ٹائپ رائٹر اور دیگر جدید ایجادوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکے۔

(۶) سندھی رسم الخط کو اردو میں جذب کر دینا چاہئے اور اُردو رسم الخط کو ممکن حد تک سہل تر کر کے چھاپے اور ٹائپ رائٹر کے لئے موزوں بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(۷) جنوبی رسوم الخط کو دیوناگری کے قریب قریب لانے کی ممکنات کا پتہ چلانا چاہئے اور اگر یہ ممکنات بہم نہ پہونچ سکیں تو مختلف جنوبی زبانوں یعنی تامل۔ تلوگو۔ کناری اور ملیالم کے لئے ایک مخلوط رسم الخط کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔

(۸) لاطینی رسم الخط میں ہمیں خواہ کیسی ہی خوبیاں نظر آئیں کم از کم موجودہ دور میں اسے رائج کرنے کے امکانات پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ پس ہمارے لئے صرف دو رسوم الخط رہ جائیں گے۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی کا مخلوط رسم الخط اور اُردو سندھی کا رسم الخط اور اگر ضرورت ہو تو جنوبی زبانوں کا ایک مخلوط رسم الخط اِس صورت میں کہ وہ اوّل الذکر رسم الخط سے مطابقت نہ کر سکیں۔

(۹) ہندوستانی بولنے والے رقبوں میں ہندی اور اُردو کا جداگانہ رجحان اگر ترقی کی طرف مائل ہو تو خطرے کا باعث نہیں اور اِن دونوں کے نشوونما میں رُکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے یہ جداگانہ فروغ زیادہ دقیق تصورات کے زبان میں داخل ہونے کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ہندی اور اُردو کی علیحدہ علیحدہ ترقی بھی ہندوستانی کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

آگے چلکر جب عالمگیر تحریکوں اور قومیت ہند کا دباؤ اِس طرف آن پڑے گا تو ہر چیز اپنی نشست پر ٹھیک بیٹھ جائے گی۔ اور پھر جمہور کی عام

۱۷۱

تعلیم سے ایک معیار اور یکسانیت قائم ہو جائے گی۔

(۱۰) ہمیں زبان کے (اس میں اردو ہندی کی تخصیص نہیں سب زبانیں مراد ہیں) مقبول عام طرزِ بیان پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ مصنفین کو عوام کی تعلیم کے لئے عوام کی سادہ زبان میں لکھنا چاہئے اور اُن مضامین پر لکھنا چاہئے جن کی عوام کو ضرورت ہے۔ درباری اور مصنوعی طرزِ تحریر کی حوصلہ شکنی کرنا اور سادہ و پُر زور طرزِ تحریر کو فروغ دینا چاہئے۔ اس روش سے جہاں اور بہت سے فائدے ہوں گے وہاں اُردو ہندی میں بھی یکسانیت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

(۱۱) بنیادی انگریزی کی طرز پر ہندوستانی میں سے ایک بنیادی ہندوستانی پیدا کرنی چاہئے یہ ایک سادہ زبان ہوگی جس کی گرامر نہ ہونے کے برابر اور لغات ایک ہزار الفاظ سے زائد نہیں ہوگی۔ اسے معمولی بول چال اور لکھت پڑھت کے لئے ایک مکمل زبان بنانا ہوگا۔ اس کا گوشت پوست خالص ہندوستانی ہوگا۔ اور یہ زبان وسیع تر مطالعہ کے لئے پہلے زینے کا کام دے گی۔

(۱۲) بنیادی ہندوستانی کے علاوہ ہمیں متعدد اصطلاحی۔ علمی۔ سائنٹفک سیاسی اور تجارتی الفاظ مقرر کرنے ہوں گے جو اُردو ہندی اور اگر ممکن ہو تو ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی یکساں استعمال ہو سکیں گے۔ جہاں کہیں ممکن ہو ایسے الفاظ غیر ملکی زبانوں سے مستعار لے کر اپنی زبان میں پیوند کرلئے جائیں اور دیگر مناسب اور موزوں الفاظ اپنی زبانوں سے چن کر فہرستیں بنالی جائیں۔ تاکہ تمام اصطلاحی اور سائنٹفک معمولات میں ہم ایک نہایت صحیح اور یکساں ذخیرۂ الفاظ استعمال کرسکیں

(۱۳) حکومت کی تعلیمی پالیسی یہ ہونی چاہئے کہ تعلیم طالب علم کی زبان میں دی جائے۔ ہر لسانی رقبے میں پرائمری سے لیکر یونیورسٹی تک تعلیم کے لئے اس رقبے کی زبان مستعمل ہو۔ اگر کسی زبان کے رقبے میں ایسے طلبار کی ایک کافی تعداد موجود ہو جن کی مادری زبان حلقے کی زبان سے مختلف ہو تو ان کا حق ہوگا کہ پرائمری تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کریں بشرطیکہ وہ ایک مرکزی مقام پر جمع ہو سکیں۔ اگر ان کی تعداد کافی ہو تو یہ بھی ہو سکے کہ انھیں ثانوی تعلیم ان کی مادری زبان میں دیجائے۔ مگر ایسے تمام طلبار کے لئے اپنے حلقے کی قدرتی زبان بطور ایک لازمی مضمون کے لینی پڑے گی۔

۱۷

(۱۴) ہندوستانی نہ بولنے والے صوبوں میں بنیادی ہندوستانی ثانوی مدارس میں سکھائی جائے اور رسم الخط کا سوال طلبا پر چھوڑ دیا جائے۔

(۱۵) یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے ذریعۂ تعلیم رقبے کی زبان ہوگی اور ہندوستانی اپنے کسی رسم الخط کے ساتھ اور غیر ملکی زبان لازمی مضامین ہونگے یہ لازمی شرط اعلیٰ صنعتی نصابات کی صورت میں نافذ نہیں کی جائے گی۔ اگرچہ اس حلقے کے طالب علموں کے لئے بھی زبانوں کا سیکھنا مناسب ہوگا۔

(۱۶) ثانوی مدارس میں ہماری قدیم قومی زبانیں اور غیر ملکی زبانیں سکھانے کا انتظام کیا جائے گا۔ لیکن خاص نصابات یا یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لئے تیاری کی صورت کے علاوہ ان کی تعلیم لازمی نہیں ہوگی۔

(۱۷) ہندوستانی زبانوں میں غیر ملکی زبانوں کی قدیم کتابوں کے تراجم بڑے پیمانے پر کئے جانے چاہئیں تاکہ ہماری زبانیں ان ملک کی تمدنی۔ ادبی اور سوشیل تحریکوں سے لگاؤ پیدا کریں اور اس اتصال سے اپنے لئے طاقت و قوت حاصل کریں۔

ساغر نظامی

۲۰/۹/۴۷ء

دُنیا کی سیاسی فضا پر ایک طائرانہ نظر

از ساغرؔ نظامی

زمانہ ہر لمحہ میں انقلاب سے کسقدر دوچار ہو رہا ہے اور قدم قدم پر جدید فلسفوں، نظریوں اور نظام ہائے عمل کے ترک و اختیار کی جو قیامت برپا ہے اسکا اندازہ کرنے کے لئے دنیا کے نقشہ اور نقشہ کے ایک ایک خط پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے ـــ!

وہ ہندوستان جس کی افلاس زدہ گلیوں اور خاک اُڑتی ہوئی سڑکوں پر "ایک خاکی ٹوپ" کی ہلکی سی جھلک انسانوں کی بھیڑ کو پھاڑ دیتی تھی اور "پولیس مین" کی سرخ پگڑی دلوں کو لرزا دیتی تھی آج شہریار سرمست کی طرح مستِ خرام ہے، ایک بڑی حد تک اس کی خودی نے ان تمام ذلتوں کو ٹھکرا دیا ہے جو غلامی کی نشانیاں تھیں، کبھی سیاست کا لفظ دلوں کو دہلا دیتا تھا مگر آج بہانگِ دہل ہندوستانی قومیت اور کامل آزادی کے حق کو پیش کیا جا رہا ہے ـــــ!؟

یہ ہندوستانی "خودی" کا بلوغ ہے جسکا نشو و نما پیہم سیاسی جدوجہد اور عام سنساری تحریکات کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔

بہت دنوں تک مُلکی سیاسیات سرمایہ داروں اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کے افراد کا شغل رہے۔ لیکن اب سیاسی میدان آزاد دیوانوں کے ہاتھ ہے۔ عام معاشری زندگی میں نوابوں، رائے بہادروں، مہاجنوں، اور سرمایہ داروں کی سواریاں تختِ سلیماں کی طرح اُڑتی [illegible] ان ہی آنکھوں نے دیکھی تھیں، طاقت کی محدود طاقت سے انکار [illegible] مگر یہی آنکھیں یہ تماشا بھی دیکھ رہی ہیں کہ سماج کا شعور اور

انسانی دماغ کی بیداری آنکھ اُٹھا کر بھی کسی تختِ سلیماں کو نہیں دیکھتی، آج ہر نظر بجائے خود ملکۂ صبا بنی ہوئی ہے ـــــ

اور ابھی ردِّ عمل کا بچپن ہی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی جوانی کتنی قیامت خیز ہوگی، کیا انقلاب اور سماج کے شعور کی تیز رفتاری سے کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ قدرت ماضی کے گناہوں میں سے ایک گناہ کا بھی مواخذہ لئے بغیر قدیم سیہ کاروں کو زندہ چھوڑ دیگی۔!!

جدید گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے نیشنل کانگریس نے وزارتیں قبول کیں اور آج ہندوستان کے اہم صوبوں میں کانگریس یعنی نیشنل حکومت قائم ہو چکی ہے، چند ہی ماہ میں کانگریس نے عوام کے نقطۂ نگاہ سے صوبہ جاتی حکومتوں کا کاروبار کامیابی کے ساتھ چلا کر ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی قوم میں اپنے مُلک کے نظم و نسق کی کامل اہلیت پیدا ہو گئی ہے اور آج اگر حکومتِ برطانیہ از راہِ کرم ہندوستان پر سے اپنا غاصبانہ قبضہ ہٹالے تو وہ تمام ملک کا انتظام بذاتِ خود کر سکتی ہے ہمارے شاعر نے خوب کہا ہے

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

کانگریسی وزرا کا جزو و کل تمام تر قومی رنگ میں رنگا ہوا ہے اور اس وقت تک جو کچھ وہ کر سکے ہیں، حکومتِ ہند کی تاریخ اسکا جواب دینے سے قاصر ہے۔ اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے کُہنہ اور قدیم افراد عوام یا عوام کے مفاد سے ادنیٰ درجہ کا تعلق بھی نہیں رکھتے تھے جس طرح

حکومت ہندوستان پر محض حکومت کر رہی تھی، اسی طرح یہ رجعت پسند
اور حکومت کے دوست ہر اُس طریقۂ عمل کی تائید کرتے تھے جو خود
حکومت ہند کے مفاد کے مطابق ہوتا تھا۔ ان کی معراج تو صرف یہ
تھی کہ یہ حکومت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے نظر آئیں۔ ان کے قلوب
غریبوں، مزدوروں اور فلاکت و نکبت کے درد سے یکسر خالی تھے۔
اور یہ جانتے تھے کہ کوئی ایسا انقلاب جو عوام کو بیدار کر دے۔ خود
ان کے زوال کا دیباچہ ثابت ہوگا چنانچہ ان سب شہنشاہیت کے
پجاریوں اور استبداد کے بندوں نے کوئی کسر ہندوستان کو تباہ
و برباد کرنے میں باقی نہیں رکھی۔ ہندوستان کی رگ رگ سے خون
چوس لینے میں جتنی مدد یہ انگریزوں کو دے سکتے تھے اس میں کمال
استبداد اور فیاضی کا مظاہرہ کیا گیا۔

چنانچہ جدید گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو میں ہندوستان کے ملک فروش
عناصر کے تعاون کا نتیجہ سمجھتا ہوں، جس کے نفاذ کے بعد یہ تمام حکومت پرست
خیال کئے ہوئے تھے کہ (پراونشل اٹانومی) پر عمل ہوتے ہی ہم صوبہ جاتی
حکومتوں پر قابض ہو جائیں گے۔ اور ان کا یہ خیال ایک حد تک بجا
بھی تھا کہ کانگریس وزارتیں قبول نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن عوام
کے متفقہ مطالبہ اور نزاکتِ وقت نے کانگریس کو وزارتیں قبول کرنے
کے لئے مجبور کر دیا۔ قبولِ وزارت کے بعد جو انقلاب ہوا اس کے منظر سے
رجعت پسند اور ملک و قوم کے دشمنوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں
ایک قلندر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ ؎

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

تقریباً ساتوں صوبوں کی حکومتوں نے اسوقت تک عوام کے
مفاد اور ان کی مبادیات کا جسقدر خیال رکھ کر قدم اُٹھایا ہے وہ
قابلِ مبارکباد ہے، کسانوں کی حمایت اور ملک سے افلاس دُور
کرنے کے ممکن ذرائع کو عمل میں لانے کے امکانات پر جسقدر کام
ہو سکا ہے وہ بحالتِ موجودہ مطمئن کرنے والا ہے

لیکن جو رجعت پسند اور بے اصول لوگ کانگریس کے متعلق
یہ لغو اور غلط پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ اس نے کامل آزادی کی راہ
کو ترک کر دیا ہے اور ہندو آزادی نہیں چاہتے وہ حاسد ہیں اور
عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ ان کے لئے سیاسیات کے میدان میں کوئی
جگہ خالی نہیں ہے اسلئے ان کا شوقِ خود نمائی فساد انگیزی پر تیار کرتا ہے
اور وہ عوام کو صوبہ جاتی نیشنل حکومتوں کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

برادرانِ وطن سے ہم کو غرض نہیں لیکن جو نام نہاد مسلم لیڈر
یہ حرکت کر رہے ہیں، وہ اسلام، ہندوستان اور عوام کے شدید
دشمن ہیں، کانگریسی حکومتوں کا وقار، ہندوستانی قومیت کا وقار
ہے، کانگریس کا ڈسپلن کُل ہندوستان کا ڈسپلن ہے۔ اس ڈسپلن
کو جو باقی نہیں رکھے گا وہ مادرِ وطن کا ناخلف فرزند ہے۔

سات صوبوں میں کانگریس کا وزارتیں بنا لینا ہرگز یہ معنی نہیں
رکھتا کہ اس نے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" کو منظور کر لیا ہے،
کانگریس نے خود عوام کے متفقہ مطالبے پر اس نئے قانون کو محض اسلئے
منظور کیا ہے کہ جس حد تک اسکی رو سے عوام کی خدمت ہو سکے کیجائے
اور عوام کے قلوب میں جو خوف اجنبی حکومت کا قائم ہو گیا ہے۔
اسکو دور کر دیا جائے، یہ تمام حقائق روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں،
لیکن ترقی، آزادی، شرافت اور ملکی فلاح کے دشمن ایسے بے دماغ
اور سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ انقلاب کا اعتراف یا اعلان نہیں
کرتے۔ مگر وہ کب تک منکر رہیں گے ایک دن انقلاب خود ہی اپنی
زبان بن جائے گا۔

کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہ نئے آئین کو منظور نہیں کرتی اور فنا
کر دینا چاہتی ہے سورج کی طرح روشن ہے۔ سندھ۔ مدراس اور
بہار اسمبلی نے باقاعدہ نامنظوری کا ریزولیوشن پاس کیا ہے اور ایک
دستور ساز اسمبلی (کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی) کا مطالبہ بجائے خود جدید آئین
کے خلاف ایک اقدام ہے۔

موجودہ نیا آئین جو ہندوستانیوں کے سر تھوپا گیا ہے ہرگز ہندوستان

کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا' ہندوستان کے لئے قانون ایک ایسی اسمبلی بنا سکتی ہے جو جمیع ہندوستانی قوم کی نمائندگی کرے اس دستور ساز اسمبلی کے متعلق کانگریس کی طرف سے مرکزی اسمبلی میں بھی رزولیوشن پیش ہو گیا۔ اور جیسے جیسے فیڈریشن کے قیام کا زمانہ ہم سے قریب ہوتا جاتا ہے' کانگریس پوری طاقت سے حکومت کی مشینری میں شریک رہکر نئے آئین کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ جن سادہ دل حضرات کا یہ خیال ہے کہ حکومت کانگریس کو فیڈریشن میں بہ خوشامد شریک کرنے میں کامیاب ہو جائے گی' وہ شدید فریب میں مبتلا ہیں۔ گو کانگریس فیڈریشن کے بنیادی اصول کے خلاف نہیں لیکن وہ اسوقت تک فیڈریشن میں شرکت نہیں کرے گی جب تک کہ اسکی اکثریت نہو۔ اور اس کی اکثریت اسوقت تک ممکن نہیں ہے جسوقت تک کہ والیانِ ریاست کی نمائندگی کم نہ کی جائے۔

فیڈریشن میں کانگریس کی شرکت کا اسوقت تک بظاہر کوئی امکان معلوم نہیں ہوتا جب تک کہ اسکی پوزیشن کے مطابق کوئی صورت حال نہ پیدا ہو جائے۔

جدید دستور میں رجعت پسند اور سرمایہ دار طبقوں کو خاص اہمیت دی گئی ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان پر برطانوی سامراج ہمیشہ مسلط رہے۔ فیڈریشن میں رائے عامہ کو شکست دینے کے لئے راجہ مہاراجوں کو رکھا گیا ہے (اور فیڈرل اسمبلی کے علاوہ ایوانِ اعلیٰ (یعنی کونسل آف اسٹیٹ) میں سرمایہ داروں اور بڑے زمینداروں کو حق نمائندگی دیا گیا ہے۔

فیڈرل ایوانات (فیڈرل اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ) کا سانچہ ہی اس قانون کے واضع اور صناع نے اس کاریگری سے بنایا ہے کہ یہ ایوانات ہندوستان کی تمام رجعت پسند طاقتوں کا ایک حصن مضبوط بن کر رہ جائینگے۔ اس سے بدتر شانِ سرمایہ داری اور کیا ہو سکتی ہے کہ والیانِ ریاست کی فیڈریشن میں نمائندگی ہوگی اور غیر مشروط نمائندگی ہوگی یعنی یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ پہلے جمہوری نظام پر اپنی ریاستوں کا نظم و نسق مرتب کریں۔

بلکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں واضح کر دیا گیا ہے "کہ دیسی ریاستوں کے داخلہ کا کوئی اثر ان معاہدات پر نہیں پڑے گا جو شاہ برطانیہ اور ان کے مابین ہوئے ہیں اور نہ انکی داخلی فرماں روائی پر"

مختصر یہ ہے کہ موجودہ دستور وفاقی (فیڈرل آئین) برطانیہ کا کوئی انعام نہیں ہے' بلکہ اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ ایک قیدی کو حوالات میں بند رکھا جائے اور مطالبۂ رہائی پر حوالات سے تو نکال دیا جائے مگر پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر آزاد فضا میں چھوڑ دیا جائے۔ نام نہاد آئینِ جدید سے یہ خدشہ ہے کہ وطن پرستی کا جذبہ صوبجاتی عصبیت میں تبدیل نہ ہو جائے۔ !؟

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی

صوبجاتی خود مختاری کو کوئی اہمیت اسلئے نہیں دی جا سکتی کہ اسکی ساری خود مختاریت گورنروں کے ایک اشارۂ چشم پر ختم ہو سکتی ہے' گورنروں کے اختیاراتِ خصوصی نے صوبجاتی خود مختاری کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رکھی اور مرکز میں فیڈریشن اسلئے غلط و لغو ہے کہ یہ طرز آئین تو مساوی طاقتوں میں نافذ ہو سکتا ہے مگر یہاں ایک طرف برطانوی ہند کی جمہوری قوت سے اور دوسری طرف مطلق العنان والیان ریاست کی طاقتیں ایسی دو متضاد دو مختلف طاقتوں کو ملا کر فیڈریشن قائم نہیں کیا جا سکتا۔

ان تمام آئینی گتھیوں کا حل صرف یہی ہو سکتا ہے کہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کا مطالبہ کیا جائے۔ مسٹر ستیہ مورتی نے جو دلیل کانگریس کے اس مطالبہ کے اہم ہونے کے متعلق دی ہے وہ مضبوط ترین دلیل ہے:۔

" یہ مطالبہ اُس جماعت (کانگریس) کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے جو اب غیر ذمہ دار ایجیٹیٹروں کی جماعت کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ہندوستان کے ۷ صوبوں میں حکومت کا نظم و نسق چلا رہی ہے"

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے متعلق یہ کہنا کہ آئین کا فیصلہ بلا شرکت غیرے پارلیمنٹ کا کام ہے اس لئے فضول ہے کہ اس سے پہلے کئی برطانوی نوآبادیوں مثلاً آئرلینڈ اور افریقہ میں ایسا ہی عمل میں لایا جا چکا ہے۔

حکومت کا کام اس مطالبہ کی منظوری، دستور ساز اسمبلی کا کام قانون سازی، پارلیمنٹ کا کام اُس پر اپنی مہر ثبت کرنا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نمائندہ اسمبلی انقلاب یا کم از کم نیم انقلاب کی حالت میں طلب کی جا سکتی ہے۔ یعنی جب قوت و اختیار عوام کے ہاتھوں میں ہو اس وقت کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کا مطالبہ حق بجانب ہوتا ہے۔ فضا شناس نہیں ہیں۔

ایسے لوگوں کو مسٹر ستیہ مورتی نے جو مرکزی اسمبلی میں تجویز کے مجوز تھے بہت اچھا جواب دیا ہے۔

"لیکن دُنیا کی تاریخ کا آخری ورق ابھی لکھا نہیں گیا۔ جب تک مہاتما گاندھی موجود ہیں کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی طلب کی جائے گی اور پُر امن ذرائع سے اس مُلک کے باشندے اختیارات حاصل کرینگے"

کوئی شک نہیں، فیڈریشن آزادی اور جمہوریت کی آزاد روح کے خلاف سامراج اور شہنشاہیت پرستوں کی خوفناک سازش ہے اس سازش کو سمجھتے ہوئے جو ہندوستانی فیڈریشن کو کامیاب بنانے میں مدد دے وہ یا تو مقدس وطن کا دشمن ہے، یا قدرت نے اس کو عقل و ادراک سے عاری کر دیا ہے۔ میری رائے میں کبھی اور کسی شخص کو بھی اس معقول ترین مطالبہ کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے۔

ہندوستان سے باہر دُنیا میں جو انقلابات ہو رہے ہیں اُن سے بھی ہندوستان کا متأثر ہونا لازمی ہے، سنساری سیاسیات میں آمریت جس طرح نشو و نما پا رہی ہے۔ اور اس کے نشو و نما میں جسقدر انسانی خون جسقدر انسانی استخواں اور جسقدر گوشت و پوست صرف ہو رہا ہے وہ یورپ کی بڑھتی ہوئی خود غرضی، اور آمریت کا روپ بھر کر شہنشاہیت کے جذبۂ خواہش کی تکمیل کی روشن دلیل ہے۔ یہ صورتِ حال خود شہنشاہیت کے زوال کے اسباب پیدا کریگی، جمہوریت کی شکست پورے انسانی سماج کی شکست ہے جسے کبھی انسان برداشت نہیں کر سکے گا۔ آمریت کی طرف یورپ کا یہ شدید رجحان، آگ کے طوفان سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ یورپ کی ہر قوم خود اپنے ہی آتشکدے میں بھسم ہو جائے۔

ادھر پچھلے سال روس نے اپنے نظامِ دستوری میں جو انقلاب کیا وہ روحِ جمہوریت کا آخری ممکن خاکہ ہے، گو اس کے جزئیات پر مفصل تبصرہ ممکن نہیں۔ لیکن یہ اندازہ بآسانی ہو جاتا ہے کہ روس نمائندہ حکومت کے بنیادی اصولوں کو سمجھ گیا ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء اور سنہ ۲۳-۱۹۲۴ء کے دستورِ اساسی کے مقابلہ میں نئے دستورِ اساسی میں ایک بنیادی تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں۔ روس میں ایک طبقے کی حکومت ایک قوم کی حکومت کا لباس بدل رہی ہے۔ یہ انقلاب یقیناً بالکل نیا اور حیرتناک انقلاب ہے کہ مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ کی جگہ محنت کرنیوالے عوام کی حکومت کا اعلان کر دیا گیا۔ روس کے اس نئے دستورِ اساسی میں ایک اہم اعلان افراد کی آزادی کا اعلان ہے، اس دستور کی رو سے سوویٹ روس اس منزل کی طرف قدم اُٹھائے گا جہاں غیر طبقاتی سماج رائج ہو گئی۔ مزدوروں اور کسانوں کے مساوی حقوق ہوں گے۔ فرد کے حقوق کو تسلیم کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ آمرانہ انقلاب کے بجائے احراری انقلاب کا ڈنکا بجے گا۔

روس کا یہ دستورِ جدید ہٹلر اور مسولینی کی ریڑھ کی ہڈی پر ایک ضربِ کاری ہے اس دستور نے شہنشاہیت پرستوں، اور انسانی جمہوریت کے دشمنوں کے ارادوں پر انسانی ذہن و دماغ کو ایک ایسے فکر کا موقع دیا ہے اسکا نتیجہ آمریت کے خلاف شدید بغاوت کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

روس نے اپنے سیاسی و معاشی فلسفۂ زندگی کو یوں واضح کر کے جرمنی اور اٹلی کے رستے ہوئے ناسور کو نمایاں کر کے دکھا دیا ہے، جس انسانی آزادی کے حقوق سے جرمنی اور اٹلی کے عوام محروم کر دئے گئے ہیں۔ روس میں اس انسانی آزادی کی دولت کو آزادانہ لُٹا دیا گیا ہے۔

ہٹلر اور مسولینی انسانی ذہن و دماغ کے اس رجحان کا مقابلہ بارود

اور فولاد سے کرنا چاہتے ہیں۔ اسپین میں وہ جمہوریت کے باغیوں کو امداد دیکر انسانیت کو پسپا کر دینا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حالات انہیں کی موافقت کریں مگر دُنیا ان کے بنائے ہوئے نقشہ کو سمجھ گئی ہے اور یہ حقیقت اب تصدیق کے درجہ سے بھی آگے بڑھ چکی ہے کہ اسپین کی بغاوت دستور پسندی اور جمہوری حکومت کو تباہ کرنے کے لئے ایک فاسسٹ سازش ہے۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہسپانوی خانہ جنگی محض فسطائیت اور اشتراکیت کی لڑائی نہیں ہے بلکہ یہ آزادی اور استبداد کی جنگ ہے۔ ہر ہٹلر ہزار کہیں کہ فرانکو اسپین کا باغی نہیں ہے، مگر دُنیا اُسے نہ صرف اسپین بلکہ امنِ عالم کا باغی یقین کرتی ہے، اگر دُنیا کو پھر کسی جنگ عظیم کا مقابلہ کرنا پڑا تو اسکا مرکزِ آغاز صرف یوروپ ہوگا۔

اسپین کے علاوہ چین اور جاپان کی جنگ دُنیا کے خرمن امن میں کوئی معمولی چنگاری نہیں، جاپان کا اپنا مفاد خواہ اس جنگ میں کچھ ہی ہو لیکن چین کی آزادی خطرہ میں ہے۔ اس ترقی یافتہ زمانے میں کسی قوم کا کسی دوسری قوم کی آزادی پر حملہ کرنا عصر حاضر کے تمام تمدنی اخلاقی اور ذہنی و دماغی ارتقا پر حملہ کرنا ہے۔

مسئلہ فلسطین جس کی اہمیت دُنیا کے تمام مسلمانوں کے نزدیک اتنی ہی ہے جتنی حجاز اور مسئلہ خلافت کی تھی، الگ ایک عالمگیر بےچینی کا سبب بنا ہوا ہے، پیل کمیشن کی رپورٹ شائع ہوتے ہی ہندوستان نے تقسیم فلسطین کے خلاف شدید احتجاج شروع کر دیا تھا اور اب اسپر عمل درآمد ہونے کے بعد سے تو ہندوستان میں نہایت پُرزور احتجاج شروع ہوا ہے۔ اگر حکومت برطانیہ نے اپنے فیصلہ کو مسترد نہ کیا تو مسلمان برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ، شاہی دربار کا مقاطعہ، اور سابقہ و آئندہ جنگی قرضوں کی ادائیگی سے انکار کر دینگے، مجلس عمل نے پروگرام مرتب کر لیا ہے اور عنقریب ہی ایک عام فلسطین کانفرنس کے انعقاد کے بعد اس پر عمل درآمد کی پالیسی پر عمل کیا جائے گا۔ یہاں موقع نہیں ہے کہ فلسطین کے تمام متعلقات پر بحث کی جائے لیکن اتنا ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ تقسیم فلسطین کے ذریعہ عربوں کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے جو بہترین حصّہ ملک تھا وہ یہودیوں کو دیدیا گیا ہے اور جو بدترین حصّہ تھا وہ مسلمانوں کو عطا فرمایا گیا ہے۔ اور درمیانی حصّہ جس میں بیت المقدس واقع ہے وہ برطانیہ نے خود اپنی حکمرداری میں رکھا ہے۔

غازی اتاترک نے تقسیم فلسطین کے متعلق ٹرکی پارلیمنٹ میں زبردست تقریر کی اور حکومت برطانیہ کو بتا دیا کہ ترک تقسیم فلسطین کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ترکی کے علاوہ بھی تمام عالم اسلامی میں اسوقت تقسیم فلسطین کے متعلق شدید اظہار ناراضگی ہے۔

اس تمام عالمگیر اضطراب کی موجودگی میں جمعیۃ الاقوام جس طرح چُپ ہے وہ موجودہ صدی کا عجیب وغریب راز ہے۔ اس راز میں اضافہ کرنے والی یہ نئی مصدقہ اطلاع ہے کہ سر آغاخاں کو لیگ اسمبلی کی صدارت تفویض کی گئی ہے جو دُنیا میں سامراج کے دست و بازو ہیں۔ آپ نے لیگ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہندوستان کے فلسفۂ امن پر روشنی ڈالی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ لیگ کا بھی یہی مقصد ہے۔

لیگ اسمبلی اور سر آغاخاں کی صدارت، کوئی بے معنی بات نہیں ہے۔ غازی اتاترک کی تحریک اتحاد ایشیا کا تصور ایک حد تک معرض تشکیل میں آچکا ہے اور میثاق ملی مرتب کیا جا چکا ہے۔ ایشیا کی اکثر سلطنتوں کے علاوہ اس میں عراق بھی شریک ہو گیا ہے۔ سر آغاخاں کا مذہبی اثر اگر تبت کی سرحدوں پر ہے تو عراق بھی اُس سے خالی نہیں۔ ایسے عالم میں جب فلسطین کا مسئلہ تمام عالم اسلامی میں شدید ہیجان واضطراب کا باعث بنا ہوا ہے۔ ایک مسلمان کو لیگ اسمبلی کا صدر بنانا سارے عالم اسلامی کے لئے متأثر کُن ہو سکتا ہے، لیکن یہ اعزاز مسلمانوں کے لئے ــــــ کانٹوں کا تاج ہے۔ جمعیۃ الاقوام نے اسوقت تک امنِ عالم ــــ کے لئے کیا کیا ہے جو وہ آغاخاں کی صدارت میں تیر ماریگی، اگر بین الاقوامی مسائل پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ ہوگئے، اور مسائل حاضرہ کا کوئی حل تلاش نہیں کیا گیا (جسکا یقین ہے) تو دُنیا کی نگاہوں میں مسلمانوں کی پوزیشن نہایت نازک ہو جائیگی

سر آغاخاں کو ہرگز حکومت برطانیہ کی ملوکیت پرستانہ اغراض کا آلۂ کار بنکر "دُز دانِ کفن" کی انجمن میں ہندوستان کے فلسفۂ امن کی علمبرداری کو رسوا کرنے کا حق نہیں۔ ہندوستان نے تو اپنے فلسفۂ امن پر عمل پیرا ہو کر اور اُس فلسفہ کو دُنیا میں پھیلا کر دکھا دیا۔ مگر لیگ اسوقت تک اپنے مقصد میں ناکام ہے، بلکہ سامراجی اور فیسسٹ طاقتوں کی نمائندگی کر کے اُس نے مجبور اور غریب قوموں پر دنیا تنگ کر دی۔

آج لیگ کہاں ہے جب جاپان نے غریب چینیوں پر زندگی تنگ کر دی ہے اور جنگ کا باقاعدہ اعلان کئے بغیر ہی چین پر چڑھ گیا ہے۔

کیا لیگ اُس بہری اور اندھی بڑھیا کی طرح نہیں ہے جو راستے سے گذرنے والے شور و غل کا اندازہ نہیں کرسکتی ! ؟ اگر ایسا ہے تو اس کے وجود سے اسکا عدم بہتر ہے۔ ہندوستان کے وہ مسلمان جو کچھ بھی سیاسی شعور رکھتے ہیں، سر آغاخاں کی صدارتِ لیگ اسمبلی کو مسرت اور پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

اسوقت تک خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن پنڈت جواہرلال کی تازہ تقریر نے اس امکان کو اصولی طور پر ناممکن ثابت کر دیا ہے۔

"مسلم لیگ جس کا وجود صرف چند صوبوں میں ہی نظر آتا ہے۔ اونچے درجہ کے گنے چنے مسلمانوں تک ہی محدود ہے اسکی پالیسی اور اسکا پروگرام کانگریس سے مختلف ہے ایسی حالت میں ان دونوں کے درمیان کیونکر اتحاد ہوسکتا ہے جب تک کہ کانگریس اپنے اصول کو ترک کر دے۔"

کوئی شک نہیں کہ محمد علی جناح کی ذات اسوقت "مسلم لیگ" ہے اگر وہ اور چند برطانیہ پرست علیحدہ ہو جائیں تو مسلم لیگ ختم ہے۔ ایسی جناب آسا جماعت کی شرکت ہرگز مسلمانوں کے حال و مستقبل کے لئے مفید نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں کے لئے واحد راستہ ایک ہی ہے کہ وہ ادائے فرض کی بنیاد پر قطعی غیر مشروط طور پر کانگریس میں شرکت کریں۔ ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ اور کانگریس کے علاوہ تیسری پارٹی نہیں ہے، اور ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔

جو لوگ سودا کرنا چاہتے اور "تحفظ حقوق" کی راگنی چھیڑے ہوئے ہیں وہ اسلام اور مسلمان دونوں کی روایات کی توہین کرتے ہیں، مسلمانوں کو بزدلی و بے اعتمادی کا زہر پلاتے ہیں، اور قوم کو فرقہ پرستی کی تعلیم دیکر ہندوستان میں برطانوی سامراج کی بنیادوں کو مضبوط کرتے ہیں۔

مسلمان کے لئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن یقین کریں اسکے مفاد کو اپنی ذات کا مفاد سمجھیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ جو بیٹا ماں سے محبت کرے، ماں اسکو اپنی گود سے پھینک دے۔

کانگریس اور مسلم لیگ کی رسہ کشی برابر جاری ہے۔ لیکن عقلمند حلقے اس رسہ کشی کو مسلم لیگ کی حماقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ حقیقت کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے کہ کانگریس ملک کی سب سے عظیم اور واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہے جس کے دروازے ہر قوم کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ کانگریس کے سیاسی اقتدار کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے "ہندو مہاسبھا" جیسی کٹر اور فرقہ پرست جماعت کو میدان سے نکال باہر کیا۔ پھر اس کے مقابلے میں کوئی فرقہ پرست جماعت کیونکر کامیاب ہوسکتی ہے ! ؟

"بندے ماترم"

کچھ دنوں سے ہندوستان کے قومی گیت "بندے ماترم" کا مسئلہ بعض سیاسی حلقوں میں ایک موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اینگلو انڈین اخبارات نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ گیت بابو بنکم چندر چٹرجی نے اپنی کتاب "آنند مٹھ" میں مسلم حکومت کے خلاف تصنیف کیا تھا۔ اور یہ ایک ہندو گیت ہے جسے مسلمانوں کو تسلیم نہ کرنا چاہئے۔

اس تشریح کی نوعیت ہی یہ بتا رہی ہے کہ اینگلو انڈین اخبارات کی نیت نیک نہیں اور وہ نہایت شاعرانہ مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں۔

ہندو اخبارات اس گیت کی مخالفت کو "ہندوستانی قومیت" کی مخالفت سے تعبیر کر رہے ہیں اور خود صدرِ کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو نے اسکے متعلق ایک بیان دیا ہے جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

اگرچہ اس گیت کو کانگریس کی رسمی منظوری حاصل نہیں ہے۔
لیکن چونکہ بہت دنوں سے "بندے ماترم" جدوجہد آزادی
اور برٹش امپیریلزم کے خلاف ایجی ٹیشن کا ایک جزو بن گیا
ہے اسلئے دوسرے گیتوں کے ساتھ یہ عام جلسوں میں گایا جاتا
ہے۔ اس میں کوئی لفظ مذہب کے لئے قابلِ اعتراض نہیں ہے۔
ممکن ہے کوئی "الہامی گانا" آئندہ اس سے بہتر ہو جائے،
مگر سرِدست اسکو ترک کرنے کا کوئی سبب نہیں ہے۔

یہ مسئلہ سیاسیات سے زیادہ ادبیات اور زبان سے تعلق رکھتا ہے اسلئے ملک کے ادبی و شاعر حلقے اسکا حل پیش کر سکتے ہیں۔ نہ کہ اینگلو انڈین یا دیسی اخبارات کیونکہ وہ "ہندوستان کے "قومی گیت" کے کلچرل، قومی اور لسانی عناصر و اجزا سے قدرتی و جینیاتی طور پر نابلدِ محض ہیں۔

آیئے پہلے یہ گیت سُنئے:۔

"ماں تجھے ہم نمسکار کرتے ہیں۔"
"تیرے پانی کی ندیاں خوبصورت ہیں۔"
"تیرے پھل میٹھے ہیں۔"
"تو جنوب کی طرف سے آنیوالی ٹھنڈی ہواؤں سے شیتل رہتی ہے۔"
"تو ہرے بھرے کھیتوں سے بھرپور ہے۔" "تیری چاندنی سفید اور حسین ہے"
"تیری راتیں کھلی ہوئی ہیں" "پھولوں سے لدے ہوئے اشجار تیری شوبھا کو بڑھا رہے ہیں"
"تیری مسکراہٹ میں مٹھاس ہے" "تیری آواز میں مادھری ہے"
"تو سکھ دیتی ہے۔" "تو ہماری رکھشا کرتی ہے"
"ہم تیس کروڑ آوازوں کو ایک آواز بنا کر تیری فتح کے گونجتے ہوئے نعرے بلند کرینگے"
"ہم ساٹھ کروڑ بازوؤں میں تلواریں لیکر تیری حفاظت کرینگے۔"
"تجھے کمزور کون کہتا ہے ماں" "تو عظیم طاقت کی مالک ہے"
"تو دشمنوں کی چھاؤنیوں کو مٹانے والی ہے"
"تو رکھشا کرنے والی ہے" "ہم تجھے نمسکار کرتے ہیں"

گیت کے ترجمہ سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ کوئی لفظ ہندوستان کی کسی قوم کیلئے مخصوص نہیں ہے۔ تمام گیت میں خالص جذبۂ حبّ وطن کی روح کارفرما ہے۔ اسلئے اس گیت کو اینگلو انڈین اخبارات یا بعض مسلمانوں کا یہ کہنا کہ یہ فرقہ پرستی کا آئینہ دار ہے، جہل و ناواقفیت پر مبنی ہے، لیکن اس سے زیادہ اہم اعتراض یہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بنگالی زبان کا گیت تمام ہندوستانی قوم کا گیت کیونکر ہو سکتا ہے، قومی گیت کے گانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ عوام میں مقدس وطن کیلئے جاں نثاری، وفاداری اور محبت کا جذبہ پیدا کرے، لیکن جو قومی گیت پورے شمالی ہندوستان، پنجاب، سندھ، مدراس، سرحد اور اکثر ہندوستانی قوموں میں سمجھا نہ جاسکے اسکو کیونکر کامیاب و کارفرما تسلیم کیا جاسکتا ہے

یہ بنگالی زبان کا گیت جس میں سنسکرت کے الفاظ بھی ہیں اسلئے ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسمیں چند سنسکرت کے لفظ ہیں۔ بلکہ اسپر اعتراض کی گنجائش اسلئے ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا۔ یہ کہنا ظلم ہوگا کہ یہ شاعر کا نقص ہے، لوگ جانتے ہیں کہ تحریک تقسیم بنگالہ کے موقع پر اسکو استعمال کیا گیا مابعد نیشنل کانگریس میں گایا جانے لگا، اسکی وجہ غالباً اسکی مقبولیت میں پوشیدہ تھی یا اس حقیقت میں کہ بنگالیوں نے اوّل اوّل کانگریس سے اپنی نمایاں وابستگی کا ثبوت دیا۔

لیکن اب ہم سیاسی شعور کی اس منزل پر آگئے ہیں کہ ہمکو ہندوستانی قومیت کی بنیادیں ایک ماہر معمار کی طرح رکھنی ہیں، اور اپنی سیاسی جدوجہد کے ڈھانچے کو پہلے سے زیادہ مکمل اور آئیڈیل بنانا ہے، کانگریس کی شاندار سیاسی کامیابی اور نمائندہ حیثیت کا تقاضہ ہے کہ ملکی مسائل سے تعلق رکھنے والی معمولی سی معمولی باتوں کا بھی خیال رکھا جائے، اور ہندوستانی قومی گیت کا مسئلہ تو کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے، اسکو متحدہ قومیت متحدہ زبان، اور متحدہ جذبۂ حب الوطنی کا نمائندہ ہونا چاہئے، اور بنیادی ہندوستانی میں لکھا جانا چاہئے۔

پہلے تو بنیادی طور پر یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہمیں ایک زبان تمام ملک کیلئے "بنیادی ہندوستانی" کے نام سے بنانی ہے اس زبان کو وضع کرنیکے بعد مروّجہ قومی گیت کی تبدیلی کے متعلق فیصلہ کرنا چاہئے اور اس فیصلے کے بعد قومی گیت کا نظم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ کانگریس اور وطن سے محبت رکھنے والے شعرا کا فرض ہے کہ وہ باہمی تعاون کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کریں، تجرباتی طور پر مختلف قومی گیت نظم کئے جائیں لیکن انکے لئے زبان بنیادی ہندوستانی ہی ہونی چاہئے تاکہ یہ سوال ہی پیدا نہ ہو کہ اسمیں ہیں سنسکرت یا فارسی کے الفاظ ہیں یا اسکا شاعر ہندو ہے یا مسلمان، اخبارات میں میں نے اس اپیل کو بغور پڑھا ہے جس میں مجھے "قومی گیت" کہنے کی دعوت دی گئی ہے کہ میں مادرِ وطن کے گیت گاؤں اور جاوداں ہو جاؤں! ؟ میں سوچ رہا ہوں کہ اس فرض سے سبکدوش ہو کر سعادت دارین حاصل کروں۔

"غالب" اور "تاریخ زبانِ ادبِ اردو"

اردو میں دو اہم کتابوں کی تصنیف و تالیف

اردو زبان کے معاصر شعرا اور ادیبوں سے تعاون و امداد کی نیازمندانہ اپیل

جناب محمود بریلوی سے ادبی دنیا اچھی طرح واقف ہے آپ اردو زبان کے مشہور ادیب ہیں اور ایک زمانے سے اردو علم ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ چند سال سے آپ "تاریخ زبانِ ادبِ اردو" کو مدوّن کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی "غالب" کے متعلق ایک کتاب تصنیف فرما رہے ہیں۔ اول الذکر کتاب کی تدوین بغیر شعرا اور ادبا کی امداد کے ناممکن ہے۔ اس سے پہلے آپ بارہا تحریک فرما چکے ہیں مگر مشرقی ذہنیت اور اسکے تقاضات نے کبھی اپنے مقاصد میں حسب دلخواہ کامیاب نہیں ہونے دیا۔ شعرائے کرام اور ادبائے جلیل نزاکت و بلندی کے خلاف خیال کرتے ہیں کہ اپنے حالات اور تصنیفات سے ایسے لوگوں کی مدد کریں، حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ کوئی نزاکت اور بلندی نہیں کہ تاریخ زبانِ ادب کیلئے شعرا اور ادیب اپنے حالات ارسال نہ فرمائیں؛

١٨٠ زبانِ اردو کی ترقی اور اس کو ملک کی ملی جلی کامیاب زبان بنانے کی سب سے پہلی قومی ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب تصوّراتی ہونیکے بجائے عملی انسان بنیں اور اپنے عمل سے اپنی زندگی اور جہدی ہونے کا ثبوت دیں۔ اس بنیادی نقطے کو پیش نظر رکھ کر میں اپنے ملک کے تمام ہندو مسلم شعرا اور ادبا سے نیازمندانہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلے کی طرف توجہ فرمائیں اور مندرجہ ذیل پتہ پر اپنے حالات اور تصانیف ارسال فرما کر محمود صاحب کی امداد فرمائیں۔

صنفِ نازک کے طبقے سے بھی میری گذارش ہے کہ وہ بھی اپنے حالات اور نمونۂ کلام بھیجکر محمود صاحب کو تاریخ ادب مدوّن کرنے میں مدد دیں۔ خصوصًا ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے اپنے دوستوں سے میری پُرزور گذارش ہے کہ وہ فوری توجہ فرما کر محمود صاحب اور مجھے ممنون و شکرگذار ہونے کا موقع دیں۔

مسٹر محمود بریلوی
سکریٹری ہز ہائینس نواب صاحب مانگرول گلزار سخن ریاست مانگرول (کاٹھیاواڑ)

خاکسار ساغر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم و ترقی صوبہ بہار کی اپیل

رسالہ ایشیا میرٹھ کی قدر افزائی کیلئے

رسالہ "**ایشیا**" میرٹھ سے ہندوستانی زبان کے مشہور ادیب [illegible] نظامی
کی ادارت میں ایک عرصہ سے شائع ہو رہا ہے۔ اب تک جتنے نمبر میری نظر سے گزرے ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ
[illegible] معیار بلند رکھنے اور بلند تر کرتے رہنے کی مخلصانہ کوشش رہتی ہے [illegible]
کم ہیں یعنی اچھے اور معیاری رسالوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ **ایشیا** [illegible]
مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ ملک نے اب تک "**ایشیا**" کی کما حقہ ہمت افزائی نہیں کی ہے۔ ہندوستانی زبان
کی ترقی کے سلسلے میں اچھے رسالوں کی قدر افزائی بے حد ضروری ہے۔ میں ہندوستانی زبان کے ہمدردوں سے اپیل
کرتا ہوں کہ وہ **ایشیا** کی سرپرستی فرمائیں اور اس طرح ان لوگوں کا ہاتھ بٹائیں جنھوں نے اپنی زندگیاں زبان و ادب
کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا ادب اور ہماری زبان اب تک ترقی کی دوڑ میں دوسری
زبانوں سے پیچھے ہے، لیکن یہ ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ بہت جلد اسے ان تمام سے آگے نکل جانا ہے، زمانہ غافلوں کو بہت کم
مہلت دیتا ہے۔

سید محمود

۱۸ر جولائی ۱۹۳۷ء

کا دلچسپ دیباچہ ہے۔ اس کے بعد رباعیاں ہیں ہر رباعی بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے۔ جسمیں حقائق و معارف اور طنزیات کے دریا بھرے ہوئے ہیں اور واقعی رباعیات کا یہ مجموعہ اس قدر دلچسپ ہے کہ ہر صاحب ذوق کو اسے دیکھنا چاہیئے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

فرانسیسی افسانے

فرانسیسی ادب کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو اس مختصر سی کتاب کو ضرور دیکھئے قیمت صرف ۴

شیطان کی خالہ

یہ بھی ایک بے حد دلچسپ ناول ہے ضرور دیکھئے قیمت ۱۲

بیروزگاری کا علاج

آجکل سب سے زیادہ عظیم مسئلہ روزگار کا ہے۔ ہر شخص تلاش معاش میں سرگرداں نظر آتا ہے اس کتاب کے ۲۸ صفحات ضرور ایک پریشانِ معاش کو شاہراہ معاش دکھا سکتے ہیں اگر اس میں جرأتِ مردانہ و قوتِ ارادی کی روح موجود ہے۔ قیمت صرف آٹھ آنے ۸

تاریخ مغربی یورپ

ڈاکٹر رابن سن کی کتاب History of Western Europe کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ نہایت سبق آموز۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یورپ کے سیاسی اور معاشرتی معاملات سمجھ میں آجاتے ہیں۔ قیمت ۶/ علاوہ محصول

خیالات اورنگ

امریکہ کے مشہور مصنف واشنگٹن ارونگ کے چند مضامین کا ترجمہ ادب کے فداکاروں اور انشاپردازوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ فن کتاب نویسی، لٹریچر میں انقلاب اور ایک شادی کا دلفریب انجام، یہ مضامین دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیمت صرف ۸ آنے

تاریخ ادب اردو

ہسٹری آف اردو لٹریچر، مصنفہ رام بابو سکسینہ کا اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے لکھنوی نے کیا ہے۔ سنہری اور مضبوط جلد تقریباً سب ہی اہل تذکرہ کے فوٹو۔ اچھی کتاب ہے قیمت صرف للعہ

محاسن کلام غالب

مرزا غالب کی شاعری پر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا قابل قدر اور معرکۃ الآرا تبصرہ۔ قیمت عہ

مقدمہ شعر و شاعری

خواجہ حالی مرحوم کی مشہور و معروف تصنیف اردو شاعری پر مفصل و مبسوط تنقید۔ تمام اصناف سخن کی مثالیں اور جدید راہوں پر روشنی

قیمت باختلاف طباعت عہ عہ ۸/

ایشیائی شاعری

ایشیا کے مختلف زبانوں کی شاعری خاص کر اردو شاعری پر مفید معلومات کا ذخیرہ از مولانا اشہدی۔ قیمت عہ

تذکرہ شعراء اردو

مشہور استاد سخن حضرت میر حسن مصنف مثنوی "سحر البیان" کا مرتبہ تذکرہ مع مقدمہ نواب صدر الصدور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔ قیمت مجلد عہ

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر

فارسی زبان کے جو اثرات مرہٹی قواعد، اسالیب بیان وغیرہ پر پڑے ...... مولوی صاحب نے لکھے ہیں۔

قیمت صرف ۸

آب حیات

اردو شاعری کا دلچسپ افسانہ اور اساتذہ اردو کا دلکش تذکرہ از مولانا محمد حسین آزاد مرحوم

قیمت سے

شعر الہند

قدمائے دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات، تمام اصناف شاعری، یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقیدی نظر۔ شعراء کا تذکرہ و نمونۂ کلام ہر دو حصص معہ

شعر العجم

علامہ شبلی مرحوم کی شہرہ آفاق اور معرکۃ الآراء تصنیف فارسی شاعری کی مکمل تاریخ عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی خصوصیات و اسلوب پر تبصرہ، تمام مشہور و معروف اساتذہ سخن کے تذکرے اور نمونۂ کلام۔ قیمت حصہ اول ۶/ دوم ۸/ سوم ۶/ چہارم ۸/ پنجم ۶/۔ مکمل سیٹ کی قیمت ۲/۵

داستان عجم

یہ کتاب اصل میں ایران کے مشہور قومی شاعر فردوسی کی شہرہ آفاق کتاب شاہنامہ کی تاریخ ہے، فاضل مصنف نے شاہنامے کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اس کتاب کا فارسی اور دوسری زبانوں کے لٹریچر پر کیا اثر پڑا۔ کتاب کی قدر وقیمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ نواب خیال مرحوم کی لکھی ہوئی ہے۔ قیمت عہ

سخنوران ایران

ایران کی مردم خیز زمین کو شاعری اور ادب میں خاص امتیاز حاصل ہے گو پہلے وہاں کی شاعری صرف قصیدہ و غزل تک محدود تھی، اور اب جب سے وہاں کی سیاسیات میں انقلاب ہوا ہے۔ شاعری کے زمین و آسمان بھی بدل گئے۔ نثر نگاروں نے بھی اپنا طرز بدلا اور صاف اور سادہ اسلوب کو ترجیح دی۔ اس میں عصر کے ایرانی شعراء کے حالات ہیں اور ان کے کلام کا نمونہ اور ہر شاعر کا فوٹو بھی ہے۔ زبان آج کل ہی کی فارسی ہے کتاب ٹائپ میں خاص اہتمام سے اعلیٰ پیمانہ پر چھپی ہے۔ قیمت ۱۸

نگارستان فارس

رودکی سے نورالعین واقف بٹالوی تک مشاہیر فارسی شعراء کا تذکرہ اور ان کا منتخب کلام۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ از مولانا آزاد مرحوم قیمت ے

محمود اور فردوسی

سلطان محمود غزنوی پر جو اعتراضات عموماً کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سلطان نے فردوسی شاعر کے ساتھ وعدہ خلافی کی۔ جناب قاضی عبدالصمد صاحب نے اس کی تردید میں لکھی ہے اور معقول عقلی و نقلی دلائل سے اسے پا در ہوا ثابت کیا ہے، اپنے تاریخ تحقیق کی اشاعت سے پہلے فاضل مولف نے بعض ملک کے مستند ماہرین کو دکھا لیا ہے۔ قیمت ۸

نکات غالب

مرزا غالب مرحوم کی آپ بیتی بہت سے ادبی رموز و نکات زبان خود نہی کے قلم جوہر رقم سے قیمت عہ

اقبال

ڈاکٹر سر اقبال کی شاعری پر مبسوط تبصرہ اور سوانح از احمد دین صاحب۔ قیمت ۴

اردو سے ہندوؤں کا تعلق

مولانا شرر مرحوم کا ایک جامع و مفید رسالہ قیمت صرف ۴

اکبر الہ آبادی

نامور ظریف و اصلاحی شاعر اکبر الہ آبادی کی شاعری اور ان کی زندگی پر مکمل تبصرہ و سوانح اور کلام کا انتخاب نہایت وقیع کتاب۔ بڑا سائز۔ تقریباً پانچسو صفحے۔ طباعت وغیرہ عمدہ مجلد مضبوط۔ قیمت صرف صہ

ٹیگور اور انکی شاعری

از مخدوم محی الدین بی اے عثمانیہ اس کتاب میں ٹیگور کے سوانح حیات اور ان کے کلام پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں ان کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں پر حقولیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت عہ

بہترین غزل گو

مشہور ادیب حضرت امیر بدایونی کا وہ مضمون جو الناظر کے انعامی ... مقابلے میں لکھا گیا ہے۔ قیمت ۴

جدید اردو شاعری

اردو شاعری میں جو انقلاب رونما ہوا اس کی پوری تفصیل اور اس پر تبصرہ از عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے قیمت ے

حقیقت علمی شاعری

از نصیر الدین حسین بیرسٹر۔ اس عجیب و غریب مثنوی میں شاعر نے شاعری کی حقیقت۔ مختلف ملکوں میں اس کے اثرات و نتائج۔ مختلف قوموں کی شاعری کی خصوصیات دکھائی ہیں۔ پھر تفصیل کے ساتھ اردو شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ مثنوی کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف کی نظر اردو شعرا کے کلام و خصوصیات پر کتنی عمیق ہے۔ قیمت عہ

ناٹک ساگر

ڈرامہ کے مشہور و مستند نقاد محمد عمر و نور الٰہی صاحبان کی بہترین تصنیف جس میں ہندوستان اور ایران کے جدید و قدیم ڈرامے پر سیر حاصل اور کار آمد بحث ہے۔ قیمت عہ

پر روشنی ڈالی ہے

اور ٹیگور نے اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کی ان خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ جنھیں عرفِ عام میں سرمایہ کی سرمستیاں اور مزدور طبقہ کی سرفروشیاں اور فاقہ مستیاں کہا جاتا ہے وہ اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کو نہایت بھڑکیلی بنا کر پیش کرتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۹ر

ابوالفاضل راز چاندپوری
دنیائے راز

ہندوستان کے کہنہ مشق ادیب اور روشن خیال شاعر حضرت مولانا ابوالفاضل راز چاندپوری کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کا مقدمہ مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر بی۔ اے نے لکھا ہے۔ ساری کتاب سات ابواب میں تقسیم اور ۹۰ نظموں پر مشتمل ہے اور اس کی ہر نظم بتاتی ہے کہ راز جدید عہد کا بہترین نمایندہ ہے۔ کتاب نقائص معائب سے پاک ہے اور نکھری ہوئی لطیف شاعری کو پیش کرتی ہے۔ ہر شاعر اور شعر و سخن کے دلدادہ کو یہ مجموعہ ضرور دیکھنا چاہئے۔ قیمت ۱ر علاوہ محصول

بشیر ملیح آبادی
حضرت جوش ملیح آبادی کے والد کا دیوان
کلامِ بشیر

ملک کے مشہور و معروف شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کے والد کا کلام "کلام بشیر" کے نام سے شایع ہو چکا ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت فی جلد ۸ر علاوہ محصول۔

تہذیب عمل

عملی زندگی کی اصلاح کے لئے چند مفید مقالات کا مجموعہ یہ اخلاقی کتاب ہے۔ بچوں اور طلبا کیلئے بے حد مفید ہے اس کے مطالعہ سے انسان کے اخلاق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، ہر فہیم باپ کو اپنے بچوں کے لئے یہ کتاب ضرور منگانی چاہئے۔ قیمت ۶ر علاوہ محصول۔

مرزا جعفر علی خاں اثر بی اے
اثرستان

ہندوستان کے مشہور اور مستند شاعر و ادیب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی اے ڈپٹی کلکٹر کا دیوانِ غزلیات۔ شروع میں نواب صاحب کی تصویر بھی شامل کتاب ہے۔ اثر صاحب کی شاعرانہ پوزیشن اسقدر اہم ہے کہ ہر شخص ان کے کلام کو استفادہ کے طور پر دیکھتا ہے لیکن ان کے کلام میں ایک خاص رس اور جذبات کی گہری چاشنی اس درجہ پائی جاتی ہے کہ دل ہر شعر پر بے چین اور مست ہو جاتا ہے۔ شعر و ادب کے دلدادگان کو یہ دیوان اپنے پاس ضرور رکھنا چاہئے۔ حجم ۱۵۰ صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول

باسط بسوانی
شاہدِ معنی

جناب ماسٹر باسط بسوانی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے قاضی ظہیر الدین احمد صاحب بسوانی نے مرتب کیا ہے دیکھنے اور پڑھنے کے قابل ہے

قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ علاوہ محصول۔

حضرت شوکت تھانوی
طوفانِ تبسم

شوکت صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے شوکت صاحب مزاح نگاروں کی اولین صف کے ادیب ہیں۔ ان کے مزاح میں ایک لطیف شوخی اور مذاق پایا جاتا ہے، زبان آسان اور سادہ ہے۔ دوسرے صفحہ سے ہی مذاق شروع ہو جاتا ہے، اپنی بیوی کے نام آپ نے اپنے طوفانِ تبسم کو منسوب کیا ہے، اس کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کا دیباچہ ہے۔ پھر مضامین شروع ہوتے ہیں، ہر مضمون بجائے خود ایک کشتِ زعفران ہے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں، شوکت کا طوفانِ تبسم زندگی کے تمام غم اپنی رو میں بہا لیجاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے جو غیر فانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کے لحاظ سے عہ قیمت بہت ہی کم ہے۔ (علاوہ محصول)

محمود الرحمن ندوی
دولتِ غزنویہ

مولوی محمود الرحمن صاحب ندوی کی تاریخی تالیف ہے۔ جس میں تاریخی تحقیق و تدقیق کے بعد غازی سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے ولولہ انگیز مجاہدانہ دینی اور علمی کارنامے دکھائے گئے ہیں اور ان تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ جو اسلام کے دشمنوں نے تاریخ میں پیدا کر دی ہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ غزنوی خاندان کے متعلق یہ مکمل تاریخ ہے۔ ہر مسلمان کیلئے اس کا مطالعہ ضروری ہے

حکیم یوسف حسن
پروازِ خیال

حکیم یوسف حسن صاحب مدیر اعلیٰ "نیرنگِ خیال" لاہور کے چار مختصر ڈراموں اور تین مکالموں کا مجموعہ ہے۔ نہایت خوبصورت اور نفیس طبع ہوا ہے۔ پروفیسر تاثیر ایم۔ اے نے

کے قلم سے دیباچہ ہے - یہ ڈرامے اور مکالمے بے حد دلچسپ ہیں
زبان نہایت آسان اور دلچسپ ہے۔ ہلکی سی چاشنی مزاح کی پائی جاتی ہے
قیمت صرف ۵ر علاوہ محصول

لالہ رُخ

ل احمد اکبرآبادی

طامس مور کی مشہور مثنوی ہے اور انگریزی ادب
میں اعلیٰ پایہ کی تصنیف خیال کی جاتی ہے
ملک کے مشہور ادیب لطیف الدین احمد اکبرآبادی
نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے، ترجمہ بہ حیثیت ترجمہ بہت ہی بلند ہوا۔ اور
اس کا درجہ بھی اردو میں وہی ہے جو طامس مور کی مشہور مثنوی کا ہے -
لطیف الدین احمد صاحب اکبرآبادی کو جو مہارت ترجمہ میں حاصل ہے، وہ
ہندوستان کے کم ادیبوں کو میسر ہے "لالہ رُخ" نے اردو ادب کی آغوش
کو بہت بڑی دولتِ ادب سے معمور کیا۔ زبان اس درجہ بلند اور شیریں ہے
کہ پڑھتے پڑھتے انسان جھوم جاتا ہے، مور کی شاعری کی زبان کا ساتھ دیتی
ہے، آپ اس کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت عہ ر علاوہ محصول -

ماہ و پرویں

میر ولی اللہ

میر ولی اللہ کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے
میر ولی اللہ بی اے ایبٹ آباد (پنجاب)
کے مشہور ادیب ہیں اور مزاحیہ مضامین لکھنے
میں ان کو مہارت تامہ حاصل ہے، کتاب آٹھ مضامین پر مشتمل ہے - اور
ہر مضمون بجائے خود پڑھنے اور لطف لینے کے قابل ہے -
قیمت ۱۲ ر علاوہ محصول -

گناہ کی راتیں

ایم - اسلم

ایم، اسلم - صاحب رئیس لاہور کے
اخلاقی افسانوں کا مجموعہ ہے - ایم
اسلم صاحب پنجاب کے نہایت پختہ
کار ادیبوں میں سے ہیں اور لاتعداد کتابوں کے مصنف ہیں۔ کتاب میں سات
افسانے ہیں اور ہر افسانہ عبرت و بصیرت کا آئینہ ہے۔ نوجوانوں کے لئے
اس کے صفحات میں تعلیم اخلاق کے خزانے ہیں - اور مذہب انسانوں کیلئے
مشعلِ ہدایت کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ بھی ضرور دیکھئے، زبان لطیف اور دلچسپ
ہے- قیمت ہ ر علاوہ محصول -

سرگذشت اسیر

ڈکٹر ہوگیو (سعادت حسن مترجم)

ڈکٹر ہوگیو کی مشہور تصنیف
The Last days
of the condemned
کا کامیاب ترجمہ ہے جس میں تنسیخ سزائے موت کے معاشری اسباب، سے
بحث کی گئی ہے ڈکٹر کی یہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جسکا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں
میں ہو چکا ہے، سعادت حسن صاحب منٹو نے اس کا ترجمہ کر کے اردو ادب پر
احسان کیا ہے۔ شروع میں مترجم کا ایک دیباچہ ہے۔ جس میں کتاب اور
صاحب کتاب کی ذات اور اسباب تحریر کا ذکر ہے مترجم کے دیباچہ کے بعد
مصنف یعنی خود ڈکٹر ہوگیو کا دیباچہ ہے اور اس کے بعد اصل کتاب ہے۔ موجودہ
دور انقلاب میں اس کتاب کا مطالعہ لازمی امر ہے۔ اس لئے ہر شخص کی نجی
لائبریری میں سرگذشتِ اسیر کو ضرور جگہ دینی چاہئے۔ قیمت عہ علاوہ محصول -

موجودہ لندن کے اسرار

نور الٰہی و محمد عمر

نور الٰہی و محمد عمر صاحبان کی
شاندار تصنیف ہے۔ جس میں
فلسفۂ جرائم پر روشنی ڈالی گئی ہے
کتاب میں جا بجا حیرت انگیز مقامات آتے ہیں اور لندن کی پُراسرار زندگی کے
مناظر، انسان کے دماغ و دل کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ [illegible]
حیرت ناک ہے - قیمت صرف عہ ر

سیر المصنفین

سید محمد یحییٰ تنہا بی اے۔

اردو نثر نگاروں کا مکمل تذکرہ [illegible]
[illegible]
اولین اور بہتر [illegible]
لبریز معلومات، اردو ادب کے شیدائیوں کیلئے ایک قیمتی [illegible] کوئی
کتب خانہ ہمارے خیال سے اس کتاب سے خالی نہ رہنا [illegible]
تاریخ کی دنیا میں یہ شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ قیمت جلد اول [illegible] دوم
ہے ر علاوہ محصول -

تاریخ امریکہ

حجم ۲۷۶ صفحات کاغذ بہترین اور طباعت
وغیرہ خوب ہے۔ اردو زبان [illegible]
نادر تاریخی کتاب ہے امریکہ کے [illegible]
ہیں ان سب کا ذکر اور تاریخی و سیاسی لحاظ سے اس میں وہ سب [illegible]
ہے جس کا تصور امریکہ کا نام لیتے ہی انسان کو ہو سکتا ہے قیمت عا علاوہ محصول

"ترانہ"

مرزا یاس عظیم آبادی

ہندوستان کے مشہور شاعر [illegible]
یگانہ چنگیزی عظیم آبادی کی رباعیات
کا مجموعہ ہے - شروع میں یاس صاحب

وجدان وکیف قومیت واسلامیت کی روح کارفرما ہے اور پیغمبر اسلام کے علاوہ رام چندر جی، کرشن جی، مہاتما گوتم بدھ اور اکثر اسلامی و ہندوستانی قائدین پر ایسی نظمیں اس کتاب میں پائی جاتی ہیں جو اتحاد اقوام کا سبب بننے کی طاقت رکھتی ہیں شباب، آزادی، مسرت اور زندگی کا ایک موج تند بادۂ مشرق کے صفحات میں موجیں مارتا ہے، آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو اعتراف فرمائیں گے کہ ساغر نے اپنی اس کتاب سے ایشیا کی عظمت کو دوبالا کر دیا ہے "بادۂ مشرق" اردو شاعری میں عقیدہ، زبان، خیال اور پیغام کے لحاظ سے اولین کتاب ہے۔

قیمت مجلد سہ علاوہ محصول۔

سرود شباب

جوانی کے موضوع پر اردو شاعری میں سب سے عجیب اور جدید کتاب ہے۔

۱۹۲۵ء میں شبابیات کے عنوان سے ساغر نظامی کی ۷۴ رباعیاں شائع ہوئی تھیں اب گیارہ برس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن سرود شباب کے نام سے کافی ترمیم کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ اپنی نئی ترتیب کی بنا پر یہ بجائے خود ایک نئی تصنیف ہے۔ شبابیات میں محض شاعر اپنے شباب کا مغنی تھا لیکن گیارہ برس میں شعور نے سینکڑوں منزلیں طے کیں اور وہ اس منزل پر آ پہنچا جہاں خود فریبی، خود نگری، خود پرستی، بیخودی، اور خودستائی حسن کی مداحی میں تبدیل ہو جاتی ہے، چنانچہ پہلے حصہ میں شاعر اپنے جوانی کے گیت پوری سرمستی سے گاتا ہے اور دوسرے حصہ میں حسن کا نغمہ گر ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کتاب "بادۂ مشرق" سائز پر چھاپی گئی ہے اور ہر رباعی کی تصویر پس منظر (Back ground) میں دی گئی ہے، اس التزام نے کتاب کو جوانی کا طلسم زار بنا دیا ہے۔ کاغذ نہایت اعلیٰ اور کتابت اعلیٰ ترین ہے، چھپائی میں "ساغر پریس" نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ جلد بندی کے بجائے کتاب کو رنگین فیتہ سے باندھا گیا ہے، ٹائٹل رنگین بلاک اور آرٹ کا بہترین نمونہ۔

قیمت عمر علاوہ محصول۔

دیگر انشاپردازوں کے شاہکار

از علامہ ابوالکلام آزاد

[illegible] کے قیدی

یہ مختصر رسالہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے عالم جوانی کا شاہکار ہے جو سنسنی خیز و سرمد کے پرخروش د

مستند حالات پر مشتمل ہے، اول تو موضوع ہی اپنی جگہ بہت پرخروش ہے اس پر مولانا آزاد کی پرجوش ادبیت پڑھتے پڑھتے انسان جھوم جاتا ہے۔ قیمت صرف ۲ر

مولوی عبدالباری آسی

تذکرۂ خندۂ گل

کون ہے جو مولوی عبدالباری آسی الدنی کی ذات سے نہ واقف ہو، آپ ہندوستان کے مشہور ادیب ہیں، یہ تذکرہ آپ ہی کی کاوش ترتیب کا نتیجہ ہے، جو اردو و فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات و منتخب کلام پر مشتمل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تذکرہ اردو زبان میں سب سے پہلی اور نئی چیز ہے، شیدایانِ ادب کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے قیمت للعہ علاوہ محصول

سید مقبول احمد بی اے

"فلسفۂ مذہب"

سید مقبول احمد صاحب کی یہ کتاب مذہب اور اس کے متعلقات پر غیر ملایانہ نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہے اس کتاب میں مذہب اور اخلاق کی تشریح جدید اور ارتقائی نقطۂ نگاہ سے کی گئی ہے۔ ہر معاملہ کو عقلی طور پر سمجھایا گیا ہے، مطالعہ کے قابل کتاب ہے اور بہت فلسفیانہ طور پر تحریر کی گئی ہے

قیمت عہ علاوہ محصول

حاجی عبدالمجید صاحب کاتب

"خریطۂ نعت"

یہ ردیف وار نعتیہ دیوان ہے۔ جو مولانا کاتب کی تصنیف ہے۔ اس مختصر دیوان کو پڑھ کر محبتِ رسول کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اسے خریدنا چاہئے، چیدہ نعتیہ کلام کا یہ بہترین مجموعہ ہے۔ قیمت مع محصول ۸ر

مولانا نیاز فتحپوری مدیر نگار

"ایک شاعر کا انجام"

حضرت نیاز فتحپوری ہندوستان کی ان ہنگامہ خیز ہستیوں میں سے ہیں، جن کی ہستی اردو ادب کی جان ہے۔ یہ مختصر افسانہ ان کے عہد شباب کا شاہکار ہے اور اس قدر بلند چیز ہے کہ اب وہ خود بھی چاہیں تو ایسی معرکۃ الآرا کہانی نہیں لکھ سکتے، لفظ لفظ میں حرارتِ شباب پائی جاتی ہے قیمت ۱۰ علاوہ محصول۔

فراست الید

یہ مختصر کتاب بھی علامہ نیاز ہی کے دماغ و قلم کا نتیجہ ہے جو علم سامدرک (Palmistry) پر مشتمل ہے جسے ہاتھ اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر ایک انسان کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل پر حکم لگانے کے علم کو کہتے ہیں۔ اس علم کے متعلق یہ مختصر سی

کتاب مکمل معلومات رکھتی ہے (Palmistry) سے ذوق رکھنے والوں کیلئے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول۔ عہ

مذاکراتِ نیاز

یہ حضرت نیاز کی ڈائری ہے۔ یہ ان ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں نگار میں شایع ہوئے تھے۔ اور جنکو ملک نے بید پسند کیا تھا۔ یہ مضامین حضرتِ نیاز کی ارتقائی انشاء کے شاہکار ہیں۔ جا بجا طنزیات کی لہری مگر مہذب چاشنی پائی جاتی ہے جو حضرتِ نیاز کی انشا پردازی کی خصوصیت ہے، حجم ۱۶۸ صفحات، قیمت عہ

جذباتِ بھاشا

اس کتاب میں ہندی دوہوں کو جمع کیا گیا ہے اور ہندی شاعری پر تنقید کی گئی ہے۔ اور خوب خوب دادِ سخن دی ہے۔ شروع میں خلیقی صاحب دہلوی کا دیباچہ ہے اردو زبان کیلئے بہت ضروری کتاب ہے اور اس کو لکھکر مولانا نیاز نے اپنی ہندوستانیت کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

یہ بھی چند افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں پیروں اور مولویوں کی رعشہ براندام کردینے والی حرکات کا ذکر ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ آج سوسائٹی میں سب سے زیادہ کریہہ مخلوق صرف مولوی اور پیر ہے، بہت دلچسپ کتاب ہے۔ ہر شخص کو دیکھنی چاہئے۔ قیمت علاوہ محصول ۵

مادئین کا مذہب

یہ انگریزی سے ترجمہ ہے جس میں "چند گھنٹے حکمائے قدیم کی روحوں کے ساتھ" کے عنوان سے ایک اسلوب بدیع کے ذریعہ ہیئتِ اجتماعی کے نقائص اور ضرورت انقلاب پر دلچسپ تبصرہ ہے، بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔

قیمت علاوہ محصول ۱۲

جمالستان

یہ نگارستان کے بعد حضرت مولانا نیاز کے افسانوں کا دوسرا ضخیم مجموعہ ہے جو تقریباً پانسو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر افسانہ پڑھنے کے قابل ہے، ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے نیاز کا جو درجہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر ادیب و ہر ادب پرست کو جمالستان کا مطالعہ بمنزلہ فرض ہے، اس کے مطالعہ سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ نیاز اُردو کا اسٹوئین ہے۔ قیمت للعہ علاوہ محصول۔

ترغیباتِ جنسی

یہ بھی حضرتِ نیاز کی معرکتہ الآرا تالیف ہے جسمیں تاریخی، علمی اور نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے انسان کے میلان جنسی پر ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے اس موضوع پر اردو میں اس سے قبل کوئی کتاب نہیں دیکھی گئی ہے

فحاشی کی تعریف کے بعد فحاشی کی ابتدا اور اس کے اسباب سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد پہلے باب میں شادی کے عنوان سے اس کے متعلقات سے بحث ہے، اس کے علاوہ مختلف اقوام کے رسم و رواج کو تحریر کیا گیا ہے دوسرے باب میں "طلاق و خلع" کے ماتحت قدیم روم، قدیم یونان، قدیم چین، قدیم جاپان وغیرہ میں طلاق و خلع کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کے تمام بڑے ممالک کے حالیہ طرز طلاق و خلع کو دکھایا گیا ہے اس کے بعد کتاب مندرجۂ ذیل ابواب میں تقسیم ہے اور ہر عنوانِ باب کے تحت مختلف ضمنی عنوانات ہیں

مذہبی فحاشیاں۔ فحاشی پر عمومی تبصرہ۔ استلذاذ بالمثل۔ عورتیں اور استلذاذ بالمثل استلذاذ بالمثل۔ استلذاذ بالوحوش۔ استلذاذ بالنفس۔ فحاشی عہد قدیم میں۔ فحاشی قرون وسطیٰ میں۔ عہد جدید اور فحاشی۔ اخلاق جنسی۔

ان تمام عنوانات کے ماتحت معلومات کی ایک دنیا ہے۔ اس موضوع پر آپ اس کتاب سے بہتر سارے اردو ادب میں نہیں دکھائیے۔

قیمت علاوہ محصول ۴ غیر مجلد ۔۔۔

سید فرید جعفری مچھلی شہری

"دلکی رانی"

سید فرید جعفری ملک کے ان نوجوان گرامی نگاروں میں سے ہیں جن کی کتابیں ہمیشہ ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں۔ ان کی لکھی ایک ... "دل کی رانی" ان ہی کی تصنیف ہے ... ہے جو بہت دردناک ہے، زبان لطیف اور آسان ہے

قیمت ۴ علاوہ محصول۔

محبت کے پھول

یہ ایشیا کے شاعر اعظم ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کے مشہور و مقبول ڈرامہ ... کا آزاد ترجمہ ہے اور فرید صاحب ہی نے اسکو ترجمہ کیا ہے۔ جس کا دیباچہ شوکت علی صاحب فہمی نے لکھا ہے اور تقریظ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے قلم سے ہے۔ ٹیگور نے اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کی خرابیوں کی ذہنیت

روحِ تنقید
اردو میں تنقید نگاری پر پہلی تصنیف جملہ فنی اصول وساد یات پر حاوی۔ از ڈاکٹر محی الدین زور
قیمت عہ

تنقیدی مقالات
ڈاکٹر سید محی الدین زور نے ادب اردو پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے یہ رُوحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے۔ قیمت ہے

حضرت امجد کی شاعری
مشہور صوفی شاعر حضرت امجد حیدرآبادی کے وجد آفریں و معارف آگیں کلام پر تبصرہ اور دلکش انتخاب کلام۔ از نصیر الدین ہاشمی صاحب قیمت عہ

یادگار انیس
میر انیس کی مکمل شاعری پر سیر حاصل تبصرہ از ادیب خوش بیان مولوی امیر احمد علوی صاحب
قیمت عہ

یادگار غالب
خواجہ حالی مرحوم اردو میں بایوگرافی لکھنے میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ ان کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس میں غالب کی سوانحعمری اور ان کی صحبتوں کے دلچسپ تذکرے اور اکثر علمی و ادبی نکات اور ان کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ
قیمت ہے

تذکرہ محسن
نواب محسن الملک مرحوم کی حیات از منشی محمد امین صاحب مارہروی
قیمت ۱۲

حیات جامی
مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح اور ان کی شاعری پر دلچسپ تبصرہ۔

حیات حافظ
خواجہ حافظ علیہ الرحمۃ کی مستند سوانح اور ان کی شاعری پر تنقید و تبصرہ۔ از مولانا اسلم جیراجپوری۔ قیمت عہ

حیات حافظ
از مولانا شبلی نعمانی مرحوم
قیمت صرف ۸

حیات سعدی
از مولانا شبلی نعمانی مرحوم۔ قیمت ۸

حیات سعدی
اردو میں سیرت نگاری کا پہلا اور بے نظیر نمونہ۔ مصلح اعظم حضرت سعدی شیرازی کی مکمل لائف اور ان کی شاعری پر مفید بحثیں اور تنقید از خواجہ حالی مرحوم۔ قیمت صرف عہ

پنجاب میں اُردو
ادیب فاضل مولانا حافظ محمود شیرانی صاحب کی تحقیقی و تاریخی تصنیف جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ اردو زبان ملتانی سے ماخوذ اور اس سے ملتی جلتی ہے
قیمت

دکن میں اردو
جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا اور اس کی ایک مبسوط تاریخ۔ از نصیر الدین ہاشمی صاحب قیمت ۶

تہذیب الاخلاق
نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں مرحوم کے گرانقدر مقالات کا مکمل مجموعہ
قیمت صرف ہے

مکمل لیکچر و اسپیچز
سر سید احمد خاں مرحوم کی مختلف تقریروں اور خطبات کا مجموعہ۔
قیمت صرف ۸

آخری مضامین
سر سید مرحوم کے بقیہ مضامین کا مجموعہ جو شایع ہونے سے رہ گیا تھا۔
قیمت صرف عہ

انتخاب مضامین سرسید
سر سید مرحوم کے چند ممتاز اور خاص خاص مضامین کا مجموعہ
قیمت صرف ۱۲

مقالات حالی
(حصہ اول)
دردمند قوم و ملک دور جدید کے مقتدر اور ادیب شاعر حضرت خواجہ حالی مرحوم کے مختلف بے بہا مضامین کا مجموعہ، مذہب، اخلاق، تعلیم، ادب و فلسفہ اور سیاسیات وغیرہ پر (۳۲) مقالات آگئے ہیں۔ یہ کتاب ہر صاحب ذوق، ادیب و شاعر و اساتذہ سب کے کام کی ہے، شروع میں حضرت پیر اُردو مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کا مختصر مگر مزیدار مقدمہ طباعت اعلی۔ کتابت نفیس قیمت ہے

مقالاتِ شبلی

پچھلے دور کے جلیل القدر ادیب و فاضل علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی اور تاریخی مقالات و مضامین کا قابلِ قدر مجموعہ جدید ترتیب اور نہایت خوش اسلوبی سے ان کے فاضل تلامذہ نے الگ الگ جلدوں میں شائع کیا ہے۔

جلد اول مذہبی عہ ۔ دوم ادبی ۱۲ر سوم تعلیمی عہ چہارم تنقیدی عہ ۔ پنجم حصہ اول تاریخی عہ

رسائلِ شبلی

علامہ شبلی مرحوم کے چند مبسوط مقالات جو علیحدہ علیحدہ رسالوں کی صورت میں چھپے تھے۔ یکجا شائع کر دیے گئے ہیں قیمت عہ

زیب النساء مولانا شبلی مرحوم کا تاریخی مقالہ ۱ر

جہانگیر " " " " ۲ر

اسلامی حکومت " " " " ۲ر

اسلامی مدارس " " " " ۴ر

اسلامی کتب خانے " " " " ۴ر

مضامینِ شرر

مولانا شرر مرحوم کے تقریباً جملہ مضامین جو بہت منتشر تھے بڑی محنت سے موضوع کے اعتبار سے الگ الگ جلدوں اور حصوں میں شائع ہوئے ہیں۔

جلد اول شاعرانہ و عاشقانہ حصہ اول ۶ر۔ دوم ۶ر سوم عہ

جلد دوم تاریخی و جغرافی۔ حصہ اول ۶ر دوم عہ سوم عہ

جلد سوم سیر و سوانح حصہ اول ۸ر دوم عہ سوم عہ

جلد چہارم ادب و تحقیقِ مسائل عہ

جلد پنجم اصلاحِ قوم و ملت قیمت عہ

جلد ششم متفرق تاریخی واقعات عہ

جلد ہفتم نظمیں، ڈرامے اور مختلف مضامین

انگلستان کی عورتیں

مولانا شرر مرحوم کا وہ لیکچر جو سفر انگلستان کی واپسی پر ہوا (۳۰) برس پہلے کی انگلستان کی عورتوں کی جیتی جاگتی تصویر

قیمت صرف ۶ر

انتخابِ مخزن

سر شیخ عبدالقادر بالقابہ کے مشہور و مقتدر اور زبان و ادب اردو کے نامور خادم رسالہ "مخزن" کے گرانقدر اور منتخب مضامین کا مجموعہ۔ قیمت حصہ اول عہ دوم عہ سوم ۶ر

مضامینِ چکبست

مشہور ادیب پنڈت برج نرائن چکبست آنجہانی کے مختلف ادبی، علمی مضامین کا مجموعہ دلکش۔ قیمت ۳ر

سی پارۂ دل

خواجہ حسن نظامی کے دلکش مضامین کا مجموعہ قیمت ۶ر

افاداتِ مہدی

نامور انشاپرداز و جواں مرگ ادیب ایم مہدی حسن مرحوم المعروف بہ افادی الاقتصادی کے بہترین مقالات کا مجموعہ۔ قیمت صرف ۳ر

پطرس کے مضامین

مشہور و بلند پایہ مزاحیہ نگار مسٹر اے ایس بخاری ڈائرکٹر دہلی براڈکاسٹنگ کے نہایت دلکش و دلچسپ مضامین کا مجموعہ۔ طباعت اعلیٰ قیمت ۶ر

مضامینِ فرحت

مشہور و معروف مزاحیہ نگار اور فاضل ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی سشن جج گلبرگہ (دکن) کے مختلف علمی ادبی مضامین کا مجموعہ حصہ اول ۶ر۔ دوم ۶ر سوم ۶ر چہارم ۶ر

دہلی کا یادگار مشاعرہ

مشہور ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سشن جج گلبرگہ کا مشہور و مقبول مقالہ جو موصوف نے ۱۲۶۱ھ کے یادگار مشاعرہ کا حال اس طرح لکھا ہے کہ اس زمانے کی تہذیب و معاشرت کی ہو بہو تصویر آنکھوں میں سما جاتی ہے۔ اندازِ بیان از حد دلچسپ۔ شعرائے شریکِ مشاعرہ کی قلمی تصویریں اور ان کے کلام کا انتخاب

قیمت صرف ۱۲

زرِ گل

مشہور محقق و ادیب قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے ادبی مقالات کا مجموعہ۔

قیمت صرف ۸ر

۹

مترجمات

مشہور فاضل و ادیب قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی کے علمی و ادبی مقالات کا قابلقدر مجموعہ جو عربی و انگریزی وغیرہ سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف ۸ر

مخزنِ ادب

اردو کے پرانے پرانے ادیبوں مثلاً سر شیخ عبدالقادر، سید سجاد حیدر، سر اقبال، میر نیرنگ وغیرہم کے قابلِ قدر مفید و کارآمد نثر و نظم مضامین کا مجموعہ متوسط سائز (۲۴۴) صفحے طباعت وغیرہ پاکیزہ۔ قیمت مجلد صرف ے

لیلےٰ کے خطوط

از مشہور فاضل ادیب قاضی عبدالغفار صاحب زبان و ادب کے اعتبار سے یہ خطوط اردو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں جو ایک طوائف کی طرف سے اس کے عاشق کو لکھے گئے ہیں رومانس اور افسانویت سے لبریز۔ قیمت عہ

ادبستان

کہنہ مشق ادیب جناب خلیقی دہلوی کے دلکش اور بے شمار ادبی لطافتوں سے زرخیز نہایت دلچسپ مضامین کا حسین و جمیل مرقع۔ شروع میں اختر شیرانی صاحب کا مقدمہ خوبصورت سنہری جلد طباعت وغیرہ اعلیٰ۔ قیمت صرف عہ

انشائے لطیف

مشہور و صاحب طرز ادیب و انشا پرداز مسٹر لطیف الدین احمد کے (۱۵) منتخب افسانے پونے تین سو صفحے قابلِ دید کتاب ہے۔ قیمت عہ

نغماتِ موت

محترمہ حجاب بیگم امتیاز علی تاج کے قابلِ قدر رشحاتِ قلم۔ قیمت صرف ۶

روحِ تہذیب

یہ مقالہ ۱۹۳۲ء میں جناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے اردو اکادمی کے جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس میں نہایت دل آویز طریقے سے تہذیب کے حقیقی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں ایک فرضی خواب کے نام سے ہماری موجودہ تہذیب پر تنقید کی گئی ہے۔ دوسرے میں تہذیب کے متعلق اصولی بحث اور اس کی تعریف کی ہے۔ خواجہ صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے اس بحث پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے قلم میں شگفتگی، زبان میں روانی ہے طرز بیان میں سہل سے سہل تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

قیمت ۸ر

میدانِ عمل

منشی پریم چند صاحب کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے یہ منشی صاحب کے پچھلے تمام کارناموں پر بھاری ہے۔ اس میں ملک کی موجودہ بیداری بے چین روح کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ اور دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے۔ بے حد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول (۵۰۰) صفحے کتابت اعلیٰ۔ کاغذ نفیس۔ روشن طباعت۔ خوبصورت اور مضبوط جلد۔ دیدہ زیب مصور ڈسٹ کور۔ اور قیمت صرف ۶ر

تائیس

شہرۂ آفاق فرانسیسی ادیب اناطول فرانس کے زندۂ جاوید ناول کا بے نظیر ترجمہ۔ ملک کے مایۂ ناز ادیب و مترجم مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے (علیگ) دہلوی مدظلہ کے ترجمے کا یہ ایک بہترین نمونہ ہے۔ اصل ناول کی اہمیت و ترجمے کے محاسن دونوں لحاظ سے یہ کتاب پڑھنے، استفادۂ ادبی کرنے اور رکھنے کے لائق ہے۔ ۴۸۰ صفحے مجلد قیمت صرف ۶ر

نجم السحر

مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی سابق ناظم دار الترجمہ حیدرآباد دکن نے رائیڈر ہیگرڈ کی کتاب "ناٹنگ اسٹا" کا ترجمہ کیا ہے۔ مصر قدیم یعنی فراعنۂ مصر کے زمانے کی موبہو تصویریں اس کمال سے پیش کی گئی ہیں کہ ایک ایک بات آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اصل مصنف و مترجم دونوں کی حیثیت غیر معمولی ہے۔ قیمت صرف ۶ر

سلامبو

اردو کے مشہور مترجم مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی مدظلہ نے حال ہی میں۔ فلابئر کا یہ شہ پارہ ترجمہ کیا ہے۔ قدیم قرطاجنہ کی سچی تصویریں اور عشق و رومان کی دلآویز داستانیں سائز متوسط۔ قیمت صرف ے

گوشۂ عافیت

دیہاتی بھائیوں کی کشمکش اور دیسی حکام کے مظالم کی دردناک داستان اور ان کے دور کرنے کے وسائل پر منشی پریم چند صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں یہ ناول لکھا ہے۔ قیمت ہر دو حصص ۱۲ے

نرملا

ایک عمر رسیدہ بزرگ کی دوسری شادی کی ناکامیاں اور گھر کی تباہیاں بہت عبرتناک ناول از منشی پریم چند۔ قیمت ۸ر

فردوسِ خیال منشی پریم چند کی جادوبیانی و سحر نگاری کا مرقع۔ قیمت ۱۲؍

چوگانِ ہستی فطرت نگار منشی پریم چند کا لاجواب ناول منشی صاحب کی قادر الکلامی اور جذبات نگاری کا اعلیٰ نمونہ۔ دو حصے (۴۹۶ + ۵۱۰) صفحے مجلد قیمت للعہ

پردۂ مجاز مشہور افسانہ و ناول نگار منشی پریم چند کا ایک دلچسپ ناول۔ مختلف طبائع کے زیر اثر محبت کیسی کیسی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ قیمت ۶؍

نجات منشی پریم چند کا ناول (۱۰۲) صفحے۔ قیمت ۱۲؍

الفانسو مولانا شرر مرحوم کا ایک سچا تاریخی ناول۔ قیمت ۲؍

بابک خرمی عہد عباسیہ کا تاریخی ناول قیمت ۱۲؍

حسن انجلینا روس و شام کی لڑائی کا تاریخی ناول۔ از مولانا شرر مرحوم نہایت دلچسپ۔ قیمت صرف ۶؍

زوالِ بغداد بغداد کی تباہی کا تاریخی درد انگیز ناول۔ قیمت ۱۲؍

شوقین ملکہ صلیبی جنگوں کے بہت ایک واقعات ناول کے پیرایہ میں۔ از مولانا شرر مرحوم۔ قیمت ۱۲؍

عزیز مصر مولانا شرر مرحوم کا ایک تاریخی ناول۔ عہد بنی طولون کا ایک دلچسپ بیان۔ قیمت ۱۲؍

رُومۃ الکبریٰ قدیم سلطنت روم کے حالات قیمت ۱۲؍

فلورا فلورنڈا مولانا مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں ہسپانیہ کے عہد خلافت کے حالات بصورت ناول لکھے ہیں قیمت ۸؍

مفتوح فاتح فرانس میں عربوں کا داخلہ قیمت ۱۲؍

فلپانا مولانا شرر مرحوم کا تاریخی ناول۔ ارض طرابلس پر صحابۂ کرام کے حملے قیمت ۱۲؍

فردوسِ بریں اسمٰعیلیوں، باطنیوں کے حیرت ناک و محیر العقول واقعات، دلچسپ ترین ناول یہ مولانا نے صرف ایک شب میں لکھا تھا۔ قیمت ۸

لعبتِ چین عہد صحابہ کرام کا ایک تاریخی ناول۔ فتوحات ماوراء النہر کے حالات۔ از مولانا شرر مرحوم۔ قیمت ۱۰؍

ملک العزیز ورجنا شیر دل رچرڈ اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی معرکہ آرائیاں، میدان جنگ کے نظارے اور زمان کے پیچھا رہے۔ سچی تاریخی حکایتیں عشق و محبت کی گھاتیں۔ بہت دلچسپ۔ قیمت ۱۰؍ ۸؍

منصور موہنا ہندوستان میں اسلامی سلطنت۔ فتح سندھ کے بعد قائم ہوئی۔ اس زمانے کے حالات بطرز ناول نہایت دلچسپ اور ولولہ انگیز۔ از مولانا شرر مرحوم۔ قیمت ۱۰ و ۱۲؍

مینا بازار عہد شاہجہاں کا ایک تاریخی ناول از مولانا شرر مرحوم۔ قیمت ۱۰؍

فتح اندلس پانچویں صدی عیسوی میں جبکہ مسیحیت رومیوں کا قومی مذہب بن رہی تھی۔ رومیوں کی معاشرت اور ان کی تمدنی حالت پر ایک دلچسپ تاریخی ناول۔ از مولانا شرر۔ یہ ناول کئی بار چھپ چکا ہے۔ قیمت ۸؍

ماہ ملک مولانا شرر مرحوم نے دولت غوریہ کے عروج کا کارنامے، ان کی معاشرت کے علاوہ شہزادی ماہ ملک کے سچے حالات اس ناول میں درج کئے ہیں۔ قیمت ۶؍

یوسف و نجمہ جگ بیتی نہیں آپ بیتی۔ قیمت ۸؍

ملکہ زنوبیہ
عربی شنراد ایک حسین شہزادی کے رومانی حالات
قیمت ۳ر

شیریں ملکۂ عجم
فرہاد کی معشوقہ کے حالات۔
قیمت ۴ر

افسانۂ قیس
عاشق لیلےٰ (مجنون عامری) کے حالات
قیمت ۳

دربارِ حرامپور
ہندوستانی رئیسوں کی عیش پرستیوں کے
عبرتناک و پُراسرار نمونے از مولانا شرر مرحوم
قیمت حصہ ۱ و ۲ ۱۰

توبۃ النصوح
اخلاق و تہذیب کا معلم مرحوم کا مشہور ناول
قیمت عہ

مراۃ العروس
خانہ داری وغیرہ معاشرتی امور کا اُستاد
مرحوم کا مشہور ناول۔ قیمت عہ

آفتابِ دمشق
عہد صدیقی و فاروقی کے کارنامے
اسلام اور نصرانیت کے معرکے اور ایک
ٹریجڈی معاشقہ از مولانا راشد الخیری مرحوم۔ قیمت عہ و عہ

امین کا دمِ واپسیں
ہارون الرشید مشہور خلیفۂ
عباسی کے فرزند امین کے دردناک
قتل کا واقعہ۔ از مولانا راشد الخیری مرحوم۔ قیمت ۴ ۱۲

اندلس کی شہزادی
مسلمانانِ اندلس کس طرح معراجِ ترقی
پر پہونچے اور پھر اپنے اعمال کی بدولت
فنا ہوئے۔ از مولانا راشد الخیری مرحوم۔ قیمت ۸

صبحِ زندگی
مولانا راشد الخیری مرحوم کا مقبول و مشہور ناول
قیمت عہ

شامِ زندگی
مولانا راشد الخیری کے مشہور ناول صبح زندگی
کا دوسرا حصہ، شادی سے مرنے تک کے واقعات
قیمت عہ

شبِ زندگی
مولانا مرحوم کے سلسلۂ زندگی کے ناولوں میں سے
بہت دلچسپ حصہ اول و دوم قیمت ۶؏

نوحۂ زندگی
مولانا راشد الخیری مرحوم کا ایک بے حد دردناک ناول
بیواؤں کے عقدِ ثانی پر۔ قیمت ۱۲

منازل السائرہ
مولانا راشد الخیری مرحوم کا ایک غیر مہمل ناول
مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش کا بہترین نمونہ
یونیورسٹیوں میں اکثر جگہ داخل نصاب ہے۔ قیمت ۶؏

وداعِ خاتون
مولانا راشد الخیری مرحوم کا نوشتہ ایک اصلاحی
افسانہ۔ لڑکی سسرال والوں کے دل کس طرح
ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ قیمت ۶

حجاج بن یوسف
مصر کے مشہور عربی ناول نگار جرجی
زیدان کے تاریخی ناول کا ترجمہ۔
خلیفہ عبدالملک کی طرف سے حجاج کا مکہ پہونچ کر حضرت عبداللہ بن زبیر سے
مقابلہ کرنا۔ مکہ کا محاصرہ اس زمانہ کا طریق جنگ و معاشرت اور ضمناً ایک افسانہ
محبت۔ ترجمہ مولوی ظہور احمد وحشتی
قیمت عہ

عبدالرحمٰن ناصر
جرجی زیدان کے ایک ناول کا ترجمہ۔
خلیفہ عبدالرحمٰن کے واقعات کا دلچسپ مرقع
قیمت صرف عہ

محبت
رُوس کے شہرۂ آفاق فیلسوف مصلح ادیب کونٹ ٹالسٹائی
کی ایک بہت اچھی اخلاقی کہانی کا ترجمہ۔ جناب مولوی عبدالرزاق صاحب
ملیح آبادی نے کیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۵۰ صفحے۔ قیمت ۴

ابن سراج
ابو عبداللہ آخری شاہ غرناطہ کے پوتے کی
دل ہلا دینے والی داستانِ عشق۔ قیمت ۸

راسپوٹین
ولی کے روپ میں شیطان جس نے سلطنتِ
روس تباہ کر ڈالی۔ زار و زارینا کے پیر کی سیاہ
کاریوں کی داستان۔ قیمت ۸

مہدی
ہال کین کے شہرۂ آفاق ناول "دی وہائٹ پرافٹ" کا ترجمہ
از ایم اسلم۔ سرزمینِ مصر کی ایک نہایت لطیف داستان۔ مصری اور
برطانوی سیاست، مصریوں کی حب الوطنی، دبے جانگی وغیرہ دلگداز افسانہ
طباعت نفیس، بہت سی رنگین و یک رنگ تصویریں، خوبصورت مصوّر و رنگین جلد، بڑا سائز
۴۰۰ صفحے۔ قیمت ے

سیب کا درخت
مشہور فرنگی ادیب گالزوردی کے بہترین ناول کا بہترین ترجمہ۔ جس پر مصنف نوبل پرائز بہت غیر معمولی انعام کا مستحق ٹھہرا۔ ملک کے مایۂ ناز ادیب جناب قاضی عبدالغفار صاحب مدیر "پیام" کی پاکیزہ زبان۔ لوچدار عشق و رومان کا مرقع۔ قیمت ۳ار

گناہ کی بیٹی
ایک بنگالی ناول کا کامیاب ترجمہ حسن و عشق کی کہانی۔ معرفت کے بیش بہا نکتے۔ قیمت ۸ر

انجام ہوس
ایک لڑکے کی دردناک کہانی اسی کی زبانی جس میں ایک شریف لڑکے کی بری صحبت اور اس کی بداعمالیوں کا نتیجہ۔ موثر انداز میں لکھا گیا ہے قیمت ۱۰ر

شراب عیش
طوائف سے شادی کرکے اسے بہو بیٹیوں میں ملاکر بٹھانے کے نتائج اور ایک بڈھی نائکہ کے نہایت دلچسپ اور سبق آموز حالات۔ قیمت ۱۰ر

احمق الذی
منشی سجاد حسین مرحوم کا ایک مزاحیہ شاہکار کاغذ خراب قیمت ۸ر

امراؤ جان ادا
مرزا محمد ہادی رسوا۔ ایم۔ اے مرحوم کا مشہور ناول۔ نہایت خراب کاغذ۔ قیمت مقابلۃً بہت زیادہ یعنی ۸عہ

اسرار بالشویزم
وسط ایشیا کی سیاسی حالت اور وہاں کے سیاسی عقائد ایک دلچسپ ناول کے پیرایہ میں۔ قیمت ۸ر

دختر فرعون
مصر و ایران کے تمدن و معاشرت و تہذیب و شائستگی کا ہو بہو فوٹو اور اس کی رفعت اور عروج کا بیان۔ مصر و ایران کی پرانی تاریخ و آثار قدیمہ سے دلچسپی پیدا کرنے کے علاوہ خود اپنے ملک ہند کی پرانی چیزوں سے خاص لگاؤ پیدا کرنے والی بہت عمدہ کتاب۔ مشہور جرمن ماہر علوم مصریہ کی تصنیف کا سلیس ترجمہ جناب لطافت حسین خاں صاحب۔ قیمت ہر دو حصص صرف للعہ ر

بلیک شرٹ
"بروس کریم" کے ایک معرکۃ الآرا انگریزی ناول کا ترجمہ۔ یورپ و امریکہ میں کوئی ناول اتنا مقبول نہیں ہوا۔ اسکی اشاعت پر یورپی ممالک میں تہلکہ مچ گیا۔ ۲۸۱ صفحے۔ قیمت صرف عہ

نرگس جمال
بلجیم کے مشہور ڈرامہ نویس مارس میٹرلنگ کے ڈرامے جائزل کا ترجمہ از مسٹر شاہد احمد بی اے ایڈیٹر "ساقی"۔۔۔۔ قیمت عہ ر

نوجوان ورتھر کی داستان غم
جرمنی کے مشہور فلسفی گوئٹے کے ایک شاہکار کا ترجمہ۔ شروع میں فاضل مترجم کی طرف سے ایک مفصل دیباچہ جس میں اس شاعر حکیم کے حالات زندگی، اس کی نفسیات قصہ و افراد قصہ پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ قیمت عہ مجلد عہ

کارنامجات آرسین لوپن
مشہور مصنف "مارس لبلانک" کی ایک عجیب غریب کتاب کا ترجمہ۔ سرا نوساں آرسین لوپن کے نو حیرت انگیز کارنامے
قیمت عہ ر

گردش آفاق
رینالڈس کے نام سے اردو دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ اس کے اکثر ناول اردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ تاہم اس کے کئی ایک اچھے ناولوں کا ابھی ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ گردش آفاق انہی میں سے ایک ہے۔ یہ ایک شوخ افسانہ ہے اور بہت کامیاب ترجمہ بھی بہت صاف اور سلیس ہے۔ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ حصہ سوم عہ

معاشقۂ نپولین
ایک فرانسیسی مصنف کا لکھا ہوا تاریخی ناول جس کا ہیرو شہنشاہ نپولین اعظم ہے ایک دلچسپ حیرت انگیز افسانۂ محبت اس سے معلوم ہوگا کہ نپولین جیسی ہستی کی نجی زندگی کیسی تاریک و رنگین تھی۔ طباعت کاغذ عمدہ۔ متعدد فوٹو
مجلد قیمت عہ ر

پیرس کے اسرار
جرائم و اسرار اور حسن و عشق کی ایک ہوش ربا داستان جس کا محل وقوع فرانس کا دارالسلطنت پیرس ہے۔ طباعت عمدہ ٹائٹل پر حسن و معصومیت کی ایک دلفریب تصویر۔ قیمت صرف عہ

وادی خوف
سر آرتھر کانن ڈائل کے ایک ناول کا ترجمہ سر لک ہومز کے ہوش ربا کارنامے۔ مترجمہ

محمد نصیر صاحب عثمانی استاد جامعہ عثمانیہ - طبع دوم قیمت ۸؍

نیلی چھتری
مشہور و معروف جاسوسی ناول نگار مسٹر ظفر عمر کا مقبول جاسوسی ناول حیرت انگیز خفیہ کارنامے
قیمت عہ؍

چوروں کا کلب
ظفر عمر صاحب کا اسی سلسلہ کا دوسرا ناول - قیمت ۹؍

بہرام کی گرفتاری
ظفر صاحب کا اسی سلسلہ کا تیسرا ناول
قیمت عہ؍

بہرام کی رہائی
بہرام کی گرفتاری کا دوسرا حصہ جو مشہور فاضل ادیب مرزا ہادی رسوا مرحوم نے پورا کیا - قیمت ۸؍

رنج و راحت
ظفر عمر صاحب کے صاحبزادے مسٹر آفتاب عمر بی اے کا نوشتہ نہایت دلچسپ ناول زندگی کی مختلف کیفیات کا عبرتناک خاکہ - قیمت صرف عہ؍

اپاسنا کے تار
بنگالی زبان کے مشہور ناول شاستی کا عکس لطیف - اور اس میں سحر کارانہ اضافہ حسین و جمیل اور مصور ٹائٹل ۲۷۰ صفحے - اور قیمت ۸؍

سادھنا کے تار
یہ ایک مظلوم دیوی کے حسرتناک زندگی کے نشیب و فراز کی تفسیر اور قربانی کی مکمل تصویر ہے - یہ بنگال کے مشہور ناول "مایا" کا عکس لطیف ہے اور منشی گوری لال اختر نے اس میں سحر کارانہ اضافہ کیا ہے - قیمت ۸؍

کیمیاگر
پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) کے مختلف افسانوں کا دلکش مجموعہ - طباعت وغیرہ خوبصورت - یہ افسانے اعلیٰ اور ستھرے مذاق کے طبقے میں عموماً پسند کئے گئے ہیں -
قیمت عہ؍

فسانۂ جوش
مشہور و مقتدر ادیب جناب سلطان حیدر صاحب جوش کے منتخب افسانوں کا مجموعہ - قیمت صرف عہ؍

جوشِ فکر
حضرت سلطان حیدر صاحب جوش کے افسانوں کا تازہ دوسرا مجموعہ - قیمت ۸؍

تلاشِ راز
حضرت نیاز فتحپوری کا نوشتہ - ایک رومان خیز ہندوستانی افسانۂ محبت - قیمت ۶؍

شہاب کی سرگذشت
حضرت نیاز فتحپوری کا نوشتہ ایک دلچسپ اور رومان خیز افسانہ نیاز کی خصوصیاتِ انشاء کا دل آویز مرقع - قیمت عہ؍

لیلیٰ مجنوں
مشہور ادیب سید سجاد حیدر یلدرم کا نوشتہ بہت دلچسپ افسانہ - قیمت ۴؍

پرانا خواب اور دوسرے افسانے
مشہور ادیب سید سجاد حیدر یلدرم کے دلفریب افسانوں کا مجموعہ - قیمت ۸؍

پرانا خواب
حضرت یلدرم کا بیحد دلچسپ افسانہ -
قیمت ۱۰

آسیب الفت
عشق و محبت کے عنصر کو آسیب اور مردوں کی روحوں کے تخیل سے ملایا گیا ہے - نہایت دلچسپ افسانہ ہے - قیمت ۱۲

نیرنگئ تقدیر
نذر سجاد حیدر صاحبہ کا یہ ایک معاشرتی افسانہ ہے - اس میں نوجوانوں پر مغرب کے برے اثرات تہذیب فرنگ کی طوطا چشمی اور ان کے مقابلے میں مشرقی بیوی کی وفا شعاری اور شوہر پرستی اور اسی قبیل کے اکثر معاشرتی مسائل پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے - قیمت ۴؍

اصنامِ خیالی
جلیل احمد قدوائی کے افسانوں کا مجموعہ ہے مغربی افسانہ نگاروں کے بعض چیدہ افسانوں کے تراجم .... قیمت ۶

سیرِ گل
جناب جلیل قدوائی کے افسانوں کا مجموعہ جس میں چیخوف اور موپاسان کے افسانوں کے تراجم بھی شامل ہیں ...... قیمت ۸؍

خاکِ پروانہ
منشی پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ - نہایت دل آویز پیرایہ میں لکھا ہے -
قیمت عہ؍

غبن سفید پوشوں کے مالی تردداد اور ترغیبات کا خاکہ۔ رسم و رواج کی بیہودہ پابندیوں کا خطرناک انجام۔ منشی پریم چند صاحب نے نہایت دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں۔
قیمت ہر دو حصص ۶

بیگناہ مجرم مہاشہ سدرشن جی مشہور افسانہ نگار کا ایک نہایت پاکیزہ مذاق کا اخلاقی مجلسی ناول۔
قیمت صرف عہ

صبح وطن جناب سدرشن کے ۱۲ قومی وملکی سبق آموز اور دلچسپ کہانیوں کا بے نظیر مجموعہ۔
قیمت عہ

پتھر سی ہیرا محبت کی ایک نگاہ، ایک انسان کی زندگی میں کیسے کیسے انقلاب پیدا کرسکتی ہے اور خونخوار وحشی درندوں کو کس آسانی سے رام کرسکتی ہے۔ یہ سچا افسانہ بتائیگا۔ کہ دنیائے انسانی میں ایک عورت کی سچی ہمدردی اور محبت بھری گفتگو کیا کچھ جادو کرسکتی ہے۔ یہ قصہ یقین دلائیگا۔ کہ بچوں کی صحیح تربیت کا طریقہ کیا ہے۔ ایسا دلچسپ اور دلآویز ہے کہ ختم کئے بغیر نہیں چھوٹے گا۔ یہ ادبی رنگینیوں کا بھی بس ہیرا ہے اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کے قلم کا ایک اچھا نمونہ ہے۔
قیمت صرف ۱۲

دامن باغباں مشہور ادیب اور صحافت نگار جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی کے منتخب اصلاحی افسانوں کا نہایت قابل قدر مجموعہ۔ ہر افسانہ ایک مستقل پیام ہے۔ اور ہر لحاظ سے کامیاب۔ طباعت وغیرہ عمدہ ونفیس۔ قیمت صرف عہ

پرواز خیال یہ نہایت دلچسپ۔ تین مکالموں اور چار مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے جو رسالۂ نیرنگ خیال میں پہلی بار شائع ہوئے اور بہت پسند کئے گئے۔ اردو میں نادر قسم کا تحفہ۔ طباعت وغیرہ عمدہ۔ قیمت صرف ۵

حجاب زندگی سید عابد علی صاحب بی۔ اے کے افسانوں کا مجموعہ طباعت عمدہ۔
قیمت ۱۲

داستان غدر ۱۸۵۷ء پر ایک دلچسپ اور پر از معلومات اور عبرتناک کتاب۔ از جناب ظہیر دہلوی
قیمت ۶

عورت کا دل یہ بنگال کے مشہور افسانہ نگار بابو ہیمندر کمار رائے کے ایک بہترین قصہ کا ترجمہ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ عورت اپنے محبوب کے لئے کیسے کیسے ایثار کرسکتی ہے۔ اور اس کا دل کیسی سخت سے سخت مصیبتیں برداشت کرتا ہے۔ ترجمہ بہت کامیاب اور شگفتہ
قیمت عہ

بڑی بی چار مزیدار پرلطف اور اخلاق آموز کہانیاں۔
قیمت ۱۲

ناظمہ کی آپ بیتی ایک شریف زادی کی عبرتناک سچی آپ بیتی دوشیزگی ازدواجی اور ایکٹرس کے تین عبرتناک پہلو۔ قیمت ۶

نصیحت کا کرن پھول ایک سچا اور پرتاثیر اصلاحی افسانہ از مولانا آزاد مرحوم
قیمت ۸

آفتاب زندگی مرزا عظیم بیگ چغتائی کا لکھا ہوا عورتوں کی اصلاح۔ تہذیب واخلاق کے لئے ایک نہایت دلچسپ قصہ۔ قیمت ۹

سدابہار پھول مہاشہ سدرشن کی لکھی ہوئی دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں۔ قیمت ۱۲

ناٹک کتھا خالص ہندوستانی رومان (۷) نہایت لطیف کہانیاں از نامور ادیب محمد عمر نورالٰہی صاحب۔ قیمت صرف ۸

چینی قزاق چین میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں موتیوں کی ہوس میں بے گناہ بیوی کا قتل گوروں کی گت۔ انتقام اور ہوس۔ فرمانروائی کی کارستانیاں بہت دلچسپ اور عبرت انگیز قصہ ہے۔ چینیوں کے عادات و اطوار پر اس سے خوب روشنی پڑتی ہے۔

قیمت عہ

الہامی افسانے

قرآنی قصص وحکایات نہایت دلچسپ وسبق آموز افسانوں کے پیرایہ میں ہزاروں نصائح کا مجموعہ۔ پچھلی قوموں کی معاشرت اور تمدن وغیرہ کا ہو بہو نقشہ بہت عمدہ کتاب ہے۔ طباعت وغیرہ اعلیٰ۔ مجلد ومطلا۔
قیمت حصہ ۱ و ۲ مکمل صرف ۶

الحمرا کے افسانے

مشہور امریکن مصنف واشنگٹن ارونگ کی شہرۂ آفاق تصنیف جس میں ہسپانیہ کے مسلمان بادشاہوں کے عہد کامرانی کی تصویر افسانوں کے پیرایے میں کھینچی گئی ہے۔ قیمت ۶

انگریزی افسانے

دنیا کے شاہکار افسانوں کا دوسرا حصہ۔ قیمت عہ

افسانہائے عشق

جناب حامد علی خاں صاحب ہمایوں کے دلچسپ افسانوں کا دلکش مجموعہ
قیمت عہ

چینی وجاپانی افسانے

مشرق بعید کے ممالک کے چیدہ قصص عشق کا مجموعہ ...... قیمت ۹

دلگداز افسانے

حضرت کوثر چاندپوری کے بہت مؤثر افسانوں کا مجموعہ
قیمت عمر

دردناک افسانے

مشہور ادیب جناب نسیم کے (۱۸) دلچسپ افسانوں کا مرقع جس میں مع مقدمہ حضرت شوکت تھانوی
قیمت صرف ۶

شاہکار افسانے

یہ اردو کے مشہور افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو جمن بکڈپو نے بڑے سلیقہ سے شائع کیا ہے۔ شروع میں حکیم سید آشفتہ لکھنوی کا مقدمہ بھی ہے۔ منشی سدرشن، علی عباس حسینی ایم اے، عابد علی صاحب، ڈاکٹر گروی، ل رموزی سبھی اس محفل کی رونق ہیں
قیمت عمر

غدر دہلی کے افسانے

خواجہ حسن نظامی صاحب کے غدر کے بہت سے دردناک .. اور حسرت انگیز حادثات وواقعات افسانوں کے انداز میں لکھے ہیں۔ بہت سی کارآمد معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ ۱۲ حصے۔

حصہ	عنوان	قیمت
حصہ اول	بیگمات کے آنسو	۸ر
حصہ دوم	انگریزوں کی بپتا	۸ر
حصہ سوم	محاصرہ دہلی کے خطوط	۴ر
حصہ چہارم	بہادر شاہ بادشاہ کا مقدمہ	۶
حصہ پنجم	گرفتار شدہ خطوط	عہ
حصہ ششم	غدر دہلی کے اخبار	۴ر
حصہ ہفتم	غالب کا روزنامچہ	۱۲ر
حصہ ہشتم	دہلی کی جانکنی	عمر
حصہ نہم	دہلی کا آخری سانس	عہ
حصہ دہم	غدر کی صبح وشام	عہ
حصہ یازدہم	دہلی کی آخری شمع	[illegible]
حصہ دوازدہم	غدر کا نتیجہ	۸

داستان رانی کیتکی

حضرت انشا کی ایک نادر کہانی جس میں فارسی عربی کا ایک لفظ نہیں اور کمال یہ کہ ہندی بھی ایسی کہ ہر شخص سمجھ لے۔ مع مقدمہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے۔ جدید نستعلیق ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔
قیمت ۱۲ر

سب رس

اردو نثر کی ایک قدیم ونایاب کتاب۔ اہتمام وصحت کے التزام سے مع مقدمہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے شائع ہوئی ہے۔ مصنف مولانا وجہی۔ سلطان قطب شاہ کے درباری ادیب تھے۔ یہ حسن اور دل کی بڑی رس بھری کہانی ہے۔ حقیقت کو مجاز کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد للعہ

محبت کا انتقام

فطرت نگار مہاشے سدرشن کا ایک حسرت انگیز ڈراما
قیمت عمر

۴

یوپی میں خوبصورت، صحیح، باشوکت اور بہترین طباعت کا واحد مرکز

ساغر پریس میرٹھ

(شعبۂ طباعت ادبی مرکز میرٹھ)

معیاری طباعت کو پسند کرنیوالے اصحاب کو نوید

ساغر نظامی کے زیرِ انتظام و نگرانی میرٹھ میں ساغر پریس نے جو کارہائے نمایاں کئے اُن کا بہترین نمونہ "بادۂ مشرق" ہے جسکی طباعت کے متعلق متفقہ طور پر ہندوستان کی یہ رائے ہے کہ اُردو تو کیا انگریزی زبان میں بھی اس شان کی کتاب نہیں دیکھی گئی، اگر آپ اپنی تصنیف یا کوئی کام بغیر کسی دقت و پریشانی کے اپنے مرکز پر مقیم رہ کر چھپوانا چاہتے ہیں تو منیجر ساغر پریس کو مطلع فرمائیے حسبِ منشا دلخواہ باصحت تیار کر کے آپکو پہونچا دیا جائیگا۔ نہ آپکو کاپیاں دیکھنے کی ضرورت ہوگی نہ پروف ملاحظہ کرینگے۔ خود ساغر نظامی کی نگرانی میں ہر کام پایۂ تکمیل کو پہونچایا جائیگا۔

خط و کتابت کیلئے پتہ:-

احدیار خاں منیجر "ساغر پریس" گھنٹہ گھر میرٹھ

(پرنٹر و پبلشر ساغر نظامی مطبوعہ ساغر پریس میرٹھ شہر)

مُدیر

ساغر نظامی

ادبِ لطیف کا شاہکار اور زندگی کے جمالیاتی رُخ کا آئینہ دار

ادبی مرکز میرٹھ سے ایک دوسرا باتصویر ماہانہ رسالہ

سالانہ قیمت عیہ (مع محصول)

پیمانہ

کا اجراء

زیرِ نظر :- ساغر نظامی ——— مُدیر :- اسدیار خان صہبا

یہ وہی رسالہ ہے جسکو ساغر نظامی نے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۲ء کامل دس سال ایڈیٹ کیا اور جو اس سے پہلے آگرہ سے شایع ہوتا تھا' اب خوبصورت سائز پر ساغر نظامی کی نگرانی اور صہبا صاحب کی ادارت میں ادبی مرکز میرٹھ سے جاری ہوا ہے' دلکش افسانے نفیس و رنگین نظمیں' بہترین مضامین' دلگداز غزلیں' مشاہیر شعراء کے تازہ افکار آرٹ کی تصاویر غرضکہ بہترین سامانِ مطالعہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ حجم ۵۲ صفحات' کاغذ سفید و چکنا۔ کتابت و طباعت نظر کش' اس پر بھی سالانہ قیمت محض ایک روپیہ۔ نمونے کیلئے ۲ آنے کے ٹکٹ ارسال کرنے ضروری ہیں۔

زندگی کے شور و شر سے جب آپکا دل و دماغ تھک کر چور ہو جائے تو "پیمانہ" ملاحظہ فرمائیے۔

ادبی مرکز۔ مکتبہ ساغر میرٹھ

برِّ اعظم ایشیا میں علوم و فنونِ لطیفہ کے عظیم المرتبت سرپرست اور اردو زبان کے سب سے بڑے حامی کے نام

میں ہندوستانی ادب کی اس کوشش کو جو ایشیا کی سہ ماہی جلد اوّل کی صورت میں نمودار ہوئی ہے

حضرت اشرف امیر الامراء نواب میر یوسف علیخاں
بہادر سالار جنگ ثالث

دام اقبالہ

کی ذات سے منتسب کرنے کی عزّت حاصل کرتا ہوں کہ نواب سالار جنگ بہادر دورِ حاضر میں مشرقی علوم و ادبیات کے سرپرست اور خاص کر اردو زبان کے سب سے بڑے حامی ہیں

دعا گوئے دولت و اقبال

ساغر نظامی

ہندوستانی زبان و ادب مشرقی تہذیب و تمدن اور مشرق کی روح آزادی کی پیشکش

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

ایشیا

زیرِ سرپرستی

زعیم قوم پرورعالی جناب ڈاکٹر سید محمود مدظلہ
وزیرِ تعلیم و ترقی صوبہ بہار

رفیق
حضرتِ جگر مرادآبادی
سید فرید جعفری (لندن)

اڈیٹر
ساغر نظامی

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

"بادۂ مشرق" پر ملک کے مشہور مزاح نگار ادیب حضرت شوکت تھانوی کی مزاحیہ تنقید

"بادۂ مشرق"

"یہ کتاب ان لوگوں کے لئے مفید ہے جو اپنی گوناگوں مجبوریوں سے عملی دنیا میں قدم قدم پر جھوٹے حلف اُٹھانے کیلئے مجبور ہیں"
(شوکت تھانوی)

"بادۂ مشرق آزادی کا آئینہ ہے" (عبدالاحد شرف الدین پوری)

"جن نادر اور جدید طریقوں سے اسکے (بادہ) اوراق کو آراستہ کیا گیا ہے ان کی مثال ہندوستانی طباعت میں تو کجا انگریزی مطبوعات میں بھی ہم نے اب تک کم دیکھی ہے"
(ادبی دنیا لاہور)

بادۂ مشرق سے سرشار ہو کر بے ساختہ یہ الفاظ زبان سے نکلتے ہیں کہ شباب، رنگینی اور موسیقی اس کلام کے عناصر ہیں اور ان اشعار میں ساغر کی وطن پرست آزاد روح بول رہی ہے۔
(رسالہ ادبی دنیا لاہور)

بادۂ مشرق کی اشاعت جس تزک و احتشام کی حامل ہے وہ اردو کی مطبوعہ کتابوں میں اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ آرٹ، حسن، تصور اور نفاستِ تخیل کا کوئی پہلو نہیں ہے جو اس کتاب کی ترتیب و تنظیم میں نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ "تیج ویکلی" ۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء

ادبستانِ مشرق کی یہ ایک عظیم الشان اور نادر تصنیف ہے جس میں جناب ساغر کا کمال شاعری اپنی تمام رعنائیوں، رنگینیوں، میگساریوں، اور شعلہ افشانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ تیج ویکلی۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء

۲

از حضرت شوکت تھانوی

اس سے قبل کہ کچھ اور عرض کیا جائے ضرورت اسکی ہے کہ ساغر صاحب سے اپنے تعلقات کو واضح کر دیا جائے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ ساغر صاحب میرے دوست ہیں مگر دوست کیوں ہیں یہ ایک طویل داستان ہے اور چونکہ داستان پُرلطف ہے لہذا حکایاتِ لذیذ کے ماتحت آتی ہے جنکو طوالت سے بیان کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس حکایتِ لذیذ کو بھی شارٹ ہینڈ میں بیان کر جاؤں اور قطرہ میں دریا والا شاعرانہ مضمون ذرا دلطب انداز سے "باندھ" جاؤں۔ ہاں تو۔ ساغر صاحب میرے دوست محض اسلئے ہیں کہ میں دشمنی کر کے ان سے جیتنے سے قاصر تھا۔ دشمنی بھی اور کر کے دیکھا کہ یہ دال گلنے والی نہیں ہے۔ اگر ادبی اور شعری مجالس میں ان کا ساتھ ہوا مگر اس طرح کہ وہاں گویا وہی وہ تھے، ہم جیسے تھے ہی نہیں۔ وہ چونکہ خوبصورت ہیں لہذا سب نے ان ہی کو دیکھا اور ان کے حسن کے مقابلہ میں ہماری قابلِ برداشت اور "خیر" قسم کی صورت کسی نے دیکھی نہیں۔ وہ چونکہ خوش آواز ہیں اور ان کے حلق میں بجائے رگ پٹھوں کے ہارمونیم کے پردے اتفاقاً لگ گئے ہیں لہذا سب نے ان ہی کو سنا اور جو کچھ ہمنے سنایا وہ گویا سنا یا ہی نہیں۔ یہ تمام منزلیں بھی گذر گئیں اور اس طرح گذریں کہ ہم نے ساغر صاحب

کو دیکھ کر اپنے سلسلہ میں فطرت کے بخل پر دانت پیسے۔ ان کی محبوبیت کے درجہ پر پہونچی ہوئی ہر دلعزیزی پر ٹھنڈی سانسیں بھریں۔ جلے۔ کڑھے۔ خودکشی کو دل چاہا
سینکڑوں قاتلانہ پروگرام بنائے لیکن جب ان میں سے کسی میں کامیابی نہ ہو سکی تو دل کو یہ سمجھا کر مطمئن کرنا چاہا کہ لاحول ولا قوۃ یہ بھی کیا تخیل ہے۔ ہم ساغر سے برے
ہیں تو کسی سے اچھے بھی تو ہوں گے وہ ہم سے خوش آواز ہیں تو ہم خود مولانا تاجور سے حامد اللہ صاحب افسر سے امین صاحب سلونوی سے ؟ اور اسی قسم کے تمام
ہیبتناک پڑھنے والوں سے خوش لحن ہیں اور اگر یہ نہ بھی ہو تو آخر ان خیالات کے ماتحت انسان کب تک مرے کہ ہمکو نظام حیدرآباد کیوں نہیں بنایا۔ ہم رضا شاہ
کیوں نہیں ہیں اور میری بیکفورڈ ہمارے گھر میں سے کیوں نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اسی قسم کی حکیمانہ تسلیوں سے دل کو قابو میں لائے اور جب کچھ نہ بنائے بن پڑی
تو آخر میں یہی طے کیا کہ ہم خود ہی کیوں نہ ساغر کے مداح بن جائیں۔ ان کو دوست بنائیں۔ ان سے محبت کریں اور ان کی خوبیوں پر جلنے کے بجائے خوش ہوں
یہ اسکیم ہنوز معرض بحث میں ۔ آکر منظور نہ ہونے پائی تھی کہ جناب ساغر نظامی نے اپنا مجموعۂ کلام بادۂ مشرق کے نام سے شائع کر دیا۔ جسکو دیکھ کر ایک گھونسہ کلیجہ پر
اور لگا اور بیساختہ ہمارے دل نے کہا کہ اب بتائیے جناب شوکت صاحب کہ آپ کے کھرستان کو لوگ دیکھیں گے یا اس بادۂ مشرق کو ؟ مگر ہم نے پھر اپنے کو سنبھالا اور اب
یہ طے کر لیا کہ واقعی اس شخص سے سوائے اس کے کہ خلوص کیا جائے اور کوئی صورت امن سے زندگی بسر ہونے کی نہیں معلوم ہوتی۔

یہ ہے ساغر صاحب سے بین ابتدائے ملاقات اول لغایت طباعت بادۂ مشرق تعلقات کا خلاصہ۔ اس کے بعد بجائے اس کے کہ میں ان تعلقات کے
موجودہ دور پر روشنی ڈالوں ذرا مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں بادۂ مشرق کی طرف بہک جاؤں اور اردو زبان اور مشرقی لٹریچر کے اس تاریخی اضافہ کے سلسلہ میں کچھ
عرض کر دوں۔

یہ کتاب ۶۴۰ صفحات پر محیط ہے اور ان حضرات کے لئے نہایت مفید ہے۔ جو اپنی گوناگوں مجبوریوں کے ماتحت عملی دنیا میں قدم قدم پر جھوٹے حلف
اٹھانے کیلئے مجبور ہیں کہ وہ اس کا ایک نسخہ پانچ روپیہ میں ادبی مرکز میرٹھ سے منگا کر ایک جزدان میں رکھ لیں اور اس قسم کے موقع پر نہایت آسانی کے ساتھ اسکو
اٹھا کر سر پر رکھ لیا کریں۔ اسکے بعد بھی اگر ان کی قسم پر کسی کو شک ہو جائے تو ہمارا ذمہ۔ رہ گئے صاحبان ذوق حضرات وہ اس اجیم جمیل۔ فیکل اور باوجود اس
دبازت کے لطیف مجموعہ سے زندگی بھر سر دھن سکتے ہیں۔ معاف کیجئے گا میں اس سلسلہ کے اس گوشہ میں پہونچ گیا جہاں اب سے کچھ دیر بعد پہونچنا چاہئے تھا
اس لئے کہ میں اس مجموعہ پر از بسم اللہ تا تائے تمت نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

مجھ کو ساغر صاحب نے جو کاپی عنایت فرمائی ہے اور جسکے متعلق خاص طور پر یہ بات کان میں کہدی ہے کہ کسی سے کہنا نہیں کہ یہ مدیہ ہے، بلکہ کہنا کہ
خریدی ہے" اس جلد کے سرورق پر ہندوستان کے فیشن ایبل مصور مسٹر سمیع کا موقلم بجائے خود شعر کہتا ہوا نظر آرہا ہے۔ سمیع صاحب یوں تو مصور ہی ہیں اور مصور
بھی مگر اس ٹائٹل میں تو گویا خود ہی کھنچ کر رہ گئے ہیں اور ٹائٹل ہی پر کیا منحصر ہے اس مجموعہ کے ہر باب کے سرورق کو آپ ہی نے مصور کیا ہے اور ہر جگہ آپ کے
نقش ونگار ذی حیات نظر آتے ہیں یقیناً قیامت کے دن ان کو ان تمام نقوش میں روح پھونکنا پڑیگی۔ سرورق کے بعد دوسرا سرورق خوشۂ انگور پر بنایا گیا
ہے۔ جسمیں ساغر صاحب کا نام پیچ ہی ساغر نظر آتا ہے اور ہر انگور سے شراب کھنچتی ہوئی رستی اور برستی معلوم ہوتی ہے ان مختلف ٹائٹلوں کے بعد انتساب ہے جو نواب
سر سالار جنگ ثالث کے نام سے ہوا ہے۔ انتساب کے ساتھ ہی سر سالار جنگ بہادر کی تصویر بھی ہے جو ایسے رخ سے کھینچی گئی ہے کہ آپ خود ساغر کا استقبال کرتے
نظر آتے ہیں۔ انتساب اور صاحب انتساب کے بعد فہرست ہے اور اس فہرست کے مطابق سب سے پہلے بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کا مقدمہ ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو
اول تو خود شاعرہ ہیں۔ دوسرے عورت ہیں۔ تیسرے ہندوستان کی سرکش قوم کی خاتون سپہ سالار کی حیثیت سے یوں بھی ان کو تکلفات کی ضرورت نہ تھی۔
پھر یہ کہ وہ ساغر سے کیا ساغر کی خداوند نعمت حکومت سے بھی دینے والی نہیں مگر اس کے باوجود انھوں نے اپنے اس مقدمہ میں ساغر کی شاعرانہ اہلیت کا نہایت
وسیع النظری کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ یہ مقدمہ تو خیر ایک ضابطہ کی چیز ہے مگر میں نے تو مسز نائیڈو کو اس عالم میں بھی دیکھا ہے کہ لکھنؤ کانگریس سشن کے
مشاعرے میں آپ صدر ہیں ساغر شراب کے رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے پھولدار صوفے پر اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں کہ گویا صوفہ کا کوئی گلاب جھوم کر ساغر بن
گیا ہے مسز نائیڈو اپنا خطبۂ صدارت ارشاد فرمانے کے لئے کھڑی ہوتی ہیں اور ادب وشعر پر عالمانہ بحث کرتے کرتے فرماتی ہیں کہ ہندوستان کے گلستان

کی جان اب ایسے ایسے گلاب ہیں" ایسے ایسے" کا اشارہ ساغر کی جانب تھا اور اشارہ بھی کس کا بلبلِ ہند کا۔ تمام مجمع مسکرایا اور ساغر ہنس کر سچ مچ گلاب بنگئے

سروجنی دیوی کے اس مقدمہ کے بعد دیباچے شروع ہوئے ہیں۔ پہلا دیباچہ حضرت خواجہ حسن نظامی کا ہے۔ جسمیں وہ اپنے مخصوص روسی طرز نگارش کے ساتھ نمایاں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس دیباچے کے ہر لفظ میں خواجہ صاحب مسکرا مسکرا کر اپنے ایک مرید پر فخر فرما رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کے بعد دوسرا دیباچہ مولانا سیماب اکبر آبادی کا ہے اور خوب ہے۔ آدھا نثر میں آدھا نظم میں اور دونوں ڈیڑھ صفحہ کے اندر۔ تیسرا دیباچہ مولانا انجمن ترقیِ اردو کا ہے۔ یہ دیباچہ ذرا علمی قسم کا ہے۔

ان دیباچوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے کہ درمیان میں مسز ہیسٹر مردن ہینڈلے واشنگٹن امریکہ کی مشہور آرٹسٹ خاتون کا چارکول سے تیار کیا ہوا ساغر کا اسکیچ ہے جسمیں ساغر کے تمام خط دخال پورے طور پر نمایاں ہیں اور بحیثیت مجموعی معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ کلایو کا تخلص ساغر تھا اور تاریخ کی جدید دریافت یہ ہے کہ لارڈ کلایو خواجہ حسن نظامی صاحب کے مرید بھی تھے غالباً یہی وجہ ہے کہ انگریز قوم کو خواجہ حسن نظامی صاحب کے وطن ہندوستان سے محبت پیدا ہوئی اور آج خواجہ صاحب کا وطن دہلی ہندوستان کا پایۂ تخت بنا ہوا ہے۔ اسکیچ بھی ساغر کی زندگی کے اہم واقعات میں سے ایک واقعہ ہے انجیل میں تو یہ آیت نہیں مگر کسی اور مذہبی کتاب میں ضرور ہوگی کہ "مبارک ہے وہ ہندوستانی جسکی تصویر کشی بطور اعتراف فن مس ہوپ کی ایک بہن اپنی مرمریں انگلیوں اور اپنی بلور کی بنی ہوئی کلائیوں سے کرے، اس لئے کہ وہ جنت میں حوروں کا مالک ہوگا۔"

اس اسکیچ کے بعد ایک دیباچہ اور ہے جو ڈاکٹر سید محمود صاحب نے لکھا ہے۔ جسمیں آپ فرماتے ہیں

"یہ نوجوان شاعر اردو شاعری اور اردو انشا پردازی میں بہت سی جدتوں کا موجد ہے
اسکی شاعری روحانیت، نازک خیالی، تخیل۔ فلسفیانہ رفعت۔ شباب، زندگی۔
جذبات محبت۔ اور خاص کر جذبات حب الوطنی سے پُر ہے۔"

اعتراف۔ اعتراف ہے یا محبت اس کو ساغر صاحب جانیں بہرحال اگر اعتراف نہیں بلکہ محض اظہار جذبات ہے تو بھی بُرا کیا ہے۔ مگر ڈاکٹر محمود کا ایسا ذمہ دار فرد محض اظہارِ جذبات کے لئے اس قدر نہیں کہہ سکتا لہذا معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان پر ساغر کا واقعی یہ اثر ہے۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ اثر صرف ہم ہی پر ہوا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ کم سے کم اس سلسلہ میں ہم بھی اپنے وقت کے ڈاکٹر محمود ہیں۔

دیباچوں کے بعد ساغر صاحب نے جرعات کے زیرِ عنوان گویا وہ چیز لکھی ہے جسکو ہم لوگ اپنی زبان میں عرضِ حال کہتے ہیں اور ان جرعات کے بعد گویا بادۂ مشرق کا دور شروع ہوتا ہے۔

میں یہاں ساغر نظامی کے شاعرانہ عیوب و محاسن کا شمار کرانا نہیں چاہتا اور نہ خواہ مخواہ تنقید میں ٹانگ اڑا کر خود بحیثیت مزاح نگار کے جاڑیں شانے چت گرنا چاہتا ہوں بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بادۂ مشرق کے متعلق اس رائے کو پیش کر دوں جو خود میں نے قائم کی ہے لہذا مجھ کو ذرا آزادی کے ساتھ چلنے دیجئے اور جانے دیجئے جدھر میں جاؤں۔

ساغر صاحب کے متعلق اربابِ علم۔ سخن سنجانِ ملک و ملت۔ نقادانِ وقت اور اس قسم کے دوسرے ذمہ دار افراد کی جو رائے بھی ہو اس سے خالی الذہن ہو کر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس شاعرِ مشرق کو میرے محسوسات میں کیا حیثیت حاصل ہے۔

ساغر صاحب کے متعلق یہ مضمون لکھتے ہوئے خدا جانے کیوں میں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہوا جا رہا ہوں۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں ڈر رہا ہوں یا بیمار ہوں یا ساغر صاحب کو کوئی مذہبی چیز سمجھتا ہوں یا ان کے بادۂ مشرق کو مسجد یا باجہ قسم کی کوئی چیز سمجھتا ہوں حالانکہ ان میں سے کوئی بات نہیں۔ بلکہ واقعہ صرف یہ ہے کہ میں اس الجھن میں ہوں کہ آخر لکھوں تو کیا لکھوں۔ اس۔ لئے بادۂ مشرق ساغر کے کلام کا مجموعہ ہے اور ساغر کو محبت کے مارے صرف میں ہی نہیں بلکہ عداوت کی وجہ سے ان کے حریف بھی شاعرِ وقت کہتے ہیں اور سچ پوچھئے تو ان سے عداوت کی وجہ ہی جلنے والوں کیلئے صرف

یہ ہے کہ وہ شاعرِ وقت کیوں ہیں! ؟

قصہ دراصل یہ ہے کہ ان حضرت نے شعر کہہ کر اور شعر سنا کر دنیائے شعر میں نئے نئے راستے پیدا کئے بلکہ یہ کہئے کہ آپ دنیائے شعر کے واسکوڈی گاما بنکر آئے اور ایک نئی دنیا دریافت کی۔ پہلے تو سخت مخالفتیں ہوئیں جس نے ساغر کو سنا وہی کھولا۔ جس نے ساغر کا کلام دیکھا وہی ڈنڈا لیکر تنقید لکھنے بیٹھ گیا۔ شعرائے کرام کے حاسد طبقہ میں کھلبلی سی مچ گئی، بڑے بڑے بت انہدام کے خوف سے حرکت میں آگئے اور ساغر کو اس میدان سے ہٹانے، ان کو چپ کرنے، ان کو بے اثر بنانے مختصر یہ کہ ان کو ہر ممکن طریقہ پر دبانے کی پوری کوششیں ہوئیں مگر یہ جادو جاگ رہا تھا اور سروں پر چڑھ کر بول رہا تھا آخر کار اس واسکوڈی گاما نے اپنی دریافت کی ہوئی دنیا پر اپنا پرچم لہرا دیا اور حکمرانی کرنے لگا۔ اب حکمرانی کرتے کرتے آپ کو خدائی کی سوجھی ہے اور بادۂ مشرق کے نام سے ایک کتاب نازل فرمائی ہے۔

مجھ کو ساغر کی غزلیں بھی پسند ہیں اور نظمیں بھی اردو بھی پسند ہے اور ہندی بھی مگر ان کا ہندی کلام تو بعض اوقات ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں لیڈرانہ انداز سے یہ کہوں کہ ساغر نے ہندی الفاظ کو اپنا کر جس طرح اپنے اشعار میں جگہ دی ہے اس سے ملک کی مشترکہ زبان کا مسئلہ خود بخود طے ہو جاتا ہے۔ جی نہیں ان امور کو تو ڈاکٹر محمود۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ گاندھی جی وغیرہ سمجھ سکتے ہیں مگر میں تو صرف اتنا سمجھا ہوں کہ ساغر نے اردو، ہندی یا فارسی کی کوئی قید ہی نہیں رکھی ہے بلکہ جس زبان میں ان کو جتنی شعریت نظر آئی اسکو بلا شرکت غیرے اپنا کر بیٹھ رہے۔ ہندی ہو یا اردو فارسی ہو یا سنسکرت یہ بھونرا ہر ایک کا رس چوس کر محض اپنی شیریں دہنی سے کام رکھتا ہے۔ بہرحال مجھ کو ساغر کی ہندی نظموں سے عشق ہے اور میں دنیا کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ شاعرِ مشرق کے اس رنگ کو دیکھ کر میرے معیارِ انتخاب کی تمیز داری کا فیصلہ کرے۔

صاحب، اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا ان کی نظم "روح کا شوالہ" بار بار یاد آرہی ہے۔ اس کا ایک بند سُن لیجئے۔

جیون میرا روپ بدل کر بن جائے اک ہار — ان کے گلے کا ہار بچاری میرا من سنگھار
مجھ کو گلے یوں پڑتے دیکھیں دیوی وہ من ہار — گُندھ جاویں اک ہار میں دونوں سنسار اور ساکار
تجھ کو کیوں ہے عار بچاری کچھ تو منہ سے بول
پٹ مندر کے کھول

میرا دعویٰ ہے کہ جھوم تو سب ہی جائیں گے خواہ اس کے بعد سوچ کر مخالفت کریں۔ خدا کرے سنسار اور ساکار کی طرح زبان اور رسم الخط کے معاملہ میں مولانا عبدالحق اور گاندھی جی یعنی انجمن ترقی اردو اور ہندی ساہتیہ سمیلن ایک ہی ہار میں گندھ جاویں اور وہ ہی زبان ہو جسکی طرح ساغر نے ڈالی ہے

۵

یعنی "روح کا شوالہ" کی زبان جسمیں عار، سنسار، اور ساکار سب بغیر کسی امتیاز کے استعمال ہو رہے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ یہ علیحدہ علیحدہ مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ خیر یہ تو ایک سنجیدہ بحث چھڑ گئی۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شعر میں جو نشتر، جو رس جو دیوانہ گری ہونا چاہیئے کیا وہ اس چیز میں نہیں ہے جو ساغر نے پیش کی ہے اور جسکا ایک پرتو میں نے آپ کو دکھایا ہے اور سنئے ؎

ٹوٹ چکا اے ساجن درپن ٹوٹ چکا
کون اب دیکھے کون دکھائے — ٹوٹے کو اب کون اُٹھائے
کس کی صورت اس میں آئے — کس کی مورت اس کو بھائے
ساجن میرے من کا درپن
ٹوٹ کے بھی جوہر دکھلائے
ٹوٹ چکا اے ساجن درپن ٹوٹ چکا

میں ساغر کے کلام کے ہر رنگ کو کہاں تک پیش کروں گا اور کیونکر پیش کرنے کے بعد زندہ رہوں گا اسی رنگ پر مجھ کو جھومنے دیجئے اور آپ میرا ساتھ دیجئے ایک چھوٹی سی نظم سنا کر میں اس مضمون کی اس قسط کو ختم کرتا ہوں۔

سندر نین رس بھرے بھونرا رس کو آئے
کالی زلفیں موہنی جیسے بدری چھائے
دو بھر ہو جینا اُسے جو تم سے نیہہ لگائے
سسک سسک کر جان دے بلک بلک مر جائے
کیوں وہ اپنے داس کو درشن دینے آئے
کیوں وہ اپنے حسن کا روپ انوپ دکھائے
اے پریمی کیوں آس میں اپنے نین تھکائے
اس کی تو خود چاہ ہے بلک بلک مرجائے

گانے کو دل چاہتا ہے اور اگر آپ اسکو مزاح نہ سمجھیں تو گھنگرو باندھ کر ناچنے کو دل چاہتا ہے اور آخر میں مرجانے کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اب بتائیے کہ جب ایک مزاح نگار پر بھی ساغر کا کلام یہ اثر کر سکتا ہے تو سنجیدہ طبقہ کا کیا حال ہوگا ! ؟

شوکت

بادۂ مشرق محترمہ جہاں آرا بیگم صاحبہ شاہنواز ایم ایل اے کی نگاہ میں

ساغر نظامی، ہمارے اُن نوجوان شاعروں میں سے ہیں جو ہمیں مستقبل کا اُمید افزا پیغام دیتے ہیں۔ ہمارا قومی ادب پستی اور یاس کی گہرائیوں میں گر چکا تھا، خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بعض نوجوان ادیب اسے اُمید اور اتحاد کی بلندیوں کی طرف لئے جاتے ہیں، ہمارے ملک و قوم کی جو حالت ہے اسے دیکھتے ہوئے ایسے شاعروں کا وجود ایک قومی کامیابی کا پیش خیمہ ہے، جو قوم کے افراد کو یگانگت انسانی ہمدردی اور فطری توانائی کا سبق دیں۔ ساغر صاحب ایک ایسے شاعر ہیں۔ اُن کے پڑھنے کا انداز سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔ اُنکی نظمیں انھیں سے سننی چاہئیں۔ سننے والے پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے جسکا نقش مدت تک قائم رہتا ہے۔

میں نے فرصت کے اوقات میں اُنکا دیوان "بادۂ مشرق" پڑھا ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ لاجواب کتاب دیکھنے، پڑھنے اور پاس رکھنے کے قابل ہے، اسکی ظاہری اور معنوی خوبیاں یکساں ہیں جا بجا خوبصورتی اور رنگینی نے ظاہری اور معنوی حیثیت سے ایک ادبی گلزار کی صورت پیدا کر دی ہے۔ "بادۂ مشرق" ہر ہندوستانی گھر میں موجود ہونی چاہئے۔

جہاں آرا شاہنواز۔ لاہور، ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء

آزادی کا آئینہ

بادۂ مشرق کو میں نے اکثر دیکھا۔ اور اب بھی اکثر دیکھتا ہوں، بلکہ تکیہ کے پاس رکھتا ہوں کہ مبادا پڑھنے کیلئے جی چاہ جائے۔ بسا اوقات میں اسکی ظاہری خوبیوں اور باطنی حسن کا مقابلہ کرنے بیٹھ جاتا ہوں لیکن اب تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ ظاہر و باطن میں کسکا پلہ بھاری ہے، کتابت اور طباعت کی جدتوں کو دیکھتا ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ بس دیکھتا رہوں اور جب کلام پڑھنا شروع کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ قلب کی آواز ہے جو کاغذ پر الفاظ کے پیکر میں موجود ہے۔ میرے لئے بہت مشکل ہے کہ بادہ کے متعلق کچھ عرض کروں۔

ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان اُردو کی ہزاروں کتابیں طبع ہوچکی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب تک اتنی شاندار اور جدتوں کی حامل کتاب زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس کی طباعت کو دیکھکر "ساغر پریس" کی خوبیوں کا اندازہ کرنیکا موقع بھی مل گیا ہے کیونکہ یہ کتاب میرٹھ کے ساغر پریس کی طباعتی خوبصورتی کی زندہ یادگار ہے۔

بادۂ مشرق، حقیقت میں بادۂ مشرق ہے، جسے ہر مشرقی کو اپنے ہونٹوں سے لگاکر وطنی فرض ادا کرنا چاہیئے۔ ایک مشرقی کو زندگی کس طرح گذارنی چاہیئے اس کو ملک و وطن کی کس طرح اور کیا خدمت کرنی چاہیئے اپنا فرض کیونکر ادا کرنا چاہیئے، بادۂ مشرق کے مطالعہ سے نہایت آسانی سے معلوم ہوسکتا ہے۔ بادۂ مشرق آزادی کا آئینہ ہے۔ خدا ساغر کو ملک کیلئے وطن کے لئے اور قوم کے لئے عمر نوح عطا فرمائے۔

مولانا (عبدالاحد شرف الدین پوری)

رسالہ "ادبی دنیا" لاہور کی رائے

"بادۂ مشرق" حضرت ساغر نظامی کے کلام کا مبسوط مجموعہ ہے جو تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ معنوی خوبیوں سے قطع نظر ظاہری حسن کی تخلیق میں اتنا اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر گام پر گوناگوں دل کشیاں دامن دل کو کھینچ کر محو حیرت بنا لیتی ہیں۔ جن نادر اور جدید طریقوں سے اس کے اوراق کو آراستہ کیا گیا ہے ان کی مثال ہندوستانی طباعت میں تو کجا انگریزی مطبوعات میں بھی ہم نے اب تک کم دیکھی ہے۔ تمام کتاب پارچمنٹ کاغذ پر چھپی ہے اور کتابت میں دیدہ زیبی کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ جلد آرٹ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

مجموعے کے آغاز میں مسز سروجنی نائیڈو، خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالحق اور ڈاکٹر سید محمود کے دیباچے ہیں جن میں اس کے محاسن کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان بزرگوں کے انتقادات کے ہوتے ہوئے اپنی طرف سے کسی رائے کا اظہار بے ادبی معلوم ہوتی ہے اور یوں بھی اہل ذوق میں سے کون ایسا بدقسمت ہوگا جس نے ساغر کے نغمات سے لطف نہ اُٹھایا ہو لیکن "بادۂ مشرق" سے سرشار ہوکر بے ساختہ یہ الفاظ زبان سے نکلتے ہیں، کہ شباب، رنگینی اور موسیقی اس کلام کے عناصر ہیں۔ ان اشعار میں ساغر کی وطن پرست آزاد روح بول رہی ہے اور اہل وطن کو وطنیت کی عظمتوں اور مسرتوں کی طرف بلا رہی ہے۔

بادۂ مشرق میں نظمیں۔ غزلیں۔ گیت۔ رباعیاں سبھی اصناف موجود ہیں اور اس فراوانی سے ہیں کہ یہ مختصر سی تنقید ان کے انتخاب کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی۔ ہم "ادبی دنیا" کے ناظرین سے یہی کہیں گے کہ وہ اسے خود منگا کر دیکھیں اور اس کے موضوعات سے بصیرت حاصل کریں۔

قیمت قسم اول چھ روپے، قسم دوم پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ ادبی مرکز گھنٹہ گھر میرٹھ

رسالہ ادبی دنیا لاہور۔ نومبر ۱۹۳۶ء

"سچ ویکلی" دہلی کی رائے

"بادۂ مشرق" (مصنفہ جناب ساغر نظامی) تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۶۴۰ صفحات۔ (قیمت فی جلد پانچ روپیہ)

جناب ساغر کی اس تصنیف پر جوان کے بلند و کیف آفریں کلام کا ایک نادر الوجود مجموعہ ہے اور جو اپنے دامن میں آتش نوائیوں اور نغمہ ریزیوں کا

ایک لازوال خزانہ لئے ہوئے ہے ریویو لکھنے سے پہلے ہم اس کتاب کے حسنِ ظاہری کے متعلق چند سطریں لکھنی چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ صورت و معنی کا رشتہ ہمیشہ سے یہی ہے کہ صورت پہلے دکھائی دیتی ہے اور معنوی محاسن بعد کو نظر آتے ہیں" بادۂ مشرق" کی اشاعت جس تزک و احتشام کی حامل ہے وہ اردو کی مطبوعہ کتابوں میں اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ آرٹ، حسن، تصوّر اور نفاستِ تخیل کا کوئی پہلو نہیں ہے جو اس کتاب کی ترتیب و تنظیم میں نظر انداز کر دیا گیا ہو، کتابت نہایت صاف اور بے عیب ہے۔ کاغذ بہت چکنا اور قیمتی ہے اور طباعت اپنی مثال آپ ہے۔ "بادۂ مشرق" بارہ ابواب پر مشتمل ہے اور ان ابواب کی تقسیم بھی بیحد دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اردو کی بہت کم کتابیں اس اہتمام و التزام کے ساتھ چھپتی ہیں اور ساغر صاحب نے "بادۂ مشرق کو دنیائے شعر و ادب کے علاوہ دنیائے طباعت و اشاعت کے لئے بھی ایک قابلِ تقلید مثال بنا دیا ہے۔

بادۂ مشرق کے حسنِ معنوی کو دیکھ کر جب ہم تبصرہ لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے

ادبستانِ مشرق کی یہ ایک عظیم الشان اور نادر تصنیف ہے جس میں جناب ساغر کا کمالِ شاعری اپنی تمام رعنائیوں، رنگینیوں، میگساریوں اور شعلہ افشانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس میں ایک طرف اگر احساسِ قومیت کا بلند ترین جذبہ، وطن پرستی کا جوش و خروش، انسانی اخوّت کا درس، حریت کی تعلیم اور آزادی کی طلب دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے تو دوسری طرف پُرکیف زندگی کی ایک وسیع دنیا جام بہ دست اور میخانہ بدوش نظر آتی ہے" بادۂ مشرق" جن گرانمایہ عناصر اور لطیف اجزا کا مجموعہ ہے وہ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور روحانیت کا ایک لطیف پہلو لئے ہوئے بقائے حیات کی دعوت دیتے ہیں۔

تیج دہلی دہلی ۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء

آنریبل جسٹس شاہ سلیمان (بالقابہ) کا مکتوبِ گرامی

الہ آباد ۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء

پیارے مسٹر صمد یار خاں

بادۂ مشرق کی اعزازی جلد جو آپ نے ارسال فرمائی اسکی شکر گذاری میں جو تاخیر ہوئی اسکے متعلق اظہارِ افسوس کرتا ہوں۔ میں نے آپ کے بلند پایہ منظومات کو جو نہایت اعلیٰ معیار کے ہیں، بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا کیونکہ آپ خود ایک شاعر مشہور ہیں اس لئے ان کی تحسین میرے لئے غیر ضروری ہے مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کے منظومات کو وہی مقبولیت اور استحسان حاصل ہوگا جس کے کہ وہ مستحق ہیں

طباعت کی نفاست اور کتابت کے (Get up) نے جو آپ ہی کے پریس (ساغر پریس) کا رہینِ منت ہے اس کے حسن کو دوبالا اور اسکی قیمت کو افزوں کر دیا ہے

آپکا مخلص۔ شاہ محمد سلیمان

اسد یار خاں اعظم منیجر مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

فہرست

سالانہ چندہ صہ/ ششماہی ہے/

قیمت فی پرچہ عہ/

رسالہ "ایشیا" ماہی اکتوبر، نومبر، دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء

شمارہ	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ	شمارہ	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۶۰	بنیادی حقوق و فرائض اور کانگریس کا اقتصادی پروگرام	جنرل سیکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی الہ آباد	۱۶۴	۶۳	عارف	ایڈیٹر	۱۶۸
				۶۴	خضر راہ	ایڈیٹر حکیم یوسف حسن	۱۶۸
۶۱	منروا فلم کمپنی	" " "				**اخبارات**	
		رسائل		۶۵	باتصویر ترقی ہفتہ وار	ایڈیٹر حضرت عمر انصاری	۱۶۸
۶۲	ہندوستانی ماہنامہ	ایڈیٹر رشید کمالی ایم-اے					

”ایشیا“ کے معزز خریداروں سے!

اصولی نوعیت تو یہی ہو کہ جس وقت تک ادبی مرکز اس نمبر کے علاوہ ۵ نمبر آپ کی خدمت میں اور نہ پیش کر دے آپ خریداری کا اعادہ نہ فرمائیں اور ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ ۵ نمبر پیش کئے بغیر دوبارہ سالانہ چندہ نہ طلب کریں۔ لیکن بہرحال یہ حقیقت بھی ایشیا کے سرپرستوں پر روشن ہو کہ ادارۂ ”ایشیا“ اُن کی روحانی و دماغی ضیافت، تجارتی اصولوں سے آزاد ہو کر کر تا رہا ہے اس معمولی سے خلاقی امکان کی بنا پر ہماری استدعا ہے کہ اگر اس نمبر کے بعد قدیم خریدار اپنی خریداری کا اعادہ فرماتے ہوئے مبلغ صہ بذریعۂ منی آرڈر ارسال فرما دیں گے تو اُن کی یہ لوازش ایک امدادِ ادبی کی حیثیت رکھے گی اور ہم اپنے خیالات و تصوّرات کو عملی جامہ پہنا سکیں گے۔ منیجر

لارڈ کلایو کے سیاہ کارنامے

تصحیح - مندرجۂ بالا عنوان کے ماتحت صفحہ ۱۷ سطر ۱۴ پر ”سبکدوشی“ غلطی سے چھپ گیا ہے۔ ”سبکدوشی“ کے بجائے سبک دستی پڑھا جائے

دیوان غالب طاہر ایڈیشن

حضرت مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے نبیرہ اور میرے دوست آغا طاہر صاحب دہلوی نے نہایت حسین و جمیل ” دیوانِ غالب طاہر ایڈیشن مجلّا و مطلّا آرٹ پیپر پر شائع کیا ہو جو تمام کا تمام بلاک سے چھاپا گیا ہو اور دیوان غالب کا صحیح ترین نسخہ ہو۔ جرمنی دیوان غالب کے مقابلہ میں یہ سب سے پہلا پاکٹ ایڈیشن ہو جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بدرجہا بہتر ہے۔ جرمنی ایڈیشن لوہے کے مصری حروف کی وجہ سے بہ آسانی نہیں پڑھا جا سکتا۔ لیکن دیوان غالب طاہر ایڈیشن جو دہلی کے اعلیٰ ترین ماہر فن خوش نویس کا لکھا ہوا اور تمام کا تمام بلاک کا چھپا ہوا ہے۔ ہر ورق پر آئینہ پیش کرتا ہو۔ شروع میں مرزا اسد اللہ خان غالب کی شبیہ ہو اس کے بعد اِن کے مزار کا فوٹو، اور فوٹو کے بعد اِن کے خط اور مُہر کا بلاک ہے ہم آغا صاحب کو اس ایڈیشن کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اُنھوں نے مشرق کے شاعرِ اعظم کے کلام کا صحیح ترین نسخہ شائع فرما کر اردو ادب پر بڑا احسان فرمایا ہو۔ قیمت مجلّا و مطلّا عہ علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ :- آزاد بک ڈپو کوچۂ چیلان دہلی (۲) مکتبۂ ساغر میرٹھ

بسمہٖ

ادبی مرکز کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

ایشیا (میرٹھ)

مرتّبہ ساغر

جلد ۳ | بابت اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۷ عیسوی | نمبر ۱

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا ——— !

کامل ایک سال کے بعد ایشیا پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے اس سے پہلے بھی اس کی حاضری ممکن تھی، لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ پیدا ہو کر پھر زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو جائے۔ پورا ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کا آغاز میرے لئے جن ذاتی مصائب اور پریشانیوں کا باعث بنا رہا۔ اس کی رام کہانی آپ کے سامنے رونا اس لئے لاحاصل خیال کرتا ہوں کہ خدمت کے نتیجوں کو آپ سے تعلق ہے کہ میری ذاتی مصیبتوں سے! اور ذاتی مصیبتوں کا سہارا لے کر کوئی بیان صفائی دینا بھی میرے نزدیک دیانت داری نہیں ہے۔ بلکہ مصیبت جیسی خطرناک شے سے ناجائز فائدہ اُٹھانا ہے۔

میں نے ایشیا کی اشاعت کے عظیم بار کو اپنے کاندھوں پر اُٹھایا اور اُٹھائے رہا۔ گو سفر رُک رُک کر منزل بہ منزل جاری رہ سکا لیکن ہمت ہار جانے والے مسافروں میں میرا نام نہیں لکھا جا سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ مسافر کے پاس زادِ راہ کم اور "متاعِ ہمت" زیادہ تھی۔ زادِ راہ ختم ہو گیا مگر "متاعِ ہمت"

میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی ؎

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی ۔۔۔ کہ میری زندگی کیا ہے یہی طغیانِ مشتاقی

یہی "طغیانِ مشتاقی" آخر ایک ایسے مرکز پر لے آیا جو منزل رس بھی ہے اور "متاعِ ہمت"، "طاقتِ سفر" میں ایک توازن بھی قائم کر سکتا ہے۔ یعنی ایشیا کو سہ ماہی رسالے کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے اور اس وقت تک وقت کی پوری پابندی کے ساتھ شائع کیا جاتا رہے گا جس وقت تک کہ ادبی مرکز ایشیا کو از سرِ نو ماہنامہ کی صورت میں شائع کرنے کی طاقت حاصل نہ کرلے۔ اس وقت تک ایشیا کے جس قدر نمبر شائع ہوئے ہیں اُن کے مطالعہ سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ایشیا کی اشاعت تجارتی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر ہندوستانی لٹریچر کی تجارت سے ہندوستان میں روپیہ کمایا جاسکتا ہے تو اس تخیّل کو بھی حقیقت تسلیم کیا جاسکتا ہے ورنہ اس حقیقت کو تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ادبی کام کرنے والوں کو قدم قدم پر جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ روح کو گھلا دینے والی اور دماغ کو چکرا دینے والی ہیں۔

ذرا کچھ اور غور کے ساتھ اگر اس مسئلہ کے متعلق سوچا جائے تو اس کا سلجھانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ کسی تحریک یا کسی کام کو چلانے کے لئے سب سے بنیادی شے "سرمایہ" ہے۔ اور ع

اہلِ نوا کے حق میں بجلی ہے "آشیانہ"

"سرمایہ" ہی ہمارے پاس نہیں ہے۔ دوسری بدبختی تجارتی ذہنیت کا فقدان ہے۔ باوجود اس طاقت کے جو عوام کی محبّت و ہمنوائی نے ہم کو عطا کی ہے۔ ہم اپنی جدوجہد میں توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔ کیونکر رکھ سکتے ہیں۔ محبّت و ہم نوائی کے جواب میں تجارت کرنا غیر شاعر کا تو کام ہو سکتا ہے شاعر کا کام ہرگز نہیں ہوسکتا!

یہ ہیں وہ نفسیاتی وجوہ و اسباب جو میں معلوم و محسوس کرسکا ہوں۔ تجارت اور شاعری دو بالکل مختلف راستے ہیں۔ مگر ہندوستانی ادب اور زبان کی خدمت کرنے کے لئے ہم کو ان راہوں پر قدم رکھنا ہی پڑے گا۔ جو تنظیم سے تعلق رکھتی ہیں۔ زندگی ایک کھلی ہوئی جہدی حقیقت ہے اس کو ہم جمود و انتشار میں کبھی نہیں پاسکتے۔

باوجود اپنی کم مائگی اور خامی کے میدان میں ڈٹ کر زمانے کا اور خود اپنا مقابلہ کرنا کسی تیسری طاقت ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ وہ طاقت کیا ہے!؟ اقبالؔ نے خوب کہا ہے ؎

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں ۔۔۔ خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

اک آگ ہے اک چنگاری ہے جو تمام پیکر کو پھونکے دیتی ہے اور بغیر تصورِ نتائج کے مصروف رکھتی ہے۔ کبھی شعر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے کبھی نثر کی صورت میں، کبھی ایشیا کی صورت میں اور کبھی پیمانہ کی شکل میں، اگر اس آگ سے تقدیرِ ملک اور قسمت قوم کے تاریک و ویران کھنڈروں میں کبھی کسی روشنی کی نمود ہوسکی تو بس یہی ہماری تمام شعلہ نوائی اور دل سوزی کا حاصل ہوگا۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات ۔۔۔ ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

ایشیا کے تمام دوست اور خاص طور پر "خریداروں" کو اس کی غیر حاضری سے جو شدید روحانی تکلیف ہوئی وہ اس لئے معاف کردینے کے قابل ہے کہ آپ سب سے زیادہ میں خود ایک روحانی کرب میں مبتلا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ نئے انتظامات سے عمل میں جو ثبات پیدا ہوگا وہ آپ کی تسکینِ روح اور تفریحِ نظر کا سامان اپنے ساتھ ضرور لائے گا۔

ایشیا کو سہ ماہی کرنے کے بعد ماہنامہ "پیمانہ" کا اجراء جولائی ۱۹۳۷ء سے کردیا گیا ہے۔ اس کے اجراء کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ محض شعر و

۱۳

ادب اور لطیف مضامین کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں وہ محض ایک روپیہ سال میں بہترین اور اعلیٰ ترین ادب لطیف پیمانہ میں مطالعہ کر سکیں لٹریچر سے بھی پہلے ایک چیز ہے۔ جس کا نام "بھوک" ہے اور ہم کو بھوکے ہندوستان میں اپنی فاقہ کشی کو پیش نظر رکھ کر ہر کام کرنا پڑے گا۔ اسی نکتۂ خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ایسا کم خرچ رسالہ ادبی مرکز نے شائع کیا ہے جسے ہندوستانی ادب سے ہر شوق رکھنے والا بآسانی خرید سکتا ہے۔

اور اسی حقیقت کی بنا پر ایشیا کے زر سالانہ میں کوئی کمی بیشی نہیں کی گئی گو اس کے حجم میں زیادتی ہو گئی ہے اور موجودہ نمبر تو نے دو سو صفحات پر شائع کیا جا رہا ہے۔ تصاویر عمداً اس نمبر میں شائع نہیں کی گئی ہیں اور اس کے وجوہ یہ ہیں کہ اول تو نادر تصاویر حاصل نہیں کی جا سکیں دوسرے کسی رسالہ کا مقصد یہ ہونا بھی نہیں چاہئے کہ تصاویر کی بنیاد پر اپنے ادب کی بنیاد قائم کرے۔ آج ہندوستان کو مفید ادب کی ضرورت ہے، انقلاب آفریں اور بیداری پیدا کرنے والے لٹریچر کی ضرورت ہے اس ضرورت کو اپنی بضاعت کے مطابق اس نمبر میں پورا کرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی ہے

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں — کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

یہ ایک رسم سہی لیکن دوستوں اور معاونین کے احسانات کا اعتراف یقیناً ضمیر کی عبادت ہے۔ ایسے ناحق شناس زمانے میں جب زندگی کی کشمکش نے انسان کے کیریکٹر کی بقا کے امکانات کو دھندلا کر دیا ہو کسی کی طرف سے ایک خفی نگاہ کرم بھی میرے نزدیک دنیائے التفات کی حیثیت رکھتی ہے اسی لئے بغیر تخصیص اُن تمام شعرا و انشا پرداز احباب کی نوازشات کا ممنون ہوں جن کا کرم میرے لئے ارزاں رہا۔

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی مسعود!

ابھی مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کی موت کے ڈالے ہوئے زخم سینوں میں بھرے بھی نہیں تھے کہ راس مسعود کی مرگ ناگہاں نے دل پر ایک گہرا چرکا لگا دیا۔

سر سید راس مسعود کی مرگِ ناگہاں ہرگز دنیا کے ہونے والے واقعات کی طرح معمولی نہیں کہی جا سکتی۔ مسعود سر سید کے جواہر خانہ کا وہ گوہر شب چراغ تھا جس کی جوت سے ایک طرف محض ادبستانِ مشرق جگمگاتا تھا تو دوسری طرف اس کے انوار سے مجلس انسانی کے تمام باقی گوشے منور رہتے تھے لیکن اس کی یکایک موت نے آج نہ صرف ایوانِ ادب کو تاریک کر دیا بلکہ مجلس انسانی کے ہر گوشہ کو دھندلا کر دیا۔

تخلیق کے قدرتی اصول کی بنا پر ہر تاریکی کے بعد روشنی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ نئی نسل سے بہت سے ستارے ہستی کے آسمان پر جلوہ گر ہوں گے لیکن مسعود کی طرح مہر نیم روز بن کر اب جگمگانا کسی کی قسمت نہیں

میں اُن کے اُن خوش اعتقاد ماتم کرنے والوں میں نہیں ہوں جو اُن کو سیاسیات کا مرد بھی خیال فرماتے ہیں۔ میری رائے اُن درجاتی خصوصیتوں سے بہت بلند و مخصوص ہے۔ وہ ایک خطیب یا وقتی سیاست داں ہرگز نہیں تھے۔ اُن کی حیثیت ایک فاضل ادیب اور ایسے ادیب کی تھی جو مشرقی و مغربی علوم پر بالکلیہ حاوی ہوتا ہے۔

بہ حیثیت انسان وہ اعلیٰ ترین انسان تھے۔ اُن کا دل گداز وسیع اور روشن تھا اور انسانی محبت و ہمدردی کی آگ اُن کو سر سید کے تشنگہ

سے دارشتاً ملی تھی وہ سادہ مزاج اور درد آشنا دل رکھتے تھے جس میں نفاق اور نفرت کے عناصر کبھی تلاش کے بعد بھی نہیں پائے گئے، مشرقی علم و ادب سے اُن کو فطری لاگ تھی اور وہ ہر جگہ ادبی فضا پیدا کرنے میں مہارت رکھتے تھے اُن کا اخلاص اور سادگی، اپنی مجلس کو آفتاب سے لے کر ذروں تک سے سجا لیتی تھی اور آفتاب کے ساتھ وہ ذرّے بھی چمک اُٹھتے تھے۔ ہندوستان میں راس مسعود آخری شخص تھا جس نے اس گئے گذرے زمانے میں شعر و ادب کی قدر شناسی کرنے اور قدر شناس بنانے کی قدیم پرستاران ادب کی طرح کوشش کی اور آج اُس آخری شخص کو موت ہم سے چھین کر لے گئی۔ ادبی حلقوں میں قدم قدم پر اس کا ماتم ہو رہا ہے مگر اس نقصان کی تلافی انسان سے کب ممکن ہے!؟

میں ساری عمر اُن ملاقاتوں کو فراموش نہیں کر سکتا جو اپنے اندر دلچسپی، معلومات، عظمت اور راحت و رافت کی ایک دنیا رکھتی تھیں۔ سر راس مسعود کی عالی ظرفی، تبحّر علمی، ذوق کی نزاکت، مذاق کی لطافت، اہل علم و فن کی قدر دانی اور انسانی ہمدردی کا ایک عام جذبہ اُن کے اندر دیکھ کر ہر کوئی اُن کا اسیر ہو جاتا تھا۔

سر سیّد اعظم کے پوتے سر راس مسعود ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے ۱۹۰۶ء تک اپنی والدہ ماجدہ کی آغوش محبّت میں مشرقی تعلیم و تربیت کے مدارج طے کرتے رہے۔ ۱۹۰۶ء میں انگلستان تشریف لیگئے۔ ۱۹۱۱ء میں آکسفورڈ میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی اور بیرسٹری کی سند لے کر ہندوستان واپس تشریف لائے۔ پٹنہ میں آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم صوبۂ بہار کے ساتھ پریکٹس شروع کی۔ آنریبل ڈاکٹر سید محمود سے راس مسعود کے تعلقات نہایت برادرانہ تھے اور ڈاکٹر محمود کو جو صدمہ اُن کی ناگہانی موت سے ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔

۱۹۱۳ء میں آپ امپیریل ایجوکیشنل سروس کے زمرۂ ملازمت میں شریک ہوئے اور پٹنہ میں ہیڈ ماسٹری کے عہدہ پر مامور ہو گئے۔ اس کے بعد "ریونشیا کالج" کٹک میں پروفیسر ہو گئے۔

لیکن جگمگاتے ہوئے ہیرے کی شعاعوں نے خود جوہری کو دعوت نظّارہ دی اور اُن کو حضور نظام دکن کی جوہر شناس نگاہ نے تعلیمات حیدرآباد کی قیادت کے لئے انتخاب فرمالیا۔ چنانچہ آپ حیدرآباد میں ۱۹۲۸ء تک ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن رہے۔

۱۵

بارہ سال دورانِ قیام حیدرآباد میں راس مسعود نے سلطنت دکن کی بہترین خدمات انجام دیں۔ جن میں سے ان کا سب سے بڑا کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی ہے۔

مادری زبان میں تعلیم کا تخیّل سر راس مسعود ہی کے دماغ کا نتیجہ تھا جس نے ہندوستانی زبان کو فنا ہونے سے بچا لیا اور عظیم الشان ثبات بخشا۔

حیدرآباد کے بعد آپ علی گڑھ تشریف لائے اور جمیع مسلمانانِ ہند نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کشتی کی ناخدائی آپ کے سپرد کر دی۔ گو آپ جانتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی مسلم جیسی نفاق پرست قوم کی درس گاہ ہے اور اس کی سیاسیات کا ایک رُخ نہیں لاکھوں گوشے ہیں لیکن جذبۂ خدمت نے سب پر حاوی کر دیا اور اپنے دادا کے لگائے ہوئے باغ کی باغبانی کرنے لگے۔

لیکن کون ہے جو جاتے جاتے ملت مسلمانوں کی ناقدر شناسی کا داغ اپنے دل پر نہیں لے گیا۔ محمد علی ہو کہ راس مسعود سب کے سینے قوم کے سلوک سے داغدار ہو گئے اور قوم ان کے اُٹھ جانے کے بعد بھی اُسی طرح سو رہی ہے، اُسی طرح یقین کے عالم میں ہے کہ وہ نہایت قائد پرست ہے۔ بہر حال علیگڈھ میں سر راس مسعود کو اپنی قوم کی بے حسی، نفاق، پارٹی بازی، اور خود غرضی کے جو تلخ تجربات ہوئے وہ ایسے نہ تھے کہ راس مسعود جیسا ذی احساس شخص اِن سے متاثر نہ ہوتا۔ ان تجربات کی تلخی نے اِن کے دل میں ناسور ڈال دئے۔ اور آج ناسور ہے نہ صاحب ناسور!؟

وہ ایک بے تکلف اور دلچسپ انسان تھے مگر جب اِن سے ملاقات ہوئی میں نے اُن کو ایک وحشت انگیز غم میں مبتلا پایا۔

آخر عمر میں بھوپال میں وزیرِ تعلیم و صحت عامہ ...... کے عہدے پر مامور ہوئے اور ۳۰ رجولائی ۱۹۳۷ء کو بروز جمعہ دن میں گیارہ بج کر دس منٹ پر انتقال فرماگئے۔ مگر سچ پوچھئے تو یہ قدرت و وقت کی ستم ظریفی تھی اور مسلمانوں کی مردم ناشناسی - راس مسعود جیسا عظیم الشان شخص اور مغربی و مشرقی علوم کا ماہر ــــــــــــ ایک ریاست کا وزیرِ تعلیم بنایا گیا - میرے خیال نے یہ ایک قسم کی نظربندی تھی جس کی ذمہ دار صرف قوم تھی لیکن بہرحال آج ہم میں راس مسعود موجود نہیں ہیں مگر اُن کی یاد اور اُن کا نام تا ابد باقی و قائم رہے گا۔

مۓ شبانہ کی مستی تو ہوچکی، لیکن کھٹک رہا ہے دلوں میں کرشمۂ ساقی

اگر راس مسعود کی موت کے غم کا اندازہ کرنا چاہتے ہو تو اس شعر کے خالق اقبالؔ سے دریافت کرو اُس کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں اور رہا میں، مجھے تو ازدیادِ غم سے رونے کا بھی ہوش نہیں ہے

شک نہ کر میری خشک آنکھوں پر یُوں بھی آنسو بہائے جاتے ہیں

چین اور جاپان کی جنگ

تہذیب اور ارتقا، تجارتی مفاد، تمدن کی ترویج، تنظیم اور اسی قسم کے دوسرے باطل اور پُرفریب بہانوں کا سہارا لیکر ملوکیت پرست اقوام دوسروں کے ملکوں اور سلطنتوں پر غاصب اور قابض ہونا چاہتی ہیں یورپ کی فطرت کا جہاں تک تعلق ہے اس کا خاص مسلک ہی یہ ہے۔ اٹلی کی تازہ کامیاب کشتہ حبش میں ابھی تک حرارت باقی ہے اور اٹلی کے جبڑوں میں ابھی اپنے تازہ شکار کا خون لسٹھرا ہوا ہے لیکن مشرق میں جو اپنی روحانی افضلیت اور کلچر و روایات تہذیب کا گہوارہ تھا - جہاں کے باشندوں کی ذہنیت مغربیوں سے بالکل مختلف ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟!

چین و جاپان کی تازہ جنگ نے یہ ثابت کردیا کہ مشرق اپنی مشرقیت کو ذبح کر رہا ہے بیرن ٹنا سابق وزیرِ اعظم جاپان کی اسکیم کے وہ الفاظ ابھی ہمارے ذہن میں محفوظ ہیں جس میں اُس نے منچوریا اور منگولیا پر قابض ہونے کی رائے دی تھی اس طرح وہ چین کی فوجی، سیاسی، اور اقتصادی ترقی کو تباہ کر ڈالنا چاہتا تھا اور چین کے اُن تمام ذرائع پر قبضہ کرلینا چاہتا تھا جو مدافعت کے وقت چین کو بچا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اس کے یہ ادعا سننے کے قابل ہیں کہ:۔

" ہم ان کی امداد سے ہندوستان، جزیرہ نما ملایا، ایشیائے کوچک، اور نیز یورپ کی فتح کے لئے آگے بڑھ سکیں گے " ہونے والوں کو ان الفاظ سے جاپان کے عزائم کا اندازہ نو سال پہلے ہی ہوگیا تھا - دراصل جاپان ہوس ملک گیری میں کسی مغربی فسیسٹ طاقت سے کم نہیں ہے۔ وہ ہندوستان پر بڑی للچائی ہوئی نگاہیں ڈال کر رہ جاتا ہے لیکن اس کی نقل و حرکت بتاتی ہے کہ وہ توسیع سلطنت کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے

یورپ کی ہر حکومت شہنشاہیت کے حصول کے لئے بیچین ہے۔ اٹلی نے آخر انسانیت کی گردن پر چھری پھیر کر حبش کو حاصل کر ہی لیا۔ یہی حال جاپان کا ہے چین کے ہزاروں انسان بمباری کئے جارہے ہیں ایک ملک کا سکون برباد کردیا گیا ہے جاپان نے شہریوں اور فوجیوں میں کوئی تمیز باقی نہیں رکھی - جاپان نے چین میں بین الاقوامی بستی تباہ و برباد کردی - چینی ساحل کی مورچہ بندی کر ڈالی - یہ اور ایسے تمام امور اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ قدیم فاتحین کے قزاقانہ غیر انسانی طریقۂ جنگ اور موجودہ طریقۂ جنگ میں کوئی فرق نہیں۔ - جو قوم آج ارتقاء و تہذیب کی ڈینگیں مارتی ہے وہ جھوٹی اور مکار ہے۔ انسان کی درندگی میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی - ایشیا میں یہ بے سکونی اور قتل و غارت کی گرم بازاری ایشیا کے سکون کو درہم و برہم کررہی ہے - اور اس کی کلی ذمہ داری جاپان پر عائد ہوتی ہے ہم ہندوستانی جنگی فطرت ظالم کی دشمن اور مظلوم کی دوست ہے چین کے ساتھی ہیں۔ ہندوستان، برطانوی جوئے کو اُتار کر پھینک دینا چاہتا ہے اور آزاد ہوکر کامل خود مختارانہ زندگی بسر کرنے کے لئے جد و جہد کر رہا ہے، وہ کیونکر یہ پسند کرسکتا ہے کہ چین جاپان کا غلام ہوجائے اور جاپان جو ایشیا میں امپریلزم کا سب سے بڑا حامی ہے اپنی شہنشاہیت کا ڈنکا بجانے لگے - صدر کانگریس کے حکم کے مطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کو "چین ڈے" ہر ہندوستانی کو منانا چاہئے اور جاپان کے خلاف اظہارِ نفرت کرنا چاہئے چین سے جاپان کی یہ جنگ موجودہ زمانے کے قطعی منافی ہے - جاپان نے بغیر اعلانِ جنگ چین پر گولا باری کا آغاز کیا ہے اور ہزاروں چینیوں کا قتلِ عام آزادی سے کیا جارہا ہے اس لئے ہندوستانیوں کا فرض ہے کہ وہ چین سے ہمدردی اور جاپان کے خلاف شدید اظہار نفرت کریں - میری رائے میں تو ایسے ظالم اور قاتل سوداگر کے مصنوعات کا بائیکاٹ کرنا ہر انسان کے لئے فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ باقی صفحہ ۱۶۹ پر

رُوحِ ادبُ

بشارت

ایشیا

کیا اس زمانے میں ایشیا کا وجود ہے یا وہ محض ایک نام ہے ؟

ایک ایشیا تو وہ ہے جو جغرافیہ میں ایک برّاعظم کا نام ہے، وہ قائم رہیگا جب تک نصاب کی کتابوں کے علم میں کوئی خاص انقلاب پیدا نہ ہوجائے، وہ جاپان سے قطب شمالی بحیرۂ اخضر سے ایشیائے کوچک فلسطین سے کوہِ طور باب المندب سے راس عمان کراچی سے سیلون برما سے ہانگ کانگ اور آس پاس کے بڑے چھوٹے جزیروں تک پھیلے ہوئے قطعۂ زمین کا نام ہے، یہ سب کچھ اس لئے گنوایا کہ اسکول کے زمانے کے ایک مدت بعد بغیر کسی امتحان کے ان کے گنوانے میں مزا آیا۔

"ایک ایشیا وہ ہے جو پیغمبروں کا مولد و مسکن ہے جہاں تقریباً ہر قسم کی روحانیت جنم لیتی ہے، جہاں خدا کبھی انسان کی شکل میں اور کبھی بذاتِ خود جلوہ گر ہوتا رہتا ہے" ——— "ایک ایشیا پرانے سے پرانے رسم و رواج کی سرزمین ہے۔

ایک اور ایشیا شخصی حکومت اور استبداد کی آرام گاہ ہے۔

اور ایشیا قضا و قدر کا معتقد بھی ہے، وہ سستی و آہستگی سے محبت کرتا ہے، یورپ کے تیز موٹر کار کے مقابل میں وہ اپنی سُست رو بیل گاڑی کھتا ہے کیا یہی ہے ایشیا ؟ کیا اس میں صبر و استقلال و ہمت یا سرعت و جوش یا ایثار یا علم پروری نہیں جیسی کہ آج یورپ میں پائی جاتی ہے۔ زندگی حال ہے، اس میں موجود حاضر کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ماضی و مستقبل کو نہیں، ایشیا وہی سمجھا جاتا ہے جو آج ہے نہ وہ کل تک تھا نہ وہ جو کل ہوگا، اسی لئے ایشیا آج تنزل کا مرادف ہے اور یورپ ترقی کا۔ ورنہ دوسری صورتوں میں کیا ایشیا نے وہی کچھ نہیں کر دکھایا جو یورپ آج دنیا کو دکھا رہا ہے۔ ہائے ماضی و مستقبل میں ایک بڑا فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ ماضی کو ہم بدل نہیں سکتے لیکن مستقبل کو ایک بڑی حد تک ہم جیسا چاہیں بنا سکتے ہیں، دورِ حاضر نے ایشیا کو بھی یہ سبق سکھایا ہے، اس کا مستقبل اسکے ماضی و حال سے مختلف ہونے والا ہے۔

ایشیا اب محض بیل گاڑی کی دنیا نہیں ہے اور ہے بھی تو رہنے کی نہیں، وہ بھی اب موٹر کار اور ہوائی جہاز اور ریڈیو سے اپنا رشتہ جوڑ رہا ہے۔ تو کیا ایشیائیت فنا ہوجائیگی ؟ کیا اب مشرق و مغرب کا اختلاف مٹ جائیگا ؟ یہ اختلاف اگر مٹ جائے اور ایشیا اور یورپ اور افریقہ اور امریکہ اور کالی گوری نسلیں سب ایک ہوجائیں تو اس سے زیادہ مبارک کون سا انقلاب ہو ؟ اس نقطۂ نظر سے روٹھی ہوئی ایشیائیت بھی فنا ہوجائے تو بہتر ہے لیکن ایک دوسری شکل میں ایشیائیت کبھی فنا نہیں ہوسکتی اور نہ اُسے معدوم ہونا چاہئے۔

صحیح ایشیائیت کے یہ معنی ہیں کہ ہر وہ اچھی چیز جو ایشیا کے ذریعے سے دنیا میں آئی قائم رہے، حلم و انکسار، ایمان و اعتقاد، آہستگی، اطمینان، توکل، خاندانی نظام، محبت و اخوت اور ایسے ہی اور انسانی اوصاف گو وہ محض ایشیا سے مخصوص ہیں اور گو آج دنیا انھیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی اور گو اب ان کی ایشیائی صورت عموماً مسخ بھی ہوچکی ہے تاہم تھیں ایشیائیت کی "ایجادیں" اور کوئی وجہ نہیں کہ آج کل کی دنیا میں جہاں ہمیں اعتمادِ نفس اور سرعت اور انفرادیت اور جدت پسندی کا سبق سیکھنا ہے ——— وہاں ہم ان اوصاف کو کھو دیں اور اپنے اس آبائی ترکے سے منہ موڑ لیں۔

دنیا کا مستقبل یہ ہے کہ مغربیت و مشرقیت کا صحیح امتزاج ہو، نہ یورپ رہے نہ ایشیا یا کہئے کہ یورپ بھی رہے اور ایشیا بھی رہیں دونوں مِل جلکر رہیں اور الگ ہونے پر بھی الگ نہ ہوں۔ یہ نسل ہو نہ وہ، نہ مشرق ہو نہ مغرب بلکہ انسانیت ہو اور دنیا۔

فلسفی اور عاقل اور تجربہ کار لوگ مسکرائیں گے کہ یہ تو فرضی قصے ہیں اور فضول خواہشیں ہیں، یہ فرضی ہو یا فضول یہ ہے وہ صحیح نصب العین جو ہمارے پیشِ نظر ہونا چاہئے، دنیا کا مستقبل نہ اس قوم کے لئے ہے نہ اس قوم کے لئے بلکہ نوعِ انسان کے لئے۔

میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن)

کمالِ انگورہ

ترکی کی جمہوری حکومت کے دوسرے دور (۱۹۲۱ء) کا تعارف

از پروفیسر مولوی ابرار حسین صاحب فاروقی بی اے (علیگ)

"کوئی قوم اپنی عزت و خودداری کو برقرار نہیں رکھ سکتی جب تک کہ وہ آزادی سے مالا مال نہ ہو" (غازی اتاترک)

تمام اخلاقی فلسفوں کا مقصد یہ تھا کہ انسان اس فرض کو محسوس کرے جو خود اسکی جنس کی طرف سے اُس پر عائد ہوتا ہے کوئی شک نہیں کہ مذاہب نے ایک بڑی حد تک اس فرض کی طرف انسانوں کی رہبری کی مگر بالآخر مذاہب کے علمبرداروں نے مذاہب کی چمکتی ہوئی پیشانی پر ناکامی کا سیاہ داغ ڈال دیا جو آب کوثر کے چھینٹوں سے بھی نہیں دھل سکتا۔ اس انقلاب کے بعد اب نیکی اسلئے نہیں کی جائیگی کہ اس نیکی کے پس منظر میں کسی اعتقاد کے نقوش کی طاقت ہے بلکہ انسان کو دنیا چلانے کیلئے نیکی کی ضرورت ہے" اب سب کچھ اسی ضروری حقیقت کی بناپر ہوگا۔

آزادی کی منزل کی جانب غلام اور بھولی قوموں کی رہبری کرنا سب سے افضل اور اقدس نیکی ہے۔ مولوی ابرار حسین صاحب فاروقی نے یہ مضمون ارسال فرماکر ایشیا کے ذریعہ اسی افضل اور اقدس نیکی کا مقدس اقدام کیا ہے ترکی کی جد وجہد آزادی کی داستان شاید ہندوستان کے ساری دنیا سے زیادہ "مطمئن" مسلمانوں میں احساس کی ہلکی سی چنگاری پیدا کردے، اگر ایسا ہوا اور نہ ہونے کے کچھ معنی نہیں ہیں تو یقیناً فاروقی صاحب نہ صرف ادارہ ایشیا کے شکریہ کے مستحق ہیں بلکہ تمام قوم کے جذبات تشکر کا استحقاق ان کو حاصل ہوتا ہے۔ ابرار حسین صاحب فاروقی بی اے (علیگ) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اُن اساتذہ میں سے ایک

ہیں جنکی مساعی اور اُستادانہ شفقت و اخلاص نے مسلمانوں کی نوجوان نسل کے سنوارنے میں بہترین حصّہ لیا ہے یہ مضمون آپ کی عنقریب چھپنے والی کتاب "کمال انگورہ" کے دوسرے دور کا ایک ٹکڑا ہے۔ کمال انگورہ کا پہلا دور زیر طبع ہے اور اس کی تیاری کی اطلاع ناظرین کو ایشیا کے ذریعہ بہت جلد دی جائیگی، دوسرا دور زیر تصنیف ہے۔ تیسرا دور زیر ترتیب اور چوتھا دور زیر فکر ہے۔ یہ چاروں دور کتابی شکل میں شایع ہوں گے۔ ہماری یہ بھی کوشش ہوگی کہ کتابی شکل میں آنے سے پہلے ادوار کا کچھ حصّے آپ کے معلومات کے لئے ایشیا میں شایع کرنے کی عزت حاصل کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ہماری آرزو اس بنیادی جذبۂ نیکی کی بنا پر ہے۔ اس لئے انسان سے نیکی کرنے والا فاروقی دل ضرور اس آرزو کا خیر مقدم کرے گا۔"

ساغر نظامی

میدانِ عمل اور جمہوریت

پہلا دور یعنی پورا سنہ ۱۹۲۰ء تنظیمی جدوجہد میں گذرا جس میں احرار نے نہ صرف خانہ جنگی اور طوائف الملوکی کو دور کیا بلکہ اقتصادی اور سیاسی پیچیدگیوں کا بھی بحسن و خوبی ازالہ کیا۔ مغربی محاذ پر یونانیوں کو صرف مصروف پیکار رکھا اور اس طرح سے ان کی درندگی کو صبر و شکیبائی سے برداشت کرتے رہے البتہ مشرق و شمال پر پوری توجہ کی۔ جہاں فرانس۔ آرمینیا۔ کرد اور بالشویکوں سے مقابلہ تھا۔ کردوں کو اپنا ہم آہنگ کر لیا۔ فرانس کے غاصبانہ قبضہ کا خاتمہ کیا۔ آرمینیا کی بغاوت اور باغیانہ امنگوں کو ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیا۔ بالشویکی زعم کو نیچا دکھایا۔ دوسری طرف اندرون ملک میں جو بعض اشرار نے شورشیں برپا کر رکھی تھیں ان کو فنا کر کے امن قائم کیا۔ "مجلس وطنی کبیر" کی بنیاد ڈالی جس میں ملک کے نمائندے بحیثیت اراکین شریک ہوئے اور انھوں نے متفقہ طور پر ایک "میثاق ملی" تیار کر کے منظور کیا۔ جسکا مفاد "آزادیٔ کامل" تھا۔ غرضکہ سنہ ۱۹۲۰ء کا دور ہر حیثیت سے تنظیمی دور تھا۔ بلکہ ملّی موت و حیات کا دور تھا جس سے گذرنا اسی قوم کا حق تھا جس نے ہمیشہ موت کی بارگاہ سے حیاتِ ابدی کا تمغہ پایا۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں اندرون اناطولیہ کے سیاسی حالات اس قدر پردۂ خفا میں تھے کہ ان کا معلوم کرنا تقریبًا ناممکن تھا، کچھ تو اس وجہ سے کہ احرار کے اپنے ذرائع رسل و رسائل مسدود تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ لامرکزیت کارفرما تھی اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ "الہامی خبر رساں ایجنسیوں" نے اپنے دوستوں کی خاطر سفاکی کی اشاعت کا ٹھیکہ لے لیا تھا جس کے لئے حقیقت کی ضرورت نہ تھی بلکہ "اقلیتوں" کی حمایت کے لئے سیاسی ڈاکٹروں نے بھی یہی نسخہ تجویز کیا تھا غرضکہ ان وجوہ سے ان کے سبق آموز اور مشکور مساعی معرض خفا میں تھے۔ البتہ ان کے "نج" کے افسانے تمام دنیا میں پھیلائے جا رہے تھے۔ وہ اگر باغیوں کی سرکوبی کرتے تھے۔ مجرموں کو کیفر کردار کو پہونچاتے تھے تو ظلم اور سفاکی کے مجرم ہوتے تھے لیکن دوسری قومیں معصوموں اور بے گناہوں کا خون کر کے بھی عادل۔ منصف اور متمدن کہلانے کی مستحق تھیں۔ ۲۰

مجلس وطنی کبیر کا ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء یوم جمعہ کو بعد نماز جمعہ افتتاح ہوا اور وزارت کی تشکیل حسب ذیل ہوئی :۔

۱۔ فوزی پاشا — وزیر جنگ
۲۔ یوسف کمال — وزیر خارجہ (انھیں نے ماسکو سے معاہدہ کیا تھا)
۳۔ عطابک — وزیر داخلیہ
۴۔ خواجہ فہمی آفندی — وزیر امورِ مذہبی (جس طرح آستانہ میں شیخ الاسلام کا عہدہ تھا اور وہ رکن وزارت ہوا کرتا تھا)

۵- فریدبک وزیرمالیہ عمومیہ
۶- حافظ محمد بک وزیر عدالت وقانون

مجلس وطنی کبیر کی پہلی سالگرہ

۲۳ اپریل ۱۹۲۱ء کو کامل ایک سال کے بعد انگورہ میں "مجلس وطنی کبیر" کی سالگرہ بڑے زور وشور سے منائی گئی۔ آفریں اس قوم پر کہ جو خونی معرکوں میں مصروف ہوتے ہوئے ابھی قومی عیدیں منائے اور نفس مطمئنہ کا مظاہرہ کرے، بہرحال اس سالگرہ کے موقع پر "حاکمیت ملیہ" (نیم سرکاری اخبار) کے اڈیٹر بانئی تحریک اناطولیہ بطل حریت غازی مصطفےٰ کمال اتاترک سے ملاقات کی اور "مجلس وطنی کبیر" کے خیال ابتداء اور اس کی تدریجی ترقی کے متعلق معلومات چاہی جسکا جواب غازی مصطفےٰ کمال اتاترک نے اجمالاً دو حصوں میں عطا فرمایا جو حسب ذیل ہے :-

"میں آزادی کا عاشق ہوں اور یہ وہ عشق ہے جسکو میں نے اپنے ماں باپ سے ورثہ میں پایا ہے جو شخص مجھ کو بچپن سے جانتا ہے اور جسکو میری خاندانی وسرکاری زندگی کا حال معلوم ہے وہ خوب سمجھتا ہے کہ میں اس عشق ومحبت کا متوالا ہوں، یہ میرا ایمان ہے کہ کوئی قوم اپنی عزت اور خودداری کو برقرار نہیں رکھ سکتی ہے جب تک کہ وہ آزادی سے مالا مال نہ ہو۔ میں ذاتی طور سے اس مخصوص صفت پر زور دیتا ہوں اور اسی وجہ سے میری رائے ہے کہ تاوقتیکہ میری قوم اس صفت سے آراستہ نہ ہو میں آزادی کا دعویٰ نہیں کرسکتا ہوں۔ حتیٰ کہ جب تک میں آزاد ملک کا فرزند نہ ہوں اسوقت تک میں زندہ نہیں رہ سکتا ہوں۔ اس لئے ملکی آزادی نہ صرف اہم مسئلہ ہے بلکہ وہی زندگی ہے۔ میں یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ ہمارے لئے اپنے ملکی مصالح کے اعتبار سے دوسری قوموں سے دوستانہ وسیاسی تعلقات کا قائم کرنا لازمی ہے کیونکہ تمدنی زندگی کا تقاضہ ہے۔ لیکن اس کیساتھ ہی اگر دنیا کی کوئی قوم یہ ارادہ کرلے کہ وہ ہمارے ہاتھ باندھ کر ہماری آزادی کو غصب کرلے تو پھر میں اس قوم کا بدترین دشمن ہوجاؤں گا تاوقتیکہ وہ اس مقصد سے باز نہ آجائے۔ مثالاً میں یہ کہوں گا کہ ہم بزمانہ جنگ عظیم جرمنی کے ساتھ ہوکر لڑے کیونکہ جغرافیائی حالت، سابقہ تاریخی واقعات اور سیاسی توازن نے ہم کو اس بات پر مجبور کیا تھا۔ غرضکہ ہم نے جرمنی کی طرف دست محبت بڑھایا حتیٰ کہ وہ ہمارے لشکروں اور ہماری حکومت میں بھی داخل ہوگئے جسکو ہم نے گوارا کیا۔ لیکن جب بعض جرمنیوں نے ہمارے راستے میں روڑے اٹکانے شروع کئے، جس سے ہماری آزادی اور استقلال میں خلل واقع ہونے لگا تو سب سے پہلے میں ہی بلاقید وشرط ان کے خلاف ہوا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی زمانۂ جنگ میں ایک سال تک میں ان لوگوں کا مخالف رہا جو میری اس رائے کو کچھ وزن نہیں دیتے تھے۔ بالآخر میں نے جنگ کے اختتام کے قریب شام کی قیادت کو منظور کرلیا اور وہاں چلا گیا۔ لیکن میں اس سے متفق نہیں تھا کہ جنگ جاری رہے بلکہ میں یہ چاہتا تھا کہ پہلی فرصت میں اسکو ختم کردیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اس اپنے خیال کو سرکاری طور سے واضح بھی کردیا تھا۔ یہ میرے دل میں کبھی خیال تک نہیں آتا تھا کہ انگریز، اطالوی اور فرانسیسی ہمارے ٹکڑے پارچے کردینے اور ہماری قوم کی تذلیل پر تلے ہوئے ہیں اور وہ وحشی جانوروں کے مثل حرکات مذبوحی کرینگے البتہ یہ مجھے ضرور گمان تھا کہ اگر ہمکو شکست ہوئی تو سزا اور نقصان اٹھائے بغیر ہم اس جنگ سے بچکر نہیں نکلیں گے۔ اس کے علاوہ یہ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ قومیں جو انسانیت - مدنیت اور

انصاف کی مدافعت کے دعویدار ہیں خواہ ان کے نفسیات اور ذہنیتیں کچھ بھی کیوں نہ ہوں وہ ترکی تاریخ کی تباہی کے درپے ہوجائیں گی اور ترکی قوم کی آزادی کو ملیامیٹ کرکے اس کی زندگی اور عزت کو خاک میں ملادینے کی کوشش کرینگی۔ غرضکہ یہ خیالات لے کر میں "آطنہ" سے "آستانہ" کی طرف چلا۔ کیونکہ آطنہ کے لشکر "یلدرم" (برق) کی قیادت میرے سپرد تھی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آستانہ شرائط وقفۂ جنگ پر دستخط کرچکا تھا اور معاہدۂ صلح کا منتظر تھا۔ غرضکہ وہاں پہونچکر میں جب کبھی انگریزی۔ اطالوی اور فرانسیسی مدبّرین اور فوجیوں سے ملا اور ان پر اپنی اس رائے کو یہ کہکر میں نے ظاہر کیا کہ:۔

"ہمارے لئے دول وسطےٰ کے ساتھ جنگ کی آگ میں کودنا
ضروری تھا کیونکہ تم نے ہمکو غیر جانبدار رہنے ہی نہیں دیا تھا۔
اس لئے کہ زار روس تمہارے ساتھ تھا۔ ہم تم سے اس چیز میں
ضرور گفتگو کرسکتے ہیں جو شکست کے لئے مستلزم ہے لیکن کسی قوم
کو محض شکست کی پاداش میں آزادی سے محروم نہیں کیا جاسکتا ہے"

لیکن میں جس قدر زیادہ پُر اثر طریقہ سے ان سے اس معاملہ میں گفتگو کرتا تھا اسی قدر زیادہ مجھے ان اقوال سے جوان کی زبانوں سے سنتا تھا حیرت ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ اتحادیوں کے فوجی افسروں اور سپاہیوں کی ترکوں پر زیادتیاں اور ان کی ذلت آمیز حرکتیں کرنی اس حقیقت کو اور واضح کر رہی تھیں۔ چنانچہ آستانہ مع اپنے سلطان۔ ارکان حکومت۔ افسران فوج اور باشندگان کے ششدر اور حیران تھا اور زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا تھا کہ جنکا توڑنا ناممکن تھا۔ چنانچہ میں بھی اسی طرح سے پابہ زنجیر تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ کوئی شریک غم مل جاتا اور غمگساری کرتا۔ بعض اوقات ایسے غیرت مند لوگ ملتے تھے کہ جو بُرے نتائج کو محسوس کر رہے تھے اور ان سے رہائی کے وسیلے ڈھونڈ رہے تھے لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ یہ وسیلے آستانہ ہی میں مل جائیں گے اسی وجہ سے وہ نئے نئے پروگرام بناتے تھے جو بے سود تھے کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ کہاں سے کام شروع کیا جانا چاہئے تھا۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ خیال کرتے تھے کہ غیروں کی حمایت ان کو اس مصیبت سے رہائی دلائیگی حالانکہ ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہی غیر لوگ آزادی کی روح کو بالکلیہ پامال کر رہے تھے۔ اس وقت مجھ کو کامل یقین ہوگیا تھا کہ دشمن نے ہماری آزادی کو ملیامیٹ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ لیکن قوم اس حقیقت سے اس وقت تک بے خبر رہی جب تک کہ آستانہ "خلیت گوہیرے کے غصہ کا شکار ہوکر آخری سانس نہ لینے لگا" وہاں کا ہر ہوشمند اور دانشمند یا تو دشمن کی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا اور یا غافل ہونے کی وجہ سے گمرہی کے گڑھے میں پڑا ہوا تھا غرضکہ وہاں نہ تو صحیح راستہ دکھائی دیتا تھا اور نہ ٹھیک نشانہ متعین کیا جاسکتا تھا۔ جسکی طرف قوم کی رہنمائی کی جاتی اس لئے ہر حالت میں تحریک کا مرکز آستانہ سے باہر ہی ہوسکتا تھا۔ اب ضرورت یہ تھی کہ وہ مرکز متعین کیا جاکر تمام قوم کی اس طرف رہنمائی کی جاتی۔ کچھ دنوں میں نے اس پر غور کیا اور بعض اپنے بھائیوں سے اس معاملہ میں تبادلۂ خیالات بھی کیا جنکو میں نے اپنا ہم خیال پایا۔ اس وقت میں نے ارادہ کیا کہ اناطولیہ جاکر نہ صرف عام رائے اور قومی احساس کا پتہ چلاؤں بلکہ ملک کے ذرائع بھی معلوم کروں لیکن میرے لئے آستانہ چھوڑنا بھی ایک

زبردست مسئلہ تھا۔ میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ قدرت نے میری مدد کی اور حکومت نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا فوج اناطولیہ کی انسپکٹری منظور ہے۔ میں نے یہ خدمت بے سوچے سمجھے منظور کرلی۔ کیونکہ مجھے کامل یقین تھا کہ اس وقت اناطولیہ پہنچنے سے میرے لئے کل راستے کھل جائیں گے۔ چنانچہ جس روز میں آستانہ سے روانہ ہوا ہوں اسی روز دشمن نے سمرنا پر قبضہ کیا تھا جس سے اسکی بدنیتی اور خیانت معلوم ہوگئی تھی۔ غرضکہ میں نے فوراً اناطولیہ کی طرف روانگی کا آخری فیصلہ کیا تاکہ وہاں پہونچ کر قوم کو تمام حالات سے آگاہ کروں اور جو قومی آزادی خطرہ میں پڑ چکی تھی اس کی مدافعت اور محافظت کے لئے اس کو تیار کروں۔ ارکان حرب کے بعض افسروں کے سامنے جن پر مجھ کو کامل بھروسہ تھا یہ مسئلہ میں نے پیش کرکے ان سے مدد کی امید ظاہر کی تاکہ میرے کاموں میں مشکلات نہ پیش آئیں۔ جہاز پر سوار ہونے سے قبل میں باب عالی میں گیا تو دیکھا کہ اس خبر کے پہنچتے ہی کہ سمرنا پر دشمن نے قبضہ کرلیا ہے۔ وزراء جمع ہیں چنانچہ جونہی انھوں نے میری حاضری سنی جلسہ ملتوی کردیا اور ان میں سے بعض نے مجھ سے آکر کہا "اب ہمکو کیا کرنا چاہیئے" میں نے جواب دیا "تیار رہو جاؤ" انھوں نے کہا "یہاں کیونکر تیار ہوں" میں نے جواب دیا "جو کچھ تم یہاں کرسکتے ہو کرو پھر کام کو جاری رکھنے کے لئے مجھ سے آکر مل جانا" یہ کہکر میں ان سے رخصت ہوا اور جہاز میں سوار ہوکر ساحل "سامسون" پر اترا۔ سرزمین اناطولیہ پر پہونچتے ہی میں نے دیکھا کہ تمام قوم کا رجحان اس درجہ پر پہونچ چکا تھا کہ وہ اب وطن کی آزادی کی مدافعت میں بے چین تھی۔ دو سال میں جو واقعات رونما ہوئے تھے انھوں نے ثابت کردیا تھا کہ جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ ٹھیک اور قوم کا عزم ایمان راسخ تھا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ مجھے اس پر فخر ہے۔"

یہ تو سوال کے اس حصہ کا جواب تھا جسمیں فاضل اڈیٹر نے "خیال عمل" کے اسباب دریافت کئے تھے۔ اس کے بعد یہ سوال کیا کہ عملاً اسکی ابتدا کیونکر اور کب سے ہوئی اور ایک سال میں اس نے مدارج ترقی کو کیونکر طے کیا تو صدر جمہوریہ نے فرمایا:۔

"۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو جب آستانہ پر قبضہ ہوگیا جس کی وجہ سے قوم اور ملک اپنے دار الخلافہ اور مرکزیت سے محروم ہوگئی تو انگورہ میں "مجلس وطنی" کا قائم کرنا ضروری ہوگیا تاکہ ملک کی آزادی اور اس کی نجات کے متعلق سوچا جائے۔ چنانچہ اسمیں ہمکو کامیابی ہوئی اور قوم کے بعض لیڈر وسط اپریل میں بھاگ کر یہاں پہونچ گئے چونکہ ذرائع حمل و نقل ناقص تھے اس لئے ان لوگوں کے یہاں پہونچنے میں دیر ہوئی اس تاخیر سے مجھکو ناقابل بیان تکلیف ہوئی تھی غرضکہ میں اپنے رفقاء کے ساتھ رات دن اسی فکر میں رہنے لگا کہ ملک کی نجات کیلئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ میں یہ خوب جانتا تھا کہ تمام قوم میں زیادتاً اخلاص و صداقت موجود ہے وہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے بے چین ہے اور اس کے قلوب ایمان صادق سے لبریز ہیں۔ مجھے کامل یقین تھا کہ اگر ہم معقول تدابیر پر قابو پاگئے تو یقیناً ہم ان تمام خطرات کا ازالہ کردیں گے جو بعض شریروں نے اپنی گمراہی سے ملک کے بعض حصوں میں پھیلا رکھے تھے۔

دشمن اندرون ملک میں رائے عامہ کو مسموم کرنے کی برابر کوشش اور بیرون ملک کے لوگوں کے خیالات پراگندہ کررہے تھے۔ کیونکہ وہ میری ذات پر حملہ کررہے تھے اور اس سے انکاری تھے کہ ملک میں قومی ہیجان تھا اور قوم اپنی بیدار قوتوں کے ساتھ اپنی آزادی اور حقوق کی مدافعت کے لئے بالکلیہ تیار ہوگئی تھی۔ اسی وجہ

سے یہ لوگ ایک طرف قوم سے اور دوسری طرف حکومت آستانہ سے یہ کہتے تھے کہ "مصطفٰے کمال کو نہ تو تسلیم کرو اور نہ اس پر اعتماد کرو۔ اتحادی حکومتیں ترکی قوم کے ساتھ جو کچھ سختی کر رہی ہیں وہ صرف اسی شخص کی وجہ سے ہیں"۔ یہ کہہ رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر میرا خاتمہ ہوگیا تو پھر ملک اور قوم کو بیرونی دوستی و صداقت حاصل ہو جائیگی غرضکہ اس طرح سے وہ لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ علانیہ زہر پھیلایا جا رہا ہے اس کے علاوہ ان ریشہ دوانیوں، سازشوں اور بہتانوں کے نتیجہ پر بھی میری نظر تھی۔ لیکن جب کبھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ لوگ مجھ کو ان تمام مصیبتوں کا جو ملک پر نازل تھیں سبب سمجھیں گے تو میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ اسی لئے میں نے ایک روز یہ سوچا کہ اس اہم خدمت کے بوجھ کو جو میں نے اپنے سر لیا ہے اتار پھینکوں۔ سوچکر میں نے اپنے احباب سے جو میرے شریک کار تھے مشورہ کرتے ہوئے کہا، کہ اس بوجھ کو وہ لے لیں لیکن ان تمام نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو دشمن اور شیر ہو جائیں گے اور ان کے ارادے اور مضبوط ہو جائیں گے۔ اندرونی بغاوت کی آگ اسقدر تیزی سے بھڑک رہی تھی کہ اب انگورہ کے دروازہ پر آگئی تھی اور میں نے اس خطرناک اور ہولناک ذمہ داری کو اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ اس وقت میں نے پھر یہ سوچا کہ خواہ کچھ بھی ہو اب اس حالت میں پیچھے ہٹ جانے کے یہی معنے سمجھے جائیں گے کہ یا تو جس خدمت کو ہم نے اپنے ذمہ لیا تھا اس میں مایوسی ہوئی اور یا جس کام کو ہم نے شروع کیا تھا اس کی ذمہ داری سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔ غرضکہ اور اسی قسم کے تاویلات ہونگے جو یقیناً ہمارے پاک مقصد کو برباد کر کے اس قوت مجتمعہ کو پاش پاش کر دیں گی۔ جو اس مقصد کے لئے مجتمع ہوئی تھی۔ آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے احباب کی صداقت اور اپنی قوم کے ارادے اور ایمان پر بھروسہ کر کے اس مقدس خدمت کو تاختم جہاد قومی انجام دیتا ہے مجھے یقین تھا کہ اللہ کی مدد سے ہم دشمن کو بالآخر اس کی عاجزی تسلیم کرا ہی دیں گے۔ لیکن چونکہ اب تحریک قومی میں تاخیر کا موقع نہیں تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس کے لئے قواعد وضوابط مرتب ہو جائیں لہذا اب ہم نے مناسب سمجھا کہ "مجلس وطنی" قائم کیا جائے چنانچہ ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء یوم جمعہ بعد نماز اسکے افتتاح کے لئے مقرر کیا گیا۔ میں دو بجے مجلس کی طرف چلا جا رہا تھا اور وہی تمام باتیں سوچ رہا تھا جو مہینوں سے میرے دماغ میں چکر لگا رہی تھیں جنکا ذکر میں نے ابھی اوپر کیا ہے۔ جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ سردارانِ قوم مجھ پر اعتماد و اعتبار کی نظریں ڈال رہے ہیں۔ جس نے اس بات کو مضبوط تر کر دیا تھا کہ جو کوششیں ہم کر رہے ہیں وہ قومی اُمیدوں کے عین مطابق ہیں۔ میں اس عظیم سعادت و افتخار کے احساس کو بیان نہیں کر سکتا ہوں جو میں نے اس وقت محسوس کیا جبکہ ان احباب سے اس جلسہ گاہ میں دوچار ہوا۔ وہ وہ لوگ تھے جو قوم کے خواہشات وجذبات کی صحیح نمائندگی کرتے ہوئے ہمارے ہر عمل میں شریک ہونے والے تھے۔

الاخبار قاہرہ۔ ۲۴ مئی ۱۹۲۱ء یوم سہ شنبہ
مطابق ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۳۹ھ ہجری۔

تبدیل وزارت

۱۹۲۰ء کی وزارت مئی ۱۹۲۱ء کو وزیر جنگ کے بعض تجاویز سے اختلاف کی بنا پر مستعفی ہوگئی۔ چنانچہ نئی وزارت کی حسب ذیل تشکیل ہوئی اور جنرل رافت پاشا، سپہ سالار افواج جنوبی اناطولیہ مجلس وزرائے کے صدر منتخب ہوئے۔

۱-	فوزی پاشا	وزیر جنگ
۲-	یوسف کمال پاشا	وزیر خارجہ
۳-	عطابک	وزیر داخلیہ
۴-	خواجہ فہمی آفندی	وزیر شریعت اسلامیہ
۵	حسن بک	وزیر مال
۶-	جلال بک	وزیر اقتصادیات
۷-	ڈاکٹر رفیق بک	وزیر صحت و امداد
۸	رفیق شوکت بک	وزیر قانون
۹-	عمر لطفی بک	وزیر تعمیرات
۱۰-	حمد اللہ صبحی بک	وزیر تعلیمات

وزارت کا یہ "نقش ثانی"، "نقش اول" سے بہتر قرار پایا۔ دو سابق وزیروں (فرید بک وزیر مال اور حافظ محمد بک وزیر قانون) کے علاوہ باقیماندہ بحالہ اپنے اپنے عہدوں پر رہے البتہ اتنا اضافہ اور کر دیا گیا تھا کہ وزرار کی تعداد قریب قریب المضاعف ہوگئی تھی۔ اس لئے کہ ایکسال کی تنظیم کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ کاموں کو دوبارہ تقسیم کیا جا کر سررشتہ جات کو از سر نو مرتب کیا جائے۔ لیکن وزارت کے اس تغیر سے سیاست میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا تھا کیونکہ وزارت کی نئی تشکیل کسی سیاسی اختلاف کی بنا پر نہیں تھی۔

ملک کی تنظیمی تکمیل پر حکومت جارجیا کے سابق سفیر موسیو مودیوانی متعینہ حکومت انقرہ نے جو حسب ذیل مختصر بیان اخبار "وقت" کو دیا تھا ۲۵ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی مالی، سیاسی اور فوجی حالت نہ صرف قابل ستائش تھی بلکہ قابل رشک تھی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

"پولس اور فوج کے دوبارہ تنظیم میں حکومت انقرہ کو حسب دلخواہ کامیابی ہوئی۔ جسکی وجہ سے فوجی قوت اس سے کہیں زیادہ ہوگئی ہے جتنی کہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔

"مجلس وطنی کبیر" میں اسوقت تین اہم پارٹیاں ہیں۔ قوم پرور وسط میں دائیں جانب اور زیادتی پسند بائیں جانب۔ جو پارٹی وسط میں بیٹھتی ہے وہی حکومت کی پارٹی ہے اور سب سے زیادہ قوی ہے۔

اس کے ساتھ ہی سفیر نے یہ بھی کہا کہ وہاں کی مالی حالت بہت ہی اچھی ہے اور یہ کہ اس نے ایشیائے کوچک کی سیاحت کے دوران میں غیر مسلم قوموں کے ساتھ کسی قسم کا برا سلوک نہیں دیکھا۔

الاخبار۔ قاہرہ۔ ۳۱ مئی ۱۹۲۱ء

اس ایک سال کی جانکاہی کے بعد "کمالی" جماعت نہ صرف منظم ہوگئی تھی بلکہ طاقتور بھی تھی اور اب وہ تذبذب جو ملی موت وحیات

نسبت ان کے دلوں میں تھا وہ قطعاً باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ بقول "الاخبار (قاہرہ) مورخہ یکم جون ۱۹۳۱ء
" مصطفےٰ کمال پاشا نے بیان کیا ہے کہ قومی لشکر اس وقت (۲۸۰۰۰۰) دو لاکھ اسی ہزار سے زیادہ ہے
جو نہ صرف بالکلیہ مسلح ہے بلکہ اس کے قبضہ میں کافی ذخیرہ اور توپیں بھی ہیں اب دشمنوں کا سمرنا خالی کرنا یقینی
امر ہے۔"
وہ یونان جس نے ۱۹۲۰ء میں سمرنا پر اس زعم باطل میں چند اپنے دوستوں کی مدد سے قبضہ کر لیا تھا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ پورے اناطولیہ
کا مالک ہو جائیگا۔ اب سمرنا کے تخلیہ کی تیاری اور تھریس کی ملکیت کی فکر کر رہا تھا۔ چنانچہ دو سال بعد "تیاری" کی تکمیل ہو گئی۔ جسکی تفصیل آئندہ آئیگی۔

شبنم و آفتاب

(از حضرت آدور ہاشمی کانپوری)

رہتے ہیں وہ جمال ریز فہم بشر سے دور، دور
عالم دل کے پاس پاس، حدِ نظر سے دور دور

عشق ہمیشہ شکستگی، جوشش طلب کی زندگی
میں ہوں اسی لئے تری راہگذر سے دور دور

شرم وگنہ کی نسبتیں آپ ہیں اپنی رفعتیں
رہ نہ سکیں وہ رحمتیں دامن تر سے دور دور

ان سے اب اُنکے ہجر کی کیجئے کیا شکایتیں
خود ہمیں آجتک رہے اپنی نظر سے دور دور

لذتِ سجدہ کیا کہوں، سجدہ بے اثر سہی
یار کا نقشِ پا تو ہے غیر کا سنگ در سہی

بارِ کرم اُٹھائے کون! مستیٔ دل مٹائے کون؟
عشق کی زندگی تو ہے قہر کی اک نظر سہی

عارضِ برق ریز ہی یوں نہ حجاب اُٹھائیے
جائیے میری شامِ غم! شام نہیں سحر سہی

کیا نہیں آپ جانتے شبنم و آفتاب کو
وہ رُخِ آتشیں سہی یہ مری چشمِ تر سہی

لذت قرب پر نہیں نسبت سجدہ منحصر
سجدہ آستاں نہو، سجدہ رہگذر سہی

اردو زبان کی تاریخ

از محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ایل ایل بی (علیگ)

"ہمارے دوست تنہا صاحب بی اے کئی سال سے قدیم و جدید شعرا کا ایک تذکرہ تحریر فرما رہے ہیں یہ مضمون اسی تذکرہ کا ایک جزو ہے یہ مضمون جس دقتِ نظر اور تلاش و مطالعہ کا نتیجہ ہے آپ پر خود ہی روشن ہو جائیگا۔ مضمون نگار حضرات کا شکریہ ادا کرنا سنتِ ادارت ہے لیکن تنہا صاحب محض مضمون نگار نہیں ہیں، وہ میرے قریب ترین دوست ہیں۔ ذوق نے دماغوں کو اور صداقت نے دلوں کو متحد کر دیا ہے۔ غالباً اظہارِ سپاس سے ضبطِ سپاس میں شعریت ہے۔"

وہ تذکرہ جس کے بسیط ابواب کا یہ مضمون ایک مختصر جزو ہے۔ ایک مہتم بالشان تصنیف ہے جس کے متعلق کچھ تحریر کرنا قبل از وقت ہے۔ مگر یقین ہے کہ اس کی اشاعت دنیائے ادب میں کافی مفید اور ہنگامہ خیز ثابت ہوگی۔ میں اس لئے مطمئن ہوں کہ خوش قسمتی سے شاعر نہیں ورنہ تنہا صاحب کے سیف قلم سے میں بھی محفوظ نہ رہتا۔

لیکن بہرحال جب یہ تذکرہ شایع ہوگا تو میں غور کرونگا کہ ظالم کا ساتھ دیا جائے یا مظلوم کا!؟ تذکرہ کی جامعیت، علمی اہمیت اور تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا اندازہ آپ اس مضمون سے بخوبی کر سکتے ہیں جو تحقیقی ادب کی بہترین مثال ہے اور تنہا صاحب کی کاوش کی خود ہی داد دے رہا ہے۔

ہماری آرزو ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ تذکرہ شائع ہو، میری رائے میں اگر "ہندوستانی اکیڈمی" یا کوئی دوسری انجمن اس تذکرہ کو بالمعاوضہ حاصل کر کے شائع کرے تو اردو ادب مالامال ہو جائے اور ایک انمول موتی گوشۂ صدف سے نکل کر اپنی جوت سے دنیا کو روشن کر دے۔

آغاز

یہ امر مسلمہ ہے کہ جب دو صاحبِ زبان قومیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور ان میں باہم رشتۂ اتحاد و ارتباط قائم ہوتا ہے تو قانونِ فطرت کے مطابق، اخلاق، مذہب، زبان، طرزِ بود و ماند، ادب و آداب، لباس اور دیگر شعائر پر ایک دوسرے کا اثر نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ اثر کچھ مدت میں ایک صورت اختیار کر لیتا ہے اور سب کو نظر آنے لگتا ہے۔ اس قاعدۂ کلیہ میں کوئی استثنا نہیں

جن لوگوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کی بھی شہادت دے سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں دیگر امور مذکورہ بالا کی نسبت دونوں قوموں کی زبان پر خصوصاً زیادہ اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ اظہارِ مطالب کے لئے ہر شخص وہی لفظ استعمال کرنے کی قدرتاً کوشش کرتا ہے جسکو دوسری قوم کا فرد بآسانی سمجھ لے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ آخر الذکر قوم کی زبان کا لفظ بولا جائے۔ اس طریقے سے دونوں قوموں کے افراد روزمرہ کے کاروبار چلانے کے لئے کچھ الفاظ ایک دوسر کی زبان کے سیکھ لیتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ایک زبان کے بہت سے الفاظ دوسری زبان کے اصلی الفاظ بن جاتے ہیں۔

اب خیال کیجئے کہ جب پہلی صدی ہجری کے اواخر میں عربوں نے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ کو اور بعد ازاں ملتان کو اپنی فتوحات میں شامل کرلیا اور وہ اسلامی قلمرو کا ایک جزو ہو گئے تو کیا اسلامی تہذیب و تمدن کا رواج وہاں شروع نہ ہوگیا ہوگا اور عربی زبان کے بہت سے الفاظ سندھی بولی میں داخل نہ ہو گئے ہوں گے۔ یقیناً ایسا ہوا ہوگا۔ عربوں نے بھی اکثر سندھی الفاظ کو معرّب بنالیا۔ مثلاً جاٹ یا جٹ کو زط کہنے لگے۔ تیسری صدی ہجری میں صفاریوں نے ایران کو فتح کرلیا تو ان کے ایرانی اثرات قربت کی وجہ سے سندھ کو متاثر کرنے لگے۔ چنانچہ اس عہد کے سیّاحوں کا بیان ہے کہ یہاں کے باشندے ہندو اور مسلمان عراقی لباس پہنتے تھے، ہندو بھی شلوار کا استعمال کرتے تھے اور داڑھیاں رکھتے تھے۔ چوتھی صدی کے سیّاح اصطخری کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے تھے۔

جب سلطان محمود غزنوی نے پانچویں صدی ہجری کے شروع میں لاہور پر قبضہ کرکے پنجاب کو اپنی سلطنت سے ملحق کرلیا اور لاہور کا نام محمود پور رکھکر اپنے والی کا صدر کا مقام بنادیا، جس کے ماتحت فوج کی بڑی تعداد رہتی تھی، اور جس میں زیادہ تر ترک، افغان، خلج وغیرہ تھے تو مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد محمود ہی کے وقت سے پنجاب میں آباد ہوگئی اور اس کا یہ اثر ہوا کہ ابوریحان بیرونی نے جو علامہ البیرونی کے نام سے موسوم ہے اور جس کا شمار دربارِ غزنوی کے افاضل اور اکابر میں ہے، ہندوؤں کی قدیم علمی درس گاہوں میں طالب علمی کرکے سنسکرت حاصل کی اور ہندوؤں کے علوم عربی میں اور عربوں کے علوم سنسکرت میں منتقل کئے اور برسوں ان شہروں میں رہ کر جہاں اسلام کا نام ونشان بھی نہ تھا یہاں کی مروجہ زبانیں سیکھیں۔ جن کتابوں کو اس نے عربی میں منتقل کیا۔ ان کے نام سنکیا اور پتنجلی ہیں۔ اسی عہد سے وابستہ فارسی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان ہے۔ جس کی نسبت تذکرہ مجمع الفصحا میں لکھا ہے "وے راسہ دیوان بود تازی، ہندی، پارسی" اور مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ "تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں اس نے ایک دیوان لکھا تھا"۔ یہ غزنویوں کے عہدِ اوّلیں کا ایک نامور مسلمان شاعر تھا۔ وہ لاہور میں پیدا ہوا تھا، اگرچہ خاندانی لحاظ سے وہ عجمی تھا تاہم اس نے اپنے وطنِ ولادت کی زبان میں بھی ایک دیوان مرتب کر ڈالا۔

۲۸ خود فارسی[۳] زبان میں ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو اسی عہد میں فارسی پر ہندی اثرات کی گواہی دیتے ہیں مثلاً لفظ بت جو بودھ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یا کوتوال جو ٹھیٹ ہندی یعنی کوٹ والا بمعنی مالکِ قلعہ تھا۔ یہ لفظ شاہنامۂ فردوسی میں موجود ہے۔ شعر

چو آگاہ شد کوتوالِ حصار برآویخت بادِستم نامدار

صاحبِ شرف نامہ کہتے ہیں۔

"واز شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بخراسان و فارس مشہور شدہ"۔

لکھن یعنی لنگھن[۴] (روزۂ ہندواں) منوچہری کے ہاں ملتا ہے۔ شل یعنی سیل ہندی ہے اور فرخی کے ہاں ملتا ہے ؎

بگونۂ شلِ افغانیاں دو پرہ و تیز چو دستہ دستہ بہم تیرہائے بے سوفار

چندن، فرخی اور منوچہری کے ہاں آتا ہے۔ جسے ہم آجکل صندل کہتے ہیں۔ برشکال (درس کال) یعنی برسات کا موسم ہندی لفظ ہے۔

۱؎ پنجاب میں اردو صفحہ ۳۰ و ۳۱ ۲؎ پنجاب میں اردو صفحہ ۳۳ و ۳۴ ۳؎ یہ لفظ برت کی جگہ استعمال نہیں ہوتا۔ عورتوں کی بول چال ہے بمعنی فاقہ ساغر
۴؎ پنجاب میں اردو صفحہ ۳۹

مسعود سعد سلمان کے ہاں موجود ہے ~ برشکال لے بہار ہندوستاں لے نجات از بلائے تابستان۔ علاوہ ازیں ہندی کا محاورہ "مارامار" بھی استعمال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :- بجور عدد زا بر بغرید کوس محمودی بر آمد از بس دیوار حصن مارامار۔

حکیم سنائی اسی عہد کے ایک شاعر ہیں جو ہندوستان بھی آئے تھے۔ ایک شعر میں پانی کے لفظ کو اس طرح استعمال کر گئے ہیں گویا کہ فارسی زبان کا لفظ ہے ~ نہ در آں معدہ خدرہ سیدہ نہ در آں دیدہ قطرہ پانی۔ عثمان مختاری غزنوی بھی ہندوستان آئے تھے انھوں نے ایک شعر میں دو ہندی لفظ باندھ دیئے ہیں ~ زمن بدیدے بادے بجستہ گفتے چوں۔ گس بدیدے برمن نشستہ گفتے مار۔ اس شعر میں چوں اور مار دونوں ہندی لفظ ہیں۔

مسعود[1] رازی سلطان محمود اور سلطان مسعود شہید کے عہد کا شاعر ہے۔ اس کو سلطان نے حکم دیا تھا کہ ہندوستان ہی میں رہے۔ استاد ابوالفرج رونی اسی شاعر کا فرزند ہے۔ رونی منسوب ہے رونہ کی طرف جو لاہور کا ایک موضع بیان کیا جاتا ہے ابوالفرج نے اپنی تمام عمر لاہور میں ہی گزاری۔ ضرورتاً ایک آدھ مرتبہ غزنیں کا سفر کیا۔ علماء میں سب سے مقدم شیخ اسمٰعیل لاہوری متوفی ۴۴۸ھ ہیں جو جامع علوم ظاہری و باطنی تھے اور سادات بخارا سے تھے۔ وہ لاہور ہی میں آباد ہو گئے تھے۔ مشائخ کے سلسلہ میں ابی الحسن بن ابوعثمان الجلابی صاحب کشف المحجوب ہیں جو ۴۶۵ھ میں انتقال فرما گئے اور لاہور ہی میں سپردِ خاک ہوئے۔ فی زمانہ داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ شاہ یوسف دوسرے بلند پایہ بزرگ ہیں جو ۵۵۵ھ میں فوت ہوئے۔ ان بزرگوں کے علاوہ شیخ فخرالدین حسین زنجانی لاہوری، سید احمد توختہ ترمذی لاہوری۔ سید یعقوب صدر دیوان زنجانی لاہوری بھی مشہور ہیں جو قرن ششم ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان امور سے واضح ہوتا ہے کہ یقیناً لاہور ان ایام میں ایک بار دنق اسلامی شہر اور مرجعِ علم و فضل و ادب بن گیا تھا۔

آلِ غزنہ[2] کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال تک رہی ہے۔ اس عرصہ میں مسلمان اور ہندو اقوام کی یکجائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے۔ سرکاری ضروریات کی بنا پر بھی شاہی عہدہ داروں اور ملازمین کے لئے اس ملک کی زبان سے واقف ہونا ضروری تھا۔ غزنویوں کے قبضہ میں تمام پنجاب، سندھ اور ملتان تھا، ہانسی، سرسی اور میرٹھ تک ان کے قبضہ میں تھے۔ اتنے بڑے علاقہ کے مالی و ملکی انتظام کے لئے عمال کو اس ملک کی زبان سیکھنی ضروری تھی۔ مسلمان چونکہ تازہ ولایت تھے اور یہاں کی زبانوں کے ناموں سے بھی ناواقف تھے۔ اسی لئے انھوں نے اس مخلوط زبان کا نام ہند کی نسبت سے ہندی رکھ دیا۔ سلطان محمود کے زمانہ میں ہندی زبان کے ترجمانوں کی ایک جماعت غزنیں میں مقیم تھی۔ ان میں تلک ہندی اور بہرام کے نام مشہور ہیں، تلک نے جو ہندی اور فارسی زبانوں سے خوب ماہر تھا، کشمیر میں تربیت پائی تھی۔ وہ ترجمانی سے ترقی کر کے ہندو افواج کے سپہ سالار (غزنیں میں ہندوؤں کی فوج بھی رہا کرتی تھی) سندر کی وفات پر سپہ سالاری کے درجہ پر پہونچ گیا تھا۔

۲۹

کوئی تعجب نہیں اگر خود سلطان محمود ہندی زبان سے کسی قدر آشنا ہو کیونکہ جب ۴۱۳ھ کی مہم میں سلطان کالنجر پہونچتا ہے تو نندا کالنجر کا راجہ سلطان کی مدح میں ہندی شعر لکھ کر بھیجتا ہے، سلطان ان اشعار سے اس قدر خوش ہوتا ہے کہ صلہ میں نندا کو پندرہ قلعوں کی حکومت کا پٹہ لکھ دیتا ہے۔ جن میں کالنجر بھی شامل تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ پنجاب کے میدانوں میں مسلمان حملہ آور بہت جلد سیاسی منافرت کے باوجود ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے سہنے اور ان کے ساتھ اختلاط اور ارتباط قائم کرنے لگے تھے۔

۱۱۹۳ء میں جب شہاب الدین غوری رائے پتھورا پر فتحیاب ہوا تو چاند کوی ایک نامی شاعر نے پرتھی راج راسو لکھا۔ اس کتاب کے ہر صفحے میں فارسی، عربی کے کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔

اسی زمانہ میں کشمیر کے حکمراں سلطان زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبانوں میں بھی پورا دخل رکھتا تھا۔ فارسی کتابوں کا ترجمہ

---

[1] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۳۳ و ۳۴۔ [2] "پنجاب میں اردو" صفحہ ۳۹

ہندی میں اور بہت سی ہندی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا اور سب سے پہلے اسی کے حکم سے مہابھارت اور راج ترنگنی (قدیم تاریخ کشمیر) کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔

جب معز الدین یا شہاب الدین اور اس کے والی قطب الدین ایبک نے چند سال کے عرصہ میں اجمیر، ہانسی، سستی، کہرام، میرٹھ، دہلی، بداوں، قنوج بنارس، نہروالہ، تھنگیر، گوالیار، کالنجر، اودھ اور مالوہ فتح کر لئے تو قدرتی طور پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی تعلقات میں اور اضافہ ہوگیا اور ایک مشترک زبان کی ضرورت بیشتر از پیشتر محسوس ہونے لگی۔

چنانچہ اسی عہد کے قریب قریب امیر خسرو نے جو ۷۲۵ھ میں فوت ہوئے خالق باری تصنیف کی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب بہت ضخیم تھی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کتاب امیر خسرو کی تصنیف ہی نہیں ہے بلکہ گیارہویں صدی میں کسی شخص نے اس کو تصنیف کیا اور امیر خسرو کے نام سے مشہور کر دیا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تصنیف امیر خسرو کی نہیں ہے تو نہ سہی لیکن امیر خسرو کے دیگر کلام سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس وقت عام گفتگو میں یہ مشترک زبان سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی تھی۔ چنانچہ امیر خسرو آنکھوں کا ایک مجرب نسخہ دوہروں کی بحر میں اس طرح لکھتے ہیں۔

لود پھٹکری، مردہ سنگ   ہلدی زیرہ، ایک ایک ٹنگ   افیون چنا بھر مرچیں چار   اُرد برابر تھوتا ڈار

پوست کے پانی پوٹلی کرے   ترت پیڑ نینوں کی ہرے۔ نیز امیر خسرو کی ایک غزل جس کا مطلع ہے

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اور پہیلیاں، مکرنیاں اور گیت پتہ دیتے ہیں کہ ۷۰۰ھ میں یہاں کے مسلمان یہی زبان اچھی طرح بولتے ہونگے، بیشک ہندوؤں کی نسبت ان کی زبان پر فارسی عربی الفاظ زیادہ آجاتے ہوں گے لیکن جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ زبان جسکو اس وقت کے مسلمان ہندی زبان سے تعبیر کرتے ہیں اور جسکو بعد ازاں اردو کا نام دیا گیا، برج بھاشا کی بیٹی ہے یا نہیں۔ جیسا کہ صاحب آبحیات کا خیال ہے۔ ہم اس بارہ میں "پنجاب میں اردو" کے مؤلف سے متفق ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "جب ان دونوں زبانوں (برج بھاشا اور اردو) کی صرف و نحو اور دوسرے خط و خال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے رستے

۳۰ مختلف ہیں۔ اردو جہاں اپنے اسماء و افعال کو الف پر ختم کرتی ہے، برج واؤ پر ختم کرتی ہے۔ برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے۔ اردو میں مرکب افعال کا مع توابعات کے بہت رواج ہے۔ برج بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے۔ اس لئے اردو کو برج بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں" کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی جس کی برج بھاشا ہریانی، راجستھانی، پنجابی اور اردو شاخیں ہیں قدیم پراکرت سوراسینی کی یادگار ہے لیکن جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ ...... آج دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے قریب ہی تین زبانوں یعنی ہریانوی، برج اور راجستھانی کا سنگم ہوتا ہے اور گریرسن نے تو صاف دہلی کو ہریانوی زبان کے علاقہ میں شامل کر دیا ہے۔ مگر ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہی یعنی وہی اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے... ...بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات سے بن گئی ہے"

جس وقت مسلمان دہلی میں آئے تو دوآبہ میں یقیناً برج بھاشا بولی جاتی تھی کیونکہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ) اور مخدوم بہاؤالدین برناوی جو علی الترتیب سہارنپور اور میرٹھ کے اضلاع سے تعلق رکھتے ہیں اپنے ہندی اشعار ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو برج کے مماثل ہے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی الکھ داس تخلص کرتے تھے۔ فرماتے ہیں :-

سرود در پردہ پوربی ؎ دہن کارن پی آپ سنوارا — بن دھن سکھی کنت کنھارا

شہ کھیلے دہن ماہنیں ایوان — باس پھول منہ اچھے حیوان

کیوں نہ کھیلوں تج سنگ میتا — مجھ کارن تیں اپنا کیتا

الکھ داس آکھے سن ہوئی — سوئی پاک ارتھ ہن سوئی

سبد ؎ ایک تھیں ہم اننت بھیلی آپی آپ بیاہی — سہجنہ سہجنہ کینا سنبھو برانا ایام سسر اجنوائی

دوہرہ ؎ ایک اکیلا آپ سوجی تھیں یہ سنسار — آتھ نیاتھ تھول سوں سبھی ایک انکار

سبد ؎ پھلے نہ بھولے آوے نہ جائے — کانسی کا سیّد کانسی ہی سمائے — جل تھیں اپنا ملبلا جل ہی ماہ بلائے — تیسا یہ سنسار سبھ مولنہہ جائے سمائے۔ دوہرہ۔ آپ گنوائے پی ملے پی کھوئے سب جائے — الکھ کتھا ہے پرم کی جے کوئی بوجھے مائے۔

اسی طرح شیخ بہاؤالدین برناوی فرماتے ہیں

برائے بارش :- کاہے اے بدرا ناں برسنہو تھی ناہن گرجت کاہے ناں جھڑلاوت

کاہے بھی برکھارت تیوت برہن من چنتو کاہے تھی ناں گھور گھور ستاوت

چترو ساتیرو ہے اُماہو دا تا میگھ کہاوت — گرہن تیا کو ماجم گت تھیں ادل بدل لے آوت

دیگر ؎ ان نین کا ہی یہ سیکھ — ہوں تجھ دیکھوں توں مجھ دیکھ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو نے برج کو ان علاقوں سے رفتہ رفتہ خارج کر دیا ہے اور آب اس کی جگہ پر قابض ہوگئی ہے۔

امیر خسرو دہلی کی زبان کو دہلوی لکھتے ہیں۔ ابوالفضل بھی آئین اکبری میں اس کو دہلوی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ شیخ باجن (متوفی ۹۱۲ھ) بھی اسکو دہلوی کہتے ہیں اور جو نمونہ اس زبان کا دیتے ہیں وہ قطعاً اردو ہے مثلاً :-

مناجات ؎ روزہ دہر دہر نماز گزاری دینی فرض زکوٰۃ — بن فضل تیرے چھوٹک ناہیں آگیں لکھیں بات

دوہرہ ؎ بھونرا لیوے پھول رس رسیا لیوی باس — باجن بلاجے سینچے آس کر بھونرا کھڑا اداس

؎ باجن جو کیسیکے عیب ڈھانکے — اس تھے درجن تھر تھر کانپے

۳۱

اس میں شک نہیں کہ اردو اپنی صرف ونحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسما وافعال کے خاتمہ میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے، یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ ان کے توابعات وملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر وتانیث کے قواعد افعال مرکبہ وتوابع میں متحد ہیں۔ پنجابی اور اردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔ قدیم کتب تاریخ ولغات کی شہادت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اہل ہندوستان لاکھ کو لکھ، باگ کو بگ، کھانڈ کو کھنڈ، بھانڈ کو بھنڈ، ماٹ کو مٹھ، گاڑی کو گڈلی۔ تالاب کو تل کہتے تھے۔ اہل پنجاب ان الفاظ کو آج بھی اسی طرح ادا کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا رہا ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں اسی زبان میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو ایک طرف پنجابی سے اور دوسری طرف برج سے ممیز کرتی ہیں۔ شیخ فریدالدین گنج شکرؒ (متوفی ۶۶۴ھ) اور مادرِ مومناں کے درمیان اردو میں جو گفتگو ہوئی اس کے دو فقرے ہم تک پہونچے ہیں۔ مادرِ مومناں نے کہا تھا "خوجا برہان الدین بالا (بچہ) ہے" شیخ نے جواب میں فرمایا "پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے" آخری فقرہ میں "کا" اور "ہوتا ہے" ایسے الفاظ ہیں جو اس جملہ

کو پنجابی اور برج سے مختلف کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بابا گنج شکرؒ کا یہ فقرہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے "رحم کرے تو چھوٹیاں عدل کرے تو لوٹیاں" اور دوسرا فقرہ "پیچ سر کے مشہور ہے۔ اسی طرح خواجہ چراغ دہلی (متوفی ۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء) کا فرمودہ "تم اوپر وے تلے۔ نقل در نقل ہوتا چلا آیا ہے آٹھویں صدی ہجری کا ایک اور فقرہ جو فیروز شاہ خلجی ۷۵۲ھ و ۷۰۹ھ ہجری کے حملہ سندھ سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف یوں نقل کرتے ہیں "برکت شیخ ٹھیا اک موا اک نہا"

اسلامی سلطنت دہلی پہونچ کر بہت جلد مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اس لئے یہ زبان اسلامی لشکروں، مہاجروں اور نوآبادوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے میں پہونچ جاتی ہے۔ خلجی اسکو گجرات اور دکن پہونچاتے ہیں۔ محمد تغلق جب آٹھویں صدی ہجری میں دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو آباد کرتا ہے تو یہ زبان دکن میں مسلمان نوآبادوں کی زبان بن جاتی ہے، گجرات و دکن میں نویں صدی ہجری سے اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، اہل گجرات اسکو نویں صدی ہجری میں "زبانِ دہلوی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں لیکن آنے والی صدی میں "گجری" یا گوجری کہنے لگتے ہیں۔ اسی طرح دکن میں پہلے پہل یہ زبان "زبانِ ہندوستان" کہلائی بعد کو "دکنی" کہنے لگے۔ شاہانِ گجرات اسی زبان میں بات چیت کیا کرتے تھے چنانچہ محمود شاہ بیگڑہ کا یہ فقرہ تاریخ میں محفوظ ہے "نیچی بیری سب کوئی جھوڑے" محمد شاہ تغلق نے لفظ "کھڑا کھڑی" کے تلفظ کو اصل دہلوی اور غیر دہلوی باشندوں کی شناخت کے لئے معیار مقرر کر دیا تھا۔[1]

دکن میں حضرت خواجہ بندہ نواز کے والد نے جن کا انتقال ۷۳۱ھ میں ہوا اپنا تخلص راجا رکھا تھا جو آج تک شاہ راجو یا سید راجا کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی طرح حضرت زین الدین خلدآبادی (متوفی ۷۷۱ھ کا آخری کلام (منجمت بلاوہ) مشہور ہے۔ علاوہ ازیں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رح متوفی ۸۲۵ھ ۱۴۲۱ء کی جانب حسب ذیل اشعار منسوب ہیں:۔

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا اُسے — جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں کھوئے خودی اپنی خدا ساتھ محمدؐ — جب گھل گئی خودی تو خدا بن کئی وسے
آنتوں بلیلہ وآنتوں لون — بتین کے گھر جائے کون

نیز معراج العاشقین بھی آپ ہی کی تصنیف ہے جو انجمن ترقی اُردو نے شائع کر دی ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔[2]

"نبی علیہ السلام کہے۔ انسان کے بوجھنے کو پانچ تن۔ ہر ایک تن کو پانچ پانچ دروازے ہیں ہور پانچ پانچ دربان ہیں"۔ ..... وغیرہ

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (متوفی ۹۰۲ھ ۱۴۹۶ء) نے شرح مرغوب القلوب نثر میں ایک کتاب لکھی ہے جسکا نمونہ یہ ہے:۔

۳۲

"پیغمبر کہے۔ جے کچ کام کریگا کوئی خدا ناؤں نالے کر تو او کام پا تمال ہوگا۔ سرانا، نواز نا خدا کو بہوت کہ او پالن ہارا ہے عالم کا"

جب دکن کی اسلامی سلطنت بہمنیہ شکست ہوکر بیجاپور، گولکنڈا اور احمد نگر وغیرہ میں تقسیم ہوئی تو چونکہ سلاطین دکن کے محلوں میں ہندو رانیاں آئیں مثلاً والی احمد نگر احمد نظام شاہ اصلاً برہمن تھا اور اسمٰعیل عادل شاہ کی ماں کوکنی تھی۔ لہٰذا سلاطین کی بے تعصبی کی وجہ سے بہت سے ہندو سلطنت کے مشیر ہوگئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم عادل شاہ متوفی ۹۶۵ھ کے زمانہ میں شاہی دفتر فارسی سے دکنی زبان میں منتقل ہوگیا۔ اور یہی زبان عوام کی زبان ہوگئی اور اہل علم و ادب کے اظہار خیالات کا آلہ بن گئی۔ اسی زمانہ میں وجدی ایک شاعر گذرا ہے۔ بعض حضرات وجدی کو وجیہہ الدین بتلاتے ہیں جو ایک بزرگ تھے۔ ان کی مثنوی تحفۂ عاشقاں مشہور ہے۔ تحفۂ عاشقاں حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کے خسرو نامہ کا ترجمہ ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں

کروں پاک دل ہور زباں پاک سوں — ثنا پاک اس عاشقِ پاک کوں
کہ جس سے ہوا ہے اد گم عشق کا — اجوں لگ اُبلتا ہے خم عشق کا

---

[1] دکن میں اردو صفحہ ۶ و ۷، ۸ [2] تاریخ نثر اردو صفحہ ۲۹

پڑیا (بڑا) عکس اس نور کا جس رتن جھلکنے لگا آرسی کے نمن (لوح)
سو اس آرسی میں کیا جیوں (جوں) نظر ہوا عاشق اپنا آپس دیکھ کر
آپس کچھ پرتو کوں معشوق جان لیا مبتلا ہو کے عاشق کا شان
نکل کنج مخفی سے خلوت کی بھار (باہر) کیا جلوہ کر کثرت بے شمار

ایک دوسرے شاعر سعدی دکنی بھی ہیں۔ ان کے چند اشعار مشہور ہیں۔

ہمنا تمن کو دل دیا تم نے لیا ہور دکھ دیا تم یہ کیا ہم وہ کیا ایسی بھلی یہ ریت ہے
دوین کے گھر میں بھر ول روز و نخوں دلکو بھرو (ں) بنشیں سنگ کویت دھر (ں) دیا نجات و مبت ہے
سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ در ریختہ دُر ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

شاہ برہان الدین جانم خلف میراں جی شمس العشاق بیجاپوری (متوفی سنہ ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء) نے ایک کتاب نثر میں کلمۃ الحقائق کے نام سے تصنیف فرمائی جس کا نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ یہ شاعر بھی تھے۔ فرماتے ہیں:۔ اللہ پاک منزہ ذات اس سوں صفتاں قائم سات، علم ارادت، قدرت، بار سنتا، دیکھتا، بولنہار۔

نمونۂ نثر:۔ "اللہ کرے سو ہووے کہ قادر، توانا سوئے کہ قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرن ہار۔ سہج سہج سو نیرا ٹھار دسہج ہوا بھی توج بھی باوجدھاں کچھ نہیں بھی تھا تھیں، دوجا شریک کوئی نہیں۔ ایسا حال سمجھنا خدا لگتے خدا کوں جس پر کرم خدا کا ہوئے۔"

حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری (متوفی ۱۰۸۶ھ / ۱۶۷۵ء) نے گنج مخفی در مبحث شاہد و مشہود تقریباً ۱۰۱۰ھ / ۱۶۰۱ء تصنیف فرمائی، نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کوں عیاں کرنے چاہا تو اول اس میں سوں یک نظر نکلی، سو اس سوں امین دیکھ ہوا۔ امین شاہد کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں ذات کے دو طور ہیں، ذات نے آپس کوں دیکھا، اسے نظر کہتے ہیں، دیکھ کر گواہی دیا تو اُسے شاہد کہتے ہیں۔ یو (یہ) تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"

"سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنا کلیات ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا، اس میں خیالات کی جدت، استعارات و تشبیہات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی نہیں ہے لیکن جیسا کہ عام قاعدہ ہے ابتدا میں سیدھے سادے خیالات نظم کئے گئے ہیں مثلاً

رکھا ایک ہے ہر ٹیک کدھن لاکھ چمن ہے لکھ جوت ہے ہر ٹھار دیے ٹیک رتن ہے
سمدور ہے ایک ہور ندیاں ہیں سو ہزاراں باتاں سو کر وڑاں میں دلے ٹیک رسن ہے

کفر ریت کیا ہور اسلام ریت ہر ایک ریت میں عشق کا راز ہے
پیا باج پیالا پیا جائے نا پیا باج یک تل جیا جائے نا

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا جانشیں محمد قطب شاہ بھی شاعر تھا، ظل اللہ اس کا تخلص تھا ۱۰۳۵ھ میں فوت ہوا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

میرا دل ہے زر الفت کا کارخانہ نہیں منجکوں بازار دالا کا حاجت
عشق کی تیلی ہے گوری رنگیلی جیتر ناریاں میں ہے سنتی ہے بھیلی
سنو لوگ میری پریم کی کہانی کہ پیا ہے رنگ عاشقی کی نشانی

اسی طرح محمد قطب شاہ کا جانشیں سلطان عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا، تخلص عبداللہ تھا ۱۰۸۳ ہجری میں فوت ہوا چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

دلا حق کی طرف ہو کہ حق آرام دوے گا سعادت کی تری بات سرانجام دوے گا

---

(۱) تاریخ نثر اردو صفحہ ۴۳ و ۴۵ (۲) دکن میں اردو صفحہ ۹ و ۱۰ و ۱۱

اے یار اگر ہے زندہ دل توں   یوں نام کہ جم ہو جام لیتا

عبداللہ علی ولی کے صدقے   معشوق سوں خط مدام لیتا

عبداللہ قطب شاہ کا داماد و جانشین ابوالحسن تانا شاہ بھی شاعر تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

کس در کہوں جاؤں کہاں مجھ دل پہ بھل بچہرت ہے   اک بات ہوں گے سجن یاں جی ہی بارہ باٹ ہے

ان قطب شاہیوں کے زمانہ میں نشاطی، غواصی، احمد جنیدی، شاہی، مرزا، شغور، بیچارہ، بحری، طالب، نوری اور مومن وغیرہ اچھے شاعر تھے، ایک ایک شعر بطور نمونہ درج کرتا ہوں۔[1]

نشاطی :- خداوندا تجی ہی جم خدائی   ہمیشہ تجکو ساجی کبریائی

یہ شعر اس کی مشہور مثنوی "پھول بن" مصنفہ سنہ ۱۰۷۶ھ سے لیا گیا ہے۔

غواصی :- (جہانگیر کے زمانہ میں دلی آیا تھا۔ برس یک ہزار و ستا دیس میں   کیا ختم یہ نظم دن تیس میں

احمد جنیدی (سنہ ۱۰۶۴ھ میں ایک مثنوی ماہ پیکر نام لکھی) الٰہی توں کر یو نظم جگ اجال   کہ ہووے تو جگ میں جوں محبوب مثال

شاہی :- ملنا تھن کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ کہے   کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

مرزا :- (مصاحب تانا شاہ)   عارض نہیں چندر کا ترے گال سوں اچھا   سمجھی ہمن خلف کو نہ تجھ خال سوں اچھا

شغور :-   برسات میں نہ دیکھا نظر بھر کر آفتاب   روشن یہ ہے کہ عاشق ہوا تجھ پہ آفتاب

بیچارہ :- (عالمگیر کے زمانہ میں دلی گیا تھا) پی سے جدا ہونا نہ تھا چاہا خدایا یوں ہوا   جز صبر کچھ چارہ نہیں بیچارہ ہو رہنا پڑا۔

بحری :- (من لگن نام مثنوی سنہ ۱۱۱۲ھ تصنیف کی تھی)   ہر تن کو تلاش جیوں ہے تن کی   یوں من کو لگن ہے من لگن کی

بحری جو پڑا ہے غیر کے یار   اے غار کے یار اس سے ہو غم خوار

طالب :-   ہمنا کے خون چشم سے آلودہ کب کرے   وہ پگ جسے گرانی ہے رنگ حنا ستی

نوری :-   نوری انہیں کے دل کی کسی سے نہ کہہ تھا   حاصل بھلا اب اس سے دوانے جو تھا سو تھا

مومن :- (مصنف مثنوی اسرار عشق) عجب دی شب کہ منجن سیم کر حل   عروس بدر سر تمنا نور کی جل

بیان متذکرۂ بالا سے ظاہر ہے کہ دکن میں ہماری زبان برابر ترقی کرتی رہی اور شاہجہاں کے عہد سے بہت پیشتر یہ دکن میں رائج ہو چکی تھی اور نہ صرف نظم میں بلکہ نثر میں ساتھ ساتھ قدم مار رہی تھی۔

۳۴

حضرت میراں صاحب یا شاہ میراں جی حسن خدا نما (متوفی ۱۰۷۱ھ/۱۶۵۹ء) نے شرح تمہید ہمدانی یا شرح شرح تمہید سنہ ۱۰۷۱ھ کے قریب لکھی نمونہ حسب ذیل ہے۔ "خواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم قاضی عین القضات کو کہے کہ تمہیں کئے سو کتاب منجے دکھلاؤ، تو کتاب دیکھکر بہوت خوش ہوئے، ہور کہے کیا خوب بیان میرے نور کا ہور خدا کے نور کا کئے" وغیرہ

عہد قطب شاہی کی ایک کتاب احکام الصلوٰۃ ہے، اس کے مصنف عبداللہ ہیں۔ سنہ ۱۰۳۲ھ میں اس کو ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نماز کے متعلقات بیان کئے گئے ہیں۔ عبارت کا نمونہ ذیل میں درج ہے۔

اول کلمہ طیب۔ پہلا کلمہ بولتا ہوں میں پاکی کا کانیکی پاکی ایمان کی کفرتی۔ شرکتی لا الٰہ الا اللہ نہیں کوئی معبود برحق الا اللہ مگر اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے۔ محمد رسول اللہ۔ محمد رسول خدا کے برحق ہے۔ دوم کلمہ شہادت دوسرا کلمہ بولتا ہوں میں شہادت کا یعنی گواہی دیتا ہوں

---

[1] "دکن میں اردو" صفحہ ۱۱-۱۲-۱۳-

اس خدائے تعالیٰ کی یک بنی ہے۔ اشہد ہور گواہی دیتا ہوں میں ان لا الہ کہ نہیں کوئی معبود برحق۔"

اس کے بعد مفتاح الخیرات نامی ایک کتاب ہے جو اسی عہد کی تصنیف یا تالیف ہے۔ نمونہ ذیل میں درج ہے۔

" ایمان کی حکماں کا معرفت ہور نماز احکام ہور ارکان پچھاننا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب کوں اس کی پچھان نی چھٹکارا ہے ہور آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار نا ہوئیگا۔"

سنہ ۱۰۴۵ھ میں ملا وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک کتاب "سب رس" تصنیف فرمائی۔ اسکی عبارت مقفیٰ ہے۔ نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

" تمام مصحف کا معنی الحمدللہ میں ہے مستقیم۔ ہور تمام الحمدللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم۔ ہور تمام بسم اللہ کا بسم اللہ کے نقطے میں کھیا ہی کریم"

شمائل الاتقیا، تصوف کی ایک کتاب ہے جو برہان الدین اولیا اورنگ آباد کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ اسکی نام سے میراں یعقوب نے سنہ ۱۰۷۸ھ میں مرتب کیا تھا۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

" اپنی حیات کے وقت منجے اشارت کئے تھے جوں شمائل الاتقیا کتاب کوں ہندی زبان میں لیا دے تا ہر کسی کوں سمجھا جاوے اس وقت منجے بیا نہیں تا کہ یک ہزار ستر پر اٹھوں سال کو رحلت کئے پران ان کے بھانجے عارف حق رسیدی عارفوں کی نور دیدی مصطفےٰ کی کلیجی ہور مرتضیٰ کے میں شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے زماں نے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا۔ جی کچھ مشکل آتا تھا سو پیر کی مددسوں آسان لکھا جاتا تھا۔"

سنہ ۱۰۹۳ھ میں ایک مثنوی موسوم بہ "روح افزا" بھی لکھی گئی تھی۔ اشعار بطور نمونہ ذیل میں درج ہیں

رکھیا استاداں پرائی اسی　　ہنر ہور ادب سیکھلانی اسی

ہر یک علم واقف ہو پڑنا کتاب　　اسی خوشنویسی بھی آئی شتاب

ہوا زور کشتی میں سینی میں در　　سکیا تیر نیزی کری سب ہنر

چڑیا باپ کا تخت رضوان شاہ　　جمع ہور وزیراں بھی سارے سپا

بیجاپور میں جو عادل شاہیوں نے اس زبان کی ترقی میں کوشش کی ہے اس کا یہ حال ہے کہ علی عادل شاہ کے زمانہ میں اس کا درباری شاعر نصرتی تھا جو ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز تھا۔ اس نے گلشن عشق اور علی نامہ دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ مثنوی علی نامہ سنہ ۱۰۷۶ھ میں لکھی گئی اور گلشن عشق سنہ ۱۰۶۸ھ میں ترتیب دی گئی۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

عنایت کا تجھ ہت ہے عالم نواز　　کوئی ذرہ خورشید تھی سرفراز

دو عالم کوں سو جانوں لک بات میں　　دکھنا چھپا تا ہی تجھ ہات میں

دیا ہی توں خاکی کوں ایسا شرف　　جو تس سجدہ نوری کھیں صف صف

ہاشمی نصرتی کا ہم عصر تھا اور مادر زاد اندھا تھا۔ ریختی کا موجد یہی شخص ہے، یوسف زلیخا نام ایک مثنوی اس سے یادگار ہے سنہ ۱۰۹۰ھ میں انتقال کر گیا۔ مثنوی مذکور کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ثنا حمد اس کوں سزاوار ہے　　سگل عشق کا جس کو بستار ہے

سکت کس میں ہے جو کرے سر بسر　　ابتا ہاشمی تو مناجات کر

۱؎ "دکن میں اردو" صفحہ ۲۱ لغایتہ ۲۳

مرے شعر کرے بادشاہاں سند   بند کر کر وراکین جو سب ہوشمند

ریختی کا نمونہ بھی حاضر ہے۔ اگر کوئی آ کے دیکھے گا تو دل میں کیا کہے گا وو   مجھے بدنام کیا کرتے کہیں میں جاؤنگی چھوڑ دو

لیکن شمالی ہند میں یہ مخلوط زبان اس قدر رواج نہیں پا سکی کہ تصنیف و تالیف میں حصہ لیتی۔ دکن کے بادشاہوں نے اس نئی زبان کی اشاعت میں بہت حصہ لیا، سرکاری دفاتر میں یہی زبان استعمال ہونے لگی۔ اور فارسی کو خارج کر دیا۔ شعرا اور مصنفین کی حوصلہ افزائی کی۔ مگر مغلوں نے اس طرف توجہ نہ کی۔ سکندر لودی نے ۹۱۵ھ ۱۵۰۹ء میں مصالح ملکی کے لحاظ سے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی ترغیب دی تاکہ وہ دفتری زبان سیکھ کر ملکی کاروبار میں حصہ لے سکیں۔ برہمن اور راجپوت تو اس طرف متوجہ نہ ہوئے البتہ کایستھوں نے فارسی پڑھنی شروع کر دی اور وہی ایک مدت تک سرکاری عہدوں پر مامور ہوتے رہے۔ بہر حال سکندر لودی کا یہ حکم بھی مؤثر ثابت ہوا اور اس کا یہ اثر ہوا کہ خود ہندوؤں کی زبان میں عربی فارسی کے الفاظ چڑھ گئے اور اُدھر مسلمانوں کی زبان پر ملکی بھاشاؤں نے قابو پا لیا اور باہمی میل جول کی وجہ سے یہ مشترک زبان صاف اور رواں ہوتی گئی۔

اسی سکندر لودی کے زمانہ میں کبیر شاعر ہوئے ہیں جو بنارس کے رہنے والے تھے اور آن پڑھ تھے، گرو رامانند کے چیلے ہوئے اور خود کبیر پنتھیوں کا سلسلہ نکالا۔ ان کے دوہروں میں فارسی اور عربی کے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً

دین گنوایو دُنی سے دنی نہ آیو ہاتھ   پیر کہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ

غافل   دنیا

کبیر سبر یہ سرائے ہی کیوں سوئے سکھ چین   کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

نقارہ

گرو نانک کی تصنیفات میں بھی جو سنہ ۹۴۵ھ ۱۵۳۸ء کے بعد فوت ہوئے عربی فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔

ساس ماس سب جیو تمھارا تو ہے کھرا پیارا   نانک شاعر ایو کہت ہے سچے پروردگارا!

بلکہ سچ پوچھو تو مسدرجہ شعر اردو معلوم ہوتا ہے۔ ابتدا میں اردو کی یہی کیفیت تھی۔ جو چیزیں وظیفۂ عبادت کے طور پر ہیں ان میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے ہیں۔ جپ جی کے دو فقرے ملاحظہ ہوں۔

وارن جاؤں ان ایک بار   تو سدا سلامت جی نرنکار

بابر شاہ جب ہندوستان آیا تو وہ بھی یہاں کی مخلوط زبان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اپنے ترکی دیوان میں ایک شعر لکھا ہے جس کا ایک مصرع یہاں کی زبان میں ہے اور دوسرا مصرع ترکی میں ہے

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی   فقرا ہلیغہ بس بولغوسید ور پانی و روتی[1]

ہمایوں نے جب بہادر شاہ والیٔ گجرات کے خلاف جنگ کی تو مالوہ میں بہادر شاہ کو رومی خاں کی نمک حرامی سے شکست ہوئی اور وہ بے سر و سامانی کے ساتھ گجرات کو بھاگ گیا۔ ایک طوطا کا پنجرہ بھی مال غنیمت کے ساتھ ہمایوں بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کی حیرت انگیز باتوں کو سن سن کر بادشاہ دنگ ہو رہا تھا کہ رومی خاں بھی حاضر ہوا، بادشاہ نے فرمایا "بیائید رومی خاں" اس کا نام سنتا تھا کہ طوطا چیخنے لگا "پھٹ رومی خاں حرامخوار پھٹ رومی خاں حرامخوار"۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ کے لشکری اس شکست کو رومی خاں کی نمکحرامی کا نتیجہ سمجھتے تھے اور بار بار یہی الفاظ کہتے ہوں گے طوطے نے بھی یاد کر لئے اور جب رومی خاں کا نام آیا تو اس نے بھی وہی الفاظ دہرا دیئے۔

سولہویں صدی میں بعہدِ شیر شاہ سوری ملک محمد جائسی نے پدماوت کی داستان نظم کی اور یہ التزام کیا کہ فارسی عربی کا ایک لفظ نہیں آنے

---

[1] گل رعنا صفحہ ۸ میں دوسرے مصرع کے معنی یہ لکھے ہیں "فقرا کو پانی اور روٹی کافی ہے"

دیا اور بحر بھی ہندی رکھی ہے، اور بعد ازاں اکبر کے عہد سے جبکہ مسلمان ہندوؤں سے گھل مل گئے یہ نوبت پہونچی کہ ہندو شرفا بلکہ راجا مہاراجا ایرانی لباس پہن کر اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے۔ جس طرح کہ آج کل انگریزی بولنے اور انگریزی لباس پہننے پر فخر کیا جاتا ہے۔

جو چیزیں ہندوستان کی پیداوار تھیں ان کے نام قدرتی طور پر ہندی تھے، وہ سب بازاروں پر چڑھ گئے اور فارسی عبارتوں میں بھی ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کئے جانے لگے، مثلاً جھرکہ، درشن، پھول کٹارہ، کھپوہ، مرصع، جم دھر، کٹار، تلوار، گھوڑا، ہاتھی، پالکی، نالکی، جھالر، کہار، ڈاک چوکی، برہ، دیس مکھ، دیس پانڈیہ، پٹیل، پٹواری، رائے، راؤ، راجہ، مہاراجہ، چودھری، پہر، دوپہر، گھڑی، گھڑیال، ڈالی، گھاٹ، گھرواڑہ، بیوپاری اور اسی طرح کے صدہا الفاظ سلاطین مغلیہ کی شاہی زبان میں ملے جلے نظر آتے ہیں۔

اکبر شاہ جہانگیر کو پیار سے شیخو جیو، مراد کو پہاڑی راجہ اور فیضی کو شیخ جیو کہتا تھا۔ آرام بانو اس کی چہیتی بیٹی تھی، مرتے وقت جہانگیر سے وصیت کرتا ہے۔

"بایں خواہر خود کہ لاڈلی من است بعد از من باید بر وشے سلوک کنی کہ من با ویکنم۔"

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ خان اتکہ اور ادہم خاں میں جھگڑا ہو گیا اور آخرالذکر نے خان کو شہنشاہ اکبر کے روبرو قتل کر ڈالا، اس وقت شہنشاہ خفا ہو کر ہندی زبان میں فرمایا "اے بچہ گاڈی تو کیوں اتکہ مارا" ایک شعر بھی اکبر سے منسوب ہے جس میں دو ہندی الفاظ آ گئے ہیں:۔

چیتۂ بادشاہ کالا گرفت　　خون او دشت راجو لالہ گرفت

یعنی بادشاہ کے چیتے نے ہرن پکڑا اور اس کے خون سے جنگل لال ہو گیا، اکبر نے ایک فیل کا نام بھیرون اور دوسرے کا بال سندر رکھا تھا۔

ایک کنیا کا نام ہوہ رکھا تھا جب اکبر نے راجہ بھگونت داس کی لڑکی سے اپنے بیٹے جہانگیر کی شادی کی اور دلھن کی پالکی کو باپ اور بیٹے شاہی محل تک خود اٹھا کر لے گئے تو راجہ نے کہا "ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری　ہم باندگلام رہے" تو اکبر نے جواب میں کہا "تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی　تم صاحب سردار رہے۔" مشہور ہے کہ شاہی دلھن نے یہ دوہا گایا "پربت بالنس کا موری بابل　نی کا نسڈ واجپوا ڈرے ادھے اوپر کلس براجے　دیکھیں راجہ راؤ رے۔"

جہانگیر بادشاہ نے شراب کا نام رام رنگی رکھا تھا۔ شاہجہاں بچپن میں باپ کو شاہ بھائی اور دادا کو شاہ بابا کہتا تھا۔ مراد بخش شاہ شجاع کو بھائی جیو کہتا تھا۔

ستر ہویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن نے جو ضلع باندہ کے رہنے والے تھے اور پنڈت، شاعر اور فقیر تھے رامائن کو برج بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ یہ کتاب مطبوع خاص و عام ہو گئی۔ ان کے دوہروں میں اکثر اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں فارسی عربی کے الفاظ موجود ہیں

سنکارے سیوک چلے سوامی رکھ پائے　گھرت ترو بن و باگ و بر ڈیرا دیو لگائے

رخ　باغ

گھر لسواس بچن ہٹ بولے　کتنی بھنگ کلہ بھی کھولے　رام انیک گریب نواجے　لوک بید بر بر دراجے

ٹوپی　غریب نواز

گنی گریب گرام نر ناگر　پنڈت موڑ ملیں اوجاگر　مایا کوٹے کر کر بسے ہاتھ　تلسی داس گریب کی کوئی نہ بوجھی بات

غنی غریب　غریب

اسی زمانہ میں سورداس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا۔ ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا

لے گل رعنا صفحہ ۹　ےے مغل دربار میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ (انگریزی) باب پنجم

جو فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔ پس اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب یہ بزرگانِ مذہب اپنے دوہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا کچھ اس سے زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔ سور داس جی کہتے ہیں:-

مایا دہام دہن دنتا باندھوں ہوں اس ساج ‏ سنت سبھی جانت ہوں، تو نا آئیو باج
ساز ‏ باز

کھیت بہت کا ہو تم تانے، سبن سنی آواج ‏ دیو نہ جا پار اُترائے، چاہت چڑھین جہاج
آواز ‏ جہاز

لیجیے پار اُتار سور کو، مہاراج برج راج ‏ نئیں کرت کہت پربھو تم سوں سد گریب نواج
غریب نواز

عبدالرحیم خانِ خاناں نے ہندی میں اپنا تخلص رحمن کیا تھا۔ اس کے کلام کی سادگی نے عوام میں خوب شہرت حاصل کی۔ اگرچہ وہ سنسکرت اور فارسی کا عالم تھا۔ اس کے دوہے عربی، فارسی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے پاک ہیں اور اس طرح اس نے ایک قدم اردو کی طرف اور بڑھایا ہے۔ نمونہ حسبِ ذیل ہے۔

رحمن چپ ہو بیٹھئے دیکھ دنن کے پھیر ‏ جب نیکے دن آئینگے بنت نہ لگئے دیر
آمی پیا دے ماں بن رحیمن ہمیں نہ سہائے ‏ ماں سمہو مربو بھلو بر دیکھ درے ہی بلائے
رحیمن وے نر مر چکے جو کہوں مانگن جائیں ‏ ان تے پہلے وے موئے جن مکھ نکھست ناہیں
رحیمن کھوجو اوکھ میں جہاں رسن کی کھان ‏ جہاں گانٹھ تہاں رس نہیں یہی پریت کی ہان
رحیمن دھاگا پریم کا مت توڑو چٹکائے ‏ ٹوٹے سے پن نا ملے۔ ملے گانٹھ پڑ جائے
رحیمن پریت سرائیے ملے ہوت رنگ دون ‏ جوں ہردی زردی تجی۔ تجی سفیدی چون
رحیمن ات مشکل بھیو گاڑھے دوؤ کام ‏ سانچ کہے تو جگ نہیں جھوٹے ملے نہ رام
رحیمن سیدھی چال سو پیادہ ہوت وزیر ‏ فرزیں شاہ نہ ہو سکے ٹیڑھے کی تاثیر
رحیمن دیکھ بڑوں کو لگھو نہ دیجیے ڈار ‏ جہاں کام آوے سوئی کیا کرے تردار

۳۸

الغرض بیانات متذکرہ بالا سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ارتباط سے پہلے ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ اور پھر مخلوط جملے زبانوں پر جاری ہوگئے لیکن ایک مدت تک معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے یہ مخلوط زبان استعمال ہوتی رہی۔ دکن میں اہلِ علم ضرور اس زبان میں تصنیف و تالیف بھی کرنے لگے لیکن شمالی ہند میں اس زبان کو ایک مدت تک علم و ادب کی کرسی پر جگہ نہ ملی۔

رفتہ رفتہ عہدِ شاہجہاں میں آگرہ کی بجائے دلی پھر دارالسلطنت قرار پائی، شہنشاہ اور ارکانِ دولت وہاں رہنے لگے۔ اہلِ سیف، اہلِ قلم اہلِ حرفہ، اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بمعنی فرودگاہ یا لشکر آتا ہے[1] چونکہ اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے اس لئے وہاں کی بولی کا نام بھی اردو ہوگیا اور یہ زبان خاص و عام میں شاہجہاں کے اردو کی طرف منسوب ہو کر مشہور ہوگئی۔

[1] مغل دربار میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ (انگریزی) باب پنجم

لیکن اس مخلوط زبان کا نام اردو ہونے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ زبان شاہجہاں کے زمانہ سے رائج ہوئی ہے جیسا کہ ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں، یہ مخلوط اور مشترک زبان تو عربوں کی فتوحات سندھ ہی سے معرضِ وجود میں آگئی تھی اور رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جب مسلمانوں نے دہلی کو اپنا دار السلطنت بنایا اور اس زبان کا رواج عام بول چال میں زیادہ ہوا تو بعض لوگ اس کو ہندی اور بعض لوگ زبان دہلوی کہنے لگے۔ جب یہ زبان اقطاع ہند میں پھیلی تو دکن میں جاکر دکنی اور گجرات میں پہونچکر گجری یا گوجری ہوگئی۔ دکن کا میں شاعروں اور نثاروں نے اسی زبان میں لکھنا شروع کیا اور ممکن ہے کہ اہلِ گجرات نے بھی اس میں نثر و نظم لکھی ہو۔ لیکن اب تک اُس عہد کا ایسا نمونہ اہلِ گجرات نے پیش نہیں کیا جس سے ہم وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے کہ گجرات میں بھی اس زبان میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہوگیا تھا تاہم اہلِ دکن کی نظم و نثر کے نمونوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ ہماری زبان میں شعر کہنا اور نثر لکھنا قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کے زمانہ سے بھی پہلے شروع ہوا اور ظاہر ہے کہ یہ زمانہ شاہجہاں کے عہد سے بہت پہلے کا ہے۔

شاہجہاں کے زمانہ میں اس زبان کا نام ہندی یا دہلوی زبان کی بجائے اردو مشہور ہوا۔ اگرچہ ہمارے شاعروں نے اس کو فارسی زبان سے ممیز کرنے کے لئے ریختہ بھی کہا ہے، چنانچہ ولی دکنی کا شعر ہے جو عالمگیر کے زمانہ میں تھے اور دہلی بھی آئے تھے

ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب ریختہ بولے
سُنے تو اس کو جان و دل سوں حسانِ عجم آکر

اور شاہ حاتم اپنے دیوان زادہ میں جو ۱۱۶۹ھ کی یادگار ہے اپنے متعلق لکھتے ہیں۔

"در شعر فارسی پیرو صائب است و در ریختہ ولی را اُستاد می داند"

بیشک شاہجہاں کے زمانہ میں اس زبان کا نام اردو ہوا لیکن ڈیڑھ سو برس سے پہلے کسی اہلِ قلم نے اس کو اُردو نہیں لکھا۔ البتہ میر تحسین کے زمانہ سے یہ زبان برابر اردو ہی کے نام سے موسوم ہے اور مرزا غالب کے بعد تو اس زبان کو اردو کے سوا کسی اور نام سے منسوب ہی نہیں کیا گیا۔ ہمارے زمانہ میں اہلِ مغرب ضرور اس کو ہندوستانی کہتے ہیں لیکن یہ نام بھی نیا نہیں ہے۔ مولانا وجہی کتاب "سب رس" میں جو ۱۰۴۰ھ کے قریب تصنیف ہوئی ہے اردو کو زبانِ ہندوستان کہتے ہیں۔ "آغاز داستان، زبانِ ہندوستان۔ نقل، ایک شہر تھا، اس کا ناؤں سیستان"

٣٩

بہرحال شمالی ہند میں ولی کے دہلی تشریف لانے کے بعد اردو میں شعر و شاعری کا چرچا ہوا اور اس میں شک نہیں کہ نظمِ اردو کے[1] آغاز میں یہاں سنسکرت کی تقلید کی گئی۔ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی ہیں، اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا میں ذو معنیین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی۔ فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔ اردو میں پہلے پہلے دلی کے شعرا نے شعر کی بنا اسی پر رکھی اور دور اوّل کے شعراء میں یہی قانون جاری رہا۔ اس عہد کے چند اشعار بطور نمونہ پیشکش ہیں ؎

لام نستعلیق کا ہے اس بتِ خوشخط کی زلف — ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے
کیوں نہ ہو ہم سے وہ صنم باغی — قد ہو جس کا نہال کی مانند
تو جو دریا کے پار جاتا ہے — دل مرا وار وار جاتا ہے
تم دیکھو یا نہ دیکھو ہمکو سلام کرنا — یہ تو قدیم ہی سے سر پہ ہمارے کر ہے
نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے — کہ آخر بد نما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا

---

[1] سیر المصنفین جلد اول صفحہ ۴۲

نادرشاہی حملہ کے بعد بہت سے اہل کمال لکھنؤ چلے گئے اور وہیں رہ پڑے۔ خان آرزو۔ سودا۔ میر وغیرہ سب لکھنؤ پہونچے اور پیوندِ خاک ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ دلی کے بعد لکھنؤ بھی ان شعرائے واجب الاحترام کی بدولت اردو زبان کا مرکز قرار پایا۔ لکھنؤ کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس کی ادبی مرکزیت بھی رامپور منتقل ہوگئی۔ نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کے دربار میں شعراء اور فضلاء کی سبھا قائم ہوئی اور داغ کے حیدرآباد دکن چلے جانے پر دکن میں پھر اردو کا چرچا ہوا۔ چنانچہ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی جو تمام مضامین کی تعلیم اپنے طلبا کو ان کی مادری زبان یعنی اردو میں دیتی ہے۔

مشرقی[1] شہروں میں عظیم آباد بھی اردو کا مرکز قدیم سے چلا آتا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے عہد میں اس شہر میں اردو کے شاعر و نثار پیدا ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، میر غلام علی راسخ جو میر کے ہمعصر تھے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ راجہ رام نرائن اور راجہ شتاب رائے بھی علم و ادب کے شیفتہ تھے، دہلی اور دوسرے مقامات سے شعراء اور ادبا آتے اور گوہر مراد لے کر مالامال واپس جاتے، نواب اشرف علی خاں فغاں نے پٹنہ میں اردو کے لئے جدید شاہراہ پیش کی، ان کی ہدایات سے متاثر ہو کر اردو بہت منزہ موثر اور نقائص سے پاک ہوگئی۔ میر شیر علی افسوس اور میر امن اسی دور کے باکمال افراد تھے جو راجہ شتاب رائے کے صاحبزادہ راجہ بہادر کے دسترخوانِ کرم پر بیٹھے ہوئے ہدیۂ تبریک پیش کرتے تھے موجودہ زمانہ میں شاد جیسا عظیم الشان شاعر بھی عظیم آباد ہی نے پیدا کیا ہے

افسوس اور میر امن وغیرہ ڈاکٹر گلکرائسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں کتابیں ترجمہ اور تالیف کرتے تھے، کیونکہ انگریزوں نے بھی اردو کی ترقی میں اسے تمام ملک کی زبان سمجھ کر اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اس طرح یہ زبان بنگال اور بہار میں پہونچی اور وہاں اپنے قدم جمالئے۔ بنگال میں اگرچہ بنگالی کا زیادہ رواج ہے لیکن اردو بھی آہستہ آہستہ اپنا قدم جما رہی ہے۔

اس[2] زبان کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے میل کر لیتی ہے، سنسکرت آئی اس سے مل گئی، عربی فارسی آئی اسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کی اس ملنساری اور آسانی کی وجہ سے یہ ملکی زبان ہوگئی، کشمیر سے راس کماری تک اور بنگال سے سندھ تک اردو بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ اس قلیل عرصہ میں جب سے ولی نے اپنی پہلی غزل اردو میں تصنیف کی جس کو سوا دو سو برس کا زمانہ گذرا آج تک جو کچھ ہوا وہ کسی تحریک یا ارادہ سے نہیں ہوا، تاہم اردو کی ترقی نمایاں روز افزوں ہے، بلاشبہہ یہ رفتار دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں نسبتاً بہت کم ہے۔ لیکن یہ اس کے ابتدائی مدارج ہیں۔ اور

۲۴۴

دوسری زبانیں اپنی ترقی مکمل کر چکی ہیں، انگریزی زبان نے اپنا موجودہ علم و ادب چوتھی صدی سے بیسویں صدی تک یعنی ایک ہزار چھ سو برس میں پیدا کیا ہے، جبکہ کل قوم اور حکومت انگلشیہ برابر اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہی ہیں تو کیا یہ تعجب خیز امر نہیں ہے کہ اردو نے بغیر کسی امداد اور وسیلے کے اس قدر جلد معتدبہ علم و ادب بہم پہنچا لیا۔

بعض اہل وطن اردو کے مقابلے میں ہندی کو کھڑا کر رہے ہیں۔ ہم کو ہندی سے کوئی نفرت نہیں اور مسلمان تو خدا کے فضل سے ہمیشہ اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کی ترقی میں حصہ لیتے رہے ہیں، ہندی میں چوٹی کے شاعر بہت سے مسلمان ہو چکے ہیں۔ بنگالی زبان کے ادبیات کا سنگ بنیاد مسلمانوں کے ہاتھ سے رکھا گیا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات بنگال مرتبہ جناب دنیش چندر سین بی اے) پنجاب میں اردو کے مؤلف نے اس عبادت کا خلاصہ صفحہ ۱۱۳ پر درج کیا ہے۔ جو یہاں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے "بنگالی زبان کے ادبی پایہ تک ارتقا حاصل کرنے کے متعدد اسباب ہیں۔ ان میں سب سے پیش پیش بلا شائبۂ اشتباہ مسلمانوں کی فتح بنگال ہے۔ اگر ہندو راجا بدستور سابق مختار اور حکمراں رہتے تو بنگالی زبان کے لئے دربار تک رسائی حاصل کرنا ایک دشوار امر تھا۔ ان پٹھانوں نے تیرہویں صدی میں بنگال کو تسخیر کر لیا

---

[1] الناظر لکھنؤ اپریل ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۷۶ و ۲۷۷ [2] سیر المصنفین جلد اوّل صفحہ ۴۳

ان کے سلاطین نے بنگالی زبان سیکھی اور اپنی کثیر التعداد ہندو رعایا کے ساتھ جن پر حکمرانی کرنے کیلئے وہ آبسے تھے، قریبی تعلقات قائم کرلئے۔ جب ان سلاطین نے سنسکرت کے مشہور رزمیوں رامائن، ورمہابھارت کا ذکر سنا جو ہندوؤں کی مذہبی اور منزلی زندگی کی تشکیل میں عجیب وغریب اثر رکھتے تھے تو قدرتاً ان کو شوق ہوا کہ ان نظموں کے موضوع سے آگاہی حاصل کریں۔ انھوں نے چند عالموں کو بنگالی زبان میں ان کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ جس زبان کو وہ اب بولتے اور جانتے تھے۔ مہابھارت کا بنگالی ترجمہ ناصر شاہ والیٔ گوڑ کے حکم سے ہوا۔ جس نے سنہ ۱۲۲۵ء تک پورے چالیس سال سلطنت کی تھی۔ (صفحہ ۱۰ و ۱۱) لہٰذا ہمارے اہلِ وطن کو یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں نے اپنی عربی فارسی زبان چھوڑ کر آپ کی زبان کو اختیار کیا۔ جو آپس کے میل جول سے پیدا ہوئی اور بحالتِ موجودہ اردو کہلاتی ہے، اردو نہ صرف آپ کی زبان ہے اور نہ صرف ہماری۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کا برابر کا حصّہ ہے۔ یہ امر انصاف کے خلاف ہے کہ اتنی مدّت گزرنے کے بعد اب آپ اسے خیرباد کہیں اور دو سو تین سو برس پہلے کی زبان اختیار کریں۔ یہ ترقی معکوس نہایت خطرناک اور قابلِ افسوس ہے۔ آپس میں محبت بڑھانے کے لئے اور نفرت کو دور کرنے کیلئے یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اُردو سے بے نیاز نہ ہوں اور اپنی مشترک زبان کی وسعت اور ترقی میں دل سے کوشاں ہوں۔

دھنک

کرنوں کے چھوّں سے بدری بنی رنگ کی کیاری
بدری کی چلمن سے جھانکی رنگوں کی متواری

جوبن پر ہے رنگ راج کی رنگیں راجکماری
چُندری اپنی اُڑا رہی ہے بھارت کی کنواری

اندر دیوتا چھوڑ رہے ہیں رنگوں کی پچکاری
پاکر کے اشنان لکشمی سکھا رہی ہے ساری

ساغر نظامی

(سنہ ۱۹۳۶ء)

افغانستان کی پہلی جنگ

آک لینڈ کے عہدِ حکومت (۱۸۳۶-۱۸۴۲) میں سندھ کا دریائی سفر رنگ لایا۔ افغانستان کے کوہستانوں پر خون و آتش کا ایک ایسا کھیل کھیلا گیا جس کی یاد سے روح لرز جاتی ہے۔

افغانستان پر کیوں حملہ کیا گیا؟ اس حملہ کا مقصد سرحدی استحکام نہیں ہو سکتا۔ برطانی ہندوستان اور افغانستان کے درمیان پانچ دریاؤں کی سرزمین، راجپوتانہ کے صحرا، ہندھ کا ریگستان اور بلوچستان کی چٹانیں تھیں۔ کمپنی نہایت آسانی سے امیرانِ سندھ اور تاجدارِ پنجاب سے اس قسم کا معاملہ طے کر سکتی تھی۔ آخر اس جنگ کا سبب کیا تھا؟ روس!

روس آیا! روس آیا!! دوڑنا!!! افغانستان کی پہلی جنگ کا بہانہ تھا۔ سبب نہیں! ایک دیانت دار مورخ افغانستان کی جنگ کے اسباب تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ ہوس ملک گیری کے علاوہ کوئی سبب دکھائی نہیں دیتا۔

شاہ شجاع لدھیانہ میں کمپنی کے رحم و کرم پر اپنے ایام زلیت بسر کرتا تھا۔ افغانستان کے تخت پر دوست محمد قابض تھا۔ آک لینڈ نے برنز کو ایک "تجارتی وفد" کا امیر بنا کر دوست محمد کے پاس بھیجا۔ شاہ افغانستان نے مشرقی مہمان نوازی کے پیش نظر برنز کی بہت عزت کی۔ برنز نے تجارتی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے دوست محمد سے برطانی اتحاد کا ذکر چھیڑا۔ دوست محمد نے بھی اپنا مطالبہ پیش کیا جسے برنز نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ برنز نے دوست محمد کو تر نوالہ خیال کرنے میں غلطی کی۔ کوہستان کے اس آہنی انسان نے برنز کے "تجارتی وفد" کو تاجرانہ جواب دیا۔ برنز مایوس ہو کر واپس ہوا۔ ۲۴۲

برنز جون ۱۸۳۸ء میں شملہ پہونچا۔ برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر جنگ کے شعلوں کو ہوا دی گئی۔

برنز کے واپس ہوتے ہی روسی سفیر ویکو ویش کا اثر دربار افغانستان میں قدرتی طور پر زیادہ ہو گیا۔

شاہ شجاع کے دامن سے آتش جنگ کو ہوا دی گئی، کمپنی شاہ شجاع اور رنجیت سنگھ کے اتحاد ثلاثہ نے جنگ افغانستان کو جائز قرار دیا۔ امیرانِ سندھ کو کمزور و نحیف خیال کرتے ہوئے اس اتحاد میں شامل ہونے کی دعوت تک نہ دی گئی۔

انگریزی فوجیں سندھ اور پنجاب سے افغانستان میں داخل ہوئیں، قندھار، غزنی اور کابل کو فتح کرنے کے بعد شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ڈیورنڈ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ برطانوی فوجوں کو تکمیل کار کے بعد باعزت طریقہ سے واپس ہو جانا چاہئے

تھا۔ میک ناٹن کا یہ بیان کہ شاہ شجاع کی تخت نشینی رعایا کے خلوص کی ترجمانی تھی ۔ حقائق کے خلاف ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ شجاع کو برطانی سنگینوں کے زیر سایہ تخت پر بٹھا دیا گیا۔ لیکن اس کی ذات محفوظ و مامون نہ تھی، قندھار، غزنی اور کابل نے برائے نام اسے اپنا تاجدار تسلیم کیا تھا۔ ہرات کی آزاد حکومت میں اسے ذرہ بھر دخل نہ تھا۔ کوہستان کی ہر وادی سے شاہ شجاع کے خلاف آواز بلند ہو کر چٹانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اگر شاہ شجاع کی تخت نشینی رعایا کے خلوص کا مظہر ہوتی تو انگریزی فوجوں کو چاہیئے تھا کہ وہ شاہ شجاع کو اسی خلوص کے سپرد کر کے واپس چلی جاتی ۔

آک لینڈ کی افغان حکمت عملی ایک بہت بڑی حماقت تھی ۔

افغان رعایا کے خلوص کے باوجود انگریزی فوجیں شاہ شجاع کی حفاظت کے لئے قندھار، کابل، غزنی اور جلال آباد میں مقیم تھیں ۔ ان فوجوں کے قیام سے برطانوی عزائم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، تمام اختیارات میک ناٹن کے قبضہ میں تھے، شاہ شجاع افغانستان کا میر جعفر اور میک ناٹن کوہستان کا کلائیو تھا۔ خارجی پالیسی سے شاہ شجاع کو کوئی تعلق نہ تھا۔ سیاسی آزادی ہے کیا؟

رعایا کا ہر ذی ہوش فرد افغانستان کے میر جعفر کی حکومت سے نالاں تھا۔ اپریل ۱۸۴۰ء میں شاہ شجاع جلال آباد سے کابل آیا ۔ اس کی آمد کے چند دنوں بعد برطانی فوجوں نے بالا حصار، خالی کر دیا۔ انگریزی فوج کی ایک چھاؤنی کابل کے شمالی میدان میں قائم کی گئی۔ فوجی افسروں نے اپنی بیویوں کو کابل بلا لیا۔ اس نیم شہری اور نیم بدوی زندگی کو پُر لطف بنانے کے لئے ہر قسم کے سامان مہیا کئے گئے۔ طوفان کی آمد سے پہلے یہ لوگ خورد و نوش میں مصروف تھے۔ طوفان ان مسرتوں اور لطف اندوزیوں کو تنکوں کی طرح بہا کر لے گیا ۔

ہندوستان کی طرح افغانستان میں بھی انگریزوں نے "نفاق ڈالو اور حکومت کرو" پر عمل کرنا چاہا۔ میک ناٹن کے معاون منشی موہن لال نے افغانستان میں افغانی 'ایندھن' اور برطانی دیا سلائی سے خانہ جنگی کی آگ لگانی چاہی لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

میک ناٹن نے افغان سرداروں کو قتل کرنے کی ایک سازش کی۔ لیکن اسے بھی کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ افغان وفد کے پیش کردہ معاہدہ کو میک ناٹن نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس انکار کے بعد افغانستان میں سکون طاری ہو گیا۔ یہ سکون تموج سے قبل لہروں کا سکون تھا۔ میک ناٹن اس سکون سے خلاف امید توقعات وابستہ کئے ہوئے تھا۔ تباہ کن ایام سرما کو آتے دیکھ کر افغان سردار بھی خاموش ہو گئے۔ انگریز سپاہیوں پر خوف و ہراس طاری ہو چکا تھا، وہ افغانستان چھوڑنا چاہتے تھے لیکن افغانستان انھیں نہیں چھوڑتا تھا۔ میک ناٹن کاغذات صلح ہاتھ میں لئے ہوئے آگے بڑھا۔ کابل اور برطانی معسکر کے درمیانی مقام پر فریقین ملے۔ یہ امر متفقہ طور پر طے پایا کہ تین دن کے اندر برطانی فوجیں کابل خالی کر دیں گی ۔

مقررہ وقت گذر گیا۔ برطانی سپاہی اپنے معسکر میں قیام پذیر تھے۔ معاہدہ کی یہ خلاف ورزی افغانوں کو ناگوار خاطر گذری، اکبر خاں نے میک ناٹن کی عیاریوں کی داد برطانی سکوں میں دینی چاہی ۔ چنانچہ میک ناٹن کو از سر نو گفت و شنید کی دعوت دی گئی ۔ میک ناٹن نے اس دعوت کو قبول کرنے میں ذرہ بھر تامل نہ کیا ۔

بڑھتی ہوئی جسارت حق و صداقت سے خالی ہوتی ہے ۔

میک ناٹن اپنے تین ساتھیوں سمیت رود کابل کے کناروں پر اکبر خاں سے ملنے کیلئے روانہ ہوا۔ جب اس کی روانگی کا مقصد اس کے ایک ساتھی کو معلوم ہوا تو اس نے کہا۔ "سازش ہے جناب! سازش"۔

"اس سازش میں شریک ہونے دو" میک ناٹن نے جواب دیا۔ ایک آزمودہ کار برطانوی افسر نے جب میک ناٹن کو اس کے عزائم سے باز رکھنا چاہا تو اس نے جواب میں کہا "میں ایسے معاملات تمہاری نسبت بہتر سمجھتا ہوں۔ مجھے مرنے دو۔ موت بہتر ہے اس زندگی سے جو گذشتہ چالیس روز سے کاٹ رہا ہوں" برطانی وفد رود کابل کی طرف روانہ ہوا۔ مقررہ مقام پر یہ وفد رک گیا۔ اکبر خاں بھی پہنچ گیا۔ رسمی گفت و شنید کے بعد اکبر خاں "بگیر بگیر" پکارا۔ برہنہ تلواریں میک ناٹن کی طرف بڑھ رہی تھیں، موت و حیات کی اس آخری کشمکش میں میک ناٹن

کی زبان سے "ازبرائے خدا" کے الفاظ نکلے۔

تسخیر کابل اور میک ناٹن کے قتل تک کے واقعات کو پاسوان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"اہلِ افغانستان نے بیگمات کی عصمت پر حملہ ہوتے دیکھا۔ ان کے وطن کو لوٹ لیا گیا۔ ہر اُس چیز کو تباہ و برباد کر دیا گیا جو ان کے نزدیک مقدس و متبرک تھی۔ ان مناظر نے ان کی رگوں میں خونِ انتقام دوڑا دیا۔ آزاد افغانستان کے باشندے ان بداعمالیوں اور بدنظمیوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، ان کی نگاہوں میں انگریز ذلیل ہو چکے تھے، ان کے نزدیک انگریز کا وجود تعزز، شرافت اور اخلاق کے عناصر سے خالی تھا۔"

افغانوں نے انگریزوں کی بدعہدیوں کے پیش نظر اس کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے وطن کو ان کے ناپاک وجود سے پاک کریں گے۔ ان کے طرزِ تفکر میں شاہ شجاع افغانی مصائب کا سرچشمہ تھا۔ وہ اسے اپنے وطن سے خارج کرنا چاہتے تھے۔ برطانی سنگینوں کی مدد سے حاصل کردہ تختِ افغانستان شاہ شجاع کے لئے کانٹوں کا بچھونا تھا۔ شاہ شجاع کو اسی تخت کے لئے جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ جب شاہ شجاع اپنے وطن کو خیرباد کہتے ہوئے مملکت کمپنی میں پناہ گزیں ہونے کے لئے کابل سے روانہ ہوا۔ تو راستہ میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

برنز کے خلاف بھی افغانستان میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ ان کے نزدیک برنز ایک ذلیل اور ناسپاس گذار انسان تھا، وہ ایک غدار تھا جس نے افغانوں کے لئے مصائب کے دروازے کھول دئیے، وہ غداری کی موت کا مستحق تھا۔ دن کی روشنی میں اُسے کابل میں قتل کر دیا گیا۔

میک ناٹن کا کردار افغانستان میں کلائیو کا پارٹ ادا نہیں کر سکتا تھا چونکہ انگریزوں کی سلامتی افغانستان کو خیرباد کہنے میں تھی۔ اس لئے انھوں نے دوست محمد خاں کو تخت نشین کرنے کا وعدہ کیا۔ اس سلسلہ میں دوست محمد کے فرزند اکبر خاں سے ایک معاہدہ کیا گیا۔ لیکن اس معاہدہ کی خلاف ورزی میں انگریزوں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ میک ناٹن اپنے وحشیانہ اور غیر انسانی طرزِ عمل سے بہت بدنام ہو چکا تھا۔ انگریزوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میک ناٹن کا غدارانہ طرزِ کار اس کی موت کا سبب بنا۔ جب میک ناٹن اور اکبر خاں معاہدہ سے متعلقہ گفت و شنید کر رہے تھے۔ تو میک ناٹن کو قتل کر دیا گیا۔

سید فدا حسین اپنی کتاب "نیرنگِ افغانستان" میں لکھتا ہے۔

"میک ناٹن نے اکبر خاں کو اپنی دوستی کا یقین دلاتے ہوئے ایک خط لکھا، اس خط کے ذریعہ میک ناٹن ہی نے اکبر خاں کو اس کے بعض غدار سرداروں سے آگاہ رہنے کا مشورہ دیا لیکن ساتھ ہی میک ناٹن نے ان سرداروں کو اکبر خاں کے خلاف خطوط لکھے۔ میک ناٹن کا خط پہنچتے ہی اکبر خاں نے اپنے سرداروں کو ایک جرگہ میں بلا کر انھیں میک ناٹن کا خط دکھایا۔ اس پر افغان سرداروں نے بھی وہ خطوط ظاہر کر دیئے جو میک ناٹن نے اُنھیں روانہ کئے تھے۔ میک ناٹن جب اکبر خاں سے ملنے کیلئے گیا تو اس نے اپنے سپاہیوں کو آس پاس کے مقامات پر چھپا دیا۔ اور انھیں اشارہ کا منتظر رہنے کا حکم دیا۔ اکبر خاں نے میک ناٹن سے ان خطوط کا مقصد دریافت کیا۔ میک ناٹن جواب کیلئے اپنے ہونٹوں کو جنبش دینا چاہتا تھا کہ ایک افغان سپاہی نے اکبر خاں کو گھات میں بیٹھے ہوئے برطانوی سپاہیوں کی نقل و حرکت سے آگاہ کیا، اکبر خاں اور میک ناٹن آمادۂ پیکار ہو گئے۔ میک ناٹن نے اپنا پستول اکبر خاں پر چلایا لیکن خود مارا گیا۔

اس حربی تمثیل کے تین کردار۔ شاہ شجاع۔ برنز اور میک ناٹن۔ سٹیج سے غائب ہوتے ہیں۔ کوہستان کی وادیوں میں ایک نیا کھیل ہونے والا تھا۔ ایک ایسا کھیل جس میں سولہ ہزار افغان شریک تھے، اور جس کی ہولناکیوں اور بربادیوں کو بیان کرنے کے لئے صرف ایک زبان باقی رہی۔

متعدد آلام و مصائب کا شکار ہونے کیلئے سولہ ہزار افراد کا قافلہ ۶ جنوری ۱۸۴۲ء کو کابل سے جلال آباد روانہ ہوا۔ کوہستان برف کی سفید ٹوپیاں اوڑھے کھڑے تھے، میدانوں پر برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھیں۔ سرما کی تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ سپاہی اپنی تلواروں کو بھولے ہوئے اور افسر اپنی وردیوں سے غافل جلال آباد کی طرف چلے جا رہے تھے، کہ اچانک ایک افغان نے ایک برطانی افسر کے کان میں کہا" اکبر خاں نے قسم کھائی ہے کہ وہ صرف ایک انسان کو زندہ رہنے دیگا جو برطانی فوج کی تباہی کا حال بیان کر سکے، سپاہی جی چھوڑ چکے تھے، افسر منہ موڑ چکے تھے موت سولہ ہزار انسانوں کو لقمہ بنانے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی، دریا کے کناروں پر اس قافلہ کو رکنا پڑا، دوپہر کے وقت یہ قافلہ دریا کے دوسرے کنارے پر پہونچا۔

افغان ان ہیبت کے ماروں پر آوازے کس رہے تھے !

لوٹ مار کے دلدادہ افغان برطانی معسکر پر جمع ہو چکے تھے۔ ہر وہ چیز جو ان کے سامنے تھی اٹھالی گئی، لوٹ مار سے زیادہ خونریزی کو مقصدِ حیات خیال کرنے والے افغان بندوقوں کو تھامے ہوئے راستہ کے دونوں طرف موت کے فرشتوں کی صورت میں کھڑے ہو گئے

شدت سرما نے کئی انسانوں کی جانیں ضائع کر دیں، تیز و تند سرمائی ہواؤں سے بچنے والے افغانوں کی گولیوں کا شکار ہو کر رہ گئے۔ وہ موت کے منتظر تھے، انھیں اس بات کا خیال نہ تھا کہ تلوار ان کا گلا کاٹے یا شدت سرما ان کی حرکتِ قلب بند کر دے، وہ وادئ موت میں آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے، یاس ہی ان کی مایئں زندگی کے آخری سانس توڑ رہی تھیں۔

تاریکئ شب نے اہل کارواں کے مصائب کو بڑھا دیا، بےخانہ، بے جامہ اور بے سامان انسانوں کی مصیبتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے محض ہوسِ ملک گیری کی خاطر ہزاروں جانیں ضائع ہو رہی تھیں، شہنشاہیت اپنی زندگی کیلئے انسانی جانوں کو وادئ موت میں ڈھکیل چکی تھی۔

موت! ہر طرف! طفلی کی موت! شباب کی موت! پیری کی موت!

وادئ موت کے سپاہیوں پر صبح نمودار ہوئی۔ لیکن بے زمزمۂ درا۔ کوئی بگل تیاری سفر کیلئے نہ بجایا گیا، سردی، بھوک تھکاوٹ نے اس قافلہ کو موت کے سپرد کر دیا۔ اکبر خاں کا وعدہ پورا ہوا، سولہ ہزار انسانوں کی تباہی کی داستان بیان کرنے کے لئے صرف ڈاکٹر برائیڈن جلال آباد کے برطانی قلعہ میں داخل ہو سکا۔ اس کے ابتدائی الفاظ نے اہل دل کو مایوس کر دیا ہو گا۔ جلال آباد میں بھی ہیجان پیدا ہو گیا۔ انگریزی سپاہیوں کا خوف اس قدر کم ہو چکا تھا کہ قلعہ کی دیواروں سے تین سو گز کے فاصلہ پر افغان چرواہے اپنی بھیڑوں کو چراتے اور مزے سے ہنستے گیت گاتے، جنرل سیل کمک کی امید پر قلعہ ہی میں مقیم رہا۔

اسی اثناء میں آک لینڈ کی جگہ الیمبرا (۱۸۴۲ء۔ ۱۸۴۴ء) گورنر جنرل مقرر ہو چکا تھا۔ الیمبرا نے جنرل پالک کو گذشتہ ہزیمت کا انتقام لینے کے لئے کابل روانہ کیا، اپریل ۱۸۴۲ء میں پالک علی مسجد کے قلعہ پر قابض ہو گیا، انہی ایام میں شاہ شجاع قتل ہو چکا تھا۔ جنرل پالک، جنرل سیل اور جنرل ناٹ تینوں کابل روانہ ہوئے۔ کابل کے بازار کو آگ لگا کر انگریزی فوجوں نے افغانستان کو خالی کر دیا۔

افغانستان کی پہلی جنگ نے انگریزوں کے حربی تدبر اور عسکری برتری کو بہت بری طرح مجروح کیا۔ ہندوستانی رعایا اس شکست کو بڑے مزے سے بیان کرتی، انگریزوں نے ہندوستانیوں کو مرعوب کرنے اور اپنے عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے امیرانِ سندھ کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔

۴۵

باری

نئی دنیا

(فرمودۂ شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

میں نے اک دنیا نئی معلوم کی ہے رُوح میں
دل فریب و دلنواز و دل فروز و دل نشین

اِن تڑپتی تلملاتی پستیوں کے اُس طرف
اک دمکتی، جگمگاتی اوجِ مبہم کے قریں

ہر ورق ہے جسکے دیواں کا کتابِ کائنات
ہر کلی ہے جسکے گلشن کی نگاہِ دُوربیں

زندگی ہے جس جہاں میں اک غلامِ بے وقار
موت ہے جس دائرے میں اک کنیزِ کمتریں

اس جہاں کے لعل و گوہر سے سوا ہے جسکی خاک
اس کرے کے آسماں سے بڑھ کی ہے جسکی زمیں

جسکا ہر بوٹا ہے رشکِ نرگسِ جادو طراز
جسکے ہر غنچے میں نازِ لیلیٔ محمل نشین

جسکے تابندہ افق کے زرفشاں آغوش میں
اک نفس بھی آنکھ جھپکاتا نہیں مہرِ مبیں

جو ہے ایک ایسا انوکھا عالمِ تمکیں جہاں
حلقۂ بیرونِ در ہے فتنۂ دنیا و دیں

جس رموزِ علم و عرفاں کی بصیرت گاہ میں
ذہن کی آوارگی ہے کاوشِ وہم و یقیں

حق و باطل، نور و ظلمت، خیر و شر، ایمان و کفر
ان تمیم افکار سے خالی ہے جو خلدِ بریں

آخرت، جنت، جہنم، قہر، رحمت، مغفرت
عقل کی اس بیہودگی سے پاک ہے جو سرزمیں

رقصِ رندانہ پہ مبنی ہیں جہاں آثارِ حق
ہوئے مستانہ پہ قائم ہیں جہاں ارکانِ دیں

جس رہِ پیغامِ بے پیغامبر میں ہم نفس لرزشِ مژگان ترے شہپرِ روح الامین
خون کی گردش میں رقصاں ہے جہانِ فکرِ حبیب نبض کی جنبش میں غلطاں ہے جہانِ حبل المتیں
میں نے اک دنیا نئی معلوم کی ہے روح میں
دل فریب و دلنواز و دل فروز و دل نشیں

کون یہ در کھٹکھٹاتا ہے؟ ذرا دیکھو کوئی خیر ہو اس عرش تک بھی آگئے اہلِ زمیں

"آئے ہیں مجرے کو کچھ اوتار کیا ان سے کہوں؟!"

کہہ دو واپس جائیں ملنے کی مجھے فرصت نہیں

جوش

اردو شاعری پر فقدانِ جدت اور فارسی کے تتبع کا الزام

(از سید محمد عسکری صاحب عسکری طباطبائی بی اے لکھنوی)

اُردو شاعری پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اس میں جدت (Originality) اور اس کے شعراء کی خامہ فرسائیاں کچھ نہیں مگر فارسی اساتذہ کی نقالی و پیروی' الزام کے دو جزو ہیں' ایک تو فقدانِ جدت' دوسرے فارسی شاعری کا اتباع۔ پہلے جزو کا جواب دینے کے لئے ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ جدت ہے کیا چیز۔ فلاسفہ کا ایک مذہب تو مُصر ہے کہ دنیا میں فی زمانہ کوئی ایسی چیز نہیں جو جدت کہلائی جا سکے۔

" ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا" ہر نئی ایجاد اور ہر نیا خیال کبھی زمانۂ ماقبل میں معلوم کیا جا چکا ہے۔ انسان کے ذہن میں کوئی ایسی چیز آ ہی نہیں سکتی جسکا یا کم از کم جس سے مشابہ کسی شے کا وجود فی الواقع پہلے ہی سے نہ ہو۔ ایک جرمن فلسفی کا قول ہے۔

" جدت تمہاری کم نظری کا دوسرا نام ہے" یعنی جس چیز کو تم جدید خیال کر رہے ہو در حقیقت کبھی پہلے موجود رہ چکی ہے' صرف تمھاری نظر اس تک نہیں پہونچی ہے۔ یہ فلسفی شاعری میں جب اس نظریہ کو جگہ دیتے ہیں تو اور بھی سخت ہو جاتے ہیں' اور کہتے ہیں کوئی شاعر اس بات پر قادر ہی نہیں کہ نیا خیال نظم کر سکے۔ جو کچھ وہ کہے گا اس سے بیشتر کوئی شاعر کہہ چکا ہوگا۔ ہم اس نظریہ کو قطعی طور سے تسلیم کر لینے کے لئے تو تیار نہیں لیکن ہاں اتنا ضرور مانتے ہیں کہ اگر جدید خیال کی تخلیق غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ شاعری میں جدت دراصل جس چیز کا نام ہے وہ جدت ادا ہے۔ ہم اگر اچھوتے سے اچھوتے اور جدید سے جدید خیال کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو اس میں اور قدماء کے خیالات میں کچھ اجزا ضرور مشترک پائیں گے' لہٰذا اردو شاعری میں بھی جس چیز کی ہمکو تلاش کرنا چاہیئے جدت ادا ہے' نہ کہ جدتِ خیال [1]

۴۸

---

[1] میں ایشیا کے کسی نمبر میں تحریر کر چکا ہوں کہ عسکری صاحب لکھنویت سے بڑی حد تک آزاد ہیں لیکن بہرحال وہ لکھنوی ہیں اس لئے ان کی رائے میں کبھی کبھی قدامت جھلک جاتی ہے' اس مضمون میں اردو شاعری کے متعلق جو رائے قائم کی گئی ہے ضروری نہیں کہ میں اس سے کلیتہً متفق ہوں' اور بنیادی طور پر میری رائے یہی ہے کہ اُردو شاعری فارسی کی متبع ہے اور اچھی طرح متبع ہے مگر اس مضمون کو میں اس لئے شائع کر رہا ہوں کہ یہ مضمون عسکری صاحب کی جرأت کا آئینہ دار ہے۔

جدتِ ادا' اور جدتِ خیال ان دونوں کے محاسن کے متعلق پہلے یہ غور کرنا ہے کہ کسی شاعری سے یہ کس درجہ پر

جدتِ ادا سے مراد ہے اظہارِ مطلب کا نیا اور اچھوتا طریقہ۔ ایک خیال کو مختلف پیرایوں میں ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن سب سے انوکھا، اور دلپسند پیرایۂ بیان اختیار کر لینا فطری شاعر ہی کا کام ہے۔ تشبیہوں کی جدت اور استعاروں کی ندرت بھی جدتِ ادا کے ذیل میں آجاتی ہے۔ اکثر سادی سی بات کو اس طرح کہتے ہیں کہ اس میں ہزار حسن پیدا ہو جاتے ہیں اسکا راز بھی جدتِ ادا میں پوشیدہ ہے۔ اکثر کلام میں ایسا اختصار ہوتا ہے جس میں بڑی وسعت پوشیدہ ہو ایسا اجمال جس میں تفصیل سے زیادہ وضاحت ہو ایسا ابہام جس میں شرح سے زیادہ بسط ہو۔ یہ تمام باتیں جدتِ ادا کے مفہوم میں داخل ہیں اور پھر بھی ہم اسی تعریف میں محدود نہیں کر سکتے۔ غرضیکہ اگر ہم اس نقطۂ نظر سے اردو شاعری کا مطالعہ کریں تو ہمیں آسکے ہر باکمال شاعر کے یہاں بے شمار ایسے جواہر پارے نظر آئیں گے جو تراش خراش، رنگ، ڈھنگ میں فارس کے لعل و جواہر سے مختلف ہیں ہاں سنگ وہی رہتے ہیں اور یہ کیا بیجا ہے۔ یوں تو کسی زبان کی شاعری کو لیجئے اور اس کا تقابل دوسری زبان کی شاعری سے کیجئے آپکو متعدد مشترک خیالات مل جائیں گے، خیالات تو دوسری چیز ہیں۔ ہزار ہا الفاظ، امثال اور محاورے ایسے ملیں گے جو دوسری زبانوں کے الفاظ، امثال اور محاورات پر لفظاً و معناً منطبق ہوتے ہیں، پھر اردو شعرا کے خیالات کو جمع کرنے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر فارسی شاعری میں ان کا مماثل تلاش کر لینے کے بعد ان غریبوں پر سرقہ یا کورانہ تقلید کا الزام کہاں تک بجا ہو سکتا ہے۔

اعتراض کا دوسرا جزو پہلے کو واضح کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اردو شاعری میں سوائے فارسی کے تتبع کے کچھ نہیں۔ یہ دعویٰ اصلیت کا شائبہ تو ضرور رکھتا ہے لیکن اس بڑی حد تک مبالغہ کی آمیزش ہے، یہاں تک تو صحیح ہے کہ اردو شعرا نے کچھ نہ کچھ ضرور فارسی اساتذہ کا تتبع کیا لیکن یہ کہنا کہ اردو شاعری میں سوائے کورانہ تقلید کے کوئی جدت یا ندرت ہے ہی نہیں، ویسا ہی بیجا ہے جیسا یہ کہنا کہ اردو نے فارسی کا قطعی تتبع کیا ہی نہیں۔ اردو شعرا نے اہلِ فارس کا تتبع کیا اور ضرور کیا لیکن سوال تو یہ ہے کہ کس حد تک ایسا کیا اور ایسا کرنے میں وہ کہاں تک بجا رہے اور کہاں تک قصوروار ہیں، دنیا میں ہر زبان کی شاعری میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے، ایک قوم نے دوسری قوم کی، ایک ملک نے دوسرے ملک کی شاعری کی پیروی کی ہے، کیا انگریزی شاعری نے لاطینی زبان سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ کیا یونانیوں نے عربوں کے خیالات مستعار نہیں لئے۔ کیا اہلِ فارس نے عربوں سے استفادہ نہیں کیا۔ پھر اگر اردو شعرا نے فارسی کی پیروی کی تو کہاں تک برا کیا۔ اور وہ اس سے کیونکر باز رہ سکتے تھے یہاں پر ایک ضروری نکتہ لحاظ کرنے کے قابل یہ ہے کہ جو پیروی بھی کی ہے وہ زیادہ تر اصنافِ شاعری میں کی ہے نہ کہ خیالات و مضامین میں۔

اردو شعرا نے فارسی اساتذہ کے قصیدوں پر قصیدے اور غزلوں پر غزلیں لکھیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے ان کے خیالات بھی مستعار لئے، انھوں نے بھی مثنویاں لکھیں لیکن ان میں اپنی معاشرت اور طرزِ بود و باش کے نقشے کھینچے (ہمکو اس زمانہ کا مروجہ اصول بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ فارسی اساتذہ کے قصیدوں پر قصیدے کہنا اور ان کے جواب لکھنا استادی کی سند سمجھا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ سودا اور ذوق کے متعدد قصیدے فارسی قصیدوں کی طرحوں میں ہیں) یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اردو میں چند وہ عام تلمیحات فارسی سے اخذ کریں جو شاعری میں صداقت

۴۹

بقیہ نوٹ صفحہ [illegible] ہم آغوش ہو سکتے ہیں۔ اگر اردو شاعری کے دورِ ماضیہ سے بحث ہے تو میں یہ کہونگا کہ وہ زبان اردو کے تعمیری دور کی شاعری ہے اور جدتِ ادا کبھی تعمیری دور میں تخلیق نہیں ہوا کرتی، البتہ جدتِ خیال کے لئے کوئی قید نہیں، شاعر اور شاعری کی قید بھی نہیں، فطرت اس جوہر کو بچوں میں بھی عام کرتی ہے، میں ان فلاسفہ سے متفق و مرعوب نہیں جو جدت کی محدود تعریف کرتے ہیں، اشتراکِ خیال دوسری شے ہے گو پھر بھی بہت سی باتیں زندگی میں قطعی نئی ہوکر ہم تک پہونچتی ہیں، موجودہ عہد کے شعرا نے جن موضوعات پر نظم نگاری کی ہے، اگر یہ جدت نہیں ہے تو ہمیں قدما اور متاخرین کے دیوانوں میں اسکو قدامت کی صورت میں دکھایا جائے

اب رہی جدتِ ادا، سو یہ بالکل ہلکی ضمنی اور جزوی حسن ہے، ہر آرٹسٹ کو اتنی اٹکل تو ہوتی ہی ہے کہ وہ اپنے آرٹ کو ممیز کر دے اور تدریج کر قدم اٹھائے، میں جدتِ ادا کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا مگر اس پر ساری عمارت کی بنیاد قائم نہیں کر سکتا

ساغر

ادبی کا مرتبہ رکھتی ہیں مثلاً شیریں و فرہاد کے افسانے، رستم و سہراب کی داستانیں اور چند ایسی ہی دیگر باتیں جنھیں بہت سی خود فارسی نے عربی سے مستعار لی تھیں مثلاً لیلیٰ و قیس، اور حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت یوسف وغیرہ سے متعلق قصّے، اور شمع و پروانہ اور گل و بلبل وغیرہ کے افسانے اُردو نے فارسی سے مستعار لئے، اس میں شک نہیں کہ ان کی بدولت اردو میں بڑی حد تک تصنع داخل ہوگیا۔ ہندوستان کے رہنے والے شاعروں کا فارس کی بہار نظم کرنا ویسا ہی غیر فطری معلوم ہوتا ہے ؎۵ جیسا اپنے ملک کے عشق و محبت اور جرأت و ہمت کے افسانے مثلاً نل دمن اور رام و ارجن کے قصّے چھوڑ کر غیر ملکی فرسودہ داستانیں دُہرانا۔ ناگزیر تھا کہ تصنع پیدا ہوجاتا۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص جس نے فارس کی بہار ہی دیکھی ہی نہ ہو، آتشِ گل کے دہکنے اور بلبل کے سوزِ دل کا ماجرا کیا بیان کر سکتا ہے، لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے شاعر شعر کہتے وقت خارجی مناظر کی مدد سے بے نیاز ہوتا ہے ضروری نہیں کہ جب وہ کسی پُر فضا چمن میں رنگا رنگ کھلے ہوئے پھول دیکھے جبھی ان کی سچی تصویر اپنے اشعار میں اُتار سکے ؎۵ اس کی دنیا خود اس کے دل میں موجود ہوتی ہے، اور وہ جو کچھ کہتا ہے صرف ؎۵ روح القدس کا فیضان ہوتا ہے، اُسے بہار نظم کرنے کیلئے پُر فضا باغوں اور شاداب میدانوں کی ضرورت نہیں۔ بیدل کا ایک مطلع ہے جو ہر شاعر پر صادق آتا ہے ؎

نہ با صحرا سرے دارم، نہ با گلزار سودائے
بہ ہر جا میروم، از خویش می جوشد تماشائے

آزاد کی وساطت سے ہم تک میر کا وہ قصّہ پہونچا ہے کہ ان کے زیرِ دیوار باغ تھا اور انھوں نے کبھی ادھر آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا، اس طرف کی کھڑکی ہی بند رہتی تھی۔ بہر حال ایک بات تو یہ ہے کہ شاعر کو کبھی خارجی مدد کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور دوسرے یہ بھی کہ اُردو شعرا ایسا کرنے پر ایک حد تک مجبور ہوگئے۔ بہار ؎۵ جس کا نام ہی دراصل کبھی ہندوستان میں آئی ہی نہیں پھر وہ کیا اسکی دلربائیوں کا تذکرہ کرتے، یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں ان چیزوں کا قطعاً فقدان نہیں جنھیں شاعری میں جگہ دی جا سکے، اس میں خوشنما پہاڑوں کے بلند سلسلے بھی ہیں اور سبزہ زاروں کے مخملیں فرش بھی۔ اس میں دریاؤں کی مستقل روانی بھی ہے اور آبشاروں کا مسلسل نغمہ بھی لیکن اس زمانے کے مذاق کو کیا کیا جائے کہ ہر شخص فارسی شعراء کے پیش کردہ مناظر ہی کا دلدادہ تھا۔ ہر زمانے میں ایسا ہوتا ہے، جو زبان عروج پر ہوتی ہے، دوسری زبانوں پر اپنا اثر لازمی ڈالتی ہے، اس زمانے میں فارسی کا دور دورہ تھا اُردو والے مجبوراً اس کے اثرات قبول کئے، کون انکار کر سکتا ہے کہ آج اُردو زبان انگریزی ادب سے متاثر نہیں ہو رہی ہے، پھر قدیم شعرا میں جذبۂ وطن پورے طور پر راسخ ہوچکا تھا، وہ خود یا اُن کے قریبی آبا و اجداد زیادہ تر باہر سے ہندوستان آئے تھے، مسلمان شعرا تو قریب قریب تمام ایران و عرب کے رہنے والے تھے۔ پس وہ اپنے وطنوں کی روایات و رسم کلیجے سے لگائے اپنے ساتھ لائے تھے اور انھیں شاعری میں داخل کرتے تھے۔ ایک عرصے تک تو وہ فارسی ہی میں طبع آزمائی اور اُردو میں شعر گوئی اپنی توہین خیال کرتے رہے جب یہ وہم دل سے دور ہوا تو بہت دنوں تک محض تفننِ طبع کے لئے کچھ

۵۰

نوٹ متعلقہ صفحہ ۲۴۹ ؎۲ یہ اس لئے بجا ہو سکتا ہے کہ اردو شاعری کی زمین گو بھاشا ہے مگر اسکا پیکر فارسی الفاظ، استعارات، تلمیح اور روایات سے بنایا گیا ہے اور وہ تمام اجزا و عناصر جن سے اس کا پیکر تیار ہوا، ہندی زبان کی شاعری سے نہیں بلکہ فارسی سے مستعار لئے گئے "ساقی" "قاتل ترک کماندار" "بُتِ ترسا" "خطِ رُخسار" اور ایسے صدہا سامان، صدہا کیا کل سامان فارسی کے خزانہ سے حاصل کیا گیا۔

ہندوستان میں آئے ہوئے مسلمانوں کی زبان فارسی تھی اور اس لئے فارسی ادب ایران کو کلیۃً عبور تھا، تو گویا ان کے دماغوں کا سانچہ ایک خاص قسم کا بن گیا تھا وہ بحیثیت ایک ہندوستانی شاعر کے فکر نہیں کرتے تھے، اپنی حاکمیت کی بنا پر وہ ہندوستان کیلئے ہی نہیں خود اپنے لئے بھی اجنبی تھے۔ وہ عادی تھے کہ ہندوستان کے "اندر تعمیر ایران" میں بیٹھ کر ایرانیوں کی طرح فکر کریں جبکہ ان کی مجلس ایران کے شاعروں سے مزین تھی یہی وجہ تھی کہ اُردو میں "وجودیت" (Realism) نہ پیدا ہو سکی، اگر اردو شاعری ہندی شاعری سے کلیۃً متاثر

کہہ لیتے، اور اسکے بعد جب وہ زمانہ آیا کہ اردو میں صحیح معنوں میں دادِ سخن سنجی دینے لگے تو ان تشبیہوں، استعاروں، اور تلمیحوں سے کیونکر گریز کر سکتے تھے جنکا استعمال فطرتِ ثانیہ بن گیا تھا پھر جوں جوں زمانہ گذرتا اور اردو سے اُنس بڑھتا گیا۔ اسمیں خالص وطنی چیزیں بھی شامل کرتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ مسلمان شعرا جنھوں نے ہندی میں جولانیٔ طبع دکھانا شروع کی اس فن میں کامل ہوگئے۔ ان کے یہاں ایسی تشبیہیں بکثرت ملیں گی جو ٹھیٹھ دیسی ہیں، ان کے مطالعہ سے ذوقِ شعری جہاں لذت یاب ہوتا ہے اور ذوقِ وطن پرستی جہاں سیراب، جسکی وجہ یہ ہے کہ ان کی تہ میں خود ما در وطن کی محبت کا ایک قومی جذبہ کار فرما ہے۔ ملک محمد جائسی کے اشعار ہیں ؎

کنچن دیکھ کسوٹی کسی   جن گھن ماں وامن پرگسی

سرخ کرن جن گنگن بسیکھی   جمنا ماجھ سرستی دیکھی

(" اسکی مانگ ہو کہ کسوٹی پر خطِ طلا کھینچا ہوا ہے، یا اندھیری رات میں بجلی چمک رہی ہے۔ یا سورج کی کرن پردۂ شب کو چاک کر رہی ہے۔ یا جمنا کے درمیان سرستی بہ رہی ہے!")

میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ جو لطافت اور دلکشی ان اشعار میں ہے وہ نہ کسی کی مانگ میں ہے نہ ان مناظر میں۔

ایک اور شعر پیش کرتا ہوں۔ تشبیہ کی لطافت اور خالص وطنیت ملاحظہ کیجئے اور سر دھنیئے۔

بھئی اور یہ چھب سب ناماں   جن ایک بگھر سے گھر ساماں

"یہ اسکی مانگ نفیس پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ جیسے کالے بادلوں میں بگلوں کی قطار اڑتی چلی جا رہی ہے"۔

" اردو شاعری میں یہ بات خال خال نظر آتی ہے لیکن مفقود نہیں۔ آتش کہتے ہیں

آئینہ میں عکسِ چشمِ یار کا عالم نہ پوچھ
دیکھ لے آتش کنول پھولے ہوئے تالاب میں

سودا کا مصرع ہے ؎ "تیری نگہ نے ظالم ارجن کا بان مارا" اور انیس نے کہا ہے " ارجن سے کماندار کو ایک تیر سے ماریں" میر ماتھے پر چندی لگانے کی رسم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

" لطف اگر یہ ہے بتان! صندلِ پیشانی کا"
حسن پھر صبح کے کیا چہرۂ نورانی کا"

ایک جگہ اور خاص ہندوستانی زیور کا ذکر کرتے ہیں اور ہائے کس زبان میں۔

ہوتی تو آج رنگ دوسرا ہوتا۔ مگر یہ تقاضہ اتنا فطری تھا کہ رُوکے نہ رُوکا جا سکا اور غزل و قدیم اسالیب کو نئے اسالیب اور جدید طرزوں کے مقابلے میں سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا۔ یہی قدیم کی شکست اور جدید کی فتح ہے۔

٤ (صفحہ ١٤٩ کا نوٹ) صرف ایرانی کلچر ہی ایسی ٹھوس چٹان ہے جس پر عربوں کے سیلاب کا اثر نہیں ہوا بلکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عرب ایرانیوں سے متاثر ہوئے اور یہ کہ عربوں کے تسلط کو ایرانیوں نے خوشی سے گوارا نہیں کیا۔

٥ (صفحہ ١٤٩ کا نوٹ) اصنافِ شاعری میں پیروی کرنا کوئی جرم نہیں، خیالات اور زبان میں اردو میں فارسی کی کھلی ہوئی پیروی کی گئی ہے!! اگر عسکری صاحب اسپر مصر ہوئے تو امثال پیش کرنا مشکل نہیں۔

ساغر

خلق خدا کی دیکھن آئی چاند تو اک تھا ہالے دو　　کو ٹھے اوپر اپنے کھڑا تھا کان میں پہنے بالے دو

اور اکثر جگہ پسر برہمن، پسر زرگر وغیرہ کا ذکر اس دعوے کا شاہد ہے کہ یہ کمی زیادہ تر ہندوستان کے فارسی شعرا نے پوری کی ہے۔ مجھ کو امیر خسرو اور حزیں کے شعر یاد آ رہے ہیں ۵

از بنارس نروم معبد عام است اینجا　　ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

ہمچو ہندو زن کسے در عاشقی مردانہ نیست　　سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

اور امیر خسرو علیہ الرحمۃ کا ایک قطعہ ہے جو نصف فارسی اور نصف اردو میں ہے۔

زرگر پسرے چو ماہ پارا　　کچھ گھڑئے سنوارئیے پکارا

نقد دل من گرفت بشکست　　پھر کچھ نہ گڑھا نہ کچھ سنوارا

ایک اور شعر میں ہندوستان کے طریقۂ سلام کی مصوری کی ہے جو محاکات کی اعلےٰ ترین مثال ہے ۵

از صبا شاخ گلے خم شد و بیتاب شدم

نازکیہائے سلام تو مرا یاد آید

یہی وہ مقامات ہیں جہاں شاعری سحر حلال کے دائرہ سے نکلکر اعجاز کی حدوں میں داخل ہوتی ہے۔

خیر ایسی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو شعرا خیالات کی وادی میں فارسی اساتذہ کے نقش قدم پر چلتے ہیں یا اپنی واسطے الگ راہیں نکالی ہیں، اگر ہم نظر غور سے دیکھیں تو چند ایسے اشعار نکالکر جس میں اردو شعرا نے عمداً فارسی والوں کا ترجمہ کیا ہے مثلاً

قدسی	آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را	اختر ز فلک مینگرد سوئے زمیں را
سودا	آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو	اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو
نظیری	عشق عصیاں است اگر مستور نیست	کشتۂ تیغ زباں مغفور نیست
شیفتہ	عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں	کشتۂ تیغ زباں ناجی و مغفور نہیں
نامعلوم	مس مالیدہ لب را رنگ پاں ہیں	تماشا ہیں، تہ آتش دخاں ہیں
ناسخ	مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے	تماشا ہے تہ آتش دھواں ہے

---

۵ (　　) اسکی وجہ صرف حاکمیت و مذہبیت تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو نل ودمن اور رام وارجن نے کیا قصور کیا تھا۔ مگر ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ آپکے محکوم کے عاشق و معشوق اور آپکے غلاموں کے پیغمبر تھے۔

۵ (نوٹ متعلقہ صفحہ ۲۴۲) عقل اس بات کو باور نہیں کر سکتی، کہ میں نے پیرس نہیں دیکھا اور میں وہاں کے بازاروں اور میدانوں کا حقیقی تصور کر سکوں، سنا جاتا ہے کہ گولر کا پھول کسی نے نہیں دیکھا (اور جو اس کو دیکھ لے بادشاہ ہو جائے) تو جس نے گولر کا پھول نہیں دیکھا وہ کیونکر گولر کی تصویر بنا سکتا ہے اور کس طرح اس پر نظم کہہ سکتا ہے، خیالات آفرینی کے متعلق تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعری کی دنیا دل میں ہوتی ہے۔ مگر اس نفسیاتی مسئلہ سے آپ انکار نہیں کر سکتے کہ اشیا کو دیکھے بغیر ہم احساس نہیں کر سکتے

ساغر

نامعلوم:- خدارا سوئے مشتاقاں نگاہے / بیاپے گر نہ باشد گاہے گاہے

ذوق:- اس طرف بھی نہیں لازم ہے نگاہے گاہے / دمبدم لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہے گاہے

ہمیں زیادہ تر یہ نظر آئیگا کہ اردو شعرا نے جدّت سے کام لیا ہے اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ ذیل میں فارسی اساتذہ کے منتخب اشعار کا اردو شعرا کے ہم مضمون اشعار سے ایک تقابل پیش کیا جاتا ہے اور اس باریک فرق کو نمایاں کرنے کی کوشش کیجاتی ہے جو دونوں کے یک رنگ خیالات میں موجود ہے، ان اشعار میں اس جدّتِ ادا کا نمونہ بھی ملیگا جس کی طرف شروع مضمون میں اشارہ ہے۔

مسیّب خاں ایک فارسی شاعر تھا، اس کی رُباعی ہے اور کس قیامت کی رباعی،

آراستہ آمدی چہ آراستنی / دلخواست بعشوہ ء چہ دلخواستنی

بنشست بمی خوردن و برخاست برقص / ہے ہے چہ نشستنی چہ برخاستنی

بعض جگہ شاعر اجمال سے وہ فائدہ اُٹھاتا ہے جو تفصیل سے ممکن نہیں۔ مذکورہ رباعی کے ہر مصرع میں یہ حسن موجود ہے، کہتا ہے "بناؤ سنگھار کرکے آیا اور کیسا بناؤ سنگھار" اس کے بعد خاموشی ہے لیکن یہ خاموشی ذوقِ آرائش جمال کے تذکرہ کر رہی ہے۔ اگر ذرا ذہن پر زور دیا جائے ـــــ اور اس شعر کے سمجھنے میں جسکی بنیاد تخیل پر ہو اپنی تخیل سے کام لینا ضروری ہے۔ تو حسن اور اسکی آراستگی کے بے شمار پہلو نظر کے سامنے آجاتے ہیں، پھر نازک سا تعلق پہلے اور دوسرے مصرعہ میں یہ ہے کہ اس کے بعد جو کچھ ہونا تھا ہوا، اس نے دل مانگا اور کس انداز سے مانگا کہ بس۔ بیٹھا تو شراب پینے کی خاطر اور اُٹھا تو رقص کرنے کی ٹھان کر۔ ہائے کیا بیٹھنا ہے اور کیا اُٹھنا۔

مجھ کو آخر کے دو مصرعوں سے زیادہ کام ہے جنکا انداز بیان ہو بہو ظفر کے مطلع سے ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی شاعر نے جس منظر کی تصویر کشی کی ہے بے پناہ ہے، کسی خود بیں و خود آرا کا ناز و غمزہ کے ساتھ بے تکلف پہلو میں آکر بیٹھ جانا اور اس پر بادہ نوشی کی مشق پہلے ہی ہلاک کر دینے کو کیا کم ہے کہ جب شراب اور حسن دونوں ملکر اپنے کیف تمام سے ایک کمزور و مغلوب ہستی کو بیخود و مدہوش کر دیں تو رقص کے لئے اُٹھا جائے۔ پھر حسن کا اپنی تمام دلربا اداؤں کے ساتھ رقص میں آجانا قیامت بالائے قیامت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ روشنی کی طرح آگے بڑھنا وہ سائے کی طرح پیچھے ہٹنا، وہ بوئے گل کی طرح پھیلنا اور موج رنگ کی طرح سمٹنا ؎

وہ دل چھیننا ہاتھ بڑھ کر کے ہاتھ / اُچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ

بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت خود رقص کناں ہے اور دیکھنے والے سکتے کے عالم میں ہیں بیٹھنے اور اُٹھنے کے انداز کو شاعر نے کہا ہے کہ ہائے کیا بیٹھنا اور کیا اُٹھنا ہے، اب مجھے ظفر کا شعر پیش کرنا ہے جو مضمون میں تو اس سے مختلف ہے لیکن اسی بیساختہ طرزِ ادا کا حامل ہے

---

۵۲ (نوٹ متعلقہ صفحہ ۲۴۴) سبحان اللہ! روح القدس کا فیضان! اسکے فیضان کو تسلیم کرنے سے قبل تو ذرا تفکر و تصدیق کی ضرورت ہے، آپ کا ذکر نہیں مگر بدقسمتی سے اکثرین کو ایسے بزرگ کی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

۵۳ یقیناً ایرانی بہار ہندوستان میں کیوں آئیگی۔ لیکن ہندوستان کا موسم بہار اپنی آپ ہی نظیر ہے، ہندوستان ہی ایسا حسین اور شاندار اور مہذب ملک ہے جسکی ماتھا اونچی یونان کے علم الاصنام سے ٹکر کھاتی ہے اور جس کے میلے اور تہوار اپنی کثرت میں یونان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہندی مہینوں کے نام ہی اپنے موسموں کا اعلان ہیں اور بہار کے موسم کے مہینے کو ہندی میں "بسنت" کہتے ہیں۔ اس موسم میں کھلنے والے پھول سرس، گیندا اور سرسوں ہیں یہ صرف ہندوستان ہی ہے جسکے ذرہ ذرہ میں شعریت کے دریا موجیں لے رہے ہیں اور شاعری اسطرح بکھری ہوئی ہے کہ غیر شاعر بھی شاعر بن سکتا ہے۔ مالوہ کے جنگل، کشمیر کی وادی،

ظفر اپنے پہلو میں اک دردمند دل رکھتا تھا۔ اس نے زمانے کی ستم رانیاں دیکھی تھیں اس کے یہاں بادۂ عشرت کی یہ سرمستی کہاں۔ ہاں اگر نغمۂ شادی کے بجائے نوحۂ غم" سننا ہو تو آئیے میں اسکے شعر میں سنوا دوں۔ دیکھیے حسن و عشق کا مضمون ہے لیکن سوز و گداز کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا۔ کہتا ہے:

آنا تو خفا آنا، جانا تو رُلا جانا
آنا ہے تو کیا آنا، جانا ہے تو کیا جانا

شعر نہیں آبگینہ ہے، جسکی نزاکت سے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ لگانے سے پاش پاش نہ ہو جائے بھلا ان جذبات و احساسات کی لطافت کا کیا ٹھکانا جو شعر کہتے وقت ظفر کے دل پر طاری ہوئے ہوں گے

اب دیکھیے کہ ان سادے سادے الفاظ سے کتنی مختلف تصویریں نظروں کے سامنے پھر جاتی ہیں، ایک طرف تو کسی کے تیوریاں چڑھائے بیگانہ وار آنے کا انداز ذہن سامع میں متصور ہو جاتا ہے، دوسری طرف خیال گذرتا ہے کہ جتنی دیر بیٹھے روٹھے ہی رہے اور جب چلنے لگے تو کچھ ایسی بیدردی سے ستانے والے کے دل میں نشتر توڑ چلے کہ پیمانۂ صبر کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں کے جام بھی چھلک پڑے، قسمت کی خوبی دیکھئے کہ ہزار منتوں مرادوں سے آئے بھی تو مقدر کی طرح برگشتہ رہے اور جتنی دیر بیٹھے دل کو برماتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ یونہی تڑپتا چھوڑ چلے۔ اب کوئی شکستہ بیچارہ سوائے اس کے کیا کرے کہ بیٹھا سر دُھنے اور یہ مصرعہ پڑھے کہ واہ ؎

آنا ہے تو کیا آنا، جانا ہے تو کیا جانا

تاثیر، جو شعر کی جان ہے، اس مطلع میں بدرجۂ اتم موجود ہے، یہ بات انداز بیان سے پیدا ہوئی۔ الفاظ کا شیرازہ بکھیر دیجئے اور نظم کی نثر کر دیجئے دیکھئے تاثیر کا طلسم ٹوٹا جاتا ہے، پھر خیال میں بذات خود کوئی باریکی کوئی دقت نہیں، سامنے کی بات ہے لیکن عام شعرا کی نظریں یہاں تک نہیں پہنچتیں اور اگر پہونچتی بھی ہیں تو وہ اس طرح کامیابی کے ساتھ نظم نہیں کر سکتے، اسی کو سہل ممتنع کہتے ہیں

ایک عرب شاعر سے کسی نے پوچھا، اچھے شعر کی کیا پہچان ہے؟ اس نے کہا جسے سن کر ہر شخص بول اُٹھے کہ وہ بھی ایسا ہی کہہ سکتا ہے لیکن جب کہنے بیٹھے تو بڑے سے بڑا عالم اور جید سے جید فاضل بھی عاجز ہو جائے ظفر کا شعر اسی تعریف کا مصداق ہے۔

تجلی کا شعر ہے   باآنکہ بپرسیدن ما آمدہ مردیم
کایاز کہ پرسیدہ رہ خانۂ مارا

یعنی اگرچہ وہ میری ہی پرسش کیلئے میرے گھر آیا لیکن میں رشک سے مر گیا کہ اس نے میرے گھر کا راستہ نہ معلوم کس سے پوچھا۔ ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ معشوق پہلی مرتبہ عاشق کے گھر آیا ہے جبھی تو اس کے گھر کا راستہ نہیں جانتا تھا۔ باریکی یہ ہے کہ عاشق معشوق کا لطف ذکر اس کے آنے اور پہلی مرتبہ آنیکی خوشی بھول گیا۔ اور رشک کیوجہ سے مر گیا کہ اس نے سر راہ کسی غیر سے بات کر لی۔ میر اس جذبۂ رشک کی ترجمانی یوں کرتا ہے ؎

داغ ہوں رشک محبت سے کہ اتنا بیتاب   کس کی پرسش کیلئے گھر سے وہ باہر نکلا

54

برزخ کے ساحل، یہ تمام سامان، روح کی شاعری کو بیدار کر سکتے ہیں۔ اور بکھری ہوئی فطری شاعری کو روح میں مقیّد کر دینے کی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر الفاظ، استادی و شاگردی، اور فاعلن مفاعلن، مشاعروں اور شاعریوں کے جکڑے ہوئے قیدیوں کیلئے یہ زمینیں بنجر ہیں۔

ساغر

(از مضمون "...")

فارسی کا شعر اس کے آگے بیجان معلوم ہوتا ہے اور تصنع سے بھرا ہوا معشوق کا عاشق کی پرسش کیلئے اس کے گھر تک جانا ایسی بات ہے جسکے یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ برخلاف اس کے کسی خاص جذبہ کے زیر اثر بیساختہ گھر سے باہر نکل پڑنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

پھر نفسیاتِ انسانی سے واقف حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں کہ رشک سے دفعتًا مرجانا زیادہ مطابق فطرت ہے یا اپنی قلبی کیفیت کا یوں اظہار کرنا کہ اپنے تئیں ہمہ تن داغ ہوجانے سے تعبیر کر دیا جائے، مزید براں میر کے یہاں "آنا بیتاب" ایسا ٹکڑا ہے کہ معشوق کی گھبراہٹ اور سراسیمگی کی تصویر کھینچ دیتا ہے اور جس سے رشک کیلئے اور گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں کوچۂ یار میں گیا تو دیکھا کہ وہ ایک مرتبہ بیتابانہ گھر سے باہر نکل پڑا میں رشک سے سراپا داغ ہوگیا کہ نہ معلوم کس کی حالت دریافت کرنے کیلئے اس قدر پریشان و مضطر ہے۔

معنیٰ کی اس نزاکت پر غور کیجئے کہ خود اسی کا جذبۂ دل تھا جو اپنی کشش سے معشوق کو گھر سے باہر کھینچ لایا لیکن رشک نے اسے آنا سمجھنے کی اجازت نہ دی اور بدگمانی کا بُرا ہو جس نے کان میں پھونک دیا کہ وہ تو کسی اور کی پرسش کے لئے گھر سے باہر نکلے ہیں۔

میلی:-

زبدگمانیٔ خود شرمسار خواہی شد
مباش این ہمہ در بندِ امتحانِ من

'ابھی تو تمہیں میرا اعتبار نہیں، اجانتے ہو یہ مجھے اپنی جان عزیز کرے گا لیکن جب میں بسر دچشم تمہارے ہاتھ سے قتل ہوجاؤں گا اور امتحان میں پورا اتروں گا تو اپنی بدگمانی پر پچھتاؤ گے، دیکھو امتحان سے باز رہو'۔

شعر کا لفظی ترجمہ آخر کے دو مختصر جملوں میں موجود ہے لیکن شاعر کی معجز بیانی دیکھئے کہ اس نے ایسے الفاظ استعمال کئے جو بیشتر کے تمام مطالب کو آئینہ کر دیتے ہیں، وہ صرف اشارے کر دیتا ہے اور ذہن سامع خود بخود معنی پورے کر لیتا ہے یہ بجائے خود شاعری کا ایک بہت بڑا کمال ہے اور پھر مضمون میں کس قیامت کی لطافت ہے، اپنے قتل ہوجانے کا غم نہیں۔ خیال ہے تو یہ ہے کہ قاتل بعد قتل پشیمان نہ ہو۔

میر

بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

اس میں بھی وہ تمام حسن موجود ہے جو فارسی شعر کی زینت تھے۔ مطلب میں فرق اتنا ہے کہ وہاں قاتل کی پشیمانی کا خیال تھا یہاں اسکی بدنامی کا ڈر ہے، خدشہ ہے کہ قاتلوں میں اس کا نام نکل جائے گا۔ حالانکہ اس کا نتیجہ بھی وہی بعد کا پچھتاوا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو میر نے پہلے مصرعے میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو میلی کے پورے شعر میں ہے۔ اس طرح ان کا دوسرا مصرعہ پورے کا پورا اس کے شعر پر بھاری پڑتا ہے اور اور پلہ گراں کر دیتا ہے، پھر مصرعہ بھی کس قیامت کا مصرعہ ہے "رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو" وہ بیساختگی ہے کہ شک کو جگہ دینے کی گنجائش ہی نہیں۔ جو دلیں متیقن نہ ہو اس طرح کیونکر کہہ سکتا ہے۔ پھر ذرا اور گہری نظر سے دیکھئے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ عاشق کا عشق اب اس نقطے پر پہونچ گیا ہے جو رقابت سے بالا ہے۔ اقبال کہتے ہیں

اقبال

محبت چوں تمام افتد، رقابت از میاں خیزد۔
بہ طوفِ شعلۂ پروانہ با پروانہ می سازد

اسکی پرستاریٔ حسن کا یہ عالم ہے کہ وہ زمانے بھر کو معشوق کا والہ و شیدا جانتا ہے جبھی تو کہتا ہے اور کس یقین کے ساتھ کہ ایک میں کیا دنیا میں کوئی بھی تم سے اپنی جان کو عزیز نہیں رکھے گا۔ مجھی پر کچھ موقوف نہیں، کسی کو بھی آزمانے کا خیال نہ کرنا

میلی

بسے خوشنود می آید بسوئم، قاصد از کوشش
کہ غیر نامہ حرفے از زبانِ یار ہم دارد

معشوق کے کوچے سے قاصد بڑا خوش خوش واپس آرہا ہے، شاید خط کے علاوہ زبانی پیغام بھی لایا ہے۔ شعر میں بدگمانی کی مرقع کشی کی گئی ہے
دراصل قاصد خط کے جواب لے آنے پر خوش ہے اور انعام کی اُمید پر پھولا ہے۔ لیکن عاشق کو بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس نے خط دینے کے علاوہ
کچھ زبانی بھی کہلوایا ہے اور یہ لطفِ گفتگو حاصل کئے ہوئے ہے جبھی اسقدر خوش ہے بعینہٖ یہی مضمون آتش بھی کہتا ہے ؎

نکلتی منہ سے قاصد کے نہیں بات
مگر لایا ہے پیغام زبانی

لیکن اس چھوٹے سے شعر میں معانی و مطالب کا ایک دفتر پوشیدہ کر دیتا ہے اسکا راز اس ابہام میں ہے جو پہلے مصرعے میں صرف ہوا ہے
اور لفظ "مگر" میں جسکے معنی شاید کے ہیں۔

فارسی شاعر نے پہلے مصرعہ میں قاصد کی خوشی کا ذکر کر دیا اور آتش نے وہ اندازِ بیان اختیار کیا جس سے ضمناً یہ اشارہ بھی ہوا اور کلام میں زور اور معانی میں وسعت جدا پیدا ہو گئی۔ انسانی مسرت کی انتہا تحیّر ہے، یہی نکتہ اس نے مدِ نظر رکھا۔ اور کہدیا ؏ نکلتی منہ سے قاصد کے نہیں بات۔ عالمِ حیرت میں ایسا ہی ہوتا ہے، پھر دوسرے مصرعہ میں جو تشکیک لفظِ مگر سے پیدا کی، متعدد مطالب پر دال ہے، شاید زبانی پیغام بھی نہ لایا ہو۔ اور قاصد جذبۂ رحم و ہمدردی سے مجبور ہو کر چپ ہو کہ یہ خبرِ بد عاشق کو کیا سنائے، پہلے مصرعے کا طرزِ ادا ایسا ہے کہ خود عاشق کے اضطرابِ قلب کشمکشِ انتظار، فرطِ شوق، اور حالتِ اُمید و بیم کی تصویر پیشِ نظر ہو جاتی ہے، معلوم ہوتا ہے وہ انتہائی بیتاب ہے کہ قاصد کے منہ سے کچھ تو نکل چکے اور جب وہ کچھ نہیں بولتا تو اُسے بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ بھی شاید معشوق کے ساتھ لطفِ کلام حاصل کر چکا ہے اور جبھی بالکل مبہوت سا ہو کر رہ گیا ہے واقعہ تو یہ ہے کہ قاصد نہ جواب تحریری لایا ہے نہ پیغامِ زبانی، اور اس لئے چپ ہے کہ کہے تو کیا کہے۔ مگر ہائے وہ حسرت نصیب، وہ فریب خوردۂ آرزو جو ایک اُمیدوں کو منقطع بھی نہ کر سکے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ قاصد عاشق کی بیتابی پر اس قدر مبہوت ہو گیا ہو کہ طاقتِ گفتگو کھو بیٹھا ہو۔ بہرحال ایک امر یقینی ہے، عاشق قاصد کی خوشی پر متوحش ہے اور وہ اس کی وحشت پر خاموش اور جیتی جاگتی تصویر سامع کے پیشِ نظر ہے، اتنے وسیع مطالب کا ایک مختصر سے شعر میں بھر دینا شاعری کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔

وی رقیب از تو جدا بود و دل آزردہ نہ بود
شاد گشتم کہ غمِ عشقِ تو چنداں اش نیست

۵۶ کل رقیب تجھ سے جدا ہونے کے باوجود، دل آزردہ نہیں تھا، میں خوش ہو گیا کہ تیرے عشق کا غم اُسے زیادہ نہیں ہے، شعر میں شوخی ہے اور شوخی کا راز اس نکتہ میں پنہاں ہے کہ رقیب کے اطمینانِ خاطر کو اس کے عشق کی کامیابی پر محمول نہیں کرتا بلکہ اپنے مطلب کی بات یہ سمجھتا ہے کہ اسے معشوق سے محبت ہی نہیں، ورنہ اس کی جدائی میں مطمئن رہنا کیا معنی، ساتھ ہی اپنی بیتاب حالت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو فراقِ یار میں اس پر گذرتی ہے کیونکہ اس کے تصور میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ کوئی فراقِ دوست میں آسودہ رہے۔

مومن جس نے اپنی شاعرانہ طبیعت کی تمام تر جولانیوں کو دائرۂ تغزل میں محدود کر لیا تھا اکثر اپنے اشعار میں اس شوخی کا اظہار کرتا ہے وہ ایک ایسی بات سے جو سراسر اس کے خلاف ہو اپنے فائدہ کا مطلب پیدا کر لیتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے

ہجراں کا شکوہ لب تلک آیا نہیں ہنوز
لطفِ وصال غیر نے پایا نہیں ہنوز

فارسی شاعر رقیب کے اطمینانِ خاطر کو جو اُسے فراقِ دوست میں حاصل ہے اسی کے خلاف ایک آلۂ کار بناتا ہے اور مومن رقیب کی اُس

انتہائی کامیابی کو جو کسی کو کبھی عشق میں حاصل ہو سکتی ہے، مٹّی میں ملا دیتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ مشکل کام تھا یا یہ۔ کہتا ہے رقیب معشوق کی جدائی کا تو مزہ چکھا ہی نہیں وہ وصل کی لذت کیا جانے، انگریزی مثل ہے (Seperation Sharpens love) پیاسے ہی کو پانی کی قدر ہوتی ہے۔ رقیب جو فراق سے ناآشنا ہے کبھی وصل سے کماحقہ لذت یاب نہیں ہو سکتا۔ کس مزے سے لپے دل کو تسلّی دیتا ہے اس کا تو غم نہیں کہ رقیب اور دوست میں کبھی فراق ہی نہیں ہوتا، اس پر خوش ہے کہ اُسے وصل کی پوری لذت نہیں ملتی۔ وہ اکثر معشوق کو ایسے مشورے دیتا ہے جو ظاہر میں اپنے خلاف اور اس کے موافق ہیں لیکن دراصل اپنے موافق اور اس کے خلاف ہیں۔

"منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
آسمان رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں"

"محفل میں کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز، دیکھنا"

"سرمگیں آنکھوں سے نامے کو لگاتے کیوں ہو
غیر کے نام کو مٹّی میں ملاتے کیوں ہو"

غالب کے یہاں صرف ایک شعر میں یہ بات پائی جاتی ہے

منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے   دوستی کا پردہ ہے بیگانگی

میلی :-
خاطرم جمع است از بدگوئی دشمن کہ باز
گوش بر حرفش نیدارد چو نام من برد

معشوق سے دشمن کی لگائی بجھائی کرنے پر مطمئن ہوں کیونکہ جب میرا نام آجاتا ہے پھر وہ کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتا۔ اس شعر میں بھی وہی شوخی ہے کہ اپنے مفید مطلب پہلو کو لے لیا ہے اور دوسرے کو چھوڑ دیا ہے، انھیں اس کا تو رنج نہیں کہ معشوق کی نفرت اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ جب نام آجاتا ہے وہ برافروختہ ہو کر کوئی بات سننا نہیں گوارا کرتا۔ لیکن اس کی خوشی ضرور ہے کہ دشمن کی بدگوئی کام نہ کرے گی۔
غالب بھی اس مضمون کو باندھتا ہے۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وہ کہتا ہے یہی نہیں کہ وہ دشمن کی بات میری بابت نہیں سنے گا، بلکہ شاید اس سے ناراض ہو کر اُسے بھی نکلوا دے اور ہمیشہ کیلئے اس کی بات بگڑ جائے وہ مردود بارگاہ ہو جائے، اسی مضمون کو ذرا بدل کر غالب کیا خوب کہتا ہے۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تجھ سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے۔

میلی :-   از بزم ناز آمدن من برون رود   برخواست وگرم کردن جا را بہانہ ساخت

معشوق کی انتہائی شوخی کا ذکر ہے، ادھر میں ان کی محفل میں گیا وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے اپنی جگہ دینے کا بہانہ کر کے چلتا ہوا۔ اب بھلا

عاشق کی حالت کا اندازہ کیجئے کہ جسکی محفل میں آئے وہی اس کے آنے سے چلتا ہوا۔ سب کی نظروں میں اور آپ اپنی نظروں میں اسکا کیا عالم ہوگا
مومن کی بزلہ سنجی ملاحظہ ہو۔ آتے ہی مرے نام کے محفل سے اُٹھے وہ بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو۔
وہ اپنے معشوق کی انتہائی تذلیل کو اس کی انتہائی تعظیم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہاں پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مومن کی طبیعت میں تسلی
کے مجبوب سے بھی کچھ زیادہ شوخی تھی کہتا ہے، اس بدنامی پر بھی میرے نام کی عزت تو دیکھو کہ اسے سن کر وہ سرو قد تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
کیا تاویل ہے محبوب تو غصہ سے بیتاب ہو کر اٹھتا ہے، یہ کہتے ہیں تعظیم کو کھڑا ہوا،

با وجو میرسم آلودہ کیشوم از دور
ندیدہ حالِ مرا دقتِ بیقراری حیف

جب اس تک پہونچتا ہوں اُسے دور ہی سے دیکھکر آسودہ خاطر اور مطمئن ہو جاتا ہوں، ہائے اس نے میری بیقراری کا حال تو کبھی دیکھا ہی نہیں
محبوب کو دیکھ کر اپنا کرب و اضطراب یکسر فراموش کر دینا اور اس کا عاشق کی پریشان حالی سے ہمیشہ بے خبر رہنا۔ کس قدر حسرت خیز ہے۔
مجبوریٔ عشق اور ناکامی محبت کی ترجمانی اس سے بہتر پیرایہ میں کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن غالب نے کہا اور کچھ بڑھ کر کہا ؎

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔

محبوب کو دیکھ کر عاشق کی پریشانی و بےچینی کا معدوم ہو جانا اور بات ہے اور دیدار یار سے مریض کے چہرہ پر صحت کا خون دوڑ جانا اور۔
پھر غالب کے شعر میں جس قیامت کا اثر ہے فارسی میں نام کو نہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ فارسی شاعر نے اپنی مصیبت اور دردِ دل کا اظہار کر دیا۔
اُس نے کہدیا کہ ہائے انھوں نے میری بیقراری کا عالم تو دیکھا ہی نہیں اور غالب نے اتنے ٹکڑے کو محذوف کر دیا صرف اپنی بدلتی ہوئی حالت اور معشوق
کی غلط فہمی کا ذکر کر دیا، غیرتِ ناکامی دیکھئے، یہ نہیں بتایا کہ ان کی غلط فہمی سے بیمار کے دل پر کیا گذر گئی اور اس نکتہ میں تاثیر کا راز پنہاں ہے، یہی غیرت و
خودداری ہے جو سننے والے کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی ہے۔ کسی فارسی استاد کا شعر ہے کہ ؎

ہلالے کہ بر آسماں جائے اوست
تراشیدۂ ناخنِ پائے اوست

اُردو میں ایک عورت نے اسی مضمون کو کہا اور اس حسن سے کہ اس میں چار چاند لگا دیئے۔

۵۸

تمہارے پاؤں کے ناخن کی ہمسری نہ ہوئی ہلال لاکھ سرِ آسماں بنا بگڑا

اس میں شک نہیں کہ اردو شعر سے فارسی شعر کو وہی نسبت ہے جو شاعرانہ مبالغہ نکالکر ماہِ نو سے ناخنِ پا کو ہو سکتی ہے۔ وہاں صرف ناخن کو
ہلال سے تشبیہ دی گئی تھی یہاں چاند کی ان متواتر کوششوں کا نقشہ کھینچ جاتا ہے جو اس نے معشوق کے ناخن کی ہمسری کرنے کے لئے کیں۔
پہلے تو کٹے ہوئے ناخن کی ہمسری کرنے کے لئے ہلال بنا، جب ناکامی ہوئی تو روز بروز اپنے سینے کو کشادہ کرتا گیا اور کسی کے ناخنِ پا سے تقابل کرتا
رہا کسی طرح اطمینان نہ ہوا، یہاں تک کہ بدر بن گیا پھر بھی ناکام ہی رہا، کسی کے ناخنِ پا کی رنگینی و دلآویزی نہ آسکی پھر اس نے اپنا جسم تحلیل کرنا
یا یوں کہئے اپنے تئیں غم ناکامی میں گھلانا شروع کیا اور ہلال کی حد تک آگیا، پھر ہمت باندھی اور یہی عمل دہرایا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ لاکھ بار نہیں
دہرایا، یہاں تک کہ چاند کی ساری زندگی ناکام کوششوں کا ایک عبرتناک سلسلہ بن کر رہ گئی ہے" ہلال لاکھ سرِ آسماں بنا بگڑا۔ مصرع نے چاند کی دیوی
کو مجسم کر کے پیشِ نظر کر دیا، معلوم ہوتا ہے کوئی خود آرا و خود نگر سو سو طرح سے اپنے حسن میں اضافہ کی کوشش کر رہا ہے، بن بن کر سنور سنور کر اپنے تئیں
دیکھتا ہے اور حزیں بزہو کر رہ جاتا ہے۔
شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بیساختگی اطلنے مبالغے کا زور گھٹا دیا۔ شعر پڑھئے اور آپ کو محسوس تک نہ ہوگا کہ اس میں کوئی تصنع آمیز

بات کہی گئی ہے۔ حسنِ تعلیل کی اس سے بہتر اور کامیاب مثال شاید ہی مل سکے پہلا مصرعہ ایسا ہے جو از اوّل تا آخر محاورے میں ڈھلا ہوا ہے۔ بلکہ خود محاورہ ہوجانے کے قابل ہے جس سے ضمناً یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ چاند جب تمھارے ناخن پا کی ہمسری نہ کرسکا تو تم تو بڑی چیز ہو۔ ایک اور تقابل پیش کرتا ہوں اور اسی پر ختم ہے

حافظ — گر ز مسجد بخرابات شدم خوردہ مگیر — مجلسِ وعظ دراز است و زماں خواہد شد

قائم — مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم — یہ ہے میخانہ، ابھی پی کے چلے آتے ہیں

وہ رنگینی و لطافت، دلکشی و دلآویزی، تاثیر و معنویت اور شوخی و برجستگی جو قائم کے یہاں ہے قائم اور حافظ کے یہاں غائب ہے ممنونِ بیان نہیں ہوسکتی، پہلا شعر مجلسِ وعظ کی طرح بے کیف ہے اور دوسرا محفلِ رندوں کی طرح بارونق (!؟!۔ حیرت!)

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

اوپر کی مثالوں سے ایک حد تک واضح ہوگیا ہوگا کہ اردو شعرا نے فارسی اساتذہ کی کورانہ تقلید کی ہے یا اپنے لئے الگ راہیں تلاش کی ہیں، اعتراض کرنے والے اگر دونوں زبانوں کی شاعری کا مطالعہ نظرِ تحقیق سے کریں تو یہ حقیقت روشن ہوئے بغیر نہ رہے کہ اردو شعرا نے اپنی شاعری کو فارسی کا دست نگر اور منت کش نہیں بنایا ہے۔ انھوں نے جو کچھ خود محسوس کیا وہی کہا ہے۔ اور جس طرح دو آدمیوں کی صورتیں قطعی ایک سی نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح کوئی دو آدمی کسی ——— جذبے سے ایک طرح متاثر نہیں ہوسکتے۔ افسوس ہے کہ دیگر اقوام تو اپنی شاعری کو معراجِ ترقی و شہرت پر پہونچا دینا چاہتی ہیں لیکن ہمارے یہاں اُن افراد کی کمی نہیں جو اپنی زبان اور اسکی شاعری کو اپنی نا واقفیت اور غلط فہمیوں سے ہدفِ اعتراضات بنا کر اُسے پستی در قعرِ گمنامی کیطرف لیجانا چاہتے ہیں۔ مبالغہ کا شائبہ بھی نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اردو نے اپنی مختصر حیات میں وہ ترقی کی ہے اور وہ شاعری دنیا کے سامنے پیش کی ہے جو کسی ملک و قوم کی شاعری کے مقابلے میں لائی جاسکتی ہے اور ہیٹی نہیں ثابت ہوگی۔

ساغرؔ — مضمون کے آخر میں عسکری صاحب نے خوب خوب دادِ تشریح و تحقیق دی ہے اس سے ان کی انتقادی قابلیت اور وسعتِ نظر ہونے کا ثبوت ملتا ہے، یقیناً یہ کہنا ظلم ہوگا کہ اردو شاعری میں کچھ گرہ کا نہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اوّل اوّل اردو شاعری فارسی ہی سے متاثر ہوئی اور اس میں جو خیالات اور جو مضامین آئے وہ فارسی سے مستعار لئے گئے لیکن بہر حال تقلید کا انجام اجتہاد ہے۔ جیسے جیسے اردو شاعری میں اعتمادِ فکر اور آفاقی اثرات سے متاثر ہونے کی اہلیت پیدا ہوتی گئی، اردو شاعری سے تقلیدی عناصر کم ہوتے گئے اور اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اردو شاعری فارسی کی اسقدر ممنونِ منت ہے۔ نئے اسالیب اور نئی زبان کی نئی شاعری تو قدامت و تقلید کے خلاف ایک زبردست اعلان ہے، یہ اردو شاعری کی انفرادیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ ابھی اس نقش میں کتنے رنگ پیدا نہیں ہوں گے، اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ آگے چل کر یہ دلہن کتنے زیورات سے آراستہ ہوگی۔

ساغر نظامی

تین خواب

"ماضی"

اے ماضیِ معدوم، مرے ماضیِ معدوم (۱) معدوم، مگر اے مرے گہوارۂ معصوم

آ حال کے ایوان میں اک آن کو دم لے
ڈر ہے کہ تری یاد بھی ہو جائے نہ موہوم

کیا یاد نہیں تجھ کو وہ ابوابِ فسانہ!؟
جب لفظِ تمنّا میں نہ معنی تھے نہ مفہوم

مجبور سا مجبور نہ آزاد نہ قیدی
آزاد سا آزاد، نہ مجبور نہ مظلوم

ہر لفظ میں اک گیت تو ہر گیت میں اک گت
بے قید وہ اشعار نہ منثور نہ منظوم

چھوتے ہوئے جب مجھ کو لرزتی تھی جوانی
کیا یاد ہے تجھ کو وہ مرا عالمِ معصوم

وہ عالمِ معصوم، وہ فردوس کا سپنا
سرشار نہ بے کیف، نہ مسرور نہ مغموم

وہ رُخ پہ مرے کاکلِ زرّینِ پریشاں
وہ لب پہ مرے موجۂ رنگینیٔ معصوم

وہ چشمِ مستانہ، وہ جاوید شرابی
آنکھوں میں وہ ڈورے، وہ مری مستیِ مرحوم

وہ ابروئے خمدار، کماں تانے ہوئے سے
وہ گیسوئے پُرپیچ یونہی بکھرے ہوئے سے

شاداب وہ بام و در و گلزار و بیاباں — گل چاک گریباں، چمن آغوش بداماں
وہ رنگ جسے دیکھ کے کُندن بھی ہو نادم — وہ نور کہ جھک جائے سرِ مہرِ درخشاں
مہکا ہوا وہ پیکرِ رنگین و معطر — دہکا ہوا وہ قامتِ گلزار بداماں
وہ چمپئی رُخ، اُس پہ پسینے کی وہ بوندیں — وہ گوہرِ رخشاں، وہ مرا جوہرِ عریاں
شبنم کے وہ قطرات وہ پارے کی سی ٹکڑے — پتوں پہ کنول کے کبھی قائم کبھی لرزاں
ہونٹوں میں وہ برسات کی بجلی کا خزانہ — آنکھوں میں شبِ ماہ کا وہ موسمِ خنداں
ہر وقت وہ ہونٹوں میں تبسم ہی تبسم — جیسے ہو چمن زار میں جگنو سی چراغاں
رہ رہ کے تبسم میں ترنم ہی ترنم — ہالو[1] ہو چناروں میں کوئی جیسے غزلخواں
گاتی ہوئی وہ مدبھری آنکھوں کی سیاہی — آفاق میں جیسے کوئی مستانہ ہو غزلخواں
بوٹا سا وہ قد، آہ وہ اک شمع فروزاں — پرتو سے در و بام پہ ہوتا تھا چراغاں
ہنستی ہوئی بجلی وہ چمکتی ہوئی بجلی — گلشن میں چراغاں کبھی صحرا میں چراغاں
آواز، وہ آواز کہ ہر ساز سے آزاد — خود نغمہ و خود بربط و خود سازِ غزلخواں
معصوم وہ وارفتگیٔ حسن کا عالم — دامن کا نہ کچھ ہوش، نہ احساسِ گریباں
اللہ رے مری فطرتِ مجنوں کا وہ بچپن — کانٹے کبھی دامن میں تو کانٹوں میں گریباں

[1] وادیٔ کشمیر کا ایک مغنی کیڑا جو چنار کے درختوں میں ہر وقت گاتا رہتا ہے۔ ساغر

وہ چال کہ دَورِ مے و ساغر بھی خجل تھا — وہ حال کہ بدمست تھا میخانۂ امکاں
اِک سلسلۂ لغزشِ مستانۂ پیہم — ہر گام پہ جنبش میں خمستان کا خمستان
کیونکر ہو تصور مجھے نازک کمری کا
جھونکا تھا تخیل میں نسیمِ سحری کا

سومنہ[۱]

وہ سومنہ اور سومنہ کی مست فضائیں — وہ کھیت وہ میدان، وہ سرشار گھٹائیں
"وہ باغ میں انگریز کی افواج کے ڈیرے — بندوق لئے بھیل کے اطراف میں پھیرے
وہ پٹیاں، وہ وردیاں، وہ پرچمِ جنگی — الجھی ہوئی ہر شاخ سے آوازِ فرنگی
وہ بدکے ہوئے بیل وہ سہما ہوا دہقاں — اور سایہ میں کیکر کے وہ اک طفلِ پریشاں
وہ خوفزدہ کھیت میں معصوم دلاری — آنکھوں میں لرزتی ہوئی کاجل کی دھاری
وہ پیچ و خمِ راہ میں رہگیر گریزاں — وہ سمٹے ہوئے خوف سے ذرّات پریشاں
وہ شاہرہِ عام پہ ٹھٹکے ہوئے آمی — چہروں پہ وہ تاریکیٔ ایقانِ غلامی"

---

[۱] گھوارۂ طفلی شاہراہ اعظم پر ضلع علی گڈھ کا ایک چھوٹا سا گاؤں

لہ جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزی فوج ہندوستان میں بہت کم رہ گئی تھی۔ عسکری تشہیر کے طور پر حکومت ہندوستانیوں کو مرعوب کرنے اور اپنی عسکری طاقت کے مظاہرہ کے طور پر اس باقی فوج کو ہندوستان کے دیہاتوں میں گھما رہی تھی۔ سومنہ شاہراہ اعظم پر ایک گاؤں ہے مجھے فخر ہے کہ اس کے ایک دیہاتی مکان میں میرا بچپن گذرا ہے اور اس کے سرسبز و شاداب میدانوں میں میں نے زندگی کا بہترین موسم گذارا ہے، سومنہ میں بھی فوجوں کا پڑاؤ ہوتا تھا۔ یہ بند اسی عہد و منظر سے تعلق رکھتا ہے۔ اور فوجوں کو دیکھ کر جو اثر میرے دل پر پڑا تھا اسکو میں نے اس بند میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے

ساغر

"وہ جھیل پہ بندوق کے چلنے کا دھماکہ ۔۔۔ وہ چرخ سے مرغابیٔ مجروح کا گرنا
ہر لمحہ وہ ہر روح پہ اک ضربِ غلامی ۔۔۔ ہر آن وہ صد وسوسۂ قلبِ غلامی
وہ شور اُٹھا گاؤں پہ آئی وہ تباہی ۔۔۔ وہ آئے سپاہی ارے وہ آئے سپاہی
اس شور پہ گھر سے مرا گھبرا کے نکلنا ۔۔۔ قبضے سے نواحی کے وہ بل کھا کے نکلنا
وہ قلبِ عساکر میں مرا جان کے جانا ۔۔۔ خال و خطِ آفات کو پہچان کے جانا
اللہ رے مرے جذبۂ آزادی کی طفلی ۔۔۔ چینی کے کھلونے نظر آتے تھے فرنگی

بیباک تھا کس درجہ مرا ذوقِ تماشا
جنگل تھا کہ مجھے آئینۂ شوقِ تماشا" ـــــــــــ !

وہ سومنہ، وہ سومنہ کی مست فضائیں ۔۔۔ وہ کھیت، وہ میدان، وہ سرشار گھٹائیں
وہ مور کی چیخ اور وہ گھنگور گھٹائیں ۔۔۔ وہ معبدِ فطرت کے پجاری کی صدائیں
جھاڑی میں وہ شاما کے ترنم کا تلاطم ۔۔۔ رقاصۂ فطرت کے وہ گھنگرو کی صدائیں
کوئل کی وہ کوک، اور پپیہے کی وہ پی ہو ۔۔۔ اک جانِ حزیں اُس پہ بلاؤں پہ بلائیں
وہ جھونپڑے بنسے پھونس کے چکی کا ترنم ۔۔۔ جھیلوں کے کنارے وہ ٹیری کی نوائیں
بیلوں کے گلے اور وہ بجتی ہوئی گھنٹی ۔۔۔ کاندھوں پہ وہ ہل اور وہ کسانوں کی صدائیں
ٹھہرے ہوئے پانی میں وہ چڑیوں کا نہانا ۔۔۔ چھائی ہوئے کہری میں وہ ٹھٹھری ہوئی گائیں
وہ مسکنِ جمیا وہ مرا مامنِ طفلی ۔۔۔ ڈھلتی تھی جہاں حسن و محبت کی ادائیں
وہ گھر میں جمن[1] کے کبھی آنکھ مچولی ۔۔۔ چمپا[2] کے مکاں پر وہ کبھی پریم سبھائیں

[1] گاؤں کا ایک لڑکا ہم جماعت [2] ہم سایہ لڑکی

وہ چاروں طرف کنواریوں کا مجمعِ رنگیں | دوشیزہ جوانی کبھی دائیں کبھی بائیں

چمپا کا تقاضہ کہ اُجالا ہے ابھی تو | کچھ پھول سرس کے چلو ہم چن کے لائیں

چوٹی پہ سرس کے جو یہ تارے سے ہیں روشن | یہ پھول بھی مل جائیں تو اک ہار بنائیں

وہ ہار جو دنیا میں نہ گوندھا ہو کسی نے | وہ ہار جو گندھ جائے تو پھر تم پہ چڑھائیں

سایہ میں سرس کے وہ مجھے بھینچ کے کہنا | اس وقت گلے ملکے کوئی گیت ہی گائیں

بالوں کی لٹیں چوم کے وہ چھومنا اس کا | اور جھوم کے لینا وہ مرے سر کی بلائیں

پھر شام کے پردیسی وہ تاروں کی گذارش | گر ہم کو اجازت ہو تو ہم بھی چلے آئیں

پھر چاند سے رہ رہ کے شعاعوں کی سفارش | اس نسل کو ہم نور کی دنیا میں بسائیں

اس عمر کے انساں کو کریں دائم و قائم | اس عمر کے آدم کو خدا اپنا بنائیں

وہ چاند وہ گلبار سرس اور وہ ستارے
وہ ریت میں معصوم محبت کے طرارے[۵]

ساغر

۵؎ یہ میری ایک طویل نظم کے ابتدائی بند ہیں [illegible] فتح پور [illegible] میاں [illegible]
ہیں [illegible] اس نظم کا محل وقوع [illegible] کا تعلق ہے
[illegible] چمپا [illegible] سرس [illegible] حقیقی [illegible]
[illegible] حقیقی [illegible]
[illegible]

ساغر

لارڈ کلائیو کے سیاہ کارنامے

ہندوستان پر برطانی تسلّط کی کہانی کا ایک ابتدائی مکرُوہ ورق

(از سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی)

"مغرب مشرق پر اور انگلستان ہندوستان پر کس طرح غالب ہوا؟ یہ سوال جب مغربیوں سے کیا جاتا ہے ـــــــ تو وہ مشرق کی داخلی وسیاسی کمزوریوں کا سہارا لیکر اپنی تہذیب اور سیاسی اہلیت کا ڈھول پیٹتے ہیں گویا مشرق اسکا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسکو یورپی سیاسیین اور حکمائے مغرب اپنی آغوش عافیت میں لے کر زندہ رہنے کے قابل بنادیں اور یورپ اسکا واحد اجارہ دار ہے کہ وہ مشرق کے ہر ملک کو منظم کرے اور مہذب بنائے ـــــــ

ـــــــ مگر تاریخ کے دبے ہوئے گوشوں کو اگر کھولا جائے اور پوشیدہ اوراق کا تجزیہ کیا جائے تو ہم کو حقیقت معلوم ہوسکتی ہے۔ کہ یورپ کے اقتدار و ترقی کے بانیوں نے کس کس طرح مشرق پر اپنا تسلط قائم کیا اور اس عہد میں انسانیت اور صداقت کو کسطرح کند چھری سے ذبح کیا گیا

سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی نے جنکی بلند ذوقی، خوش مذاقی اور علمی ادبی حیثیت محتاج تعارف نہیں (کہ ہمیشہ تعارف ان کا محتاج رہتا ہے) یہ مضمون تحریر فرماکر ایک رازِ سربستہ کو عریاں کیا ہے یقیناً یہ تاریخی ادب کی ایک بڑی خدمت ہے، ایشیا اور سید محمد یحییٰ صاحب کا سمبندھ ایسا نہیں ہے کہ تعلق کی عصمت کو شکریہ ادا کر کے مجروح کیا جائے۔ ان کا شکریہ ادا کرنا بھی ہم ایک نوع کی خودستائی تصور کرتے ہیں۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو ــ کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

آغاز

وائے بر سادگیٔ ما کہ فسونش خوردیم
رہزنے بود کمیں کردہ رہِ آدم زد

فضائے بسیط میں جو آوازیں محفوظ ہیں اگر بعض انسانی اختراع کا کوئی عمل آج گویا بناسکے تو تاریخ کے بہت سے مسلمات جن پر قرنیں

فخر کرتی رہتی ہیں نہ صرف مسلمات کے درجہ سے گرا دیئے جائیں بلکہ بہت سے "ایماندار" خائن، اور بہت سے بہادر بزدل ثابت ہوں گے۔ قوم پرست اور وطن پرور مورخین نے اپنے اپنے قومی ابطال کے چہروں پر جو نقاب ڈالدیا ہے اس سے دنیا عجیب و غریب مغالطوں میں پھنس گئی ہے۔ چنانچہ ہر اس انسان کو زبردست شخصیت تسلیم کر لیا جاتا ہے جس نے کسی نہ کسی طرح کامیابی حاصل کر لی ہو اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی انسان کو ہیرو تسلیم کرنے سے قبل اس کے کیرکٹر کی چھان بین کی جائے یا ان ذرائع اور وسائل کو تلاش کیا جائے جو اس کی کامیابی میں مدد معاون ہوئے۔ بہرطور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مورخین کے ایک زبردست گروہ نے صحیح حالات اور حقیقی واقعات کی پردہ پوشی اس طرح کی ہے گویا یہ ان کا قومی اور وطنی فرض تھا خصوصًا ہندوستان کے آخری دور کی تاریخ کی تدوین جن اصولوں پر کی گئی ہے وہ ہرگز اس فلسفۂ تاریخ سے دور کی بھی مناسبت نہیں رکھتے۔ جن کا پیشِ نظر رکھنا ہر دیانت دار مورخ کیلئے ضروری ہے، ہندوستان کی تاریخ میں انگریز مورخین نے سیاسی مصلحتوں کو مدِّنظر رکھ کر جو کتر بیونت کی ہے اس کا ایک اہم نتیجہ تو یہ ہے کہ اس ملک کی دو زبردست قوموں میں کسی نوعیت سے بھی مفادِ مشترکہ اور وحدتِ قومی کا خیال مؤثر طریق پر جاں گزیں ہونے کیلئے تیار نہیں معلوم ہوتا۔ ہر چند کہ بعض محققین نے بارہا اس قسم کی کوششیں کی ہیں کہ ان تاریخی مغالطوں اور ماضی کے بے بنیاد فسانوں کو قوم کے دل و دماغ سے خارج کر دیں لیکن جب ہر نسل یکے بعد دیگرے دورِ تعلیم کے مختلف مدارج میں سیاسی مورخین کی کتابوں کو رٹ لینے اور یقین کر لینے پر مجبور کی جائیگی تو ظاہر ہے کہ کسی محقق کی تحقیق اور کسی ایماندار نقادِ تاریخ کا تبصرہ اول تو اس تک پہونچیگا نہیں اور پہونچ بھی گیا تو عہد طالب علمی کے پختہ یقین میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

ہندوستان میں برطانی تسلط قائم کرنے والے چار اشخاص تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لارڈ کلائیو بانی اول جس نے برطانی اثر و اقتدار کو تمام مشرقی ساحل پر مدراس سے لیکر کلکتہ تک قائم کیا، دوسرے اور تیسرے نمبر پر "ولزلی" اور لارڈ ہیسٹنگز "کے نام آتے ہیں۔ انھوں نے مرہٹہ قوت کو پاش پاش کر دیا اور ہندوستان کے وسطی حصے و نیز جزیرہ نمائے دکن کے مغربی ساحل کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں کیا، چوتھا دور لارڈ ڈلہوزی کے نام سے مشہور رہی، اس گورنر جنرل نے نہ صرف گذشتہ فتوحات کو منظم اور منضبط ہی کیا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات کی وسعت کو دریائے سندھ کے ساحل تک پھیلا دیا۔

دیکھنا یہ ہے کہ انگریز مورخین کا یہ دعویٰ کس حد تک صحیح ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی محض ایک تجارتی ادارہ تھا اور اس کے وہم و گمان میں بھی ہندوستان کا فتح کرنا نہ تھا۔ ممکن ہے کہ سنہ ۱۶۰۰ء سے لیکر مغل بادشاہی کے انحطاط تک انگریزوں کی پالیسی محض تجارتی سرگرمیوں تک محدود رہی ہو۔ اگرچہ تاریخی شہادتیں اس قسم کی موجود ہیں کہ عین اس وقت جبکہ سلطنت مغلیہ کا آفتاب نصف النہار پر تھا، بعض سر پھرے انگریز تاجروں نے سر زمین ہندوستان پر اپنا قبضہ اور ملکیت قائم کرنے کیلئے بارہا ناکام کوششیں کیں لیکن مغلوں کی زبردست قوت کے مقابلہ میں کچھ پیش نہ چلی جونہی مغلوں کا چراغ ٹمٹمانا شروع ہوا کہ ان بدیشی سوداگروں نے بھی یکایک تاجرانہ چولا اتار کر پھینکدیا اور ملکی سیاسیات میں علانیہ اور خفیہ حصہ لینے لگے۔ فرانسیسی اثر و نفوذ کو ملیامیٹ کرنے کے بہانے سے انگریزوں نے ملکی ریاستوں میں جس طرح نفاق کا بیج بو دیا وہ صحیح تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ ثبت رہیگا، بنگال میں نواب سراج الدولہ کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا محض تاجرانہ سرگرمیوں کے نام سے منسوب نہیں کیا جا سکتا اسی طرح باوجود اس ادعا کے ڈائرکٹران کمپنی مداخلت کی پالیسی کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے اس زمانہ کی سیاست کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ملیگا، جہاں انگریزوں نے بنیادی طور پر ممالک ہند پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ لیکن انگریز مورخین کا قلم اس خلافِ حقیقت واقعہ کو بار بار دہراتا رہتا ہے۔ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے صرف اپنی فیکٹریوں کی محافظت میں ہتھیار اٹھائے۔ حالانکہ دکن کی آویزشیں بہ بانگِ دہل اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ آرکاٹ کا محاصرہ، نواب محمد علی کی حمایت اور نظام حیدرآباد سے ساز باز اس تحریک جوع الارضی کی صدائے بازگشت تھی۔ جسمیں یورپین قومیں خصوصًا انگریز اور فرانسیسی اٹھارہویں صدی کے نصف کے بعد از سرتاپا منہمک ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب یورپ

میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مابین جنگ چھڑی، اس کے شعلے ہندوستان تک پہونچے اور یہاں کے امن و عافیت کو جلا کر خاک کر دیا۔ حقیقتاً یوروپین اقوام کی استعماری پالیسی تاریخ کے ان خونچکاں شہادتوں میں کارفرما تھی "توسیع انگلستان" پر ایک انگریز نقاد جے۔ آر۔ سیلے رقمطراز ہے

"یہ بیان جو اکثر پیش کیا جاتا ہے، اور جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کا بعجلت مطالعہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ برطانی سلطنت محض سوداگری کی اندھا دھند توسیع کا نتیجہ ہے اتنا ہی غلط ثابت ہوا ہے جتنا یہ بیان کہ ہماری سلطنت بیدریغ جارحانہ عسکریت کا حاصل ہے"۔ . . .

"برطانی ہند کے اس انقلابی اور مجرمانہ دور میں (یعنی جب سلطنت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی)۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے قدم محض لوٹ کھسوٹ کے جذبات کی بنا پر آگے کی طرف اٹھے تھے۔ اودھ، روہیلکھنڈ اور بنارس میں وارن ہیسٹنگز کی ظالمانہ کارستانیاں محض دولت جمع کرنے کی خاطر عمل میں آئیں، اگر برطانی ہند کی تاریخ مابعد بھی اسی نوعیت کی ہوتی تو بجا طور پر اس کی تشبیہ "پیرو" اور ہسپانیولا" میں ہسپانوی سلطنت سے دی جا سکتی تھی اور کہا جا سکتا تھا کہ ہماری سلطنت کلیتاً حصولِ دولت کی وجہ سے ظہور میں آئی ہے"۔

آگے چلکر یہی مورخ پھر لکھتا ہے:۔

"لارڈ ولزلی نے الحاق اور مداخلت کی پالیسی کو پہلے پہل نافذ کیا، اسی نظریہ کو لارڈ ہسٹنگز نے اختیار کیا، اگرچہ وہ گورنر جنرل کے عہدہ پر مامور ہونے سے قبل اس کا مخالف تھا۔ کچھ عرصہ بعد کمپنی کے آخری گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے تشدد اور تعصب کے ساتھ اسی حکمت عملی کو جاری رکھا۔ . . . کمپنی نے لارڈ ولزلی کے نظریہ کی مخالفت کی۔ لارڈ ہیسٹنگز کو اس کی پالیسی پر قابلِ ملامت ٹھہرایا۔ یہ نظریہ (الحاق و مداخلت) اکثر شدید سخت گیری کے ساتھ عمل میں لایا گیا، لارڈ ڈلہوزی تاریخ میں فریڈرک اعظم سے مشابہت رکھتا ہے اور اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں جنھیں حق بجانب ثابت کرنا اتنا ہی دشوار ہے جسقدر فریڈرک اعظم کے اس تسلط کو جو اس نے سیلیشیا میں حاصل کیا یا جو طرزِ عمل تقسیم پولینڈ میں اس نے اختیار کیا، لیکن یہ تمام اعمال اگر انھیں جرائم کہا جائے تو ہوا و ہوس کے جرائم کہنا ہوگا لیکن ایسی ہوا و ہوس جس میں خودغرضی شامل نہ تھی۔ نہ ڈلہوزی کے متعلق اور نہ کسی اور بڑے گورنر جنرل کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی یہ شبہہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ذلیل قسم کی خونخواری کے مرتکب ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سلطنت ہند کی بنیاد اگرچہ تجارت سے پڑی اور اس کے نتائج میں ایک چیز ہماری عظیم تجارت بھی ہے۔ تاہم اس کا خاکہ نہ تو سوداگروں نے کھینچا تھا اور نہ اس کی غرض و غایت تجارت تھی"

مندرجہ بالا اقتباسات و نیز ان تاریخوں سے جو تنقیدی شان رکھتی ہیں پہلی بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ سلطنت ہند کا ظہور و قیام کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا بلکہ انگریز قوم کی آمد کے ایک صدی بعد ہی سے مدبّرین برطانیہ نے ہندوستان کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ چنانچہ باوجودیکہ سوداگرانِ کمپنی ہمیشہ الحاق و مداخلت کی پالیسی کی مخالفت کرتے رہے لیکن اسی کمپنی کے گورنر جنرل بڑی دلیری کے ساتھ یکے بعد دیگرے مغلیہ سلطنت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو شاہ انگلستان کے زیر فرمان مجتمع کرنے میں بیدریغ چالاکیوں، عیّاریوں اور ظلم و تعدّی کو اپنا لائحہ عمل بنائے رہے، دوسری بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستان میں برطانوی مفاد کو ترقی دینے میں اور قیام سلطنت کی خاطر ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل صاحبان نے ڈائرکٹران کمپنی کے علی الرغم ہر اس ذریعہ کو جائز سمجھا جو ان کی استعماری پالیسی کو کامیاب بنا سکتا تھا اور اگرچہ انگریزی تاریخوں میں یہ ڈھونگ رچایا گیا ہے کہ جن گورنر جنرل صاحبان نے ہندوستان میں جا و بیجا مظالم کئے اس کا مواخذہ قوم انگریز نے بڑی غیر جانبداری کیساتھ کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں لارڈ کلائیو سے لے کر ڈلہوزی تک جو جو جگر خراش مظالم اور جیسی جیسی شرمناک عیاریاں تاریخ کے صفحات سے اخذ کی جا سکتی ہیں، ان کی پردہ پوشی نہ صرف مورخین کے قلم ہی سے عمل میں آئی ہے بلکہ مدبّرینِ سیاست اور عدالت کے ججوں کی سیر چشمی کو بھی اس میں کافی دخل ہے۔ وارن ہسٹنگز کا تاریخی مقدمہ اس بیان کی ناقابلِ تردید شہادت ہے، برک اور شیریڈن جیسے نخر روزگار خطیبوں کی وکالت، بیگمات اودھ کی تباہ حالی کی فریاد پر قوم برطانیہ کی سب سے اعلیٰ عدالت کو متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہوئی، یہ وہ قوم تھی اور اس قوم کے فاضل جج صاحبان تھے جو عورت کی تعظیم و احترام کو اپنا جزو ایمان سمجھتے تھے لیکن ان کی رگِ حمیت کو ایشیا کی بیکس خواتین کی سچی داستان

مظلومی حرکت میں لانے سے بالکل قاصر رہی۔ اس قسم کی نسلی عصبیت اور قومی امتیاز تاریخ برطانیہ کے ہر صفحہ سے نمایاں ہے۔

برطانی ہند کی تاریخ کا بانیٔ اول لارڈ کلائیو سمجھا جاتا ہے۔ ۱۷۴۴ء کے اختتام پر وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں بحیثیت محرر داخل ہوا۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ اس شخص کا عہدِ طفولیت جن لغویات اور حشر سامانیوں میں گذرا اس کا اندازہ صرف اس چیز سے ہوسکتا ہے کہ لارڈ کلائیو طالب علمی کے زمانہ میں نہایت رکیک الحرکات اور اعلیٰ درجہ کا شیطان لڑکا تھا۔ اس کے اُستاد اس کی شرارتوں سے کانپتے تھے۔ مدرسہ میں جہاں کہیں دنگا فساد ہوتا کلائیو کا ہاتھ ...... اسمیں ضرور شامل ہوتا تھا۔ زیادہ تر تنازعات کا بانی اور سرغنہ خود کلائیو ہی ہوتا تھا۔ یقیناً ایسا شخص ہر کام میں دلیر ہوتا ہے لارڈ کلائیو عہدِ طفلی سے ہی دلیر اور آزاد طبع واقع ہوا تھا۔ اسکی سیرۃ کی ممتاز خصوصیات دو ہی تھیں۔ اول دلیری اور جرأت دوسرے نافرمانبردار طبیعت ضمیر اور اسکی صلاح کاریوں سے کلائیو نے کبھی تعلق نہ رکھا۔ اس کی فرہنگ میں اس لفظ کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ بالفاظ دیگر کلائیو ایک خود رو شخصیت تھی جس کے غیر تربیت یافتہ قوی اور ناتراشیدہ دل و دماغ میں حیوانیت کے عناصر بوجہ اتم موجود تھے، حرص و ہوا، عیاری و چابکدستی، بیخوفی و جرأت اور سب سے زیادہ انانیت اس کی عملی زندگی کے ہر گوشہ سے جھلکتی ہے۔ ایسے فطری رجحانات کا انسان یقیناً برطانی سلطنت ہند کی خشتِ اول رکھنے کیلئے موزوں ترین شخص ہوسکتا تھا، اور اگر ہماری آنکھیں ان دلخراش واقعات کو دیکھتی ہیں جو اس دورِ غارتگری میں قدم قدم پر ملتے ہیں تو اس کا حقیقی سبب بتانے کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ " تاجرانِ فرنگ " کے اس معصوم قافلہ " کا میر کارواں رابرٹ کلائیو تھا۔

رہزنی را کہ بنا کرد، جہانبانی گفت
ستمِ خواجگی او کمرِ بندہ شکست

بہر کیف اس طبیعت اور سیرۃ کا انسان ۱۷۴۴ء کیں آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کا محرر بن کر ہندوستان کی کایا پلٹ کرنے کے لئے ساحلِ مدراس پر قادم رنجہ ہوا۔ مغلوں کی مرکزیت اورنگزیب کے انتقال کے بعد ہی سے روبہ تنزل تھی۔ مرہٹوں اور صوبائی حاکموں نے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد پہلے ہی سے تعمیر کرلی تھی۔ مغربی اقوام کی تاخت و تاراج کیلئے میدان بالکل خالی تھا۔ لیکن یہ تاخت و تاراج عسکریت اور قوائے جسمانی کے بل بوتے پر اتنی نہ تھی جسقدر قوائے دماغی اور فطرتِ مغربی کو اس میں دخل تھا، رومتہ الکبریٰ کا زرّیں اصول " پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو " اقوام مغربی کے صحیفۂ سیاست کی بنیادی آیت رہبری بن چکا تھا۔ اس ہتھیار کو لیکر سوداگروں کی کمپنی کا ایک معمولی محرر آگے بڑھا۔ بڑی بے جگری کے ساتھ آرکاٹ کے محاصرہ میں اپنے کمالات دکھلائے، تنظیم افواج کی کمانداری کا سکہ اپنے ہمعصروں پر بٹھایا، ہر شخص کو یقین تھا کہ لارڈ کلائیو کے عزم مصمم کو مشتعل شعلوں کا مواج سمندر بھی روک نہیں سکتا، بنگال کی سرزمین پر امید کی ایک کرن عرصہ سے جھلملا رہی تھی، ہندوستان کے مضمحل قویٰ میں علی وردی خاں کا پوتا سراج الدولہ سب سے پہلے اس بدبختی سرزمین کے نشتر کا شکار بننے کے لئے قدرت کی طرف سے انتخاب کیا جاچکا تھا، غالباً اس وقت اس صوبیدار کے دربار میں ہی سب سے زیادہ نمک حراموں کا جمگھٹ تھا، بہر کیف مغربی دماغ کی کاوش نے کال کوٹھری کا افسانہ تیار کیا۔ اٹھارہ فٹ مربع کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں ۱۴۵ مرد اور ایک عورت جسمیں افسران بھی تھے بے رحمی کے ساتھ ٹھونس دیئے گئے ...... اگر ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ اتنی تھوڑی سی جگہ میں ۱۴۵ لمبے چوڑے انگریز کیونکر سما سکتے تھے۔ تو اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ روایت میں درایت کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ انگریز مورخین کے مضحکہ خیز مسلمات کا ایک نادر المثال نمونہ ہے، رابرٹ کلائیو اپنے تمام فطری اوصاف سے آراستہ اس عضو ضعیف کو کاٹ کر پھینکدینے کے لئے منتخب کیا گیا۔ سرزمین پلاسی پر پہلی اور مختتم جنگ لڑی گئی۔ میر جعفر اور اس کے ہمنوا سینکڑوں نمک حراموں نے کلائیو کے ہاتھوں کو مضبوط کردیا تھا۔ امین چند کی دلالی کا واقعہ اور اس کا عبرتناک انجام طلبار تاریخ سے مخفی نہیں۔ سچ ہے جو یہوں کا نہیں ہوتا اس پر بیگانے بھی اعتبار نہیں کرتے۔ کلائیو نے امین چند کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے متعلق ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے:

۶۸

" اس دوران میں کلائیو نے جو دست درازیاں کیں ان کے متعلق صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ انسان تھا لیکن اسکی بعض بداعمالیاں

اتنی مکروہ تھیں کہ جن کی وجہ سے اس کی زندگی پر مستقل داغ لگ گیا۔ امیر البحر واٹسن کا نام اقرارنامہ پر خود لکھدینا ایسا جرم تھا جسکا مقابلہ اگر اس مقصد سے کیا جائے جس کی خاطر اس جرم کا ارتکاب کیا گیا تو کچھ زیادہ بھاری جرم نہ ہوگا۔ یعنی بنگالی امین چند کو دھوکا دینا یہ سچ ہے کہ امین چند ایک بدمعاش اور دھوکہ باز شخص تھا جو یہ کہا کرتا تھا "کہ مجھے جتنا روپیہ دو گے اتنا ہی میں تمہارے راز طشت از بام کرونگا" لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہ تھے کہ کلائیو ایسے شخص کا مقابلہ اس کے ہی ہتھیاروں سے کرتا۔ اور فریب کاری کی اس پستی تک اتر آتا جسیں امین چند اور اس کے ہموطن بد طولیٰ رکھتے تھے۔ ایمانداری کے راستہ سے کلائیو کا الگ ہٹ جانا اس کا ذمہ دار غالباً وہ ماحول تھا جس میں وہ سانس لیتا تھا۔ لیکن یہ دھبہ باقی ہے۔ کسی قسم کی لیپا پوتی اسکو دور نہیں کر سکتی۔ اس کا اثر کلائیو پر اس زندگی میں بھی تھا اور آئندہ کبھی نہیں مٹیگا۔"

اس سے قطع نظر کہ امین چند کے ساتھ کلائیو کا سلوک افشائے راز کی دھمکی کی وجہ سے تھا یا محض اس روپیہ کو بچانے کیلئے جو امین چند کو حسب وعدہ دینا چاہئے تھا۔ یہ امر تو ظاہر ہوگیا کہ امین چند اور اس کے ہموطن اتنے جعلساز نہ تھے جتنا کہ خود کلائیو اور اس کے مشیر کار کار رہے حتیٰ کہ انگلستان کے وہ تمام ممبران پارلیمنٹ اور کمیٹی کے جج جن کے روبرو یہ واقعات پیش کئے گئے اور جنھوں نے کلائیو سے کسی قسم کا مؤاخذہ کرنے کی بجائے یہ سرٹیفکٹ اعطا فرمایا۔

"لارڈ رابرٹ کلائیو نے اپنے ملک کی قابل قدر اور عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں" اس سرٹیفکٹ کے متعلق برطانی پارلیمنٹ کے ایک ماہر نے لکھا ہے "اس قسم کا ووٹ تقریباً برات کے مترادف سمجھا جاسکتا ہے"۔ کم از کم اس سے یہ تو یقینی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کلائیو کو مجرم ٹھہرانے کے لئے تیار نہ تھے، تمام مقدمہ اس فیصلہ کے بعد ختم ہوگیا اور اس کے بعد کلائیو کو پارلیمنٹ کی طرف سے کسی قسم کا حملہ کا خوف نہ رہا۔

لیجئے تمام الزامات دُھل گئے، کلائیو کی ساری فریب کاریوں پر قومی خدمت کے صلہ میں پردہ ڈالدیا گیا گویا دوسروں پر ظلم کرنا اور ان کے مال و متاع کو لوٹ کر غاصبانہ قبضہ کرنا عظیم الشان قومی خدمت ہے۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جبکہ پٹ جیسے ایماندار حکومت انگلستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے جنگ پلاسی نے ہندوستان کی قسمت خدا جانے کتنے نامعلوم عرصہ تک کے لئے قوم انگریز کے رحم و کرم پر چھوڑ دی۔ لیکن ان لوگوں کا حشر بھی قابل یادگار ہے جنھوں نے اپنے پرانے آقاؤں سے بدعہدی کر کے کلائیو کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔ امین چند کا انجام تو معلوم ہی ہوگیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سازش کے سب سے بڑے مہرے یعنی میر جعفر کیساتھ کلائیو نے کیا سلوک کیا۔ سراج الدولہ کے قتل کے بعد صوبہ داری کے جلیل القدر منصب پر میر جعفر کلائیو کی مدد سے متمکن ہوا۔ لیکن ذرا بہ نظر غور اس قیمت کو بھی دیکھئے جو نئے تاجداروں کی دوستی اور قدیم حلیفوں سے نمک حرامی کرنے کے عوض میر جعفر کو ادا کرنی پڑی۔ سب سے پہلا کام جو جنگ پلاسی کے بعد میر جعفر نے کلائیو کے حکم سے انجام دیا۔ وہ۔ ان تمام خزائن پر قبضہ ٦٩ کرنے کے متعلق تھا جو سراج الدولہ کے مملوکہ تھے۔ چنانچہ حتی الامکان سراج الدولہ کی تمام دولت میر جعفر کے قبضہ میں آگئی۔ اب اُن مطالبات کو بھی بہ نظر غور ملاحظہ کیجئے جو نہ صرف کمپنی کی طرف سے بلکہ ملازمین کی جانب سے ذاتی حیثیت میں میر جعفر کے سامنے پیش کئے گئے۔ مسند نشین ہوتے ہی میر جعفر کو تجارتی مراعات اور انتقال اراضی کے علاوہ حسب ذیل نقد روپیہ بھی ادا کرنا پڑا۔

١۔ بطور تاوان کمپنی کو ۔۔۔ ۔۔۔ ایک کروڑ روپیہ

٢۔ " " باشندگان کلکتہ کو دس لاکھ "

٣۔ " " آرمینیوں کو سات " "

٤۔ " " بحری فوج کو ٢٥ " "

٥۔ " " بری فوج کو ٢٥ " "

٦۔ مسٹر ڈریک (گورنر کلکتہ) کو ٢ " ٨٠ ہزار "

۷۔ رابرٹ کلائیو ۲ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ

۸۔ میجر کل پیٹرک ۲ ״ ۴۰ ״ ״

۹۔ ایم۔ واٹس ۲ ״ ״ ״ ״

۱۰۔ مسٹر مشبیر ۲ ״ ״ ״ ״

اس کے علاوہ پرائیوٹ عطیات کا نمبر ہے جو غریب صوبہ دار کو دوستی کی پاداش میں خزانۂ عامرہ سے دینے پڑے ان کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

لارڈ کلائیو کو ۱۶[۵] لاکھ روپیہ

واٹس کو ۳ ״ ״

۶ ممبران کونسل کو ۶ ״ ״ (یعنی ایک لاکھ فی کس)

کلائیو کے سکریٹری مسٹر والش کو ۵ ״ ״

مسٹر اسکریفٹن ۲ ״ ״

لوشنگٹن پچاس ہزار ״

میجر اے گرانٹ ۱ ״ ״

ایسے بھاری مطالبات کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ خالی ہوگیا۔ میر جعفر کا وزیر مال راجہ دولاب رام تنگ آکر اپنی زمینداری میں گوشہ نشین ہوگیا۔ میر جعفر نے جن دولتمندوں سے روپیہ اینٹھنا چاہا وہ باغی بن گئے اور بالآخر کلائیو کی اُمید برآئی، وہ چاہتا تھا کہ میر جعفر اس قسم کی مشکلات میں گرفتار ہو کر دست سوال اس کی طرف بڑھائے تاکہ وہ ظاہری آزادی جو صوبہ دار کو حاصل تھی برائے نام بھی باقی نہ رہے، ایک انگریز مؤرخ اس حقیقت کو کس شوخ چشمی سے بیان کرتا ہے:۔

"کلائیو پہلے ہی سے اس چیز کو تسلیم کرچکا تھا کہ مشرق میں طاقت کا انحصار دولت کی فراوانی پر ہوتا ہے، اس لئے خزانہ خالی کردینے کے بعد میر جعفر ایک بھکاری کی طرح کلائیو کے پیروں میں گرنے پر مجبور ہوگا۔ وہ ہر پہلو سے حالات کا مطالعہ کرچکا تھا۔ دیسی حکومت کو جو کاری ضرب اس نے لگائی تھی اس سے سراج الدولہ جیسی مطلق العنان حکومت کا قائم رہنا ناممکن ہوچکا تھا۔ اس لئے یہ ضروری ہوگیا کہ آئندہ کے لئے دیسی حکمرانی کی نگرانی انگریز کریں۔ اور صوبہ دار کے ہاتھ میں برائے نام حکومت کی باگ ہو، میر جعفر نے خود کو اس کے ہاتھوں میں دیدیا تھا۔ کلائیو موقع کی تاک میں تھا۔ اس وقت اس نے اس معاملہ کو صاف کردیا کہ وہ خود حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے ...... نتیجہ یہ ہوا کہ معاملات اسی طرح طے ہوئے جس طرح کلائیو چاہتا تھا اور صوبہ دار کی مملکت پر انگریزوں کا تصرف اور بڑھ گیا۔" ۷۰

لارڈ کلائیو کے اوصاف میں انگریز مورخین کتنے بھی رطب اللساں کیوں نہ ہوں لیکن یہ دھبہ مٹائے نہیں مٹ سکتا کہ اس نے انتہائی بے ایمانی جعلسازی اور فریب کاری سے بنگال میں حکومت انگلشیہ کی بنا ڈالی۔ جتنی مہمات اس نے سر کیں، جتنے عہدنامے اس کے ذریعہ مرتب ہوئے سب میں مشرقی سادہ کاری و اعتماد اور مغربی پُرفریبی، عہد شکنی نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ جنگ پلاسی کے بعد لارڈ کلائیو کا ایک زبردست کارنامہ بادشاہ شاہ عالم کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ میثاق الہ آباد کے متعلق مختلف تاریخوں میں تفصیلات ملیں گی اور کہیں کہیں دبے ہوئے لفظوں میں

۵؎ یہ عطیہ جاگیر کے علاوہ تھا جو میر جعفر کی فیاضی نے کلائیو کو عطا کی تھی۔ اور جس کے سلسلے میں وہ سرکاری طور پر "لارڈ آف پلاسی" تسلیم کیا گیا۔ — ساغر

اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بادشاہ شاہ عالم دہلی سے ناکام و نامراد جب الٰہ آباد میں سکونت پذیر ہونے پر مجبور ہوا تو کلائیو کے دماغ میں کمپنی کی سرحدوں کو مضبوط کرنے کا سوال چکر لگا رہا تھا۔ نیز وہ اس قدیم توہم سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جو نام نہاد مغل بادشاہوں کی سرداری کے متعلق ہنوز ہندوستان کے ہر گوشہ میں پایا جاتا تھا۔ میثاق الٰہ آباد کے فوری اور خارجی اسباب کچھ بھی ہوں لیکن کلائیو کے دل میں یہ خیال تھا کہ اکبر اور اورنگ زیب کے مفلس و ناچار جانشین سے حکومت انگلشیہ کے جواز کا پروانہ حاصل کیا جائے۔ شاہ عالم کو ایک طاقتور حلیف کی ضرورت تھی جو دہلی کے تاج و تخت کو واپس دلا سکے، چنانچہ کلائیو نے فوجی امداد کا وعدہ کر کے میثاق الٰہ آباد پر شاہ دہلی کے دستخط ثبت کرائے شاہ عالم کو جس طرح دھوکہ دیا گیا اس کا بیان کسی تاریخ میں صراحتاً نہیں ملتا۔ لیکن ایک قلمی نسخہ میں جو غالباً ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اور بلا شبہ اصل ہے اس واقعہ کا ایک سچا پہلو دکھایا گیا ہے، حقیقتاً اس مضمون کا تعلق زیادہ تر اس قلمی نسخہ سے تھا۔ جس میں لارڈ کلائیو کے حقیقی کیرکٹر کو صرف ایک واقعہ سے صاف صاف کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام "شگرف نامہ" ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ اس خاص واقعہ کو تحریر میں لایا جائے "شگرف نامہ" کے مصنف اور اس کی تاریخی اہمیت کا بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"شگرف نامہ"

اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف حصّہ کے دوران طوائف الملوکی میں جبکہ ہر بوالہوس انقلاب روزگار اور ہنگام تشتت سے تمام ممکن فوائد و منافع حاصل کرنے پر تلا بیٹھا تھا اور کسی ایک شخص کو بھی اتنی فرصت نہ تھی کہ ملک کی بربادی اور بندگان خدا کی تباہ حالی کا تذکرہ اور صحیح صحیح واقعات آئندہ نسلوں کی عبرت کیلئے ایک جگہ جمع کر سکے، ایک شخص اعتصام الدین نامی ساکن باجتور ضلع ندیہ نے ترقیم حالات پر کمر ہمت باندھی اور چند صفحوں کے اندر اس راز کو آشکار کر دیا جو دولتِ انگلشیہ کے کارپردازوں نے بڑی ہوشیاری اور انگریز مورخین نے حیرتناک سبکدستی کے ساتھ مخفی رکھنا چاہا تھا۔ سببِ تالیف کتاب کے متعلق وہ خود لکھتا ہے۔

" عاجز را کہ بمقتضائے آب خور سفرِ ولایت انگلند اتفاق افتاد و واقعات و خصوصیات بحر و بر کہ بدید و شنید آمدہ داستانیست غریب بس شگرف در سینہ نگہدار و نبود و نہ بتحریر مقدسہ ...... چار و ناچار با حالات زار روزگار بطراز نامہ نادرہ کار دست رانگار بربست ...... چوں مقصد از اطلاع حالات بود و خالی از فوائد ہم نیست بعبارت پیچیدہ و لغات دقیقہ و استعارات و اصطلاحات کہ مشعر بر دراز نفسی و رنگینی کلام است نہ پرداخت ...... ایں مجموعہ کہ از قسم نوادر حالات دارد "شگرف نامہ ولایت" نام کردہ بر صفحۂ روزگار یادگار گذاشت۔

ع " غرض نقشے است کز ما یاد ماند"

۷۱

خدا معلوم کتنی مدت بعید سے یہ نقش جس کی یاد قائم رکھنے کی آرزو مؤلف نے مؤثر الفاظ میں ظاہر کی ہے زمانہ کی ناساعدت کے سبب نظروں سے اوجھل رہا لیکن جسطرح ہر چیز کا ایک نہ ایک زمانہ موافقت کا ہوتا ہے اسی طرح کیا عجب ہے کہ شگرف نامہ کے اظہار کا وقت بھی آپہونچا ہو اور انگلستان کے وہ چشم دید حالات جنھیں مولف نے بڑی احتیاط کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ ذخیرۂ معلومات میں قابلقدر اضافہ کا موجب بنیں۔ شگرف نامہ حقیقتاً انگلستان کے تمدن و معاشرت پر ایک سیاحانہ نظر تک ہی محدود نہیں بلکہ مؤلف کی دقت نظر اور عظیم قوت مشاہدہ نے زندگی کے ان تمام شعبوں کو بیان کیا ہے جو اٹھارویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف حصّہ میں قوم انگلشیہ سے تعلق رکھتے تھے اس شخص کی قوت تحقیق بھی اس دوران میں کافی سرگرم عمل رہی۔ بحری سفر میں سمندروں کے تموج، جزائر کے نوادرات بعض عجیب و غریب قوموں کے حالات، جہازوں کی تعمیر اور کل پرزوں کی معلومات، ہر چیز کو دیکھنا، غور کرنا، پرکھنا اور پھر سادہ لفظوں میں بیان کر دینا غرض تمام جزئیات کا مجمل تذکرہ اس شخص کی قادر الکلامی اور تحقیق و تدقیق کے ذوق و شوق پر زبردست دلیل ہے۔ شگرف نامہ کے اسلوب بیان اور سفر کے چیدہ چیدہ واقعات کا برمحل اور بلا مبالغہ بیان کرنا ظاہر کرتا ہے کہ مشرق کا ذہن مشاہدہ اور ادراک اشیاء میں کسی قوم سے پیچھے نہیں تھا بلکہ اس کی ذکی طبیعت باوجود ان تمام دشواریوں کے جو دوسرے

ملک کی زبان اور طریقوں سے عدم واقفیت کے سبب راستہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ حالات کے معلوم کرنے میں اپنے مغربی معاصرین سے کہیں زیادہ زود رس تھی۔

تالیف کتاب کا سبب مؤلف نے سفر انگلستان بیان کیا ہے۔ مقدمہ میں یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ سفر انگلستان اسے کیوں اختیار کرنا پڑا۔ سفر اختیار کرنے کا سبب ہی اس مضمون کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے اور اگرچہ خود مؤلف نے اس سبب کو ایک ضمنی واقعہ کے طور پر قلمبند کیا ہے لیکن یہی ضمنی واقعہ تاریخی اعتبار سے تمام شگرف نامہ کی جان ہے۔ لارڈ کلائیو کی عیاریاں اکثر و بیشتر معرضِ بحث میں آچکی ہیں اور ہندوستانی و نیز بعض فرانسیسی اور انصاف پسند انگریز مؤرخین نے بھی اس انگریز "ہیرو" کی شرمناک حرکات کا راز طشت از بام کیا ہے لیکن شگرف نامہ میں جس ذلیل حرکت کا بیان ہے غالباً وہ اب تک کسی کی نظر سے نہیں گذرا۔ اس واقعہ کی سچائی اور وزن و اہمیت پر اعتبار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ راوی کے حالات کا مجمل ذکر کیا جائے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ آیا اسکی پوزیشن اور صلاحیت اس درجہ کی تھی، اس کے بیان کو قابلِ اعتبار تسلیم کیا جاسکے۔ قوم انگریز سے اُسے کوئی تعصب تو نہ تھا؟ جو واقعات اس نے سپردِ قلم کئے ہیں وہ سنی سنائی باتوں پر تو مشتمل نہیں؟ کسی جگہ جذبات اور مبالغہ سے تو کام نہیں لیا گیا ہے

پوزیشن اور صلاحیت کا اندازہ ان عہدوں سے ہو سکتا ہے جو مؤلف کو مختلف اوقات میں ملتے رہے۔ عمل ناظمی جعفر علی خاں میں یہ شخص سرکار نواب کا میر منشی تھا۔ عمل قاسم علی خاں میں میجر پارک (ایسٹ انڈیا کمپنی) کی ملازمت اختیار کی۔ میجر پارک کی مراجعت انگلستان کے بعد چند ماہ تلاشِ روزگار میں افسران ایسٹ انڈیا کمپنی میں گھومتا پھرا اور بالآخر مسٹر واسترس (ڈنسٹیارٹ) کی سرکار میں بسر کردگی کپتان مکس صاحب بعہدۂ بخشی لشکر ممتاز کیا گیا۔ دوران جنگ میں قاسم علی خاں میں بھی انگریزوں ہی کا ملازم رہا۔ بعدہٗ مسٹر برڈ بیتھ صاحب کے ماتحت پرگنہ قطب پور کی تحصیلداری کے فرائض ایک سال تک انجام دیئے۔ مسٹر ونسٹیارٹ سے اس شخص کو جو عقیدت تھی وہ حسب ذیل الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے

"واسترس صاحب بسیار نیک ذات و عالی ہمت بود۔ بعد فوت آں صاحب یک ماہ آب از دیدہ جاری بود و تا یکسال آہ از دل می کشید و تا حال ہم ہرگاہ نامش بیاد می آید داغ دل تازہ می شود،،

نواب شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ سے بمقام جنگ بکسر جو لڑائی ہوئی اور جس میں نواب کو ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ مؤلف کتاب اس جنگ میں بملازمت مسٹر کارناک موجود تھا۔ اختتام جنگ پر میجر منرو کے ہمراہ لکھنؤ پہونچا اور پھر کارناک کے ساتھ روہیلکھنڈ چلا گیا۔ بمقام جہانگیر گڈھ شاہ عالم بادشاہ غازی سے شرف نیاز حاصل ہوا اور انھیں کی ملازمت کرلی۔

مندرجۂ بالا واقعات سے ہر ذی فہم شخص یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ اس شخص کو انگریز قوم سے کوئی تعصب نہ تھا۔ جن عہدوں پر وہ مامور کیا گیا۔ ان سے اس کی قابلیت اور صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض واقعات جو اس سفرنامہ میں اس نے درج کئے ہیں وہ عام تاریخی واقعات سے بہ تمام و کمال ملتے جلتے ہیں۔ جسکے معنی یہ ہوئے کہ اس نے حالات کے بیان کرنے میں دروغگوئی یا مبالغہ کو اختیار نہیں کیا۔ عبارت کا طرز بتاتا ہے کہ کہیں جذبات سے کام نہیں لیا گیا البتہ بعض اس قسم کے اشارے ضرور موجود ہیں جنھیں انگریز مؤرخین یا وقائع نگار سیاسی مصلحتوں کی بنا پر پوشیدہ رکھنے کے عادی ہیں۔

یثاق الہ آباد لارڈ کلائیو کا مایۂ ناز کارنامہ تصور کیا جاتا ہے لیکن اس کی سرگذشت شگرف نامہ کے الفاظ میں تاریخ عالم کی سیاہ ترین دستاویزات میں سے ہے۔ لارڈ کلائیو جب دوبارہ ہندوستان واپس آیا تو اس کے پیش نظر داخلی اصلاحات کے علاوہ کمپنی کی سرحد کو مضبوط کرنا بھی تھا، نواب وزیر اودھ جس کی سرحدیں کمپنی کے غلام صوبہ دار بنگال کی سرحدوں سے بہ سمت شمال و مغرب ملتی تھیں۔ اوّلاً انگریزوں سے برسر پیکار رہا لیکن باقتضائے حالات کلائیو سے صلح کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ نواب موصوف کے ساتھ قرار داد صلح پیش

پیش کی گئی۔ صوبۂ الہ آباد کے مداخل ۲۴ لاکھ روپیہ خرچ ملازمان شاہی کے لئے مقرر کئے گئے۔ باقی صوبۂ اودھ ایک کروڑ و پچاس لاکھ اور بنارس و غازی پور ضمیمہ ۱۵ لاکھ روپیہ نواب مذکور کے تصرف میں آئے۔ پچاس لاکھ روپیہ نقد برائے خرچ سپاہ لشکر کمپنی نواب شجاع الدولہ نے کئے۔ صلح نامہ لکھا گیا۔ دستخط و مواہیر کمپنی ثبت کئے گئے۔ لارڈ کلائیو نے نواب کے ہاتھ میں انجیل دی اور نواب نے مصحف مجید خود لیکر اور انجیل مقدس لارڈ کلائیو کو دیکر قرارداد صلح پر قائم رہنے کی قسمیں کھائیں۔ شاہ عالم نے سندِ نظامت بنام نجم الدولہ پسر جعفر علی خاں اور سند دیوانی بنگال، بہار و اُڑیسہ بنام کمپنی انگریز بہادر فرمان بادشاہی کے ساتھ لارڈ کلائیو کو عطا کی۔ یہ صلح نامہ ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۳ء میں لکھا گیا۔ شگرف نامہ میں لارڈ کلائیو اور شاہ عالم بادشاہ غازی کے درمیان جو آخری گفتگو ہوئی وہ بجنسہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

"لارڈ کلینوس (کلائیو) ثابت جنگ بہادر سندِ دیوانی بنگالہ و بہار و اڑیسہ بنام حاصل ساختہ و سندِ نظامت بنام نجم الدولہ پسر میر جعفر علی خاں از حضور تیار کنانیدہ رخصت خواست۔ حضرت ظل سبحانی در آنوقت آب در دیدہ گردانیدہ فرمود کہ تمام کار کمپنی خود را خاطر خواہ بانجام رسانیدند و اصلا بکار و خدمت ما بدولت و اقبال کہ عبارت از حاضر بودن سپاہ انگریزی بپائے رکاب تا جلوس تخت دہلی و انتظام ممالک محروسہ است نپرداختند والحال ما را از چہار طرف درمیان دشمنان در کمال امان گذاشتہ میروند۔"

لارڈ کلائیو کی بیک وقت سادگی و پرکاری اس جواب سے مترشح ہوتی ہے جو اس نے شاہ عالم کے رقت آمیز سوال پر دیا۔ ملاحظہ ہو۔

"لارڈ کلینوس و جنرل کارناک ازیں معنی خیلے متأثر و منفعل شدہ عرض رسانیدند کہ درباب سرراہی فوج انگریزی بدوں حکم بادشاہ (انگلستان) و عرضی کمپنی اقدام نمیتوانم نمود مگر آنکہ عرضی نمایم و ہرگاہ از ولایت فرمان رسد بسر انجام لشکر خواہم پرداخت، تا رسیدن جواب باصواب صلاح دولت آنست کہ خود بدولت در الہ آباد متمکن سریر دولت باشند.......... حضرت بدولت اقبال خاطر اقدس بجمع وجوہ مطمئن فرمودہ فدویان را در لوازم بندگی و اطاعت حاضر و غائب یکساں تصور فرمایند"

مذکورہ بالا عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میثاق الہ آباد مرتب ہونے سے قبل شاہ عالم کو یہ سبز باغ دکھایا جا چکا تھا کہ سپاہ انگریزی کی مدد سے تخت دہلی اس خانہ خراب کو واپس دلایا جائیگا۔ لیکن جونہی عہدنامہ تکمیل کو پہونچا کلائیو نے آنکھیں پھیر لیں اور ایک ایسا حیلہ پیش کیا جس کی تردید عالم بیچارگی میں شاہ عالم کی طرف سے ممکن نہ تھی۔ چنانچہ باتفاق رائے منیر الدولہ و راجہ شتاب رائے بہادر مطابق مرضی شاہ عالم ترسیل نامہ شاہی "بشاہ جم جاہ انگلستان" قرار پایا۔ نامہ شاہی کا منشا یہ تھا کہ سپاہ انگریزی بہ سپہ سالاری سرداران انگریز انتظام سلطنت مغلیہ کے لئے برائے امداد و اعانت و کمک عنایت کی جائیں۔ اس سے نہ صرف دونوں بادشاہوں کے درمیان ارتباط محبت و یگانگی میں استحکام ہوگا بلکہ بپاس محبت و اخلاص سندِ دیوانی بنگال و بہار و اُڑیسہ کمپنی بہادر کے حق میں حاصل ہو جائیگی۔ اس خط کے ہمراہ شاہ عالم نے ایک لاکھ روپیہ کی قیمت کے تحائف بھی شاہ انگلستان کے لئے ارسال کئے۔ اس خط کو لارڈ کلائیو نے کلکتہ پہونچ کر باتفاق جنرل کارناک و کپتان سوئٹن و جارج نسترٹ و نواب منیر الدولہ و راجہ شتاب رائے بے اطلاع کونسلیان دیگر باغ دمدمہ میں مکمل کیا۔ مہر شاہی لگائی گئی اور خریطہ نامہ ہمایوں کپتان سوئٹن کے حوالہ کیا گیا۔ کپتان مذکور برسم رسالت "از طرف بادشاہ عالم پناہ ہندوستان" بطرف شاہ ولایت انگلستان مع تحائف ایک لاکھ روپیہ روانہ کئے گئے۔ ترقیم و ترسیل نامہ کے دوران میں مؤلف شگرف نامہ خود موجود تھا اور شاہ عالم کا منشا یہ تھا کہ کپتان مذکور کے ہمراہ ایک منشی بادشاہ ہندوستان کا ہونا ضروری ہے تاکہ سیاق کلام اور مقصد نامہ و پیام کی تشریح باحسن وجوہ کر سکے

اس لئے طے پایا کہ مولف شگرف نامہ ہمراہ جائیں۔ مولف مذکور کپتان کے ہمراہ جہاز سے ولایت کو روانہ ہو گئے۔ ایک ہفتہ کی راہ طے کرنے کے بعد کپتان نے جو مولف سے کہا وہ خود اس کے الفاظ میں سنئے :۔

"نامۂ بادشاہ را لارڈ کلینوس (کلائیو) از من کپتان گرفتہ فرار کردہ وگفت کہ تحائف مرسلہ حضور (شاہ عالم) از بنارس نرسیدہ صرف نامۂ شاہی را ہمراہ بردن قرین صلاح نباشد سال آئندہ نامہ معہ تحائف ہمراہ من (یعنی کلائیو) خواہد رسید .... بندہ (مولف) بمجرد استماع ایں کلام ہوش از سر رفت و یقین دانست کہ عذر ایں معنی بے علت نخواہد بود۔ مآل کار چندیں محنت و مشقت سفر پُر خطر بہ بیجا حاصلی و ناکامی خواہد کشید۔ اگر ازیں پیشتر می دانستم اقدام بریں کار نمی نمودم .... بعد شش ماہ در ولایت انگلستان داخل شد۔ ازاں تاریخ تامدت بودن آنجا گاہے خاطر پراگندہ ام نگزید۔ چوں در افشائے ایں راز مناہی کپتان مذکور بتاکید تمام بود شگرف حالتے رُو دے نمود کہ نہ یارائے گفتن داشت نہ طاقت صبر"

غالباً قارئین یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہونگے کہ بالآخر نامۂ شاہی اور ایک لاکھ روپیہ کے تحائف کا کیا حشر ہوا۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"القصہ تا یکسال و شش ماہ در انتظار نامہ حضور پُر نور توقف بعمل آمد۔ چوں لارڈ کلینوس (کلائیو) در ولایت رسیدہ برائے پیش آمد خود تحائف مرسلہ حضرت قبلہ عالم را بنام خود بخدمت ملکہ بادشاہ انگریز گذرانیدہ، مورد مراحم سلطانی گردید وذکر نامہ و پیام حضرت قبلہ عالم ممدوح اصلاً در میان نیاورد۔ کپتان مذکور ہم ازیں معنی لب بہ سخن آشنا نساخت زیرا کہ کپتان مذکور براعتماد قول و عہد لارڈ کلینوس و پاس قومیت و آشنائی لارڈ مذکور اعتماد تمام بہ خاطر داشت۔ یکبارگی از فریب لارڈ کلینوس مایوس شدہ با حقیر (مولف) گفت آنچہ شما خیال کردہ بودند در آئینۂ شہود صورت گرفت لارڈ کلینوس با من (کپتان) دغا کرد"۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

نامۂ شاہی کے اخفا کا سبب شگرف نامہ میں شرح و بسط کے ساتھ نہیں بتایا گیا۔ شاید وہ کماحقہ اس راز سے واقف نہ ہو سکا۔ البتہ اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ کاربرداران کمپنی اور متصدیان شاہی کے درمیان اخذ ملک بنگالہ کے سلسلہ میں تنازعہ ہو گیا تھا۔ شاہ عالم کا یہ خط اراکین سلطنت انگلستان کے حق میں حجت قوی اور دستاویز معتبر ثابت ہوتا۔ لارڈ کلائیو چونکہ کمپنی کا خیر خواہ تھا اس لئے یہ خط تلف کر دیا گیا۔

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس واقعہ کو ذرا غور سے مطالعہ فرمائیں۔ راوی ایک ایسا شخص ہے کہ جو خود تمام اسرار کا حامل ہے انگریز مورخین بھی کنایۃً یہ لکھ دیتے ہیں کہ شاہ عالم تخت و تاج دہلی کو واپس حاصل کرنے کیلئے خود انگریزی افسران سے مدد و اعانت کا طالب ہوا تھا اور یہ کہ حالات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس قسم کی امداد ایسٹ انڈیا کمپنی کے امکان سے باہر تھی۔ شاہ عالم کو جو وظیفہ کمپنی کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد بند کر دیا گیا اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شاہ عالم مرہٹوں کی حفاظت میں چلا گیا۔ سوال یہ ہے کہ شاہ عالم نے انگریزوں کی دوستی کو کیوں ترک کیا۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ لارڈ کلائیو اور اس کے ساتھیوں کی عیاری اور دغا بازی کا حال جب شاہ عالم کو معلوم ہوا تو برداشتہ خاطر ہو کر عالم یاس میں دوسرے لوگوں کی اعانت و ہمدردی قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے اور صفحات بھی مکر و دغا سے ایسے ہی سیاہ بنائے گئے ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شخص جو اس قسم کے جرائم کا مرتکب ہو "نیشنل ہیرو" کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ سرسری نظر سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ لارڈ کلائیو کا کوئی کیرکٹر نہ تھا۔

حصولِ مقصد کی خاطر وہ پست ترین دنائت کا اختیار کرنے میں پس و پیش نہ کرتا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک پر غلبہ و تصرف حاصل کرنے میں اس نام نہاد تجارتی کمپنی اور اس کے کارپردازان نے کیا کیا ستم توڑے ہوں گے۔ لیکن ان تمام حقائق کی روشنی میں بھی دزدانِ مغرب کی دلاوری کس قدر تعجب خیز ہے جو چراغ بکف دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کی سعی لاحاصل کرتے رہتے ہیں

ایک صاحب فرماتے ہیں :-

"سیزر نے اپنے وطن کی خاطر گال فتح کیا۔ ہانیبال نے تقریباً ۲۵ سال تک روما میں تہلکہ مچایا۔ ولنگٹن نے فرانسیسیوں کو اسپین اور پرتگال سے نکال باہر کیا۔ لیکن کلائیو کے کارنامے ان میں سے ہر شخص کے مقابلہ میں زیادہ شاندار تھے۔ اس شخص نے بحر اٹلانٹک کے چھوٹے سے جزیرہ کے لئے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنا ڈالی۔ .... لارڈ اسٹین ہوپ کی رائے میں وہ بڑا آدمی تھا۔ لیکن (حقیقتاً) وہ "بڑے آدمی" کے لقب سے بھی کچھ زیادہ کہلانے کا مستحق تھا۔ جولیس سیزر کی طرح اس میں بھی دو اوصاف متحد ہو گئے تھے، وہ ایک زبردست مدبر اور زبردست سپاہی تھا۔ تخیلی آدمی بھی تھا اور عملی بھی .... ایک جملہ میں اس کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ پیدائشی طور پر حکمراں تھا"

"کیوں نہ ہو؟ سراج الدولہ کے ہمراہیوں کو غلط وعدوں سے نمک حرام بنانے والا۔ امین چند کے ساتھ فریب کرنے والا۔ واٹسن کے دستخط بنانے والا۔ شاہ عالم کے خط کو اڑانے والا اور اس کے ایک لاکھ روپیہ کے تحائف کو بادشاہ بیگم انگلستان کی خدمت میں اپنی طرف سے پیش کر کے مورد مراحم سلطانی ہونے والا۔ اگر زبردست مدبر کہلانے کا مستحق نہ ہو تو کیا سیزر، یا ہانیبال، یا ولنگٹن ہونگے جن کی زندگی میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی نہیں ملتا۔ سپاہیانہ شان بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں۔ پلاسی اور بکسر کے معرکے یقیناً قابل تعریف ہیں ع جو خود ہی مر رہا ہو اس کو مارا تو کیا مارا

اگر ایک میزان قائم کی جائے اور اس میں کلائیو کے سیاہ و سفید کارناموں کو تولا جائے تو ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ سیاہ کارناموں کا پلڑا زمین سے مل جائے گا۔ اس مضمون میں کسی دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے کہ کلائیو کو ضمیر کی خاموش آواز سننے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا لیکن ضمیر کی آواز ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک غیر محسوس رہے پھر بھی زندگی میں ایک وقت آتا ہے کہ شقی سے شقی انسان بھی اس کے محاسبہ کو محسوس کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ انگلستان کے اس "زبردست مدبر" اور "زبردست سپاہی" کا انجام اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو کچھ کم عبرتناک نہ تھا۔

لارڈ اسٹین ہوپ لکھتا ہے :-

۷۵ "ایسا اتفاق ہوا کہ ایک نوجوان خاتون جو کلائیو کے گھرانے سے گہرے تعلقات رکھتی تھی اس کے مکان برکلے اسکوائر میں قیام پذیر تھی۔ ایک دن وہ کسی کمرہ میں خط لکھنے کے لئے بیٹھی۔ اس نے لارڈ کلائیو کو چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھ کر اپنا قلم درست کرانے کے لئے آواز دی۔ لارڈ کلائیو وہاں پہونچا اور قلمتراش چاقو جیب سے نکال کر قلم درست کر دیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے کمرے میں سے گذرتے ہوئے کلائیو نے وہی چاقو اپنے [illegible] بھونک لیا"

یہ تھی ضمیر کی آواز جس نے کلائیو کی زندگی کے آخری ایام کو اتنا تلخ کر دیا تھا کہ اس نے زندگی پر خودکشی کو ترجیح دی ؎

ربودی دل ز چاکِ سینۂ من
بغارت بردۂ گنجینۂ من

مزدور طالب علم

حضرت احسان دانش

جہاں گنگ ہے نصف رات آچکی ہے   بشاشت کو افسردگی کھا چکی ہے
ہے بے نور بازار دلداریوں کا   مقفّل ہے مقتل ریاکاریوں کا
مسافر نہیں شاہراہوں میں کوئی   دیا تک نہیں خانقاہوں میں کوئی
ہے بھرپور تاریکیوں کی جوانی   جمائی پہ ہیں انجمِ آسمانی
صدا دور سے بوم کی آرہی ہے   غنودہ سماعت کو چونکا رہی ہے
منڈیروں پہ خاموشیاں گا رہی ہیں   ستاروں پہ بے چینیاں چھا رہی ہیں
شبِ تار نے زلف کھولی ہوئی ہے   سیاہی خموشی میں گھولی ہوئی ہے
مساجد بھی چپ ہیں شوالے بھی چپ ہیں   پجاری بھی چپ، پجنے والے بھی چپ ہیں

مگر اک محلّے کے خستہ سے گھر میں
زمیں کے جگر پر فلک کی نظر میں

اک انساں ادھیڑ عمر گردن جھکائے   چراغ اک کنستر کے اوپر جلائے

ترقی کی دھن سے جبیں پر پسینہ　　مقدس خیالوں سے معمور سینہ
نہیں دیدۂ شوق میں خوابِ راحت　　مشقت کے رُخ پر ہے رنگِ شجاعت
پسینہ میں بھیگا ہوا پیرہن ہے　　بہاروں پہ افلاس کا بانکپن ہے
نصیبوں میں پیدا چمک کر رہا ہے　　سبق یاد اس وقت تک کر رہا ہے

مبارک ہو اے ہند مزدور جاگا
زمانے کا پامال و مقہور جاگا

شہادت کا لختِ جگر چونک اُٹھا　　صداقت کا نورِ نظر چونک اُٹھا
تمدن کی تقدیر نے آنکھ کھولی　　اندھیرے میں تنویر نے آنکھ کھولی
غبارِ حزیں کو بلندی کی سوجھی　　تنزل کو رفعت پسندی کی سوجھی

وہ دن اب نہیں دُور جب ہر قدم پر
نچھاور کرے گا فلک لعل و گوہر

تری بزم کی بزم دل شاد ہوگی　　خموشی میں گلبانگ آباد ہوگی
حکومت مسرت کی ہو گی الم پر　　برس جائینگی رحمتیں چشمِ نم پر
کہ ہیں طاقتیں علم میں ایسی پنہاں　　بنا دیں جو آتشکدوں کو گلستاں

جو کانٹوں کو کلیوں کا ہمسر بنا دیں
جو کنکر کو ہمتابِ گوہر بنا دیں

بابِ عشق

از مرزا فہیم بیگ نہیمؔ چغتائی

راؤ لوک پال سنگھ صاحب چترکار (گوالیاری) کے پُرمعنی دوہے بھاشا بھاشیوں (ہندی اہل زبان) کی ضیافتِ طبع کا بیش بہا ذخیرہ تو ہیں ہی، میرا خیال ہے کہ اردو دانوں کو بھی ایک دلچسپ و نادر تحفہ سے کم ثابت نہ ہوں گے یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے ہم زبانوں کی دلچسپی کیلئے اس قابل قدر کلام کی اشاعت ایک ادبی خدمت سمجھی اور کچھ اجزا اخبار و رسائل میں شائع کیئے۔ اور اسی جذبہ کے ماتحت راؤ صاحب موصوف کے چند شہ پارے قارئینِ "ایشیا" کی نذر کرتا ہوں۔

مرزا فہیم بیگ

دل دادگی

پلک پلن ہیرت ہرت پھیرت بھرکُٹ مرور
پھیر نہ درشن دیت کچھ ناگر نیہہ ہلور

पलक पलन हेरत हरत फेरत भरकुद मरोर
फेर न दरशन देत कुछ नागर नेह्न हलोर ॥

ترجمہ:۔ پپوٹوں کے پلڑوں میں جانچ کر لُبھالیتی ہے، پھیرتے ہوئے ابرؤوں کی جنبش کو۔ پھر کچھ پھیر نہیں سوجھنے دیتی عورت کے عشق کی موج

تشریح:۔ شاید نظر سے نظر ملانے میں حجاب مانع ہوا یا سے
گر تُمھیں مرے تو زہر کیوں دو
یہ سمجھ کر کہ سودائیوں میں تابِ نظّارہ کہاں، ایک لاپروائی سے پپوٹوں کے پلڑوں میں مستورِ نیم باز آنکھوں سے تول رہے ہیں۔

بہت ممکن تھا کہ اس وقت از خود رفتہ سر نیچا کئے کھڑے رہتے لیکن کیا کریں جی نہ مانا، انھیں اپنی دھن میں پاکر کچھ جھجکتے جھجکتے کن انکھیوں سے دیکھا۔

کدھر؟

ترازو کو نہیں، تولنے والے کی طرف!

جونہی اس شرمائی لجائی نظر نے پھولوں کے پلڑوں سے سودا جانچا، اور کمان جیسے کشیدہ ابرو خفیف سی جنبش کے ساتھ ذرا پھیرے کہ ؎

کجامی نمائی کجامی زند

بقول کوی ور بہاری لال ؎

تیئے کت کمینتی پڑھی درگ سر بھونہہ کمان
چل چت بیدھو چکت نہیں، بنک بلوکن بان

तिय कित कमयन्ती पढ़ी
द्रग सर भौंह कमान
चल चित बधहू चकत नहीं
बनक विलोकन बान ॥

عورت! تو نے یہ تیراندازی کہاں سیکھی کہ بھوؤں کی کمان سے خدنگ نگاہ چھوڑ کر دلِ مضطر جیسے متحرک نشانہ کو چھیدنے میں نہیں چوکتی۔ حالانکہ دیکھنے میں تیر بھی ترچھا ہے۔

یعنی سودا کرتے کرتے کھڑے بک گئے اور خبر نہ ہوئی .... ہائے دن دہاڑے ...... بھرے بازار میں ؎

دل چرا کر نظر چرائی ہے
لٹ گئے لٹ گئے دہائی ہے — مرزا داغ

۷۹

انتظار

چومکھ دیپ سنجوئے درگ پنتھ نہار نہار
نس گت پون جھکور سو بجھو بھئے بھنسار

चौमुख दीप संजोए
द्रग पंथ निहार निहार
निस गत पवन झकोर सो
भजो भए भन्सार

ترجمہ:۔ آنکھوں کا چومکھ دیا روشن کر کے راہ دیکھتے دیکھتے، رات بیت گئی، آخر صبح ہوتے نسیم کی لپٹ سے وہ گُل ہو گیا۔

تشریح :- جابجا پاور ہاؤس قائم ہو گئے، شہروں کے گلی کوچے الیکٹرک لائٹ سے جگمگانے لگے، لیکن دیہاتوں کی جھونپڑیوں میں اب وہی مٹی کے دیئے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں اور اپٹوڈیٹ شہریوں کے خلاف ان کے یہاں بجائے بیٹری، لالٹین، ٹارچ وغیرہ کے دیوں سے ہی مہمانوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

علیٰ ہذالقیاس قدامت پسند غریب دیہاتیوں کے علاوہ شہروں کے عقیدت مند ہندو مسلمان تہواروں پر گھی یا کڑوے میٹھے تیل کے دیوں ہی سے چراغاں کرتے ہیں، مقدس دریاؤں میں مٹی اور آٹے کے دیوں کی ہی دیپ مالائیں بہائی جاتی ہیں۔ درگاہوں، خانقاہوں پر دیئے رکھنے مسجدوں کے طاق بھرنے اور دیوی دیوتاؤں کی آرتی اتارنے کے وقت ابھی تک دیوں کے استعمال کا ہی رواج چلا آتا ہے۔

علاوہ ازیں جیسا کہ حضرت آتش فرما گئے ہیں

گیا ہوں جوشِ وحشت میں جو اڑ کر مثلِ پروانہ
چراغِ چشم دکھلائے ہیں غولوں نے بیاباں میں

اس دوہے میں عام دستور کے مطابق صرف "دیا" نہیں "چومکھ دیا" لایا گیا ہے "چومکھ" کہتے ہیں چار منہ والے کو اور چومکھ دیئے سے چار منہ والا چراغ مقصود یعنی عاشق کی آنکھوں کو چومکھ دیئے سے شباہت دی ہے۔ وہ اس لئے کہ چشم براہ مہجور کچھ ایک ہی طرف ٹکٹکی نہیں لگائے رہتا، وفورِ شوق کی دیوانگی سے بیتاب ہو ہو کر کبھی ادھر دیکھتا ہے کبھی ادھر، ابھی سامنے نظر دوڑائی، ابھی مڑ کر پس پشت نگاہ ڈالی۔
گویا اگر فقط لفظ دیا لایا جاتا تو شاعر کا مفہوم کیونکر ادا ہوتا، اور تخیل کی مکمل ہیئت کا صحیح منظر کس طرح پیشِ نظر ہوتا۔
خلاصہ یہ کہ اس لفظ "چومکھ" نے دوہے کی وسعت معنوی اور تکمیل لفظی کو چار چاند لگا دیئے۔

جس کے خیر مقدم کو اندھیری رات میں مشتاق دید آنکھوں کا چراغ روشن کیا تھا آہ! جس دیوتا کی چومکھ دیئے سے آرتی اتارنی تھی اس نے درشن نہ دیئے، حتیٰ کہ شب گذر گئی، جب اس کی آمد کا امکان نہ رہا (کیونکہ وعدہ شب تار کا تھا) آس ٹوٹ گئی اور نسیم کے جھونکے صبح کا پیغام دینے لگے، تو مایوسی نے بینائی کا چراغ بجھا دیا۔

عالم میں ہے گھر گھر خوشی و عیش پر اس بن
ماتم کدہ ہم کو نظر آتا ہے گھر اپنا — جرأت

افتراق

درگ جلجات نہ لاج جل کا سس روپ لجاؤ
سو سو سوہیں کر کہا، ہریں ہریں مسکاؤ

दृग जल जात न लाज, का सोस रूप लजाओ
सौ सौ सौहें कर कहा, हरें हरें मुसकाओ

ترجمہ :- کنول جیسی آنکھوں سے "غیرت کا پانی ڈھل گیا، چاند سے مکھڑے کو کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ سو سو قسمیں کھا کر چپکے چپکے

کیا سکرا رہے ہو۔ !!

تشریح :- کیوں جناب !

(۱) وہ ہفتہ عشرہ کو شہر سے باہر جانے کے لئے رخصت ہو کر دو دن نہ ملنے کے بعد تیسرے روز گارڈن پارٹی میں کون نظر آیا ؟

(۲) کیا نمائش میں کوئی اور منہ پھیر کر دوسری پٹڑی سے گذر گیا تھا۔

(۳) اس جیب سے گر جانے والے خط کا کیا جواب ہے ؟

(۴) کون صاحب نظر ملتے ہی جلوس میں غائب ہو گئے تھے۔

(۵) "ابھی آتا ہوں" کہہ کر جو گئے تو اتنے روز کس نے روپوشی اختیار کئے رکھی۔

(۶) دروازے میں جھانک کر کیا میں کھسک گیا تھا اور اچانک سینما میں سامنا ہو جانے پر میں نے بھی الٹے گلے شکوے کئے تھے۔ ؟

(۷) کس نے زید سے نہ ملنے کا یقین دلایا، اور پھر اس کے ساتھ کار پر جانا دکھائی دیا۔

(۸) دولت خانہ پر حاضری دی تو کہہ دو ! "ہیں نہیں" کس کی آواز تھی۔ ؟

چاند سے کنول کا سمٹنا سب جانتے ہیں، مگر یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی آپ کی کنول جیسی آنکھوں سے غیرت کا پانی ڈھل گیا۔ ایسا شریف جوہر (غیرت) ضائع کر کے آپ اٹھا چاند جیسی دلفریب صورت کو داغ لگا رہے ہیں، یہ کرتوت اس پر سو سو قسمیں کھا کر ہنسنا بڑے افسوس کی بات ہے۔

بہت در گذر سے کام لیا، اب رو رعایت کی گنجائش نہیں، کان کھول کر سن لیجئے ؎

گر یہی ناز ہیں صاحب کے یہی ہیں انداز ہم نے بھی عہد کیا دل سے کہ اے بندہ نواز
نہ کریں گھر کی طرف تیری کبھی رُو دیں نیاز ہو اگر کعبہ اُدھر کو تو کریں ترک نماز

واں نکل جائیں جہاں کا نہ پتہ ملتا ہو
نہ ملیں ملنے سے تیرے جو خدا ملتا ہو

قطع تعلق

سو سو بدھ گیہہ کی نسی، سرانی چاہ
اب آئے راہیں ملے، الٹ پلٹیئے کاہ

सौ सौ विध गेह की नसी सरानी चाह ॥
अब आए राहें मिल, उलट पलटिए काह ॥

ترجمہ :- وہ سو سو طرح کا ساز و سامان اور گھر گرہستی کے پُر تکلف لوازمات تباہ ہو گئے، محبت بجھ چکی۔ اب ملے ہو ! ...... راہ چلتے . . کیا بلیں۔

تشریح :- زندگی کا وہ دور جس کا بدل ناممکن ہے، طویل مایوسیوں کی نذر ہو گیا۔ تلخ کامیوں کے تند جھونکوں نے نخل آرزو کو جھلسا دیا۔ اور یہاں تک نوبت آئی۔

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ مجھکو ناز تھا وہ دل نہیں رہا

افسوس! اس وقت کرم نہ فرمایا، جب اُمنگوں کے دن تھے۔ اور جملہ سامان عیش فراہم کرکے آمد آمد کی گھڑیاں گنی جا رہی تھیں۔ اب آنکھیں کھلی ہیں، جب مسلسل نامرادیوں نے ہمیں وہاں پہنچا دیا، جہاں دکھ سکھ کا احساس فنا ہو جاتا ہے۔ اور آخری منزل کچھ دور نہیں رہتی۔
بس! اب بقیہ لمحہ گذارنے کے لئے اس بھولی بھالی صورت کا تصور ہی کافی ہے۔
بس خدا حافظ!

سکون

سن نہ سمجھ آیو کچھو، دھیمے بولو جون
سرس نہارت لکھ پرو بھیو سدا کو مون

सुन न समुझ आयो कछु धीमे बोलो जौन
सुरस निहारत लख परे, भयो सदा को मौन

ترجمہ : سن کر سمجھ میں نہ آیا، وہ جو آہستہ بولا، طیش کھا کر دیکھا تو ہمیشہ کیلئے خاموش تھا۔
تشریح :- یہ سرہانے کون آ کھڑا ہوا؟
اس سے پوچھئے جس کے حواس بجا ہوں
چند لمحہ کی مہلت میں خشک ہونٹوں کو خفیف سی جنبش ہوئی۔ ... ذرا تھر تھرائے اور رہ گئے
پتھرائی ہوئی آنکھوں پر لاپروائی کا دھوکہ کھانیوالا خاک نہ سمجھا۔
بے نیازی کی عادت سے مجبور، عذر معذرت کا منتظر رہا.... ... جب ناکامی ہوئی سخت جھنجھلایا، لال بیلا ہوتا نزدیک آیا۔
اب جو غور کیا تو ارے!
خوشامدیں کر کر کے منانیوالا ہمیشہ کے لئے روٹھ چکا ہے۔

اے شاعرِ رنگیں بیاں

اثرِ نواب جعفر علی خانصاحب اثرؔ بی اے لکھنوی

فطرت تری آواز ہے
فطرت ہی تیرا ساز ہے
فطرت کا تو ہمراز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

جوہر دکھائے عشق کے
دے کر زباں جذبات کو
کیا سحرگیں انداز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

کہسار تیرے منتظر
گلشن کو تیری آرزو
آغوشِ صحرا باز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

ساحل کو ہو لب تشنگی
یا اضطرابِ موج ہو
دونوں کا تو غمّاز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

بالا نشاط و غم سے ہے
بازیچہ گاہِ دہر میں
سب کا مگر دمساز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

نغموں کے گل بکھرا دیئے
سازِ محبّت چھیڑ کے
کیا نغمے ہیں کیا ساز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

اک جنبشِ لب نے تری
گمنام کو نامی کیا

آواز یا اعجاز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

قربانی و ایثار ہیں
زندہ ترے الفاظ ہیں
تو غیب کی آواز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

ہر نالۂ موزوں ترا
تاثیر میں ڈوبا ہوا
اک شاہدِ طنّاز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

تو حسن کا نورِ ضیا
تو عشق کا رنگِ صفا
تو خلوتیٔ راز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

انجام ہر آغاز کا
تجھ پر ہوا ہے منکشف
عالی تری پرواز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

وجدان ترا الہام ہے
پیغام تیرا عشق ہے
دل خوابگاہِ ناز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

شہبازِ عقل و ہوش کے
جلتے ہیں پر جس اوج پر
تیرا وہ پا انداز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

سائنس اور حکمت جہاں
تاریکیاں ہیں جہل کی
تو آئینہ پرداز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

وہ گیت گا وہ سوز بھر
یا جاگ اُٹھے یا جل اُٹھے
دنیا کہ محوِ آز ہے
اے شاعرِ رنگیں بیاں

سقراط کی موت

"فیڈو"

مرنے سے پہلے اپنے دوستوں سے سقراط اعظم کی گفتگو

(مسلسل)

(مترجمہ:- مہر لال ضیا ایم۔ اے فتح آبادی)

اور فیڈو اس نے کہا اگر استدلال کا کوئی ایسا طریقہ ہو جو صحیح اور سچا ہو اور جسکو ہمارے دماغ قبول کرسکیں تو یہ بہت رنجدہ ہوگا کہ ایک آدمی چند ایسی دلیلوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو کبھی سچی اور کبھی غلط ثابت ہوئیں آخر کار تنگ آکر بخوشی تمام الزام اپنی ذات یا اپنی کم تعلیمی پر لگانے کی جگہ استدلال پر عاید کرے اور اپنی بقیہ زندگی استدلال سے نفرت اور اس کی مخالفت کرنے میں گذارے اور اس طرح حقیقت کی سچائی سے بے بہرہ رہے۔

یقیناً میں نے کہا یہ بہت افسوسناک ہوگا۔

تو سب سے پہلے اس نے کہا ہمیں احتیاط کرنی چاہئے کہ ہم اپنے دماغ میں اس خیال کو جگہ نہ دیں کہ تمام استدلال بہت ممکن طور پر غیر یقینی ہے۔ بلکہ ہمکو سوچنا چاہئے کہ ہم غیر یقینی ہیں اور ہمکو مردوں کی طرح پختہ بننے کی سعی کرنی چاہئے۔ تم کو میرے دوستو اپنی تمام آیندہ زندگی کی خاطر اور مجھ کو اپنی موت کے لئے کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ اس وقت میں موت کو ایک فلسفی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں ان غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح پُرسکون حالت میں ہوں جو مسئلہ زیر بحث کی حقیقت سمجھنے کی کوشش نہ کرتے ہوئے دوسروں کو اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خود راستی پر ہیں اور میرا خیال ہے کہ آج میں ان سے صرف ایک بات میں اختلاف کروں گا۔ میں آپ کو یہ ماننے پر مجبور نہیں کروں گا کہ میں راستی پر ہوں۔ لیکن میں خود کو ایسا کرنے پر مجبور کرنے کی ضرور کوشش کرونگا۔

دیکھا تم نے میرے دوستو میرا استدلال کتنا خود غرض ہے۔ اگر جو کچھ میں
کہتا ہوں صحیح ہے تو اس پر یقین کرنا چاہئے لیکن اگر موت کے بعد کچھ بھی نہیں
ہے تو میں کم از کم اپنے دوستوں کو اپنی موت اور اس وقت کے درمیانی
حصہ میں اپنی فریادوں سے تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ اور یہ لاعلمی ہمیشہ
نہیں رہے گی، ایسا نہ ہونا اک زبردست نعمت ہے، وہ جلدی ختم ہو جائیگی
اب سیمیاس اور سیبیس میں بحث کرنے کے لئے تیار ہوں اور اگر تم میری
بات مانو تو تم سقراط کا نہیں بلکہ سچائی کا خیال کرو۔ اس طرح تم میری باتوں
سے متفق ہو سکو گے ورنہ تم اپنی ہر دلیل سے میری مخالفت کرو گے اور
یقین رکھو کہ تمکو مطمئن کرنے کے لئے میں خود کو اور تم کو دھوکا دیکر ایک شہد
کی مکھی کی طرح اپنا ڈنک اپنے پیچھے نہیں چھوڑ جاؤں گا۔

اب ہمکو آگے بڑھنا چاہئے اُس نے کہا۔ اور سب سے پہلے اگر تم سمجھتے
کہ میں تمہاری دلیلیں بھول گیا ہوں تو انہیں دہرادو۔ میرے خیال
میں سیمیاس کو شک ہے کہ روح ایک توازن کی حیثیت سے جسم سے
پہلے فنا ہو سکتی ہے گو وہ جسم سے زیادہ پاک و صاف ہے۔ اگر میں غلطی نہیں
کرتا ہوں تو سیبیس روح کو جسم سے زیادہ دیر پا تسلیم کرچکا ہے۔ لیکن اس
نے کہا تھا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کئی مرتبہ جسموں کو اختیار کرنے کے بعد
روح خود بھی آخری جسم کو چھوڑ کر نہیں مٹ جاتی اور یہ کہ دراصل روح کے
اس طرح فنا ہو جانے ہی کو موت نہیں کہتے۔ کیونکہ روح کی فنا ایک
نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی بات قابل غور ہے
سیمیاس اور سیبیس۔!؟

دونوں متفق تھے کہ ان کے یہی سوالات ہیں۔

کیا تم ان سب نتائج سے انکار کرتے ہو جن پر ہم اب تک پہنچ
چکے ہیں یا صرف بعض سے؟ اُس نے دریافت کیا۔

صرف بعض سے انھوں نے جواب دیا۔

بہتر ہے اُس نے کہا تم اس نقطۂ نظر کے متعلق کیا رائے رکھتے ہو کہ علم ایک
یادداشت ہے اور یہ ہماری روحیں یقینی طور پر کسی جگہ موجود تھیں پیشتر
کہ وہ ہمارے جسموں میں قید کی گئیں

میں سیبس نے جواب دیا اسوقت عجیب طریقہ سے قائل ہو گیا
تھا اور اب اس سے زیادہ میں کسی چیز کا قائل نہیں ہوں۔

اور میرا بھی یہی خیال ہے۔ سیمیاس نے کہا اور مجھے بڑا تعجب
ہوگا اگر میں اپنی اس رائے کو بدل دوں گا۔

لیکن میرے تھیبا کے دوستو تمہیں اسکو بدلنا ہی پڑے گا۔ سقراط نے
جواب دیا۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ توازن ایک مرکب کا نام ہے اور کہ روح
ایک توازن ہے جو جسم کی مختلف عناصر کی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے
تم کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ توازن موجود ہو سکتا ہے۔ ان چیزوں سے بھی
پہلے جن سے کہ اس کی تخلیق ہوتی ہے؟ کیا تم ایسا کرسکتے ہو؟

یقیناً نہیں۔ سقراط

لیکن تم دیکھتے ہو کہ تمہارا استدلال اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جب
تم کہتے ہو کہ انسان کے جسم میں آنے سے پیشتر بھی روح موجود تھی حالانکہ
وہ اُن عناصر کی ترکیب ہے جو اُس وقت موجود نہیں تھے۔ تمہارا توازن
ویسا نہیں ہے جیسا تم اُسے سمجھتے ہو۔ ستار، تاریں اور سُر جو ابھی متوازن
نہیں سب سے پہلے وجود میں آتے ہیں اور توازن سب سے بعد میں پیدا ہوتا اور سب
سے پہلے مرجاتا ہے۔ تمہارا یہ یقین دوسرے یقین سے کیونکر متفق ہو سکتا
ہے؟

ایسا نہیں ہو سکتا سیمیاس نے جواب دیا۔

تو بھی اُس نے کہا توازن کی دلیل میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

یقیناً نہیں سیمیاس نے کہا۔

تمہاری دلیل میں اختلاف ہے اُس نے کہا۔ تمہیں ان دو نظریوں
میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا چاہئے کہ علم یادداشت ہے یا روح ایک
توازن کا نام ہے۔

یقینی طور پر اول الذکر سقراط اُس نے جواب دیا۔ آخر الذکر کا میں نے
کبھی تجربہ نہیں کیا۔ یہ محض ممکنات میں سے ہے اور یہی وجہ ہے اس نظریے
کی شہرت اور عام مقبولیت کی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ نظریے جو ممکنات
محض پر قائم ہیں فریبی ہیں اور امکان ہے کہ وہ غلط راستہ پر لے جائیں
جیومیٹری کے علاوہ ہر دوسری چیز میں بھی اگر انسان اُن کے خلاف
احتیاط نہ کرے۔ لیکن یادداشت اور علم سے متعلق نظریہ حقیقت اور یقین
پر مبنی ہے۔ ہم مان چکے ہیں کہ روح جسم میں داخل ہونے سے پیشتر بھی موجود
تھی جس طرح وہ حقیقت موجود ہے جس کو حقیقی وجود کہتے ہیں۔ اور میں مجبور

ہوں کہ میں اس حقیقت کو دلائل کے ساتھ تسلیم کروں۔ میرے خیال میں اس
سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ میں خود کہہ سکتا ہوں نہ کسی کو کہنے کا موقع دے سکتا
ہوں کہ روح ایک توازن کا نام ہے۔

اب سیمیاس اس سوال کو دوسرے رُخ سے دیکھو سقراط نے کہا
کیا تم خیال کرتے ہو کہ توازن یا کوئی دوسری ترکیب اپنے ترکیبی عناصر کے
علاوہ بھی کسی حالت میں موجود ہو سکتی ہے۔

بالکل نہیں۔

اور نہ ہی وہ عناصر سے زیادہ یا کم تکلیفیں برداشت کر سکتی ہے؟

اُس نے اتفاق رائے کی۔

پس توازن اُن عناصر سے پہلے موجود نہیں ہو سکتا جن سے وہ ترکیب
پاتا ہے بلکہ وہ اُن کے بعد وجود میں آتا ہے۔

ہاں ہاں۔

اور نہ وہ اپنے عناصر کے خلاف ہی کوئی حرکت کر سکتا ہے یا آواز بلند
کر سکتا ہے۔

بہت کم اُس نے جواب دیا۔

کیا فطرتاً ہر توازن اُس حالت پر قائم نہیں رہتا جس پر اُسے قائم
کیا جائے؟

میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا اُس نے جواب دیا۔

اگر یہ ممکن ہو کہ ساز کو زیادہ اچھی طرح درست کیا جائے تو کیا توازن
بھی زیادہ اچھا نہیں ہوگا جب کہ کم درست ہونے پر اُس کا توازن
بھی کم ہوگا؟

بالیقین۔

کیا یہ روح کے متعلق بھی سچ ہے؟ کیا ایک روح دوسری روح سے
زیادہ یا کم روح ہو سکتی ہے گو وہ فرق غیر معمولی ہی کیوں نہ ہو؟

بالکل نہیں اُس نے جواب دیا۔

تو پھر اُس نے جواب دیا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا ایک روح کے متعلق یہ
نہیں کہا جاتا کہ وہ ذہین پاک اور اچھی ہے جبکہ دوسری بے وقوف
خراب اور بُری ہے؟ اور کیا یہ صحیح نہیں؟

ہاں یقیناً۔

تو پھر نظریۂ توازن میں یقین رکھنے والوں کے خیال میں نیکی اور
بدی جو ہماری روحوں میں پائی جاتی ہیں کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی دوسری
قسم کا توازن اور اختلاف ہے؟ کیا وہ یہ کہیں گے کہ ایک نیک روح
درست ہونے کی وجہ سے اپنے اندر کوئی توازن نہیں رکھتی؟

میں سیمیاس نے کہا نہیں بتا سکتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسی
ہی بات کہیں گے۔

لیکن یہ تسلیم کیا جا چکا ہے اُس نے کہا کہ ایک روح دوسری سے بڑی
یا کم نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں ہم مان چکے ہیں کہ ایک توازن دوسرے
توازن سے کم و بیش نہیں ہوا کرتا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟

ہاں یقیناً۔

اور ایک توازن جو کم و بیش توازن نہیں کم و بیش درستی پر مبنی
نہیں کیا جاتا۔ کیا ایسا ہی ہے؟

ہاں۔

اور وہ درستی جو زیادہ ہے نہ کم، کم و بیش توازن کی ضامن ہے یا
یکساں توازن کی؟

تو پھر ایک روح جو دوسری روح سے کم و بیش نہیں کم یا زیادہ درست
نہیں کی جاتی۔

ٹھیک ہے۔

اس لئے اُس میں زیادہ توازن یا اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔

یقیناً نہیں۔

پس کیا ایک روح دوسری روح سے زیادہ نیک اور بد ہو سکتی ہے
جبکہ نیکی توازن اور بدی اختلاف ہے؟

کسی طرح نہیں۔

دوسرے لفظوں میں سیمیاس اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر روح
ایک توازن ہے تو کسی روح میں بدی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ میرے خیال میں
ایک مکمل توازن میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا

یقیناً نہیں۔

نہ ایک مکمل روح میں کوئی بدی ہو سکتی ہے ؟

نہیں استدلال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام ذی حیات چیزوں کی روحیں یکساں طور پر نیک ہیں اور روحوں کی فطرت ہر جگہ یکساں رہتی ہے۔

ہاں میں یہی سمجھتا ہوں سقراط اُس نے کہا۔

کیا تم اس کو صحیح سمجھتے ہو اُس نے پوچھا اور کیا ہمارے استدلال کا حشر یہی ہوگا اگر یہ نظریہ کہ روح ایک توازن ہے صحیح ہو؟

نہیں یقیناً نہیں اُس نے جواب دیا۔

کیا اُس نے کہا جسم کے تمام اعضا میں تمہارے خیال میں صرف روح اور وہ بھی عقلمند روح ہی جسم پر حکومت نہیں کرتی ؟

کرتی ہے۔

کیا وہ جسمانی خواہشات کے سامنے جھک جاتی ہے یا اُن کا مقابلہ کرتی ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ جب جسم گرم اور تشنہ ہو تو کیا روح اُس کو دور لیجا کر پانی پینے سے نہیں روکتی اور جب اُسے بھوک لگتی ہے تو کیا وہ اُسے کھانے سے منع نہیں کرتی؟ اور کیا اس طرح ہم نہیں دیکھتے کہ روح ہزاروں جسمانی خواہشات کے خلاف چلتی ہے۔

ہاں یقیناً۔

لیکن ہم اس سے بھی اتفاق رائے کر چکے ہیں کہ اگر وہ ایک توازن ہے تو وہ جزر و مد اور اُتار چڑھاؤ کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھا سکتی اور کہ اُس کو اُن عناصر کا ساتھ دینا پڑتا ہے جن سے وہ مرکب ہے اور کبھی اُن کے خلاف نہیں چل سکتی؟

ہاں اُس نے جواب دیا ایسا ہی ہے۔

اب کیا ہم نہیں دیکھتے ہیں کہ روح اس کے بالکل خلاف چل رہی ہے۔ اور صرف اُن عناصر کی جن سے کہ اُس کی ترکیب ہوئی ہے رہبری ہی نہیں کرتی بلکہ عمر بھر تقریباً ہر چیز میں اُن کی مخالفت کرتی ہے۔ ہر طریقہ سے اُن پر حکومت کرتی ہے۔ اُن کو سزا دیتی ہے جو بعض اوقات بڑی سخت اور تکلیف دہ ہوتی ہے مثلاً ورزش اور معالجہ اور کبھی یہ سزا نرم ہوتی ہے بعض اوقات وہ خواہشات، ارمان اور خوف کو سزا کا ڈر دیتی ہے گویا وہ اپنے سے ایک جُدا چیز سے مخاطب ہے جس طرح ہومر نے اوڈیسی میں اوڈیسیس کو کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ

"اُس نے اپنی چھاتی پیٹی اور اپنے دل کو ملامت کے طور پر کہا
ضبط سے برداشت کر اے دل تو اس سے بھی زیادہ سختیاں سہہ چکا ہے"

کیا تم سمجھتے ہو کہ جب ہومر نے یہ الفاظ لکھے تو وہ روح کو ایک توازن سمجھتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ وہ جسمانی خواہشات کی رہبری کرنے کی جگہ اُن کے اشارے پر چلتی ہے اور ایک توازن کی سی غیر ارضی شے ہوتے ہوئے بھی وہ جسم کی محکوم ہے ؟

یقیناً سقراط میں ایسا نہیں سمجھتا۔

تو میرے اچھے دوست روح کو ایک توازن کہنا بالکل غلطی ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں ہم ہومر جیسے الہامی شاعر سے متفق ہوں گے نہ اپنے آپ سے۔

یہ سچ ہے اُس نے جواب دیا۔

بہت اچھا سقراط نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ ہم اپنے تھیبا کے ہارمونیا کو مطمئن کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن کیڈمس کے متعلق کیا کیا جائے سیبیس اُس نے پوچھا۔ ہم اُس کو کیونکر اور کس دلیل سے مطمئن کریں؟

میں کہہ سکتا ہوں کہ تم اس کا کوئی ذریعہ نکال سکتے ہو۔ سیبیس نے کہا تمہاری دلیلوں سے ظاہر ہے کہ روح ایک توازن نہیں ہے وہ دلیلیں جنہوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ جب سمیاس اپنے اعتراضات پیش کر رہا تھا تو میں اس بات پر متعجب تھا کہ کوئی اُس کے اعتراضات کو کس طرح رد کر دے گا۔ پس تمہاری تردید کے سامنے اُس کے تمام اعتراضات کو جھکتے ہوئے دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ مجھے تعجب نہیں ہوگا اگر کیڈمس کے اعتراضات کا بھی یہی حشر ہو۔

میرے اچھے دوست سقراط نے کہا حد سے زیادہ خود اعتمادی بہتر نہیں ورنہ کوئی چشم بد اُس دلیل کو جو پیش ہونے والی ہے غلط ثابت نہ کر دے تاہم اس چیز کو خدا پر چھوڑ دو۔ آؤ ہم بھی ہومر کے ہیرو کی طرح "بہادری سے آگے بڑھتے ہوئے" دیکھیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو صحیح ہے یا غلط۔ تمہاری گفتگو کا ماحصل یہ ہے۔ تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ میں ثابت کروں کہ روح غیر فانی اور ابدی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو تم سمجھتے ہو کہ ایک ایسے فلسفی کا اعتماد جو موت پر یقین رکھتا ہے اور جو سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ دوسری دُنیا میں زیادہ بہتر رہے گا اس کی نسبت کہ وہ دُنیا ہی میں کسی دوسری قسم کی

دوسری قسم کی زندگی بسر کرے، بیوقوفی سے کم نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ
یہ دکھانا کہ روح زبردست اور دیوتا کی طرح ہے اور وہ ہمارے پیدا ہونے
سے پہلے بھی موجود تھی کافی نہیں ہے کیونکہ اس سے اُس کا لافانی ہونا
ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیرپا ہے اور عرصہ تک قائم رہتی
ہے اور کسی گذشتہ حیثیت میں بھی کئی کام کر چکی ہے۔ تاہم اس وجہ سے وہ
ابدی نہیں ہو سکتی۔ اُس کا جسم میں داخل ہونا ہی ایک مرض کی طرح اُسکی
تخریب کا باعث ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ اس زندگی میں خراب ہوتے ہوتے
آخر تباہ و ختم ہو جاتی ہے جس کو ہم موت کہتے ہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ اُسکا
ایک یا زیادہ وقتوں میں جسم اختیار کرنا ہمارے لئے کوئی مطلب نہیں رکھتا
کیونکہ کوئی بیوقوف ہی موت سے ڈرے گا اگر وہ یہ نہ جانتا ہو اور ثابت
نہ کر سکتا ہو کہ وہ لافانی ہے۔ یہ ہے تمہارے اعتراض کا لب لباب میرے
خیال میں سیبیس۔ میں اسکو بار بار اس واسطے دوہرا رہا ہوں کہ ہم کوئی بات
بھول نہ جائیں اور تم اس میں ترمیم کر سکو اگر تم ایسا کرنا چاہو۔

سیبیس نے جواب دیا۔ نہیں۔ میرا مطلب یہی ہے اور میں اس
وقت کوئی ترمیم نہیں کرنا چاہتا۔

کچھ دیر ٹھہر کر سقراط سوچنے لگا۔ پھر اُس نے کہا تمہارا سوال آسان
نہیں ہے۔ سیبیس۔ اس صورت میں ہم کو تخلیق اور تخریب کے تمام اسباب
پر غور کرنا ہوگا۔ اگر تم کو ناگوار نہ گذرے تو میں اپنے تجربات بیان کروں
اور اگر تم اُن سے اپنے شکوک کو دور کرنے میں کامیاب ہو سکو تو یہ
بہت اچھا ہوگا۔

یقیناً سیبیس نے کہا میں تمہارے تجربات سُننا چاہتا ہوں۔

تو سُنو میں تمہیں بتاتا ہوں سیبیس اُس نے جواب دیا۔ عالم جوانی
میں میری زبردست خواہش تھی کہ میں اُس علم کو حاصل کر لوں جسے
([illegible] کہتے ہیں۔ ہر چیز کی علت کو سمجھنا میرے
نزدیک بہت بڑی چیز تھا۔ کوئی چیز کیوں پیدا ہوتی ہے۔ کیوں ضائع ہو
جاتی ہے اور کیوں موجود رہتی ہے۔ یہ سوالات ہمیشہ مجھے پریشان رکھتے
تھے کہ کیا ذی حیات وجود جیسا کہ چند اشخاص کہتے ہیں آب و آتش سے
اپنی آخری شکل اختیار کرتے ہیں؟ ہم خون کی مدد سے سوچتے ہیں یا ہوا یا آگ
کی مدد سے؟ یا ان کی مدد سے نہیں بلکہ دماغ کی مدد سے جو دیکھنے سُننے
اور سونگھنے کی قوتوں کا دینے والا ہے اور کیا یادداشت اور رائے
ان قوتوں کا نتیجہ ہے جبکہ علم اس یادداشت اور رائے کی متحدہ
کوششوں سے ماخوذ ہے؟ اس کے بعد میں ان چیزوں کی تخریب کے
متعلق غور کیا کرتا تھا اور انقلابات کائنات پر بھی تا آنکہ میں اس نتیجہ پر
پہنچا کہ میں اس علم کو حاصل نہیں کر سکتا۔ میں اس بات کو تم پر ثابت کروں گا
ان علوم نے مجھے اس قدر کھو دیا تھا کہ میں وہ باتیں بھی بھول گیا جو اس
سے پہلے مجھے اور دوسروں کو معلوم تھیں۔ وہ تمام باتیں جن کا علم مجھے
ہو چکا تھا میرے دماغ سے محو ہو گئیں اور اُن میں تخلیق انسانی اور اُسکی
پرورش بھی شامل تھی۔ پیشتر ازاں مجھے یقین تھا کہ انسانی نشو و نما کا انحصار
کھانے پینے پر ہے کیونکہ کھانے پینے سے گوشت اور ہڈیاں بڑھتی ہیں اور
جسم کے تمام حصوں کو تقویت پہنچتی ہے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ چھوٹا جثہ بڑی
شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح ایک لڑکا ایک آدمی بن جاتا ہے۔ کیا
تمہارے خیال میں میرا یقین قابل تسلیم نہیں تھا؟

تھا سیبیس نے کہا۔

اب میں تمہیں اپنا دوسرا تجربہ بتاتا ہوں۔ جب میں ایک لانبے
آدمی کو ایک پست قد آدمی کے ساتھ کھڑے ہوئے دیکھتا تھا تو مجھے
یقینی طور پر محسوس ہوتا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اول الذکر مؤخر الذکر سے
ایک سر کے قریب اونچا ہو یا اسی طرح ایک گھوڑا دوسرے گھوڑے سے
بڑا ہو۔ اس سے بھی زیادہ یقین مجھے اس بات پر تھا کہ دس اور آٹھ
میں دو کا فرق ہے اور ایک چیز جس کی لمبائی دو ہاتھ ہو ایک ہاتھ لمبی
چیز سے دوگنی بڑی ہے۔

اور تم اب کیا خیال کرتے ہو؟ سیبیس نے دریافت کیا۔

اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے ان میں سے کسی کی علت کے متعلق کچھ علم
نہیں۔ جب تم ایک میں ایک کا اضافہ کرتے ہو تو مجھے یقین نہیں کہ وہ ایک
جس میں ایک جمع کیا گیا ہے دو بن گیا ہے یا جمع کیا گیا ایک اور جس میں ایک
جمع کیا گیا ہے اس اضافے سے دو بن گئے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان
کو جمع کرنے یا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھ دینے سے وہ دو بن
جاتے ہیں جب کہ جدا گانہ طور پر دونوں ایک ایک تھے اور دو نہ تھے
اسی طرح اگر ایک کو تم دو میں تقسیم کرو تو میں مطمئن نہیں ہو سکتا کہ تقسیم

اُس کے دوبن جانے کا باعث ہے کیونکہ ایک چیز جب دو بنتی ہے تو اُس کی وجہ کچھ اور ہی ہوتی ہے پہلی مثال کی وجہ تو یہ ہے کہ دو ایک ایک چیزیں ایک دوسرے سے ملادی گئی تھیں اور ایک کو دوسرے میں جمع کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کو جُدا کر دیا گیا ہے اور ایک کو دوسرے سے الگ کر دیا ہے نہ ہی میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ ایک چیز دوسری چیز سے کیونکر پیدا ہوتی ہے مختصراً یہ طریقہ مجھے نہیں بتا سکتا کہ ہر چیز کی تخلیق یا تخریب یا وجود کا کیا سبب ہے۔ میرے دماغ میں ایک دوسرے طریقہ کا دھندلا سا تصور ہے لیکن میں اِس کو اِس وقت تسلیم نہیں کر سکتا۔

لیکن ایک دن ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ وہ اناکسیگورس (Anaxagoras) کی ایک کتاب میں سے پڑھ رہا تھا کہ دماغ ہی ہے جو حکم دیتا ہے اور تمام چیزوں کا مبدا ہے۔ اس نظریہ کو معلوم کر کے میں بہت خوش ہوا۔ یہ مجھے صحیح معلوم ہوتا تھا کہ دماغ تمام چیزوں کی اصل ہے اور میں نے غور کیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو دماغ ہر چیز کو بہترین ترکیب دیگا۔ پس اگر ہم تخلیق، تخریب یا وجود کی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں معلوم کرنا چاہئے کہ وہ چیز کس طرح بہترین طریقہ سے موجود رہ سکتی ہے یا کام کر سکتی ہے، یا اس پر کام کیا جا سکتا ہے پس آدمی کو یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس کے لئے کونسی بات بہترین اور قابل ترین ہے۔ اس کا یقینی نتیجہ نکلے گا کہ اُسے معلوم ہو جائے گا کہ کونسی چیز بُری ہے کیونکہ دونوں باتیں اسی علم میں شامل ہیں۔ ان خیالات نے میری خوشی میں اضافہ کر دیا۔ میں نے خیال کیا کہ اناکسیگورس میں مجھے ایسا اُستاد مل گیا ہے جو میرے خیال کے مطابق مجھے وجود کی علت سمجھا سکتا ہے۔ اور میں سمجھتا تھا کہ سب سے پہلے وہ مجھے بتائے گا کہ زمین گول ہے یا ہموار اور پھر ثابت کرے گا کہ اس کی علت و ضرورت کیا ہے۔ اور زمین کے لئے کونسی صورت بہترین ہے، اگر وہ کہتا کہ زمین کائنات کے مرکزی حصے میں واقع ہے تو میرے خیال میں وہ وضاحت سے بیان کرتا کہ اس کے لئے ایسا ہونا ہی بہترین اور واجب تھا۔ اور اگر وہ مجھ پر یہ بات روشن کر دیتا تو میں مطمئن ہو جاتا، اسی طرح میں سورج چاند، ستارے اور اُن کی متعلقہ رفتار، گردش اور تبدیلیاں بھی دریافت کرنا چاہتا تھا یہ سننے کے لئے کہ ان کے لئے کونسی بات اور کام بہترین ہے میں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا جب اُس نے کہا کہ دماغ تمام چیزوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے علاوہ بھی کوئی وجہ بتائے گا کہ اُن کا ایسا ہونا ہی بہترین ہے، میرا خیال تھا کہ وہ ہر چیز کو کسی علت سے منسوب کرے گا، اور کائنات سے ایک علت کو اور پھر بتائے گا کہ ہر چیز کے لئے بہتر کیا ہے اور سب میں اچھا کیا ہے بے تاب ہو کر میں نے اس کی کتابوں کو اُٹھایا اور بڑے انہماک اور تیزی سے اُن سب کو پڑھا تاکہ میں یہ جان سکوں کہ بہترین کیا ہے اور بدترین کیا ہے۔

میری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں میرے دوست! جب مطالعہ نے مجھ پر ظاہر کر دیا کہ مصنف نے دماغ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اور چیزوں سے متعلق کوئی دلیل پیش نہیں کی، اُس کی علتیں ہوا فضا اور پانی جیسی عجیب چیزیں تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ کوئی ایسا آدمی ہوگا جو یہ کہکر اپنا بیان شروع کرے گا کہ سقراط وہی کرتا ہے جو دماغ کرتا ہے اور جو میرے اعمال کی وجوہ ظاہر کرتے ہوئے یہ کہیگا کہ میں اب یہاں اس واسطے بیٹھا ہوں کہ میرا جسم نسوں اور ہڈیوں کا مجموعہ ہے اور ہڈیاں سخت ہیں اور جوڑوں سے وابستہ ہیں، جبکہ نسیں کھینچ سکتی ہیں اور پھیل سکتی ہیں اور ان کے ساتھ ہی وہ گوشت جو اُن کو ترتیب میں رکھنے کے علاوہ ہڈیوں کو چھپائے ہوئے ہے کھنچتا اور پھیلتا ہے۔ چنانچہ جب ہڈیاں اپنی جگہ سے حرکت کرتی ہیں نسوں کا کھنچاؤ اور پھیلاؤ میرے لئے یہ ممکن بنا دیتا ہے کہ میں اپنے اعضا کو جھکا سکوں پس اپنی ٹانگوں کو موڑ کر بیٹھنے کی یہی وجہ ہے۔ اسی طرح وہ بتائے گا کہ میں تم سے کیوں باتیں کر رہا ہوں اس کی وجوہ وہ آواز، ہوا، سماعت، غرضکہ ایسی ہزاروں چیزوں کو ثابت کرے گا۔ لیکن وہ اس اصلی علت کو نظر انداز کر دے گا کہ جب سے اہل ایتھنز نے مجھ کو مجرم ٹھیرایا ہے

میں نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ یہاں بیٹھا رہوں اور ان کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کردوں۔ کیونکہ سنگِ مصر کی قسم ہے کہ اگر میرے خیال میں ریاست کی مجوزہ سزا کو برداشت کرنا ہی بہترین اور باعزت نہ ہوتا تو یہ ہڈیاں اور نسیں بہت مدت سے میگارا یا بوٹیا میں پہنچ چکی ہوتیں لیکن ان چیزوں کو علت بنانا سخت جہالت ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ہڈیوں نسوں اور جسم کے دوسرے حصوں کے بغیر میں اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوتا تو صحیح تھا لیکن یہ کہنا کہ میری حرکات کی بنا یہی ہیں اور کہ اس طرح میں دماغ کی مدد سے کام کر رہا ہوں نہ کہ اس قوت سے جو نیک و بد میں امتیاز کرتی ہے لاپروائی اور بے بضاعتی کا ثبوت دینا ہے اس سے ظاہر ہے کہ آدمی اصلی علت کو اُس علت سے جُدا نہیں کرسکتا جو تمام علتوں کی علت ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق میرے خیال میں ہر وہ شخص گفتگو کرتا ہے جو تاریکی میں راستہ ٹٹولتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کا صحیح نام کیا ہے، اسی طرح ایک شخص کہتا ہے کہ زمین ایک مرکزی ستون پر قایم ہے جس کو آسمان سہارا دئے ہوئے ہیں، دوسرا کہتا ہے کہ زمین چپٹی ہے اور ہوا پر قایم ہے

لیکن ان میں سے کوئی یہ معلوم کرنے کی سعی نہیں کرتا کہ ان دونوں کاموں کے پس پشت کون سی طاقت کام کر رہی ہے۔ نہ ہی وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ طاقت غیر ارضی ہے۔ بلکہ وہ اطلس کی تلاش کرتے ہیں جو اتنا مضبوط اور عقلمند ہے کہ دُنیا کو اپنے کاندھوں پر اٹھا سکے اور وہ ایک لمحہ بھی اس خیال پر صرف نہیں کرتے کہ یہ نیکی کی قوتِ جذب ہے جو تمام چیزوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر کوئی شخص اس قسم کی دلیل میرے سامنے پیش کرے لیکن میں خود یا کسی کی مدد سے ابھی تک اس دلیل کو نہیں پا سکا ہوں تاہم میں نے دوسرا طریقۂ کار اختیار کیا ہے اور میرا خیال ہے سیبیس کہ تم جاننا چاہتے ہو کہ وہ طریقۂ کار کیا ہے

یقیناً میں اُسے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے جواب دیا۔

نعرۂ قلندر

کہوں کیا کہ چیز کیا ہے تری ملتفت نگاہی
جو ملے تو پادشاہی نہ ملے تو روسیاہی

ہے کمالِ رقصِ صوفی بھی نشاطِ پادشاہی
بڑی مدتوں میں ٹوٹا یہ فریبِ خانقاہی

یہی امتیاز مجھ کو نہ کرے کہیں نمایاں
نہ ہو گر مری جبیں پر نہیں داغِ بے گُناہی

ہے عجیب طرزِ سادہ مِرا مسلکِ جنوں بھی
نہ اصولِ پادشاہی نہ طریقِ خانقاہی

مجھے کیوں ہو فکرِ شاہد کہ معاملہ ہے روشن
میں تری کھلی شہادت تو مری کھلی گواہی

میں ہوں نوجواں قلندر میں گدائے میکدہ ہوں
مری ٹھوکروں میں ساغر ہے غرورِ کجکلاہی

نعم

اک تارا

دھیرے دھیرے چھیڑ مغنّی دھیرے دھیرے چھیڑ

(ایک نامکمّل نظم کے دو بند)

جھَن سے نہ دھرتی پر آ ٹوٹے جھِل مِل کرتا تارا
اوشا[1] کے ماتھے کی بندی پوشن[2] کا گھوارا
پڑا کمل پر سُپنا دیکھے جوبن رَس متوارا
مدن بان کی کلیوں میں ہے خوشبو کی اِک دھارا
دیکھ ترے راگوں کی دھمک سے کھیل نہ بگڑے سارا
دھیرے دھیرے چھیڑ مغنّی دھیرے دھیرے چھیڑ

میں یوگن بےچاری ٹھیری من ماروں کا مارا
من ماروں کا مارا ہے تو سارا جگ دُکھیارا
نیّا میری ٹوٹی پھوٹی کوسوں دور کنارا
آشا کا اِک تارا ہے اِک تارے کی کیا سارا!؟
دیکھ ترے راگوں کی دھمک سے کھیل نہ بگڑے سارا
دھیرے دھیرے چھیڑ مغنّی دھیرے دھیرے چھیڑ

[1] صبح کی دیوی۔ [2] سورج دیوتا کی طرح ایک دیوتا۔

دُنیا کے فضلاء، واُمراء کے سنینِ وفات

(از ملفوظاتِ حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری مرحوم)

ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ

نام عبداللہ ابوالخیر۔ مشہور بہ ابوالخیر بن حضرت شاہ محمد عمر مدفون رام پور بن حضرت مولانا عبدالرشید صاحب مجددی نقشبندی دہلی میں جمعہ کے دن ۲۹ رجمادی الثانی سنہ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۶ رفروری سنہ ۱۹۲۳ء انتقال فرمایا۔

بیدل۔ سیّد حامد حسین شاہجہاں پوری

شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے۔ رسالہ مخزن کے مدیر رہے۔ کلکتہ سے کلیم نامی رسالہ جاری کرنے کا قصد تھا۔ کلکتہ میں بیمار ہوئے۔ پانچ چھ مہینہ بھوپال میں سل ودق میں مبتلا رہ کر وہیں ۲۴ رجنوری سنہ ۱۹۲۶ء کو انتقال فرمایا۔ مرحوم کے خاندان میں سوائے ایک بڑی بہن کے جو اپنے گھر کی ہیں اور کوئی موجود نہیں ہے (ہمدرد دہلی ۵ رفروری سنہ ۱۹۲۶ء)

مرزا ابلاق

امیر الملک مرزا ابلاق چشم وچراغ خاندان مغلیہ نے ۱۲ رمارچ سنہ ۱۹۲۶ء کو بروز جمعہ ایک بجے دن کے دہلی میں انتقال کیا۔ صوفی منش صاحب حال وقال تھے۔ دیوان ـــــــ طبع ہوچکا ہے۔ نظام حیدرآباد کے وظیفہ خوار تھے۔ کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی۔ (ہمدرد ۱۴ رمارچ سنہ ۱۹۲۶ء دہلی)

حکیم محمد اجمل خاں دہلوی۔ مسیح الملک

ولد حکیم محمود خاں صاحب۔ ولادت سنہ ۱۸۶۶ء۔ رامپور میں خاص باغ کی کوٹھی میں قلب کے درد سے دسمبر کی ۲۸ رتاریخ گزر کر رات کے اڑھائی بجے انتقال کیا۔ جنازہ موٹر پر دہلی بھیجا گیا۔ ۲۹ ردسمبر سنہ ۱۹۲۷ء کو دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قاضی محمد عبدالغنی صاحب

ساکن منگلور۔ ضلع سہارن پور۔ یو، پی صاحب طریقت ورئیس اعظم تھے۔ ۲۷ ررجب سنہ ۱۳۴۶ھ کو وطن میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالسلام عبّاسی پانی پتی

۲۳ رشوال سنہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۵ راپریل سنہ ۱۹۲۸ء دن کے سوا بارہ بجے پانی پت میں انتقال ہوا۔ عربی، فارسی اُردو کے ادیب اور صاحب ثروت تھے۔ قاری عبدالرحمن صاحب محدث پانی پتی کے شاگرد رشید اور قاری صاحب مرحوم کا وسیع درس اُن کی ذات سے قایم تھا۔

عبّاس علی خاں صاحب

والد محمود علی خانصاحب مرحوم۔ فوج میں جمعداری رسالہ پنجم سے لیکر مختلف عہدوں پر رام پور میں ملازم رہے۔ عہدہ نظامت سے علیحدہ ہوکر خانہ نشین ہوگئے۔ میرے چچازاد بھائی تھے میری حقیقی بڑی بہن سے شادی ہوئی تھی۔ عرصہ سے مرض نقرس میں مبتلا تھے۔ آٹھ مہینہ صاحب فراش رہے۔ مجھ سے تین برس بڑے تھے۔ ۹ راگست سنہ ۱۹۲۹ء کو رات کو ساڑھے دس بجے انتقال

ہوا۔ اخیر وقت تک ہوش درست تھے۔ مگر زبان بند تھی قل ہو اللہ پڑھی جاتی تھی۔ اور سکرات میں احدیت پر انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔ ۱۰ اگست کو میاں امیر شاہ صاحب کے احاطہ میں بموجب وصیت حافظ بہادر علی خاں صاحب مرحوم کی پائنتی دفن ہوئے۔

مرزا بشیر الدین احمد خاں

ولد نواب علاؤ الدین خاں برادر خورد نواب فرخ مرزا صاحب رئیس لوہارو۔ تھوڑی استعداد عربی کی تھی۔ فارسی کے ماہر ایرانی سے فارسی پڑھی تھی۔ گوالیار اور انگریزی میں ملازم رہے۔ جے پور سے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ منصب تھا۔ ریاست رامپور میں بھی کئی سال مصاحبت میں رہے۔ فارسی میں نسیمی تخلص کے ساتھ نظم لکھتے تھے باخدا۔ مرنجان مرنج اور دوست نواز تھے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں انتقال فرمایا۔ اہل حدیث سے اُلفت تھی۔

میر باقر علی داستان گو

ساکن دہلی محلہ بھوجلا پہاڑی داستان گوئی میں بے مثل تھے۔ زبان اُردو کے ماہر۔ بات چیت میں پھول برساتے تھے۔ ان کے مضامین ہمدرد اخبار دہلی میں نکلتے تھے۔ کانا باتی وغیرہ چند رسالہ ان کی تصنیف سے ہیں۔ ۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔

شیخ عبد العزیز شاویش

۲۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو قاہرہ میں انتقال ہوا۔ یہ انگریزوں کے خلاف تھے۔ ۱۹۱۰ء میں مصر میں قید ہوگئے تھے۔ قسطنطنیہ۔ ماسکو۔ اور برلن میں ان کے تعلقات کی وجہ سے مصر کا داخلہ بند تھا۔ مگر مصر میں وہ آئے اور ابتدائی تعلیم کے نگراں مقرر ہوئے اخیر میں سیاسیات کو چھوڑ کر خانہ نشین ہوگئے تھے۔

جسٹس محمد رفیق صاحب جج ہائیکورٹ

وممبر پریوی کونسل کا انتقال دہلی میں بتاریخ ۸ فروری ۱۹۲۹ء حرکت قلب بند ہونے سے ہوا

مولوی عطاء اللہ خاں

عرصہ تک مڈل اسکول رامپور کے ہیڈ مدرس رہے۔ اخیر میں علی گڑھ یونیورسٹی میں دینیات کے مدرس تھے ۱۲ نومبر ۱۹۲۸ء کو رامپور میں انتقال ہوا۔ عربی کے عالم تھے، انگریزی میں بی اے تک تعلیم تھی۔

سیّدی محمد الحبیب ٹونس بک

۱۱ فروری ۱۹۲۹ء کو ٹونس میں انتقال ہوا۔ اکہتر سال کی عمر ہوئی۔ اور ۱۹۲۲ء میں ٹونس کے فرماں روا ہوئے تھے۔ سیّدی محمد الحبیب ولد سیّدی محمد المامون ابن سیّدی حسین ہیں۔ سیدی حسین ۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۹ء تک ٹونس کے فرماں روا تھے۔ یہ خاندان ترکی نژاد ہے۔ ان کے آباؤ اجداد ترکی سپاہی تھے جنہوں نے قبرص فتح کیا تھا۔ سیدی مرحوم فنونِ لطیفہ کے بڑے استاد تھے۔ شاعر بھی تھے۔ حال میں جب مولائی یوسف سلطان مراکش پیرس گئے تھے تو اُن کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا جو بہت مشہور ہوا۔ ان کی جگہ اب سیّدی محمد الہادی کے چھوٹے بھائی اور سیدی حسین کے صاحبزادہ حکمراں ہوئے ہیں جو ۱۸۸۲ء سے ۱۹۰۲ء تک فرمانروا تھے۔ ان ہی کے بھائی محمد الصادق نے ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی سیادت قبول کی تھی۔ محمد الحبیب کے صاحبزادہ کا نام سیّدی محمود ہے جو اب حکمراں ہوئے ہیں۔

(از ہمدرد ۸ مارچ ۱۹۱۹ء)

داؤد اپسن

ایڈیٹر مُسلم آوٹ لک کا انتقال بعارضہ نمونیا ۱۹ فروری ۱۹۲۹ء کو ہوا۔ یہ خود مسلمان ہوگئے تھے اور مسلمانوں کے طرفدار تھے۔ اخبار کیپٹل۔ انڈیپنڈینٹ نیشن انگریزی اخبارات کے بھی ایڈیٹر رہے۔

حمید اللہ ولد مولوی بشارت اللہ

ابن مولوی سعد اللہ انتقال بعارضہ اسہال بتاریخ ۲۶ اپریل ۱۹۲۹ء شب میں ہوا۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا غیر کفو قوم سے چھوڑا۔

محمدی بیگم

بنت صاحبزادہ سجّاد علی خاں مرحوم از بطن صاحبزادی نواب سیّد محمّد حامد علی خاں بہادر

کا انتقال بعارضہ دق یکم مئی ۱۹۲۹ء کو ہوا۔ مقبرہ جناب عالیہ میں مصطفےٰ علی خاں کی قبر کی پائنتی دفن ہوئیں۔

صاحبزادہ امجد علی خاں

ولد نواب احمد علی خاں رئیس مالیر کوٹلہ کا انتقال ۲؍ مئی ۱۹۲۹ء کو مالیر کوٹلہ میں بعارضہ موتی جھرہ ہوا۔ اس لڑکے کا نکاح ۱۹۲۸ء میں بمقام دہرہ دون صاحبزادی ننی بیگم صاحبہ بنت جناب نواب سید حامد علی خانصاحب بہادر دام ملکہم از بطن فرخی بیگم صاحبہ ہوا تھا۔

بدری ناراین (پنڈت) چودھری پریم گاون

رئیس مرزا پور۔ پرانے رسم و رواج کے پابند۔ ایڈیٹر ہندی رسالہ آنند کدم بینی۔ ڈرامہ نویس۔ پریسیڈنٹ ہندی سہتیا سمیلن کلکتہ۔ ہندی کے مشہور شاعر۔ بھارتندو ہرش چندر کے دوست کا ۱۴؍ فروری ۱۹۲۳ء کو انتقال اپنے وطن میں ہوا۔ ایک لڑکا یادگار چھوڑا۔ ہندی نظم و نثر کے بڑے ادیب تھے۔

تاتار خاں

قوم کا ترک تھا۔ خراسان کا کوئی بادشاہ مع حاملہ بیوی کے ملتان اور دیپالپور پر حملہ آور ہوا۔ وہیں بچہ پیدا ہوا۔ پیدائش کے روز سلطان تغلق نے اُس پر حملہ کیا۔ بادشاہ فرار ہوگیا۔ یہ بچہ سلطان تغلق نے پایا۔ اور اس کو پرورش کیا۔ اور تاتار ملک نام رکھا۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں جوان ہوگیا۔ نہایت شجاع اور بہادر تھا۔ علم و فضل میں کامل تھا۔ تخلص تتار تھا۔ سلطان محمد تغلق ایک دفعہ ناراض ہوگیا تو تتار خاں نے یہ غزل بھیجی اور عفو حضور ہوگیا۔

دہ ندانم از کجا رنجیدۂ　　　بے سبب از دوستاں ببریدۂ

تفسیر تاتارخانی نہایت اہتمام سے لکھی اور فتاوائے تاتارخانی مرتب کیا۔ یہ فتاوی تیس جلدوں میں مرتب ہوا تھا۔ حج بھی کیا۔ سلطان فیروز شاہ (المتوفی ۷۹۰ھ) کے ابتدائی عہد حکومت میں انتقال کیا۔ نہایت دیندار وزیر تھا (تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف صفحہ ۳۸۸ مطبوعہ)

عبدالمجید خاں (کرنل)

سابق وزیر خارجیہ ریاست پٹیالہ انتقال وسط ۱۹۱۷ء۔ ٹرسٹی علی گڑھ کالج۔ ہمدرد قوم۔ علی گڑھ کالج سے بہت الفت تھی۔ مسلمان راجپوتوں میں راجپوت کانفرنس قایم کی۔ اپنا بہت روپیہ اور وقت اس کام میں خرچ کیا۔ باپ کا نام کرنل غلام رسول خاں تھا۔ وہ بھی پٹیالہ کے سردار تھے۔

عین الملک مولف ترسل عین الملکی

مشہور عین ماہرو کے نام سے تھا۔ سلطان فیروز شاہ (المتوفی ۷۹۰ھ) آغاز جلوس میں دیوان وزارت بنایا۔ علم و فضل میں کامل تھا۔ اس کے بھائیوں کی حرکات ناشائستہ سے سلطان محمد تغلق نے کچھ دنوں نظر سے دور رکھا تھا۔ پھر سلطان نے بحال کردیا۔ سلطان فیروز شاہ کے عہد میں خان جہاں وزیر سے عین الملک کو کاوش تھی۔ اخیر کو معزول ہوا اور ملتان کا صوبہ دیا گیا مگر دیوان وزارت سے اس کو جدا کردیا (تاریخ فیروز شاہی شمس سراج صفحہ ۴۰۶ مطبوعہ)

خان جہاں وزیر کا انتقال ۷۷۰ھ میں ہوا اور شاہ نظام الدین محبوب الٰہی کے پاس دفن ہوا۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی

ابن مولوی عبدالوہاب ابن مولوی عبدالرزاق ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء ۵ رجب ۱۳۴۴ھ بعارضہ فالج لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ صاحب تصانیف کثیرہ۔ نہایت خلیق۔ نیک نہاد متواضع تھے۔

خان بہادر منشی رضا حسین

قوم کنبوہ ساکن بریلی انگریزی اور فارسی میں معقول استعداد تھی۔ گورنمنٹ ممالک متحدہ کے میر منشی اور پریسیڈنٹ گورنمنٹ پریس رہے۔ دیانت اور نیک نیتی میں ضرب المثل تھے۔ جوان ہونہار بیٹا زہر کھا کر مرگیا۔ صبر و شکر سے زندگی بسر کی۔ ۷؍ اپریل ۱۹۲۱ء کو بعمر ستر سال بریلی میں

انتقال کیا۔ مرحوم کے عزیز اقبال حسین صاحب سے مجھے بھی خصوصیت تھی۔ ان کے ساتھ مرحوم کا بچّہ بھی میرے ہاں ملنے کے لئے آیا تھا۔

بھگوتی پرشاد سنگھ بہادر کے۔ سی۔ آئی۔ ای

والئ ریاست بلرام پور۔ مہاراجہ اور سر کا خطاب تھا ۱۹ جولائی ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۹۴ء میں مہاراجہ سر دگنج سنگھ نے بوجہ لاولدی متبنیٰ کیا۔ ۱۸۹۴ء میں بجائے سر دگنج سنگھ مسند نشین ہوئے۔ جولائی ۱۹۰۰ء میں اختیارات ریاست حاصل ہوئے ایک سال سے علیل تھے ۴ مئی ۱۹۲۱ء کو لاولد انتقال کیا۔ بیالیس سال کی عمر ہوئی۔ کنور رکم بہادر شاہ کو متبنیٰ کر لیا ہے۔ یہ راجہ زمیندار ہیں۔ بہت بڑی آمدنی زمینداری کی ہے کہتے ہیں ساٹھ لاکھ سال کی آمدنی ہے۔ کروروں روپے جمع ہیں اختیارات دیوانی و فوجداری بالکل نہیں ہیں۔

جیمس لاٹوش (سر)

لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ (ہندوستان)

ولادت دسمبر ۱۸۴۴ء قوم آئرش تھی۔ ۱۸۶۷ء میں ہندوستان آئے۔ مختلف عہدوں پر کام کیا۔ ۱۹۰۱ء میں لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ ہوئے۔ اور ۱۹۰۶ء تک اسی عہدہ پر رہے ۱۹۰۷ء سے تا ۱۹۱۴ء سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کے ممبر رہے۔ ستتر برس کی عمر پا کر ۶ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو مر گئے۔

حسین رضا خاں حاکم صدر

ولد علی رضا خاں ساکن رامپور محلہ

گھیر نجو خاں۔ قوم پٹھان۔ ہمیشہ سے معزز خاندان ہے۔ نجو خاں جو جنگ دوجوڑہ میں مارے گئے۔ ان کے خاندان سے ہیں۔ نوشت و خواند بہت معمولی اردو کی ہے۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے انتقال (۱۸۸۷ء) کے بعد جنرل اعظم الدین خاں کا اقبال یاور ہوا۔ ان کو جمعدار رسالہ میں کر دیا۔ چند روز کے بعد ترک تعلق کیا عالیجناب نواب محمد حامد علی خاں بہادر نے ان کے فرزند اکبر کو شرف دامادی عطا فرمایا۔ اور یہ شرط ٹھیری کہ شیعہ مذہب پر تربیت ہوگی ان کو تحصیلدار کیا۔ پھر حاکم صدر مقرر ہوئے۔ مال کثیر جمع کیا۔ تاجران شہر سے ہر گاؤں میں نفع کی شرکت تھی۔ لاکھوں روپیہ آگیا۔ چند سال سے ذیابیطس کا عارضہ تھا۔ چھ مہینہ تک امراض کی شدت رہی ۲۶ اپریل ۱۹۲۱ء کو منگل کے دن انتقال ہوا۔ نواب محمد حامد علی خاں بہادر خود تشریف لے گئے۔ اعزہ کی تسلی فرمائی۔ آنریری عہدہ میجر کا تھا۔ دفن کے وقت فوجی ماتمی جلوس بھی تھا ۲۷ اپریل کو اس رنج میں تعطیل دفاتر دی گئی۔ اپنے گھر کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ فرزند اکبر نواب دولہ صاحب داماد دربار رام پور ہیں۔ فرزند اصغر کا نام حامد رضا خاں ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

رحمت اللہ ابراہیم کریم بھائی بمبئی

۲ مئی ۱۹۲۱ء کو بعارضہ نمونیا انتقال ہوا۔ لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر تھے۔ جمعہ کے دن تک اپنے کارخانہ کریم بھائی ابراہیم اینڈ کمپنی میں کام کیا۔ شنبہ کے دن بخار ہوا۔ دوشنبہ کے دن انتقال ہوا۔ ان کے مرنے سے ایک قومی کام کرنے والے کی کمی ہوگئی۔ میونسپل کارپوریشن میں خوب کام کیا۔ ۱۹۱۸-۱۹ء میں میونسپل کارپوریشن کے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ اور کارخانہ داران انجمن کی ایسوسی ایشن کے چیرمین منتخب ہوئے۔ چیرمینی سے علیحدہ ہونے کے وقت نہایت زبردست تقریر متعلق کارخانہ جات صنعت و حرفت کی تھی۔

شمس الدین اعجاز رقم

نہایت اعلیٰ درجہ کے خوشنویس

بہت سے شاگرد ہیں۔ کاپی نویسی میں خوب شہرت پائی اور ان کے شاگردوں نے اعجاز رقم کے لقب سے مشہور کیا۔ نول کشور کے لکھنؤ کے مطبع میں ملازم تھے۔ ۱۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو انتقال ہوا۔

اُردُو شاعِری کی شاہکار کتابیں

بادۂ مشرق .... مصنفہ ساغر نظامی قیمت صہ علاوہ محصول

صبوحی ..... (غزلیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″

سرودِ شباب (رباعیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت عہ ″

صبحِ نو ..... (نظمیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۱۲ر ″

ہدیۂ روح ..... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″

پیامِ سروش ... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″

حریمِ فطرت ..... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″

نقوشِ باقی .... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″

صنم کدۂ حیات ... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″

حدیثِ گل ..... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″

غنچہ زار ...... ″ مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″

رموزِ میکدہ و روحِ بادہ (رباعیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″

جرعۂ آخریں .... (نظمیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۸ر ″

ساغرستان .... (غزلیات) مصنفہ ساغر نظامی قیمت ۱۲ر ″

کارِ امروز (نظمیات) مصنفہ حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی قیمت عہ ″

کلیمِ عجم (غزلیات) مصنفہ حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی قیمت ... عہ علاوہ محصول

اثرستان (غزلیات) مصنفہ نواب جعفر علی خانصاحب آثر بی-اے- قیمت ... عہ ″

نقش و نگار (نظمیات) مصنفہ حضرت جوش ملیح آبادی قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ ″

شعلہ و شبنم (نظمیات) مصنفہ حضرت جوش ملیح آبادی قیمت ... سے ″

فکر و نشاط (نظمیات) مصنفہ حضرت جوش ملیح آبادی قیمت ... عہ ″

شعلۂ طور (غزلیات) مصنفہ حضرت جگر مراد آبادی قیمت ... سے ″

ضربِ کلیم (نظمیات) مصنفہ علامہ ڈاکٹر سر اقبال قیمت ... عہ ″

باقیاتِ فانی (غزلیات) مصنفہ حضرت فانی بدایونی قیمت عہ و عہ ″

سرودِ زندگی (غزلیات) مصنفہ حضرت اصغر گونڈوی قیمت ... عہ ″

بانگِ درا (نظم و غزل) مصنفہ ڈاکٹر سر اقبال قیمت عہ و سے ″

اسرار و رموز (نظم) ″ ″ قیمت عہ مجلد عہ ″

پیامِ مشرق (نظم) ″ ″ قیمت ... سے ″

جاوید نامہ ″ ″ ″ قیمت مجلد للعہ ″

خضرِ راہ ″ ″ ″ قیمت ... ۴ر ″

شکوہ و جوابِ شکوہ ″ ″ ″ قیمت ۴ر و ۶ر ″

شاہنامۂ اسلام (نظم) مصنفہ ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری ۔ قیمت ہر دو جلد سے علاوہ محصول

ملنے کا پتہ :- **مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ**

اِرشاداتِ عالیہ

اعلیٰ حضرت ہز ہائینس نواب حافظ محمّد سعادت علی خان بہادر بالقابہ فرمانروائے ٹونک

میری نیازمندانہ عرضداشت پر اعلیٰ حضرت نے اپنے ارشاداتِ عالیہ صفحاتِ ایشیا کے لئے عطا فرمائے ہیں۔ اس عطائے عالی پر ادارۂ ایشیا مجسّم شکریہ ہے، اعلیٰ حضرت کا ذوقِ شعری جس قدر بلند، لطیف اور دلنواز ہے اس کی ستائش کم از کم مجھ سے ممکن نہیں، مگر ہاں میں اس مصرعہ پر برسوں سر دُھن سکتا ہوں۔

"جو بھول کر یاد آ گیا ہیں تو یاد کر کے بھلا رہے ہیں"

ساغرؔ

جو آہ وزاری سے وقتِ رخصت لگی ہوئی ہم بجھا رہے ہیں
تسلّیوں سے تشفّیوں سے بجھی ہوئی وہ لگا رہے ہیں

ابھی وہ آئے نہیں ہیں لیکن بندھا ہوا ہے خیالِ رخصت
تصوّر آنے کا اُن کے مجھ کو بتا رہا ہے کہ جا رہے ہیں

ہے اُن کا پہلے پہل یہ آنا خوشی کا حیرت کا کیا ٹھکانا
بجا ہے بیجا نہیں ہے جانا جو میرے اوسان جا رہے ہیں

وہی تو ایمانِ معرفت ہیں وہی تو جانِ عبودیّت ہیں
خودی کو اپنی جو کھو رہے ہیں جو خود کو تم پر مٹا رہے ہیں

خدا ہی جانے مآل کیا ہو پیامی تیرا خیال کیا ہو
ہم آپ اپنے کو کھو رہے ہیں پتہ تجھے کیا بتا رہے ہیں

بلا کے عیّار۔ شوخ چنچل۔ بلا کے ضدّی بلا کے چالی
کہ بات بگڑی ہوئی جو دیکھی تو اب بگڑ کر بنا رہے ہیں

یہ اُن کی آنکھوں سے مل رہی ہے وہ اُن کے عارض سے مل رہا ہے
کھٹک رہی ہے نظر میں نرگس تو گُل پہ ہم خار کھا رہے ہیں

خیال میں جو بسے ہوئے ہیں اُنہیں نے دیوانہ کر دیا ہے
اُنہیں نے اندھا بنا دیا ہے نگاہ میں جو سما رہے ہیں

نہ وعدہ آنے کا کر گئے وہ نہ ہم کو گھر ہی بلا گئے وہ
یہ کہہ گئے ہیں خدا کو سونپا تو ہم بھی دُنیا سے جا رہے ہیں

عزیز و ہمدم سے کوئی پوچھے اس آہ وزاری سے مدّعا کیا
ہم اپنی میعاد ختم کر کے جہاں سے آئے تھے جا رہے ہیں

کہا سعید اور پھر کہا یوں یہ نام کس کا ہے ہم نہ سمجھے!؟
جو بھول کر یاد آ گیا ہیں تو یاد کر کے بھلا رہے ہیں

جذباتِ عالیہ

ایشیا اور اُردو ادب کے سرپرست عالی جناب شیخ عبدالخالق بی اے ولی عہد بہادر ریاست مانگرول دام اقبالہ نے بطورِ خاص صفحات ایشیا کے لئے اپنی یہ تازہ غزل عطا فرمائی ہے۔ میں اس لطف و کرم کا بیحد شکر گذار ہوں۔ غزل کی بے ساختگی شوخی اور لطافت دلنوازہی نہیں دلدوز بھی ہے۔

ساغر (نظامی)

تری چشمِ سرور آگیں کو ہم میخانہ کہتے ہیں — لبِ رنگیں کو ہم دو آتشیں پیمانہ کہتے ہیں

ہو تو ہی مدعا جس کا اُسے مستانہ کہتے ہیں — قصور و حور جو چاہے اُسے دیوانہ کہتے ہیں

شکستِ کاسۂ دل کی جو میں فریاد کرتا ہوں — تو مجنوں کر قیس اور لیلےٰ کا وہ افسانہ کہتے ہیں

ہماری عشق بازی پر ہے واعظ معترض لیکن — نہو جس دل میں یہ جذبہ اُسے ویرانہ کہتے ہیں

جو ہو نا آشنا اندازِ ایثار و محبت سے — اُسے اسرارِ لطفِ زیست سے بیگانہ کہتے ہیں

ہوں انساں جانتے ہیں اور پھر بھی آزماتے ہیں — اسی انداز کو اندازِ معشوقانہ کہتے ہیں

سُنی تم نے بھی خالق حضرتِ واعظ کی بے ربطی
جوانی میں جحیم و خلد کا افسانہ کہتے ہیں

جب کوئی دوست جذبات کا پجاری ہو کر حُسن و عشق کی خلوتوں میں دادِ عیش دینے لگے تو امن پسند بندگانِ اخلاص کے لئے دوستانہ تنقید کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی' ـــــ اب آپ اس کو دوستی کی سپر اندازی کہہ لیجئے' یا تعلق کی تہذیب و شرافت ۔ بہرحال جس کے ہاتھ حُسن کی شانہ گیری میں مصروف ہوں' اس سے دست و گریباں ہونے کی کس میں طاقت ہے' ـــــ ! ؟

ایک مشہور میرٹھی شاعر دوست جب یوں ہاتھ سے جاتا رہا تو اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی تھی کہ اسکے اور اپنے ایک دوسرے ہم پیشہ و ہم ذوق دوست کو خلوت سے کھینچ نکالا جائے اور ثابت کر دیا جائے آپ اپنی بُت گری و بُت پرستی پر اس درجہ نازاں کیوں ہیں' کنارِ آذر ہی سے ابراہیم پیدا ہوتے ہیں'۔

"کہ خاکستر ہی کرتی ہے بالآخر اک شرر پیدا"

یہ چند اشعار جو بلیغ فکر' وسیع جذب اور گہرے لطیف کیف کے حامل ہیں میرے لئے مخصوص تھے مگر آپ جانتے ہیں میں بخیل نہیں اس لئے آپ کو بھی شریک لطف کرتا ہوں' یہ اُسی بانسری کے نغمے ہیں جو ابھی اپنے خیال میں محض شرمندۂ نَے ہے ۔ اے کاش نَے نواز محسوس کر سکتا کہ اُس کا سینہ تو سوزِ فطرت کے نغموں سے کبھی کا پھنک چکا ہے ۔

ساغر

خود اپنی پرستش کرتے ہیں کچھ دیر و حرم سے کام نہیں ـــ وہ طرزِ نیاز خاص ہے یہ جو کفر نہیں اسلام نہیں

ہے جوشِ عطائے ساقی بھی کب وجہِ سکونِ تشنہ لبی ـــ یا جام بقدرِ بادہ نہیں یا بادہ بقدرِ جام نہیں

ہم توڑ دیں قیدِ ہستی بھی یہ قیدِ قفس تو چیز ہے کیا ـــ اک جنبشِ قلبِ مضطر میں یا ہم ہی نہیں یا دام نہیں

ہمت ہی نہیں کی ورنہ ابھی اک جست میں منزل جا لیتے ـــ کٹتی ہے کہیں یوں راہِ طلب دو گام چلے دو گام نہیں

آزاد رہے' ناکام جیئے پابند بھلا کیا شاد رہیں
ہو صحنِ چمن یا کنجِ قفس ہم کو تو کہیں آرام نہیں

پروفیسر حبیب الرحمن صدیقی ایم اے
(میرٹھی)

فردوسِ ریاض

(از قاضی محمد ریاض الدین انصاری ریاضؔ ایم۔ اے۔ بی ٹی (علیگ) لشکر)

مولانا حالیؔ کے زمانے سے اب تک اک شور ہے کہ شاعری کو اصلاحی جذبات کا حامل ہونا چاہئیے۔ مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ اسکے لئے شاعری میں یا اسکے اصناف و آئین میں انقلاب کی ضرورت نہیں ہے۔ اسکے لئے تو ذہنی اور قلبی انقلاب کی ضرورت ہے، یعنی وہ سانچہ بالکل بدل جانا چاہئے جس میں اس وقت تک فکرو احساس ڈھلتے رہے، ہر با فکر کیلئے آج ذہنیت اور نقطۂ نگاہ میں تغیرّ لابدی ہے، مگر اسکے باوجود میں شاعری میں بالواسطہ تو عیظ و تلقین کا قطعی قائل نہیں اور بے روح و بے اصل تغزل کو دفن کردینے کے قابل سمجھتا ہوں، لوگ اقبال کو دیکھ کر الفاظ اور "مومنیت" کے نقال تو بن جاتے ہیں مگر کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ہمیں ایسا کیوں کرنا چاہئیے۔ لوگ غلط خیال کررہے ہیں، اقبال اس وقت شاعری اور شعریت کے آخری مرکز پر نہیں ہے بلکہ فکر اور اپنے فلسفۂ خودی کی چوٹی پر ہے، جہاں پہنچکر جذبات کی حیثیت ختم ہوجاتی ہے مگر کاروبارِ حیات محض فلسفے سے نہیں چل سکتا زیادہ تر اس کے لئے جذبات کی ضرورت ہے، جہاں تک جذبات محبت کا تعلق ہے انسان پتھر کا بھی ہوجائے تو ان سے بچ نہیں سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعری نے کہاں تک ان جذبات کی صحیح خدمت کی ہے جو لوگ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے اس کو دیکھنے کے عادی ہیں ان کا یہی اعتراض ہے کہ اُردو تغزّل میں بہت کم "رومانی وجودیت" پائی جاتی ہے۔ یہ "رومانی وجودیت" زندگی کو نہ سمجھنے غلط احساس اور کھوکھلے معاشری نظام کے غلام بنے رہنے کی وجہ سے شاعری میں پیدا نہیں ہوسکی۔ شاعری کو امرا کی نشاط انگیزی اور بزم آرائیوں کا کھلونا بنا دینے کی وجہ سے بلند افکاری کی منزل نصیب نہ ہوئی۔ ہم نوابوں کے دماغوں سے سوچتے تھے اور ہمارے سینوں میں نوابوں کے دل رکھے ہوئے تھے۔ دماغی طور پر شاعر فروخت ہوچکا تھا اور اسکے عوض محاورات اور الفاظ کی بازی گری اس کو حاصل ہوگئی تھی۔

اب ہر چیز نے کروٹ لی ہے اور نقطۂ نگاہ میں انقلاب پیدا ہوا ہے، بعض لوگ شعر کو "مذہب" کا درجہ دینے لگے ہیں، یہ اس ماحول سے کتنا مختلف ہے کہ ایک زمانے میں بزرگوں کے سامنے شعر پڑھنا، مخرب اخلاق خیال کیا جاتا تھا۔

گو قاضی ریاض الدین انصاری ایم۔ اے نے قدیم شاعرانہ "اسکول" کی آغوش میں پرورش پائی ہے، مگر ان کا کلام "رومانی حقیقت نگاری" کا آئینہ دار ہے، اور لذّتیت۔ تاثیر کی بے ساختہ شہد آفرینی، ان کے دل اور ان کی روح کے ارتقا و تکمیل کا پتہ دیتی ہے۔

دنیا میں اگر میں ڈرتا ہوں تو "دوست" سے کہ اس سے زیادہ خطرناک مخلوق افریقہ کے کسی جنگل میں بھی نہ پائی جاتی ہوگی اس لئے میں ایسا خطرناک خطاب تو ریاضؔ کو نہیں دے سکتا مگر ان کے مدّاحوں میں ضرور ہوں، وہ ایک سلیم الطبع، گوشہ گیر اور من موہن انسان ہیں۔

ساغر

غزل

جاتی نہیں ہے اُن کی محبّت کو کیا کروں
اللہ اپنے دل کو، طبیعت کو کیا کروں

کرتا ہوں اُن سے مِلنے کی تدبیر گو ہزار
قسمت ہی جب بُری ہو تو قسمت کو کیا کروں

روزِ ازل سے حُسن طبیعت کو ہے پسند
اِس حُسنِ ذوق، حُسنِ طبیعت کو کیا کروں

دنیا پڑی ہے، میری تو ناصح خطا معاف
میں تیری پندِ ترکِ محبّت کو کیا کروں

محتاط ہے ہزار مِرا عشقِ سادہ دِل
حُسنِ فریب کار کی فطرت کو کیا کروں

اوّل تو ترکِ عشق پہ راضی نہیں ہے دِل
دِل پھر بھی مان جائے طبیعت کو کیا کروں

خود کو تو روک لوں گلۂ جور سے مگر
یہ کیئے دل کی خوئے شکایت کو کیا کروں

گو واقفِ مصائبِ انجام ہوں مگر
آغازِ دلفریبِ محبت کو کیا کروں

مانوس عشق میں تو نہیں اپنی ذات سے
لیکن ادا شناسیٔ فطرت کو کیا کروں

مانا کہ مستحق وہ وفا کے نہیں مگر
پابندیٔ رسُومِ محبّت کو کیا کروں

اس کو سُنا تو اُن کے بھی آنسو نکل پڑے
پُر دردیٔ بیانِ محبت کو کیا کروں

ہر چند اب بدل گئی طرزِ غزل ریاض
میں اپنے ذوق و رنگِ طبیعت کو کیا کروں

مسلسل غزل

آ کہ میری زندگی ناکام ہے تیرے بغیر — دل بہت بے چین، بے آرام ہے تیرے بغیر

آ کہ ہر لحظہ ترقّی پر ہے درد و اضطراب — ہر نفَس اِک موت کا پیغام ہے تیرے بغیر

آ کہ مٹتا جا رہا ہے اب سکونِ زندگی — چین کے بدلے خدا کا نام ہے تیرے بغیر

آ کہ بڑھتی جا رہی ہیں رات دِن مایوسیاں — ہر گھڑی اک نزع کا ہنگام ہے تیرے بغیر

آ کہ اب بے کیف سی رہنے لگی ہے زندگی — صبحِ لطف و عیش غم کی شام ہے تیرے بغیر

آ کہ مٹتا جا رہا ہے لطفِ احساسِ وجود — زندگی یعنی برائے نام ہے تیرے بغیر

آ کہ اب دل کو کسی پہلو نہیں صبر و قرار — جان وقفِ حسرت و آلام ہے تیرے بغیر

آ کہ ہیں بے لطف بزمِ عیش کی رنگینیاں — کس قدر بے کیف دَورِ جام ہے تیرے بغیر

آ کہ تکمیلِ وفا کے واسطے مضطر ہے دل — عشق اک آغازِ بے انجام ہے تیرے بغیر

اب نہ وہ اگلی سی راتیں، اب نہ وہ پہلے سے دِن — اب نہ صبح و شام، صبح و شام ہے تیرے بغیر

آرزوئے زیست، شوقِ دید، ارمانِ وصال
دل کی جو حسرت ہے، وہ ناکام ہے تیرے بغیر

افکارِ رزمی

ستمبر ۱۹۴۳ء نمبر میں "گفتار و کردار" کے عنوان سے حضرت رزمی صدیقی کی ایک نظم شائع کی جاچکی ہے، یہ نظم اصلاحی خیالات سے معمور تھی، اصلاحی نظم میں میرے خیال سے کسی شاعر کی اصلی جودت اور صحیح وجدان کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ "آپ بیتی" میں شاعر کے جوہر کھُلتے ہیں۔ اور جو "جگ بیتی" کے بیان کرنے پر بھی قادر ہو، اسکے کیا ہی کہنے۔ زیر نظر ایشیا میں رزمی صاحب کی دو غزلیں "آپ بیتی" اور "جگ بیتی" کے عنوان سے شائع کی جارہی ہیں، جس میں تغزل، قدرت کلام اور فکر کی تیز روح پائی جاتی ہے۔

میری نہ نبھی برہمن عہد شکن سے ! ‏ ‏ بُت سے بھی وہ پھرتا نہیں بھولا میں خدا کو

کیا شبابِ فکر ہے، سیاسیات پر کیسا شاعرانہ انتقاد ہے "

برہم وہ ہوئے عاشقِ مشرک مجھے سمجھے ‏ ‏ طنزاً بخدا میں نے پکارا تھا خدا کو

اڈیٹر

"جگ بیتی"

آدابِ خرام اب میں سکھاؤں گا صبا کو ‏ ‏ روندا تو ہے اس نے ترے نقشِ کفِ پا کو

آ، سرِ دپسینہ مرے ماتھے کا سکھا دے ‏ ‏ پہنچی ہے دوا بھی کہیں دامن کی ہوا کو

کرتی ہے مرے در سے ترا نقشِ قدم محو ‏ ‏ گیسو کی ترے بُو نہ ملے موجِ صبا کو

ظلمت میں شبِ ہجر کی جگنو بھی نہ چمکے ‏ ‏ زینت ہے حرام آج مرے گھر کی فضا کو

فرمایا مرے سر سے قدم اپنے ہٹا کر ‏ ‏ ہم خوب سمجھتے ہیں تری لغزشِ پا کو

برہم ہوئے وہ عاشقِ مشرک مجھے سمجھے — طنزاً بخدا میں نے پکارا تھا قضا کو

آپ بیتی

جینا ہو تو ملحوظ رکھ آئینِ بقا کو — مرنا ہو تو رسوا نہ کر آدابِ فنا کو

کوئی نہ مرے قافلے والوں کو جگائے — سُن کر ابھی سوئے ہیں یہ آوازِ درا کو

میری نہ بنی برہمنِ عہد شکن سے — بُت سے بھی وہ پھرتا نہیں بھولا میں خدا کو

نیکی کا یقیں، جُرم کی لذّت ہے خطر میں — اللہ بدل دے خبرِ روزِ جزا کو!

پُر چاک ہیں پتّے جو ہوا میں متحرّک — یہ شانے ہیں کیا گیسوئے امواجِ ہوا کو

کافر میں خدا سے ترا شکوہ نہیں کرتا — رونے دے بغاوت نہ سمجھ یادِ خدا کو

صیّاد مری قوّتِ پرواز سے انکار!؟ — اب جب میں ترسنے لگا آزاد ہوا کو

دُکھّا ہوا دل، ضبط کی حد، آہ کی نیّت — یارب! یہ پرائے ہیں سنبھال ارض و سما کو

رسوائی میں اتنی نہ تھی ایذائے ندامت — اِس تیری خطا پوشی سے پہنچا میں سزا کو

ہر بات میں لب ملتے ہیں اُٹھ جاتے ہیں اب ہاتھ
رزمی کبھی تم وہم سمجھتے تھے دُعا کو

عذرا کی آمد

(حضرت نازؔ انصاری سہارنپوری)

آلیشیا کو یہ فخر ہے کہ وہ "جدت" کا ناشر ہے، اور اس کا مقصد زندگی کے تمام کاروبار میں ایک انقلاب آفرینی ہے۔ ہر قوم میں ادبی انقلاب ہی قومی زندگی کی تعمیر و حیات کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اس وقت قومی زندگی کے اُن خشک ستونوں سے بحث نہیں ہے جو معاشری اور سیاسی وزن کو اُٹھاتے ہیں، اس وقت بحث ہے اُن جزوی محرکات سے جو کسی قوم میں نئی حیات پیدا کرتے ہیں، شاعری نئی زندگی کا آئیڈیل پیش کرسکتی ہے، ہم بہت دنوں تک شاعری کو "گناہ" سمجھتے رہے ہیں، یہ مروجہ معاشرت کی سیہ کاری کا نتیجہ تھا۔ ہم نے سماج میں دو طبقے مقرر کئے، ایک طبقہ عورتوں کا اور دوسرا مردوں کا، اسکے بعد قوم میں غلط اور تنگ رُخا" لٹریچر پیش کیا گیا، جو ہماری یعنی مردوں کی خود غرضی کا انتہائی کریہ نمونہ تھا، مردوں کی لائبریری عورتوں کے دیکھنے کے قابل نہیں ہے، کیونکہ انسانی طور پر ہم نے حقیقی مخلوط زندگی کو اختیار ہی نہیں کیا۔

اب یہ دور ختم ہوجانے والا ہے، اسی لئے شاعر کے رومانی نقطۂ نگاہ میں انقلاب فطری اور لابدی ہے، یہ نظم ان نظموں سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے جو اس سے قبل آلیشیا میں شائع کی گئیں، خصوصاً ریحانہ جو صابر امرتسری کی نہایت رنگین نظم ہے، بہرحال نازؔ کی یہ نظم شباب اور کیف و مستی کی آئینہ دار ہے، اس میں جوانی پائی جاتی ہے، لکھنؤ اور قدیم طرز کے اردو شعراء کی المناکی کا یہ بہترین طرزِ عمل ہے، خصوصاً اس کا آخری بند۔

ساغرؔ

بہارِ حسن سے پھولوں کو شرماتی ہوئی آئی
ادا سے مسکراتی نور برساتی ہوئی آئی
جوانی کے نشے میں چور لہراتی ہوئی آئی

وہ لہراتی ہوئی آئی وہ اٹھلاتی ہوئی آئی
وہ دیکھو! میری عذرا پھول برساتی ہوئی آئی

نوائے مدہوش

(شیخ علی بخش صاحب مدہوش گوالیاری)

مشکل ہے تو ایک ہماری دار کا خطرہ رہتا ہے — ورنہ موجودات کا ذرّہ ذرّہ انا الحق کہتا ہے

اشکِ الم کیا چیز ہے اے غمخوار اسے تو کیا سمجھے — آہ یہ میرا دل ہے جو پانی ہو ہو کر بہتا ہے

عشق و الم میں گریۂ غم کی پوچھتے کیا ہو غمخوارو — دل جب بھر آتا ہے پہروں مینہ سا برستا رہتا ہے

شکوہ شکایت ننگِ وفا ہے وہ یہ بھی تو سوچینگے — آخر کچھ تو بات ہے یہ جو ظلم ہمارے سہتا ہے

لوگ یہ کہتے ہیں کہ عبث کیوں جان گھلاتے رہتے ہو — اشک بہاتے رہنے سے کچھ جی تو ہلکا رہتا ہے

آخر کب تک بسترِ غم پر منہ ڈھانپے روتے رہیے — کون بچا ہے رسوائی سے کس کا پردہ رہتا ہے

مست بقا مدہوش ہی یا منصور ہی پر موقوف نہیں
دریا میں مل جائے جو قطرہ وہ کب قطرہ رہتا ہے

محبت کا سفر

(مجید احمد صاحب تاثیر (متعلم طبیہ کالج دہلی)

نگاہوں میں آئی ہوئی تیرگی ہے — خیالوں پہ چھائی ہوئی بیکسی ہے
بہت روز سوچا یہ کیا زندگی ہے — کہاں تک اب اس سوچ میں کھپائیں
چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

وہی شام و شب ہے وہی ہے سحر بھی — وہی ہیں پرانے سے دیوار و در بھی
طبیعت بھی اُکتا گئی ہے نظر بھی — نگاہوں کو دُنیا نئی اک دکھائیں
چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

یہ کھیتوں کے اُس پار ندّی پہ جانا — نہانا، اُچھلنا، اُچھلنا، نہانا
خوشی سے گذرتا تو ہے گو زمانہ — مگر آج کچھ اور خوشیاں منائیں
چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

یہ کیا راگ چھیڑا ہے بادِ صبا نے　　یہ کیا کر دیا مجھ کو موجِ ہوا نے
بہت دور سے آئی ہیں یہ صدائیں　　نہیں، اس جہاں کے نہیں یہ ترانے

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

جہاں ابتدا انتہا کچھ نہیں ہے　　جہاں یہ فنا یہ بقا کچھ نہیں ہے
اُسی دیس میں پریم کے گیت گائیں　　محبّت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

نہیں واں چمکتی ہوئی بجلیاں ہی　　نہ ہیں واں لرزتے ہوئے آشیاں ہی
نہ چھائی ہوئی رنج و غم کی گھٹائیں　　نہ ہے یہ زمیں ہی نہ یہ آسماں ہی

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

یہ مانا کہ رستے میں دشواریاں ہیں　　یہ مانا کہ ہم بے جرس کارواں ہیں
مگر ہم چراغِ محبّت جلائیں　　یہ مانا کہ ہر سمت تاریکیاں ہیں

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

بہت خوشنما بقعۂ نور وادی　　ہے وہ جو یہاں سے بہت دور وادی
چلو اُس کے پھولوں میں مسکن بنائیں　　مسرّت کے پھولوں سے معمور وادی

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

ستارہ ہوں میں اور ہو آسماں تم — مجھے چھوڑ کر جا سکو گے کہاں تم
جہاں تم وہاں مَیں جہاں مَیں وہاں تم — من و تو کے یہ تفرقے سب مٹائیں

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

فلک کی بلندی کو پستی بنا کر — مہ و مہر انجم سے بھی دور جا کر
وجود و عدم راستے سے ہٹا کر — بہت دور جائیں بہت دور جائیں

چلو آج ہم تم بہت دور جائیں

نغمۂ ناتمام

(محترمہ خورشید اقبال صاحبہ حبؔا میرٹھی)

جو تھی وجہِ سرور و عشرتِ دِل — ہے تصور میں وہ بہار ہنوز
حُسن کی کم نگاہیاں ہیں وہی — ہے وفا عشق کا شعار ہنوز
آرزو کی کھٹک سی باقی ہے — دِل میں پیوست ہے یہ خار ہنوز
ہے اُسی شان سے تصور میں — تابشِ حُسنِ سحر کار ہنوز
وہ نہ آئیں گے ہے یقین ۔ مگر — روح کو ہے اِک انتظار ہنوز
اُن کے جلوے کی تابشیں، اللہ! — روح ہے میری طور زار ہنوز
میری دُنیا میں انقلاب نہیں — میں ہوں، اور ایک اضطرار ہنوز
مجھ پہ طاری ہے بیخودی ابتک — اُن کا جلوہ ہے کامگار ہنوز

ہو گئی دِل کی کائنات اُداس
روح پھر بھی ہے بے قرار ہنوز

ترنّمِ رُوح

امیدوار و شبِ انتظار کیا کہنا — خیالِ یار و دلِ بیقرار کیا کہنا

جنوں نوازئ افتادِ دل خدا کی پناہ — فسوں طرازئ اندازِ یار کیا کہنا

تکلّمِ لبِ سحر آفریں معاذاللہ — تبسّمِ نگہِ شرمسار کیا کہنا

تخیلات کی رنگینیاں پناہ پناہ — تصوّرات کے نقش و نگار کیا کہنا

نگاہ و محشرِ امید و بیم یا اللہ — نیاز و ناز کے قول و قرار کیا کہنا

دلِ فسردہ نے کھینچی ہے غم کی اک تصویر — پریدہ رنگ کے نقش و نگار کیا کہنا

حسابِ ساعتِ امید و بیم یا اللہ — کتابِ قدرتِ پروردگار کیا کہنا

بعشوہ عشوہ نگاہے بہ ناز ناز کرم — بجرعہ جرعہ مئے خوشگوار کیا کہنا

چمن میں جوشِ نمو کی بہار ارے توبہ — دل و دماغ و نظر کا فشار کیا کہنا

ترقئ اثرِ وحشت و جنوں توبہ — تلوّنِ نگہِ ناز یار کیا کہنا

ہر ایک رگ میں لہو برق بنکے دوڑا ہے — ادائے جنبشِ مژگانِ یار کیا کہنا

سُناؤ ایک سخنور کو ہاشمی یہ کلام

ترنّمِ دلِ آشفتہ کار کیا کہنا

(از چوہدری رحم علی ہاشمی ایم اے)

جرسِ منزل

(سنہ ۱۹۳۶ء)

طاقِ حرم و کرسی و منبر سے گذر جا — دیوار سے محراب سے اور در سے گذر جا

تسبیح کے ہر حلقۂ انور سے گذر جا — سر رشتۂ زنّار کے چکّر سے گذر جا

دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو جہنّم ہو کہ جنّت — ہر جادہ و ہر منزل و ہر در سے گذر جا

پر تو ہے شب و روز ترا اے مہ و خورشید — اس عالمِ تاریک و منوّر سے گذر جا

ہر منزلِ پُر نور گذر گاہ ہے تیری — ہر دائرۂ انجم و اختر سے گذر جا

"ظلمات" تو ہے منزلِ یک جادۂ مقصود — اے نورِ اتم حدِّ سکندر سے گذر جا

ہر راہ میں قزاق ہیں ہر گام پہ رہزن — بچنا ہے تو جذبات کے محشر سے گذر جا

(حضرت امین حزیں۔ بہاولپور)

تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
جہاں پر زندگی رقص آفریں ہے
جہاں کا پیکرِ ہستی حسیں ہے
جہاں کا ہر نفس رنگیں تریں ہے

تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
جہاں پر کفر ہے سرمایہ داری
جہاں پر ظلم ہے بیروزگاری
جہاں محکومیت کا نام بھاری

تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
جہاں معصوم آوارہ نہیں ہیں
جہاں بیوائیں بیچارہ نہیں ہیں
جہاں انسان ناکارہ نہیں ہیں

تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
نہیں ہمت شکن تقدیرِ ہستی
نہیں انساں میں انساں پرستی
نہیں ہر کم نظر کو زعمِ مستی!

تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
شرر افشاں ہے ذوقِ جستجو بھی
فسوں انگیز ہے جوشِ نمو بھی
مقدس ہے وطن کی آرزو بھی!

تم ایسی سرزمیں میں جاؤ گے، جاؤ! خدا حافظ!
وطن کی وادیاں جب یاد آئیں
وہ جب بیتے ہوئے دن مسکرائیں
وہ جب سوکھے ہوئے لب تھرتھرائیں

فقط اک سانس لینا اور کہنا
"وطن کے نام پر مرنا ہے جینا"

داستانرا

افسانے

کتاب	مصنف	قیمت	
کہکشاں	مصنفہ ساغرؔ نظامی	قیمت ۸عہر	علاوہ محصول
کیمیاگر	〃 پروفیسر مجیب بی اے	〃 عہر	〃
فسانۂ جوش	〃 سلطان حیدر جوشؔ	〃 عہر	〃
عجیب	〃 قاضی عبد الغفار	〃 عہر	〃
جوشِ فکر	〃 سلطان حیدر جوشؔ	〃 ۸عہر	〃
تلاشِ راز	〃 مولانا نیاز فتحپوری	〃 ۶ر	〃
نگارستان	〃 〃 〃	〃 عاہر	〃
شہاب کی سرگزشت	〃 〃 〃	〃 عہر	〃
تہذیب کی سرگزشت	〃 ساغرؔ نظامی	〃 عہر	〃
لیلےٰ مجنوں	〃 سجاد حیدر یلدرم	〃 ۸عہر	〃
پرانا خواب اور دوسرے افسانے	〃 〃	〃 ۸عہر	〃
پرانا خواب	〃 〃	〃 ۱۰ر	〃
اصنامِ خیالی	〃 جلیل احمد قدوائی بی اے	〃 عاہر	〃
سیرِ گل	〃 〃	〃 ۸عہر	〃
خاکِ پروانہ	〃 منشی پریم چند	〃 عہر	〃
غبن	〃 〃 (دونوں حصے)	۸عاہر	〃
بے گناہ مجرم	〃 سدرشن جی	قیمت عہر	〃
صبحِ وطن	〃 سدرشن	〃 عہر	〃
حجابِ زندگی	〃 سید عابد علی بی۔اے	〃 ۱۲ر	〃

کتاب	مصنف	قیمت	
افسانہ ہائے عشق	حامد علی خاں صاحب ایڈیٹر "ہمایوں"	قیمت ۴عہر	علاوہ محصول
چینی و جاپانی افسانے		〃 ۹ر	〃
مصری افسانے	ترجمہ حضرت سجاد میرٹھی	〃 ۸ر	〃
معیاری افسانے	مرتبہ حضرت حفیظ جالندھری	〃 ۴عاہر	〃
ہفت پیکر	مصنفہ 〃 〃	〃 ۴عہر	〃
فرانسیسی افسانے	〃 〃 〃	〃 ۱۲ر	〃
فاؤسٹ	ترجمہ المانوی شاعر گوئٹے	〃 للعہ	〃
پردۂ غفلت	〃 ڈاکٹر عابد حسین	〃 عہر	〃
انجام	〃 پروفیسر محمد مجیب	〃 ۱۲ر	〃
کھیتی	〃	〃 ۶ر	〃
گناہ کی دیوار	اشتیاق حسین قریشی	〃 ۸ر	〃
نیم شب		〃 ۸ر	〃
چند ڈرامے	محمد عمر نور الٰہی	〃 ۸ر	〃
زود پشیماں	عبد الماجد دریاآبادی	〃	〃
جلال الدین خوارزم شاہ	ترجمہ از ترکی سجاد حیدر یلدرم	〃 ۱۲عہر	〃
جنگ و جدال	〃 〃	〃 ۱۲ر	〃
آغازِ ہستی	برنارڈ شا مجنوں گورکھپوری	〃 عہر	〃
آرٹسٹ	آسکر وائلڈ تمکین کاظمی	〃 ۸عہر	〃
اسیرِ بابل	گولڈ اسمتھ شررؔ	〃 ۴ر	〃

فریبِ عمل جان گالزاوردی رواں مرحوم قیمت عاہر علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

۱۳۴

جوانی کا خواب

(ادیب گرامی لطیف الدین احمد اکبرآبادی)

(۱)

تماشہ دیکھنے والوں کی بھیڑ میں جو تھیٹر میں داخل ہو رہی تھی ایک بلند و بالا لڑکی بھی تھی۔ اس کے چہرہ کی وضع قطع کچھ زیادہ نظر فریب نہ تھی۔ لیکن "ہال" کی روشنیاں اس کے گالوں کی لوحوں کو چھو کر پلاستی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کی آنکھیں بھی وہی تھیں جو ہر بنگالی لڑکی کو ہرنی بنادیتی ہیں۔ لیکن ان آنکھوں کی جوت ؟ یہ شاید کبھی کوئی شاعری بیان کرسکے گا!

اس بنگالی اَبلا کی نوجوانی میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔ لیکن اس کے خدوخال سے محسوس ہو۔ تا تھا کہ اس کے اندر کی نسوانی روح ابھی سوئی ہوئی ہے۔ اس بیدار دوشیزہ کی یہ خوابیدگی سمجھنے سمجھانے کی چیز نہ تھی ——— بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا "حال" اس کی خوابیدگی کو' اور خوابیدگی اس کے "حال" کو زیادہ پُر اسرار بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔

بنگالی کلچر کا لوچ اور قدیم یونانیوں کی بن دیوی ڈائنا کے رخسار ——— ایک عجیب طلسم تھا۔ مچھلی کی طرح صحرائی چشموں میں چہلیں' اور ہوا کی طرح اپنے شکار کا تعاقب کرنے والی دیوی کے اندر ———

تہذیب و تمدن کی لطیف روح زندگی بن کر سرایت کر گئی تھی۔

اسٹیج پر رومیوں کی عشق بیانیوں اور جولیٹ کی محبت انشائیوں نے فضا کو تھرتھرا دیا تھا۔ تھیٹر میں سناٹا تھا۔ تماشائی بالکل خموش تھے "ہال" کا ماحول ایک مندر کا ماحول بن گیا تھا ——— کہ اس سناٹے میں پاکیزگی تھی' اس خموشی میں احترام تھا!

آج مورتی جولیٹ نے رومیو کی نگاہوں کے لئے ایک نئی زمین' اور نیا آسمان' ایک ایسی جنت پیش کر دی تھی جس کا ذکر کسی مذہبی کتاب میں بھی نہیں ملتا! کامدیو روپ رومیو نے جولیٹ کے خواب جوانی کی وہ تعبیر سنادی تھی جس کے تعاقب میں انسان کی شاعرانہ تخیل آجتک مصروف پرواز ہے!

سچی جوانی کی سچی محبت نے یوں تو ہر دیکھنے والے کو متاثر کیا تھا' لیکن اس ہجوم کے حیات سے بالکل جدا طور پر' اس لڑکی کی روح ایک انگڑائی لیکر جاگ پڑی' جوانی کی سوئی ہوئی آتما رنگ جذبات سے شرابور ہوگئی: اب وہ پو پھٹتی دیکھ رہی تھی ——— اسے ایک چمکیلا دن نکلتا معلوم ہونے لگا تھا!

(۲)

نوبت نقاروں اور باجے گاجوں کی آوازیں کیسی بے ہنگم ہوتی ہیں: شادی کے ان ترانوں کے اندر' اکثر ایک بدخواہ آواز بھی آتی ہے' مگر وہ اتنی مدھم ہوتی ہے کہ اسے بس ایک کلبی' (CYNIC) ہی سُن سکتا ہے۔

وہ لڑکی جس کی استری آتما تھیٹر میں جاگی تھی' بیاہی جارہی تھی۔ اب اس کی جوان تمناؤں کے خوابوں کی تعبیر نکلنے کا وقت آگیا تھا ——— شادیانے بج رہے تھے اور خوشیاں ہو رہی تھیں۔

عین اس حال میں کہ ابھی اس کی خوشیاں غیر منظم تھیں' اس لڑکی کے دل میں اچانک ایک وسوسہ پیدا ہوا جسے اس نے بہت جلد اور سمجھنے کی کوشش کئے بغیر رفع بھی کر دیا۔

کامرانی کی صورت جب سامنے دکھائی دینے لگتی ہے تو خطرات
کا وجود کالعدم ہوتا ہے۔ اس کے اس نہایت ہی معمولی احساس کو خوف
کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کا یہ احساس اتنا ہی خفیف تھا جتنی
کہ شادی کی شہنائیوں میں وہ بدخواہ آواز مدھم ہوتی ہے۔

(۳)

لیکن یہ کیسا غضب ہے؟ اس لڑکی کی مرگ جال آنکھیں تو
آنسو بہا رہی ہیں! دن کی مسرور روشنیوں میں غسل کرنے کے بدلے
اس پر رات کا خوفناک اندھیرا غالب ہے!

اس کی حسین آرزوئیں ڈراؤنے خوابوں سے بدل گئی ہیں! اب
وہ پریم کا لفظ سُن کر ہی کانپ جاتی ہے؟ اور شادی کی نوبت و
شہنائی کے خوفناک نغمے ہر وقت اس کے کانوں میں بجتے اور اس کا
مُنہ چڑھاتے رہتے ہیں۔ محبت کے جس منظر نے اس کے حسیات کو
جگا دیا تھا وہ نقلی تھا؟ محبت کے جس نغمے نے اس کی روح کو بیدار
کر دیا تھا وہ جھوٹا تھا ــــ جھوٹ ہے یہ سب کچھ جھوٹ ہے!

(۴)

سنگھار اور سنوار نے اسے ایک شاندار اور شوق آفریں عورت
بنا دیا تھا۔ اس کے خدوخال میں، اس کی چال ڈھال میں، خواہش پروری
سانسیں لیتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ لذت اور عشرت کے شوالے کی پجارن
ــــ ایک بلاس موہنی معلوم ہوتی تھی: ڈائنا نے وینس کا چولا
بدل لیا تھا!

(۵)

بڑے شہروں میں آدھی رات کا گھنٹا ذرا گمبھیر معلوم ہوتا ہے
جس وقت وہ بجتا ہے اس وقت ایک دن مرتا ہے۔ دوسرا جنم لیتا
ہے۔ اور "دن مر گیا، دن زندہ باد!" کی صدا کو گھنٹے کی وہ آواز محلوں
اور جھونپڑیوں میں یکساں طور پر پہنچا دیتی ہے۔ اس کا پیغام یہ ہوتا ہے
کہ اس وقت اندھیرا اور اُجالا، سکوت اور شور، دست و بغل ہیں ــــ
ــــ شہر مر بھی گیا ہے اور شہر جیتا بھی ہے!

آدھی رات کے سناٹے میں، ندی کے پل پر ایک عورت
کھڑی ہے؛ اس کی شکل بدروپ ہے۔ اس کی آنکھوں میں نہ آس
ہے اور نہ نراس! نیم شبی گھنٹے کی آواز اسے اپنی شادی کے شادیانوں
کی یاد دلا کر اس کا مونہہ چڑھا رہی ہے۔ مگر کس سے پوچھا جائے کہ
گھنٹے کی یہ راگنی وقت کی ہے کہ بے وقت کی!

لیکن حیرت ہے! اس کے خیال میں ایک عزم قایم ہونے
کے ساتھ وہ وہی پریم کتھا، وہی پریم راگ پھر سُنتی ہے جو اس نے
برسوں ہوئیں تھیٹر میں سُنا تھا، اور جس نے اس سے ایک نورانی
دن کے نکلنے کا وعدہ کیا تھا!

اور تعجب ہے! وہ گھر سے نراس چلی، پل پر پہنچ کر نراس
نہ رہی، بلکہ جس منظر اور نغمہ نے اس کی جوانی کی آتما کو جگا دیا تھا،
اب وہ اُسی نغمے کے بازوؤں پر سوار ہو کر صوت سرمدی سے
ملنے جا رہی تھی!

ایک دھماکا، ایک زور کا چھپکا، اور پھر کچھ بھی نہ تھا!

ل احمد

ذات باہر

(اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی علیگ)

(۲)

بہار کی پہلی پورن ماشی تھی نسیم جنوب کے نرم نرم جھونکے آم کے مور کی خوشبو پھیلا رہے تھے۔ باغ میں چشمے کے کنارے لیچی کے درخت کی گھنی پتیوں میں چھپی ہوئی بیگانۂ خواب کوئل کی ان تھک کوک ہیما آنتا کے شبستان بیداری کے کھلے ہوئے دریچہ میں سے آ رہی تھی۔

بہار کا ہیجان ہیما آنتا پر بھی طاری تھا، کبھی اپنی بیوی کے جوڑے کی لٹ کھول کر اپنی انگلیوں پر لپیٹتا کبھی اس کی چوڑیوں کو بجاتا کبھی اس کے سر کے گرد لپٹی ہوئی چنبیلی کی پھول مالا کو کھینچتا یہاں تک کہ وہ ڈھیلی ہو کر سہرے کی طرح اس کے ابروؤں پر لٹک آتی۔ باہر مست ہوائیں پھولوں کو ہلکی ہلکی جنبش دے کر ان میں احساس حسن بیدار کر رہی تھیں۔ یہی عالم ہیما آنتا کا تھا۔

لیکن اس کی بیوی کُسُم بے حس و حرکت سیج کنارے کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی اس کی گہری نظریں چاندنی سے روشن خلا میں کھوئی ہوئی تھیں، شوہر کی ترغیبات پنہاں کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔ آخر ہیما آنتا نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک مضطربانہ حرکت دی اور کہا۔ "کہاں ہو کسم؟ تم تو اتنی دور معلوم ہوتی ہو کہ دوربین سے بھی دیکھو تو ایک دھندلا سا نشان نظر آئے۔ آج میں تم کو اپنے سے بہت قریب چاہتا ہوں دیکھو کیسا پیارا سماں ہے۔"

کسم نے کھوئی ہوئی نظریں آسمان سے ہٹا کر شوہر کے چہرے پر جما دیں اور زیر لب کہا۔ "میں ایک منتر جانتی ہوں جس کے اثر سے یہ بہار، یہ چاندنی، یہ تمام حسن لمحہ بھر میں معدوم ہو سکتا ہے۔"

"یہ بات ہے! تو تم ایسا مت کرنا ہاں اگر کوئی جادو تمہیں ایسا آتا ہو کہ ہفتہ میں تین چار اتوار آ جایا کریں یا رات طویل ہو کر اگلی شام سے جا ملے تو ضرور کرامت دکھاؤ۔" یہ کہکر ہیما نتا نے بیوی کو اپنے سے قریب تر کھینچنے کی کوشش کی۔

کسم نے اس کے آغوش سے بچ کر کہا۔ "آج میں تم سے وہ بات کہنا چاہتی ہوں جس کو مرتے وقت ظاہر کرنے کا ارادہ تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب میرے لئے سزا بھگتنی آسان ہو گی۔"

اس کا شوہر سزا کے مضمون پر جے دیو کی عاشقانہ غزلوں میں سے کوئی شعر پڑھ کر اس کی سنجیدگی کو ہنسی میں اُڑا دینے والا تھا کہ زینہ پر کسی کی کھڑاؤں پہنے جلدی جلدی کمرے کی جانب آنے کی آہٹ ہوئی۔

ہیما آنتا اپنے ضعیف باپ ہری ہر مکرجی کے اس طرح غصہ میں آنے کی آواز پہچان کر اس طرح چونک پڑا جیسے کسی بدشگونی پر۔

دروازہ پر پہنچکر ہری ہر نے کرخت آواز میں ڈانٹ کر کہا۔ "ہیما آنتا! تم فوراً اپنی بیوی کو گھر سے نکال دو۔"

ہیما آنتا نے حیران ہو کر کسم کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر تعجب کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس نے ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپا لیا تھا گویا چاہتی تھی کہ زمین پھٹے اور میں سما جاؤں۔

کوئل کی آواز کھڑکی میں سے آ رہی تھی لیکن کسی کو توجہ نہ تھی یہ دُنیا کتنی حسین ہے! لیکن اس کا حُسن کتنی جلدی زائل ہوتا ہے!!

"کیا یہ سچ ہے؟" ہیما نتا نے باپ کے پاس سے واپس آکر پوچھا
"بالکل سچ ہے" کسم نے کہا
"تم نے اب تک مجھ سے کیوں نہیں کہا؟"
"کوشش تو کئی دفعہ کی لیکن ہمت نہ پڑی۔ میں ایسی پاپن ہوں"۔
"اچھا تو اب مجھے ساری باتیں بتا دو"

اور کسم نے اس طرح اطمینان اور سکون کے ساتھ سارا قصہ کہہ سنایا جیسے آگ پر چلنے والا دہکتے ہوئے کوئلوں پر بھی تلے قدم رکھتا ہے۔ اس تذکرہ سے اس کو کتنی تکلیف اور سوزش ہو رہی تھی اس کی کوئی علامت ظاہر نہ ہونے پائی۔

ہیما نتا نے ساری داستان سنی اور کچھ کہے بغیر اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔ کسم کو محسوس ہوا کہ پریتم چلے گئے اور اب کبھی نہ ملیں گے۔ اسے کوئی تعجب نہ تھا گویا جو کچھ پیش آیا تھا وہ بھی ان کی روزانہ زندگی کا ایک معمول تھا۔ وہ اس قدر بے حس ہو گئی تھی۔ ہاں دنیا اسے سونی نظر آتی تھی محبت سے ہر شے سے خالی!

ہیما نتا کے اظہار التفات کی یاد نے اس کے لبوں پر ایک
۱۲۶
ہلکا سا خشک، محروم طرب تبسم پیدا کیا جیسے نشتر کا زخم ہو۔ وہ تمام محبت جس کی گہرائی کو وہ اتھاہ سمجھتی تھی جس کی کیفیت کو وہ لا انتہا تصور کرتی تھی جس میں ذرا سی جدائی بھی اس قدر دلگداز ہوتی تھی جس میں ہر ملاقات اس قدر کیف تمام پیدا کیا کرتی تھی۔ جو زمان و مکان کے تعینات سے آزاد معلوم ہوتی تھی جس کے اگلے جنم میں بھی ختم ہونے کا تصور نہ ہوتا تھا۔ اس ساری محبت کی یہی کائنات تھی! اتنا نازک رشتہ تھا!! سماجی مظالم کے ایک اشارے نے اس کو تہس نہس کر دیا۔ اس کی ساری وسعت کو خاک میں ملا دیا!!! تھوڑی دیر ہوئی ہیما نتا نے محبت سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا "کیسی جادو بھری رات ہے" رات تو وہی باقی تھی۔ اسی کوئل کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ ہوا بھی سہری کے پردوں کو اڑا رہی تھی۔ چاندنی بھی کسی محروم التفات حسینہ کی طرح سیج کے کنارے پڑی تھی — اور یہ سب فریب نظر تھا!!! یہ محبت تو مجھ سے بھی زیادہ قول اور فعل کی بے اعتبار نکلی!

کسم نے محسوس کیا۔

(۳)

اگلے روز علی الصباح ہیما نتا رات بھر جاگا ہوا، پریشان بال، وحشیوں کی سی شکل، بوڑھے پیارے گھوشال کے گھر پہنچا۔

پیارے نے نرمی سے پوچھا "کیوں کیا خبر لائے؟"

انگاروں پر لوٹتے ہوئے غصہ کے مارے تھرتھراتے ہوئے ہیما نتا یہ کہہ سکا: "تم نے ہماری ذات بگاڑ دی تم نے ہمارا گھر تباہ کر دیا تم لوگوں کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا" اس کے بعد شدت جذبات نے گلوگیر ہو کر اس کو خاموش کر دیا۔

پیارے مسکرایا "اور تم لوگوں نے؟ تم نے میری ذات بنا دی؟ مجھے سماج میں رہنے دیا؟ تم نے ہمارے گھر پر امرت برسایا۔ تم بھی تو میری پریشانیوں میں اتنے ہی ہمدرد اتنے ہی مہربان رہے ہو!"

اگر ہیما نتا کے غصہ میں بھی وہی اثر ہوتا جو پرانے زمانے میں برہمنوں کے سراپ میں ہوتا تھا تو پیارے بھسم ہو جاتا لیکن اب تو غصہ کی آگ اندر ہی اندر اس نوجوان کے دل کو پھونک رہی تھی۔ اور یہ بوڑھا مزے سے مسکرا رہا تھا۔

ہیما نتا نے رک رک کر کہا "میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

پیارے نے کہا "یہ تو مجھے پوچھنا چاہئے کہ میری بیٹی نے میری اکلوتی بچی نے جو میری سب کچھ تھی اس غریب لڑکی نے تمہارے باپ کا کیا بگاڑا تھا۔

میں سمجھا۔ تمہیں معلوم نہیں۔ اچھا تو بیٹھ جاؤ اور بیٹا جس قدر سکون سے ممکن ہو۔ سنو۔ میں بتاتا ہوں۔ قصہ طویل ہے لیکن دلچسپی سے خالی نہیں۔

جب میرا داماد اپنی بیوی کا زیور لیکر انگلستان چلا گیا تھا تم بچہ سے تھے۔ لیکن شاید تمہیں وہ ہنگامہ یاد ہو گا جو پانچ برس بعد اس کے بیرسٹر ہو کر واپس آنے پر گاؤں میں برپا ہوا تھا۔ تم یہاں کلکتہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ تمہارے باپ نے برادری کو جمع کیا۔ خود لیڈر بنا اور فیصلہ سنایا "اگر تم اپنی بیٹی کو اس کے سوامی کے پاس بھیجنا

چاہتے ہو تو پھر اس سے کوئی سروکار نہ رکھنا"۔ میں نے اس سے کیسی
کیسی التجائیں کیں کہ ایک دفعہ ہمیں معاف کر دو۔ میں نے کیا کیا ذلتیں
سہیں اور کہا کہ اگر تم ذات میں ملا لو تو میں اپنے داماد کو پرائشچت پر آمادہ
کر لوں گا لیکن تمہارا باپ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں اپنی عزیز بچی کو ہمیشہ
کے لئے چھوڑنے پر تیار نہ ہو سکا۔ ذات چھوڑ دی اور آکر کلکتہ میں رہنے
لگا لیکن سماج کے مظالم نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا میرے بھتیجے کی منگنی
ہوئی تو تمہارے باپ نے لڑکی والوں سے جاکر کہدیا اور نسبت
فسخ کرا دی۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے قسم کھائی کہ
برہمن نہیں اگر انتقام نہ لیا ہو۔

اب تو معاملہ سمجھے ؟ لیکن ٹھیرو۔ افسانہ کا بقیہ حصّہ اور بھی
دلچسپ ہے ۔

جب تم کالج میں داخل ہوئے تو ہیرآداس جنہیں ہم لوگ چچا کہتے
تھے۔ افسوس غریب اب زندہ نہیں ہیں۔ تمہاری قیام گاہ کے برابر ہی
رہتے تھے۔ انہوں نے ایک نوجوان کایستھ لڑکی کسُم کو جو بچپن میں بیوہ
ہو گئی تھی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ کسُم اس بلا کی حسین تھی کہ ہیرآداس
کو کالج کے لڑکوں کی توجہات سے اس کی حفاظت کرنے میں بڑی دشواریاں
پیش آتی تھیں لیکن ایک نوجوان لڑکی کے لئے بوڑھے آدمی کی نظر بچانا
کیا مشکل ہے۔ اکثر اسے کوٹھے پر ہوا لگانے یا اور کوئی کام کرنے جانا
پڑتا تھا اُدھر معلوم ہوتا تھا کہ تمہارا جی بھی سوائے برابر والے بالاخانہ کے
کہیں پڑھنے میں نہیں لگتا۔ کوٹھوں ہی کوٹھوں پر تم دونوں میں کیا گزرتی
تھی یہ تو تمہیں جانتے ہو۔ لیکن نیچے گھر میں لڑکی کی حالت سے ہیرآداس
کو شبہ ہوا ہو گا۔ گھر کے کام کاج میں اس کی فراموش کاری بڑھ گئی۔
بھوک کم ہو گئی۔ تندرستی کی بشاشت جاتی رہی اور ایک دن انہوں نے
اُسے بلا سبب روتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ بالآخر ان پر تمہارے بالائی
پیام سلام ظاہر ہو گئے انہیں معلوم ہو گیا کہ تمہیں تنہائی میں پڑھنے
کا شوق بڑھ گیا ہے۔ کالج سے اکثر غیر حاضر رہنے لگے ہو اور اپنے بالاخانہ
کے زینہ پر تنہا کتابیں لئے بیٹھے رہتے ہو۔

جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہیرآداس نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے
رائے دی: "دیکھو چچا! تم ایک عرصہ سے تارک الدنیا ہو کر بنارس
جا رہنے کا ارادہ کر رہے ہو۔ بہتر ہے اب یہ ارادہ پورا کر لو۔ لڑکی کی
دیکھ بھال میرے ذمہ رہی"۔

وہ تو شکر گزار ہو کر یاترا کو چلے گئے اور میں نے کسُم کے رہنے کا
انتظام اپنے بے تکلف دوست چٹرجی کے یہاں کر دیا جو وہیں پڑوس
میں رہتے تھے اور یہ ظاہر کیا کہ کسُم اُن کی سگی بیٹی ہے۔ اس کا جو نتیجہ
ہوا وہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ بہر حال یہ تمام پچھلے واقعات دُہرانے
سے مجھے خوشی ہوئی۔ ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ مجھے لکھنا نہیں آتا
ورنہ پڑھنے میں بھی افسانہ معلوم ہوتا۔ میرے بھتیجے کا رجحان البتہ اس طرف
ہے اس سے کہوں گا کہ وہ اسے قلمبند کرنے کی کوشش کرے۔ ہاں اگر
ہم تم دونوں مل کر کوشش کریں تو ہم سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا انجام
ابھی مجھے بھی معلوم نہیں ہے ؟

ہیما کنتا نے پیارے کے آخری فقروں پر توجہ نہ کی تھی۔ اس نے
اپنے سلسلۂ خیال کے مطابق پوچھا: "کیا کسُم نے ایسی شادی پر
کوئی اعتراض نہیں کیا؟

پیارے نے کہا: "یہ سوال آسان نہیں ہے۔ تمہیں تو تجربہ ہو گیا
ہے اور تم جانتے ہو کہ عورت کیا چیز ہے۔ جب وہ 'نہیں' کہتی ہے تو مقصد
'ہاں' ہوتا ہے۔ کسُم نئے مکان میں آئی اور تمہارا روزانہ دیدار موقوف
ہوا تو وہ اپنے آپے میں نہ رہی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ تم نے
اس کا پتہ لگا لیا ہے۔ تم بھی کالج کا راستہ بھولنے لگے۔ چٹرجی کے دروازے
کے سامنے کتابیں ہاتھ میں لئے ٹھیر جاتے گویا کوئی کھوئی ہوئی چیز
ڈھونڈھ رہے ہو۔ میں یہ تو سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ تمہیں کالج کے راستہ
کی تلاش ہے کیونکہ ایک معزز شخص کی کھڑکی میں ہو کر راستہ پر دار
کیڑوں یا محبت بھرے دلوں ہی کے لئے مخصوص ہے بہرحال مجھے
لڑکی کی بچنا اور تمہاری تعلیم کا اس قدر ہرج دیکھ کر بہت افسوس
ہوتا تھا۔

آخر ایک دن میں وہاں گیا اور کسُم کو علیحدہ لیجا کر کہا "دیکھو
اپنے چچا سے شرم نہ کرو۔ بیٹی میں جانتا ہوں تمہارے دل میں کس کی لگن

ہے۔ وہی سامنے والا لڑکا۔ اس کی بھی حالت اچھی نہیں ہے۔ میں خوشی سے تمہارے سمبندھ کی کوشش کروں گا۔"

کسُم جواب دینے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور وہاں سے بھاگ گئی۔ میں نے اپنی آمد و رفت جاری رکھی اور تمہارا ذکر کرتا رہا۔ بالآخر اُس کی شرم مجھ سے کھل گئی اور میں نے اس کے دل پر یہ بات نقش کر دی کہ صرف شادی ہی سے یہ مشکل حل ہو سکتی ہے پھر بھی اُسے اصرار تھا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ جب ہم ایک دوسرے سے موافق اور مخالف بحث کر چکے تو کسُم نے مجھ سے تمہاری رائے دریافت کرنے کو کہا۔ میں نے اس کی مخالفت کی۔" وہ غریب اپنے ہوش حواس میں کب ہے اُسے اس اُلجھن میں ڈالنے سے کیا فائدہ؟ دوسروں پر اس راز کے ظاہر ہونے کا تو کوئی امکان ہی نہیں پھر اُسے عمر بھر کے لئے کیوں رنج دیا جائے۔" میں تو سمجھ نہیں سکا کہ کسُم کی سمجھ میں یہ بات آئی یا نہ آئی۔ وہ خاموش روتی رہی اور جب آخر میں نے کہا کہ بس یوں ہی رہنے دو تو وہ بالکل پھوٹ پڑی۔ یہ معاملات یہاں تک پہنچ گئے تھے جب میں نے چٹرجی کو تمہارے پاس پیام دے کر بھیجا اور جیسا کہ مجھے بعد میں اطلاع ملی تم نے بلا تامل منظوری بھجوا دی۔

مقررہ دن سے کچھ عرصہ قبل کسُم اس تجویز کی مخالف ہو گئی۔

اس نے مجھ سے التجا کی۔" اچھے چچا! ہاتھ جوڑتی ہوں اس کو روک دیجئے۔" میں نے کہا کیا فضول بکتی ہو۔ اب تو سب کچھ طے ہو گیا۔ آخر میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں گا۔" اس نے مجھ سے کہا۔" مجھے کہیں بھیج دو۔ اُن سے کہہ دینا کہ وہ مر گئی۔" میں نے اعتراض کیا۔" اور اس غریب لڑکے کا کیا حشر ہوگا اس کے خوابوں کی تعبیر ظہور میں آنے والی ہے وہ تو ساتویں آسمان پر ہے اور میں اس سے کہہ دوں کہ تم مر گئیں۔ اس کے بعد مجھے تمہیں اس کی موت کی خبر دینا ہو گی اور جواب میں تمہاری سنائی آئے گی۔ تم اس بڑھاپے میں میرے سر برہمن ہتیا اور استری ہتیا کا کلنک لگاؤ گی۔

آخر ایک روز سعید اور ساعت نیک میں تمہارا بیاہ ہو گیا اور یوں میری قسم پوری ہوئی۔ باقی حال تم خود جانتے ہو۔

"تمہیں جو کچھ ہمارے ساتھ کرنا تھا جب تم کر چکے تھے تو پھر تم نے یہ راز ظاہر کیوں کیا؟" ہیمانتا نے آزردہ ہو کر پوچھا۔

"جب کچھ دن ہوئے مجھے تمہاری بہن کی نسبت طے ہو جانے کا حال معلوم ہوا تو میرے ضمیر نے مجھے ملامت کرنا شروع کیا ایک برہمن کی ذات تو مجھے یوں بگاڑنی پڑی کہ میں نے ایک فرض اپنے اوپر عاید کر لیا تھا۔ اب ایک دوسرے معصوم برہمن کی ذات پر دھبہ نہ آنے دینا بھی میں فرض سے کم نہ سمجھتا تھا۔ اس لئے میں نے اُن کو لکھ دیا کہ میرے پاس ہیمانتا کی بیوی کے شودر ہونے کا ثبوت موجود ہے۔"

ہیمانتا اپنے اُبلتے ہوئے جذبات کو بدقت روک سکا اور لکنت سے کہا۔" اب اگر میں چھوڑ دوں تو اس لڑکی کا کیا حشر ہو گا۔ کون اس کی خبر لے گا۔"

" میرا جو فرض تھا میں نے کر دیا۔ لوگوں کی چھوڑی ہوئی بیویوں کو پناہ دینا میرا کام نہیں ہے۔"

"یہاں آؤ۔" پیارے نے نوکر کو آواز دی۔" ہیمانتا بابو کے لئے ایک گلاس برفاب لاؤ۔ جلدی۔"

لیکن ہیمانتا نے اس کی ٹھنڈی تواضع کا انتظار نہیں کیا۔

(۴)

پورنماشی کے بعد پانچویں رات تھی۔ کوئل کی کوک سُنائی نہ دیتی تھی۔ چشمہ کے کنارے لیچی کا درخت سیاہ پس منظر پر روشنائی کا داغ معلوم ہوتا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ لیکن اندھیری رات میں اسکی سائیں سائیں پر آسیب کا گمان ہوتا تھا۔ تارے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ گویا تاریکی کو چیر کر کسی خفیہ راز کا پتہ لگانا چاہتے ہیں۔

ہیمانتا کی خواب گاہ میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ وہ پلنگ پر کھڑکی کے نزدیک بیٹھا ہوا باہر کی طرف اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ فرش پر اس کے قدموں میں کسُم سر جھکائے بیٹھی تھی۔

تقدیر کے مصور نے ابدی رات کی وصلی پر جذبات کے گرد باد میں گھری ہوئی دو خاموش ہستیوں کی ایک تصویر بنائی تھی جن میں سے ایک دادرس تھا اور ایک دادخواہ۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو مشتاقانہ نظروں سے دیکھنے کے لئے خود وقت کی رفتار ساکت ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی ہنڈ یک لخت ساکن ہو جائے۔

(ٹیگور)

یکایک پھر کھڑاؤں کی آواز آئی۔ ہری ہر کے بھاری قدموں کی چاپ باہر سے کمرے میں سُنائی دی

"تم کب تک اس عورت کو گھر سے نکالو گے۔ میں یہ حیلے حوالے پسند نہیں کرتا۔"

ہری ہر کی آواز سُنی تو کُسم تڑپ کر ہیمانتا کے قدموں سے لپٹ گئی۔ آخری الفاظ سُن کر اس نے رخصت کا سلام کیا۔ قدموں کی خاک چھوئی اور ان کو چھوڑ کر جانے کے لئے اٹھی۔

ہیمانتا نے باپ کو جواب دیا۔ "میں اپنی بیوی کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

ہری ہر چلّایا۔ "تو تم ہماری ذات خراب کرو گے۔"

ہیمانتا نے جواب دیا۔ "میں ذات پات کو نہیں مانتا۔"

"تو نکلو دونوں یہاں سے۔"

(ٹیگور)

دُعا

(ضیاء الدین احمد سلہری)

میرے خالق! مجھے رحمتیں نہ دے، اور نہ مجھے برکتوں سے مالا مال کر۔ میں تجھ سے، اور تیری نظر سے، اُس نظر سے، جو ہزاروں اندھیروں میں، سیاہ مور ناتواں کو رینگتا ہوا دیکھ لیتی ہے، محض ایک شعاع چاہتا ہوں، تاکہ میں، اُن سازشوں کو، جو غریبوں کو پیسنے کیلئے، سرمایہ داری کے سینے میں مستور ہیں، دیکھ سکوں ـــ!

رحمتیں مجھے نہ درکار نہیں، برکتیں میرے لئے بیکار ہیں، میرے آقا! میں تو صرف اُس تڑپ سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہوں، جو مجھے ـــ زندگی کی خوفناک کشاکش سے، مٹے ہوئے، ضعیف و ناتواں شبہوں کو جن کی روحیں، فلاکت کے گہرے دھبوں سے سیاہ پڑ گئی ہیں ـــ ایک جذبۂ انسانی دینے کیلئے بیقرار کر دے۔

نیکیاں مجھے نہ چاہئیں، ثواب سے میں بے نیاز ہوں، میرے بے نیاز ـــ! تو مجھے صرف اک "آہ" دیدے، جس سے میں، اُس ماں کے آنسوؤں کو، جس کے نوزائیدہ بچے کے لئے اس کی چھاتیوں میں دودھ نہیں رہا، خشک کر سکوں۔

رحمتیں! برکتیں! اور تیرے موعودہ احسانات، میرے خالق! مجھے ایک سوال پر مجبور کر رہے ہیں، اور میرا دست دُعا تیری طرف، یہی پوچھنے کیلئے اُٹھ رہا ہے، کہ آخر وہ کون سے مقاصد کبیر ہیں، جن کے لئے دُنیا افلاس و نکبت کو جنم دیے جا رہی ہے، رحمتیں و برکتیں، کیوں انہی کے کاشانوں پر نازل ہو رہی ہیں جو تیری رحمتوں و برکتوں سے، ایسے ہی بالا ہیں، جیسے بلند آسمان۔

اے منبع فیض، سرنگوں ہونے کے بجائے، میری آنکھوں کو تر ہونے کی قوت دیدے، اپنی رحمت سے، تو میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں بارش کر دے، اور میری آنکھوں کے خشک چشموں کو، آنسوؤں سے لبریز! میرے مالک! غریب و بیکس کے زخم، بس ہمدردی کے دو آنسوؤں سے مندمل ہو سکتے ہیں، میں تیرے بخشے ہوئے آنسوؤں سے، زندگی سے دھتکارے ہوئے بندوں کے، چٹیل و سخت قلوب، جن کو ظلم و ستم کی آندھیوں نے، بنجر کر دیا، پھر سرسبز کر دوں گا، اور اس طرح میرے رب، اس مقصد عظیم کو تیرے قریب کر دوں گا، جس نے تجھے، دُنیا کی تخلیق پر آمادہ کیا تھا۔

(طبعزاد)

ضیاء الدین احمد سلہری

ناکام

(حضرت امین حزیں)

"بلیک گارڈ" سینکڑوں انسانی زندگیوں کو اپنی آغوش میں لئے ایک بپھرے ہوئے دیو کی طرح سمندر کے سینے کو چیرتے ہوئے ساحل ہندوستان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بلند لہریں ہانپتے ہوئے مگرمچھوں کی طرح اٹھتیں اور سورج کی روشنی میں پارے کی طرح چمکتے ہوئے لہرا کر سطح سمندر پر پھیل جاتی تھیں۔ آسمان پر کہیں کہیں پریشان بادلوں کے ٹکڑے بھٹک رہے تھے۔ جو کبھی کبھی سورج پر حاوی ہو کر اس کی روشنی کو مدھم اور افسردہ سا بنا دیتے تھے۔ ہوا بھی خلاف معمول بہت تیز چل رہی تھی ــــ جیسے کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی ــــ موجوں کا تلاطم جہاز کی "بھک بھک" کے ساتھ مل کر ایک غیر دلچسپ اور تکلیف دہ لاانتہا ہی شور پیدا کر رہا تھا۔ جہاز کی اندرونی زندگی میں حرکت اور مسرت کی فراوانی تھی۔ اگرچہ "ہنگامِ ہستی" جو طلوعِ آفتاب کے ہمراہ پیدا ہوتا ہے اور غروبِ آفتاب کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اب کافی دن ڈھل چکنے کی وجہ سے اپنے پورے زور پر نہیں رہا تھا۔

اس دُنیائے ہاؤ ہو سے بے نیاز حمید ڈیک کے ایک تنہا حصّہ میں اپنا سر نیچے کئے ٹہل رہا تھا ــ جیسے وہ اپنے پریشان خیالات کا کوئی حل تلاش کرنے کے لئے جہاز کی پُرشور زندگی کو خیرباد کہہ چکا تھا ــ وہ ایک عجیب کشمکش میں تھا۔ اس کا چہرہ اس کے دلی اندوہ کی آئینہ داری کر رہا تھا۔ وہ بعض وقت ٹہلتے ٹہلتے یکدم ٹھہر جاتا اور جوش میں اپنی مٹھیاں بند کر لیتا ــ ایک دیوانے کی طرح جو کسی سے گتھم گتھا ہونے کے لئے بیتاب ہو ــ اور پھر غیر ارادی طور پر اس کا لرزتا ہوا قدم آگے اُٹھتا اور وہ ایک غیر مبہم آواز میں اپنے آپ سے بڑبڑانا شروع کر دیتا۔

میں آخر اس عورت کو اپنے ہمراہ کیوں لئے جا رہا ہوں؟ وہ مغربی عورت ہے! میں اس کے چال چلن، وطن اور والدین سے مکمل واقفیت نہیں رکھتا ہوں! کیا میں اس پر اعتبار کر لوں؟ اور کیا اس کا اس قدر کہنا میرے لئے کافی ہے کہ "میں تم سے محبت کرتی ہوں اور میرا جینا تمہارے بغیر محال ہے"؟

لیکن پھر انہی خیالات کی مخالفت میں اس کا دماغ کچھ اور اختراع کر رہا تھا۔

"اس نے میری خاطر اپنا پاسپورٹ بدلوایا ہے؟ وہ لنکا میں اپنے چچا کے پاس جا رہی تھی .... جو وہاں گورنر ہے ــ ایک بہت بڑا آدمی! ــ کیا وہ میرے ساتھ اس لئے آ رہی ہے کہ میں اسے اس کے بھائی سے زیادہ آسائش اور امن دے سکوں گا؟ ...... نہیں! .... اُسے واقعی مجھ سے ...."

لیکن پھر خیال آتا کہ

"عورت ہر ایک کو اپنی توجہات کا مرکز اتنی آسانی سے نہیں بنا لیتی"۔

جہاز میں ایک بڑا سا ہچکولا آیا۔ اور حمید ٹھٹھک کر خاموش ہو گیا۔

"ہماری زندگی میں بہت سے واقعات ایسے آتے ہیں جن کے حل ہماری دسترس سے باہر ہوتے ہیں"۔ اس نے پھر اپنے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس معمہ کو اس بہتر وقت کیلئے چھوڑ دینا

چاہئے جبکہ اس کا خود بخود کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔........
بہت سے پریشان کن معاملات اپنے مناسب وقت پر خود بخود حل
ہو جاتے ہیں۔"

دُنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو رکاوٹوں کے ایسے غیر متوقع
ظہور سے گھبرا جاتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ کوئی آسمانی ہاتھ ان کو
فوراً دور کر کے رکھدے، حمید بھی ایسے ہی انسانوں میں سے تھا لیکن
اس میں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی متانت اور سنجیدہ مسکراہٹ
کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا تھا۔ جس سے اس کے ہر ملنے والے یا
دیکھنے والے کو یہ گمان تک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی پریشانی یا
گھبراہٹ میں ہے۔ اس لئے جب مس فرگوس اس کے پاس
آئی تو وہ مُسکراتے ہوئے اس سے اس طرح مخاطب ہوا۔ جیسے وہ
انتہائی دلچسپی سے کائنات کی رنگینیوں کا جویا ہے

"میں یہاں سمندر کے نظارے کے لئے آگیا تھا.....ہاں
تو آپ ٹینس کھیل آئیں؟"

"جی ہاں! لیکن جہاز پر ہمیں کچھ اچھے کھلاڑی نہیں مل سکتے"

"لیکن جہاز کے تلخ اور صبر آزما سفر میں ایسے کھیل مصروفیت
اور دلچسپی کے لحاظ سے بہترین ہیں؟"

"ہاں یہ درست ہے!"

"اس لئے ہمیں ایسے ماحول میں ان کے معیار کو جانچنا غیر
مناسب ہے" اس نے اپنے کندھے ہلاتے ہوئے تقریباً نیم مزاحیہ
انداز میں کہا۔

مس فرگوس کچھ جھینپ سی گئی جیسے اس نے ایک عورت
کی فطرت سے مجبور ہو کر اپنے کھیل کی قابلیت اور پھرتی کا غیر مناسب
رعب حمید پر بٹھانا چاہا تھا۔

حمید پُر امن صورت بنائے اطمینان سے نزدیک پڑے ہوئے
ایک بنچ پر سمندر کی طرف رُخ کر کے بیٹھ گیا۔

مس فرگوس تاسف اور مسرت کے درمیانی جذبہ میں حمید
کو تک رہی تھی۔

"میرے لئے ہندوستان جانے کا یہ پہلا موقع ہے میرا بھائی
کیپٹن سٹروک جو پچھلے دنوں سرحدی حملوں میں مارا گیا ہے مجھے ہندوستان
آنے کی کئی بار دعوت دیتا رہا........ وہ یہاں کی عجیب اور شاندار
زندگی میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔"

"عجیب اور شاندار! اور ہندوستانی زندگی؟" حمید نے
ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔

مس فرگوس اُسے حیرت اور پریشانی سے اپنی کبودی نگاہوں
کو مٹکاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

"کیوں ہندوستان تو......" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر
حمید کی انتہائی خاموشی اور پژمردگی نے اسے خاموش ہو جانے پر
مجبور کر دیا۔

حمید نے مُنہ پھیر کر سمندر کی بے چین موجوں پر اپنی نگاہیں
ڈال دیں، جیسے ہندوستان کے نام سے اس کے سینے میں کسی نے
نشتر چبھو دیا ہے اور جیسے وہ اپنی اذیت اور اندوہ کا اظہار بھی قابلِ
نفرت سمجھتا ہے۔

دونوں نہ جانے کتنی دیر تک خاموش رہے اور یہ طویل خاموشی
اگرچہ دونوں کے نزدیک خلاف توقع اور خلاف موقع تھی تاہم کسی نے
بھی گفتگو میں پہل کی ضرورت نہ سمجھی۔

(۲)

حمید جامعہ ازہر مصر سے۔ اخلاق، فلاسفی، اور سیاسیات پر اپنی
تعلیم ختم کر کے چھ سال کے بعد گھر واپس آرہا تھا۔ اگرچہ بی اے پاس کرنے
کے فوراً بعد ہی اسے والدین نے جامعہ ازہر بھیجدیا تھا۔ تاہم چھ سال
کی مکمل سادہ، پاکیزہ اور مصروف زندگی نے اسے اس قدر بلند اخلاق
اور شریف النفس بنا دیا تھا کہ گزشتہ "مکروہ" ہندوستانی اطوار اور
عادات کا اب اس پر ذرہ بھر بھی تسلط نہیں رہا تھا۔ اور ہمیں یقین کرنا
چاہئے کہ مس فرگوس کے پیار و محبت میں بھی اس کی "طبعی شرافت اور
نیک عادت" کو بڑا دخل تھا۔

وہ اگرچہ اپنے بھائی کیپٹن سٹروک کے خطوط میں" ہندوستانی

غلاموں کی بے حسی، افلاس اور جاہلیت کے متعلق کافی کچھ پڑھ چکی تھی مگر اس نوجوان حمید کی چند روزہ دوستی سے وہ ہندوستان کے متعلق اپنے نظریوں پر ——— جن کی بے ہودگی اور بے بنیادی میں اس کے شبہات ہر لحظہ بڑھتے جا رہے تھے ——— نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو گئی تھی اور آخر کار اس کا نتیجہ اور فیصلہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ "حمید بہر حال ایک قابلِ پرستش نوجوان ہے۔"

لیکن حمید پر بھی مس فرگوس کی عقیدتوں اور اظہارِ محبت کے باوجود اگرچہ اخلاقی اور پاکیزگی کا انتہا سخت اور کڑا قبضہ تھا اور اس لئے وہ مس فرگوس کی خود ستائیوں اور آزادانہ اظہارِ محبت کا جواب سوائے ایک غیر مبہم مسکراہٹ کے اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن اس کے دل اور دماغ میں ایک ایسی کشمکش شروع ہو گئی تھی جس کی شدت اور تلخی کو تو وہ محسوس کر سکتا تھا۔ مگر اس سے نجات حاصل کرنا ہر لمحہ اس کی دسترس سے باہر ہو رہا تھا۔

اس کے لئے مس فرگوس ایک ایسا لقمہ تھا جس کو وہ نہ پھینکنا چاہتا تھا اور نہ نگل سکتا تھا۔ اس نے اس کے جدا ہونے کی کئی تدبیروں پر غور کیا (جن میں سے بعض انتہائی خطرناک تھیں) لیکن اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک نغمہ تھا جو اگرچہ بہت مدھم تھا تاہم اس کے لطیف سُر لحظہ بہ لحظہ تیز سے تیز تر ہو رہے تھے اور اسے اس حقیقت کا بھی مکمل اعتراف تھا کہ اس نغمہ کی بقا کا انحصار مس فرگوس سے دوستی پر ہے لیکن وہ اسے اپنے ہمراہ لے جانے میں بھی کئی خطرات اور مشکلات کے ہیبت ناک دیوؤں کو منہ پھاڑ کر اپنے سامنے ناچتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اس کا تمام خاندان مشرقیت پسند اور مشرقی رسم و رواج اور مذہب کی پابندیوں میں بہت سختی سے جکڑا ہوا تھا اس لئے اس کے رشتہ دار وغیرہ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے گھروں میں ایک مغربی مس صاحبہ ——— جو موجودہ زمانہ کی نام نہاد "تہذیب" اور بے حیائیوں سے مکمل طور پر آراستہ ہو کر سڑکوں پر اِتراتی پھرے اور کلبوں میں ناچتی پھرے ——— رونق افروز ہو۔

اسے ایک دم خیال آیا جس سے اس کے چہرہ پر غیر معمولی مسرت کے آثار پیدا ہو گئے...... جیسے اس نے اپنی پریشانی کا حل تلاش کر لیا ہے۔

"میں اسے حبیب کے پاس ٹھہراؤں گا ——— والدین کے رضامند ہو جانے تک۔" وہ مسرت اور نیم مدہوشی کے عالم میں سوچ رہا تھا۔

حبیب جو ابھی انگلستان سے انجینئرنگ کی تعلیم سے فارغ ہو کر آیا تھا، اس دُنیا میں تنہا تھا۔ اس کا باپ اس کے لئے بہت کافی سرمایہ اور جائداد چھوڑ گیا تھا۔ اس لئے وہ نہایت شاندار طریق پر مکمل مغربی طرز اور معیار پر زندگی بسر کر رہا تھا۔ حمید کا اس وسیع دُنیا میں صرف یہی دوست تھا جس پر اسے مکمل اعتبار تھا کہ "وہ اس نازک مرحلہ پر ضرور اس کی امداد کرے گا۔"

حمید چھ سال کے طویل عرصہ میں اسے کبھی نہیں بھولا تھا۔ اگرچہ آپس میں ان کے رجحانات اور خیالات کا بہت زیادہ اختلاف تھا لیکن یہ اختلاف ان کے دلوں میں غیریت اور بیگانگی پیدا کرنے سے قطعاً قاصر تھا ——— ان کے درمیان خط و کتابت بہت عجیب اور دلچسپ ہوتی تھی، ایک کی زندگی مذہب اور خدا کے متعلق شبہات سے بھرپور، دوسرے کی زندگی ایمان، استقامت اور یقین سے پُر امن اور پُر سکون۔ ایک کا ماحول بالکل مادی اور بے ثبات، دوسرے کا روحانی، الہیاتی اور پائیدار۔ ایک زندگی کو ناقابلِ برداشت سمجھ کر اس سے نجات کا قائل۔ دوسرا اسے خدا کی طرف ایک عظیم ترین بخشش اور حسین ترین عطیہ سمجھ کر اسے نیکی اور پاکیزگی میں بسر کرنے کا حامی، ایک دُنیا کی ہر چیز سے بیزار، تنگ مزاج اور بے چین دماغ، دوسرا قانع، وسیع اور پُر امن دل کا مالک ——— غرض ان کے خطوط میں شاید ہی کوئی ایسا خط ہو جس میں دُنیا، زندگی اور مذہب پر بحث نہ ہو۔

——— (۴۳) ———

دوسرے دن حمید بہت سویرے اُٹھا، اگرچہ مس فرگوس کے متعلق اس کی پریشانی قدرے کم ہونی چاہئے تھی، مگر اس کی بجائے اتفاقات کی غیر یقینی نے اس کے دل و دماغ کو تمام رات پریشان اور متردد رکھا

اس کا چہرہ انتہائی سنجیدہ اور تھکا ہوا تھا جس سے معلوم ہو رہا تھا کہ
تخیلات کی کشمکش نے تمام رات اسے بیدار رکھا ہے اور وہ آخرکار
دماغی کوفت سے بیزار ہو کر بہت سویرے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔

دن چڑھنے میں ابھی بہت دیر تھی، چاند اپنی مجروح زردی کے
ساتھ افق مغرب میں گم ہو رہا تھا، اس نے مشرق کی طرف اپنی نیم وا
نگاہوں سے نظر دوڑائی —— جیسے وہ سورج کے طلوع کا بیتابی سے
منتظر ہے، شاید آفتاب کے ہمراہ جہاز اور اس کی محدود دُنیا کا ہنگام
اس کی دماغی تنگ و دو سے زیادہ قوی ثابت ہو کر اسے اس سے نجات
دلا دے، اور وہ اس نئی زندگی اور اس کی رنگینیوں میں دلچسپی
لینے لگے؟

لیکن پھر انہی پریشان خیالات کا انبوہ اس کے دماغ پر ٹوٹ
پڑا اور وہ سوچنے لگا۔

"میں جب بندرگاہ پر اس کے ہمراہ اتروں گا، تو میرے اقربا
اس کو میرے ہمراہ دیکھ کر کیا کہیں گے؟ — اور حبیب؟" وہ قدرے
ٹھٹکا "اگرچہ میں نے اسے مصر سے بوقت روانگی مطلع کر دیا تھا، لیکن
کیا وہ یقینی طور پر مجھ سے ملنے کے لئے آیا ہوگا؟ مستقبل پر کسے اعتماد ہے؟
.... کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل میں تقدیر ہمیشہ واقعات کی تشکیل
ایسے ہی کرتی ہے، جیسے ہم چاہتے ہیں؟ اگر وہ نہ آیا ہوگا —— تو —— میں
کیا کروں گا؟ کیا بہانے تراشوں گا؟ .... کس کس کو جواب
دوں گا؟ میرے اخلاق اور کیریکٹر پر بدگمانیاں ہوں گی ——
اعتراضات ہوں گے! اور میری بدنامی .... میں کس کس
کے سامنے اپنی صفائی پیش کروں گا؟ اور ان میں سے کتنے ایسے
انسان ہوں گے جو میرے الفاظ پر یقین کرنے کو تیار ہوں گے؟"

"خدایا! میں کیسا خوش قسمت ہوں گا، اگر حبیب بندرگاہ
پر آجائے گا؟!" اس نے آخرکار دبی ہوئی آواز میں اپنے آپ
سے کہا۔

اس نے اپنی گھڑی پر نگاہ کی، "سات بج کر بیس منٹ" اس
نے کافی بلند آواز میں کہا۔ "جہاز تقریباً دس بجے ساحلِ ہندوستان
پر پہنچے گا؟"

اتنا وقت! ایسے تلخ لمحات اور اس قدر بے تابی! —— وہ
ڈیک کا جنگلہ کافی دیر تک پکڑے کھڑا رہا .... اس کی نگاہیں
سمندر کی بے چین امواج میں کچھ تلاش کر رہی تھیں —— ایک راز
—— سمندر کی لا انتہا گہرائی سے بھی زیادہ عمیق اور گہرا راز ——
اس کی نگاہوں سے کئی دفعہ بیتاب اور مچلتے ہوئے آنسو گرے اور
بے پناہ موجوں میں بے حقیقت قطروں کی طرح جذب ہو کر رہ گئے۔

وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر خود فراموشانہ حالت میں نہ جانے
وہاں کتنی دیر تک ٹھہرا رہا۔ حتیٰ کہ جب مس فرگوسن نے عقب سے
آکر مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، تو وہ اچانک
مُڑا —— جیسے وہ کسی آسمانی خواب سے جگا دیا گیا ہے —— اور
مس فرگوسن کی طرف پہلے تیز اور ترش نگاہوں سے اور پھر مصنوعی
مسکراہٹ سے دیکھنے لگا، —— جیسے وہ اپنے پریشان اور روح
فرسا تخیلات کی تنہا دُنیا میں کسی انسان کے آنے کی توقع ہی نہیں
رکھتا تھا۔

"آداب! آپ آگئیں": اس نے اپنی پلکوں میں سے دیکھتے
ہوئے پُر معنی الفاظ میں کہا۔

"ہاں! ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے اور ہم ہندوستان پہنچ جائیں
گے ڈیئر حمید!" فرگوسن نے عمداً اس کی اس عجیب اور غیر معمولی
پریشانی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اب جلدی سامان وغیرہ
باندھنا چاہئے۔"

حمید ایک کلوے سے حرکت کرتے ہوئے آدمی کی طرح اس
کے ہمراہ چل پڑا۔

بمبئی کی بندرگاہ نظر آنے لگی تھی۔ تمام جہاز میں انتہا درجہ کا شور
و غل تھا۔ ہر شخص جہاز میں کوئی بلند جگہ تلاش کر رہا تھا تاکہ وہ سب سے
پہلے اپنے عزیز وطن اور اس کی رنگین سرزمین کا نظارا کر سکے۔ کئی
آدمی تو ابھی سے مسرت اور جوش میں رومال ہلا رہے تھے، حسینوں کے

قہقہے فضا میں بلند ہو کر "دل پھینک" انسانوں کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے، ہر ایک نے تقریباً اپنے سامان کی دیکھ بھال شروع کر دی تھی، ہر ایک کے چہرے پر مسرّت، محبّت اور بے تابی رقصاں تھی، ہر دل سمندر کی غیر دلچسپ یکسانیت اور تکلیف دہ سفر سے نجات پاکر اپنے "پیارے ملک" میں جانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

زرق برق ریشمی ساڑھیوں میں لپٹی ہوئی نازک اور بلوریں نازنین پھدک پھدک کر ایک دوسرے سے لپٹ رہی تھیں، مذہب پرست بزرگ اپنی "صحیح و سلامت واپسی پر" تقدیر اور خدا کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ غرض جہاز کی تمام زندگی میں ایک ایسی حرکت پیدا ہو گئی تھی، جیسے خدا نے دُنیا کو شادمانی اور محبّت سونپ کر اس سے افسردگی اور تفکرات واپس لے لئے ہیں۔

لیکن اس امید اور محبّت کی رنگین دُنیا اور اس کے ہنگام میں ایک نوجوان ایسا بھی تھا، جو بارہ نمبر کمرے کے سامنے اپنے بستروں اور سوٹ کیسوں وغیرہ کے انبار کے پاس سنجیدہ اور خاموش بیٹھا تھا ـــــ زندگی اور اس کی تمام حرکتوں سے بے نیاز، اپنے ہاتھوں میں اپنا نصف چہرہ چھپائے ہوئے ـــــ وہ اپنی نیم وا نگاہوں سے دور ـــــ بہت دور جہاں سمندر اور آسمان کی حدود ایک ہو جاتی ہیں ـــــ دیکھ رہا تھا، اس کی روح یاس اور امید کے درمیان بھٹک رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا اس دُنیائے حرکت و برکت میں کوئی پُرساں حال نہیں رہا ہے۔

مس فرگوس جہاز کے کپتان کے پاس چند ضروری امور کے تصفیہ کے لئے گئی تھی، اور اس کی غیر حاضری میں حمید خصوصاً اس وقت یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ تمام مشکلات اور معاملات کی پیچیدگی اسے مس فرگوسن سے بلا کم و کاست کہہ دینی چاہئے تھی اور اب تک ایسا نہ کرنے سے اس نے اپنی غلطی کو اور بھی زیادہ پُرخطر بنا دیا ہے۔

اب جہاز ساحل کے قریب تھا، تمام لوگوں میں ایک طوفانی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی، مس فرگوس بھی اس پریشان ہجوم سے گزر کر تیزی سے حمید کے پاس آئی، اور اس کی پژمردگی بے حسی اور خاموشی پر اظہار نفرت کئے بغیر اس کا کندھا پکڑ کر ـــــ جیسے وہ اسے نیند سے بیدار کر رہی ہے ـــــ کہنے لگی۔

"چلئے! بندرگاہ آپہنچی"

اس نے پہلے حیرت سے اس کے چہرہ پر نگاہ کی اور پھر اپنی کاہلی اور بے دلی پر نادم ہوتے ہوئے اپنی پتلون جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔

⁂

جہاز بندرگاہ پر لگ گیا تھا، اور مسافر دھڑا دھڑ اُترنے شروع ہو گئے تھے۔ مس فرگوس نے بھی قلیوں سے اسباب اٹھوایا۔ اور حمید کی معیت میں چل پڑی، لیکن وہ اب خلاف توقع بیتابی سے بہت جلد جلد قدم اُٹھا رہا تھا۔ جس سے مس فرگوس اور قلیوں کو ـــــ جو بوجھ کے نیچے سسک سسک کر چل رہے تھے ـــــ اس کثیر ہجوم میں بڑی دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔ اگرچہ ساحل پر قدم رکھتے ہی اس کے قدموں کی تیزی میں فرق پڑ گیا تھا۔ اور وہ اپنے اعضا میں ایک جمود روح میں سردی اور دماغ میں ایک تکان محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس کی نگاہوں کی تیزی اور پریشانی میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ چاروں طرف کسی کی تلاش میں انہیں شدت سے جھپکا رہا تھا۔

اک ساتھ اس کی نگاہ حبیب پر پڑی۔ جو ابھی نچلی سیڑھیوں پر تھا اور جس نے اگرچہ حمید کو دیکھا نہیں تھا، لیکن دیوانہ وار اس کی تلاش کے لئے بے پناہ ہجوم کو چیر رہا تھا۔

حمید اپنی خوش قسمتی اور واقعات کی ایسی عجیب مطابقت پر کھلکھلا اٹھا، اس نے اپنا رومال ہلاتے ہوئے اپنی انتہائی بلند آواز سے حبیب کو آواز دی۔ حبیب کچھ دیر ٹھٹکا اور پھر حمید کو پہچان کر نئی اُمنگ اور تازہ جوش کے ساتھ اس تک پہنچا۔

لیکن حمید کی خوشی اور اشتیاق حبیب سے مختلف تھا، اس کا چہرہ نہایت سنجیدہ اور پر امن تھا، اور وہ سب سے پہلے کم سے کم وقت میں اپنے اس "نہایت اہم معاملہ" پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ حبیب اپنی امید اور توقع کے خلاف اس کے یہ طرز سلوک کو گہری اور مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، اور بیشتر اس کے کہ وہ اپنے شبہات کا اظہار کرتا حمید

اپنی آنکھیں پھاڑتے ہوئے اپنا منہ رازدارانہ طریق پر اس کے کان کے نزدیک لے گیا! اور مدھم مگر تیز آواز میں بڑبڑانے لگا۔

"حبیب بھائی! مجھے اُمید ہے کہ تم...... میری اس نازک وقت پر...... امداد...... امداد کرو گے، ہاں! جہاز میں میری اِس سے" اور اس نے کانپتے ہوئے انگوٹھے سے مس فرگوسن کی طرف اشارہ کیا "دوستی ہوگئی ہے — اور...... وہ میرے ہمراہ...... میں بہت پریشان ہوں، حبیب!...... جب تک میں والدین کو رضامند کرلوں...... اسے آپ مہمان...... سمجھئے!...... ہاں! معاملہ بہت اہم ہے!"

"فکر نہ کرو حمید!" حبیب نے مسکراتے ہوئے کہا جیسے وہ سب معاملہ سمجھ چکا ہے اور اسے بہت ہی معمولی سمجھتا ہے سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا...... فکر نہ کرو"

"آپ مس فرگوسن ہیں" اس نے حبیب سے اس کا تعارف کرتے ہوئے کہا "اور آپ" وہ حبیب کی طرف پھرتی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "اور آپ میرے عزیز ترین دوست مسٹر حبیب...... آپ" وہ اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے مس فرگوسن سے مخاطب ہوا "آپ ان کے ہمراہ تشریف لے جائیں، ہم وہیں ان کی کوٹھی پر آپ سے ملوں گا"

مس فرگوسن قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کے ہمراہ روانہ ہوگئی۔

←—— ×××× ——→

مسٹر حبیب اور مس فرگوسن کو مغربی تہذیب و تمدن کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ دو دن کی دوستی میں انہوں نے نہ صرف ایک دوسرے کی حقیقی فطرت اور قابلیت کا مکمل جائزہ لے لیا، بلکہ ایک دوسرے کی عادات اور طرزِ سلوک کے بھی مدّاح ہوگئے — جیسے وہ پہلے ہی سے آپس میں جان پہچان رکھتے تھے۔

اور یہ مسٹر حبیب کے لئے کوئی حیرت انگیز یا غیر معمولی بات نہیں تھی، جب مس فرگوسن نے مسلسل تین دن کی صحبت میں حمید کا ذکر تک ہی نہ کیا! بلکہ اگر وہ خود بھی کبھی اپنی "غلطی" کا مرتکب ہوا تو مس فرگوسن نے فوراً موضوع گفتگو بدل کر اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کی — جیسے اب حمید کی محبت اس کے لئے ناقابلِ قبول ہے اور وہ اس سے دور رہنا ہی بہتر سمجھتی ہے) شاید یہ اس وجہ سے تھا کہ حبیب مغربی زندگی اور مغربی عورتوں کی محبت اور وفاداری سے مکمل واقفیت رکھتا تھا! یا شاید اس وجہ سے تھا، کہ وہ "پہلی رات کے واقعہ" سے اپنے دل میں قدرتاً ایک ندامت محسوس کرتا تھا! — جس سے بعض اوقات وہ اپنی گردن نیچے ڈال دیتا اور غیر ارادی طور پر ایک طویل خاموشی اختیار کرلیتا تھا۔

اب ہر شام اس "پہلی رات کے واقعہ" کے اعادہ نے اس کی رہی سہی شرم کو بھی خاکستر کردیا تھا۔

اس کا دماغ طرح طرح کے "قبیح خیالات" کی آماجگاہ تھا!......

اس کا یہ اعتقاد کہ "عورت صرف شہوانی خواہشات کی تسکین کے لئے پیدا ہوئی ہے" — روز بروز مضبوط ہورہا تھا — جس کے بُرے نتائج سے اگرچہ وہ خود مکمل واقفیت رکھتا تھا۔ تاہم اس سے بچنے یا اسے تبدیل کرنے کی صلاحیت اس کا دماغ آئے دن کھو رہا تھا...... اس لئے اس کے دل سے حمید کی مس فرگوسن سے "پاکیزہ محبت" کی اہمیت زائل ہورہی تھی، وہ حمید کی بیوقوفی پر حیران تھا کہ اس نے کس طرح کسی "گہرے تعلق" کے بغیر مس فرگوسن کے "حسین وعدوں" پر اعتبار کرلیا ہے؟ —

اس کے نزدیک ایک مرد کا ایک عورت کو سوائے اس "قبیح فعل" کے اپنے قابو میں رکھنا ناممکن تھا،

اس کے لئے وہ اپنے مغربی فلسفے کو کام میں لارہا تھا۔

"اخلاق اور اس کی پابندیاں کیا ہیں؟ کیا یہ سب اس لئے نہیں کہ سب گناہ منظم طریق پر کئے جائیں، اور انسان سے اُن "گناہوں" کے انتخاب کا حق اور محبت کی آزادی چھین لی جائے؟ لیکن دُنیا میں کتنے ایسے انسان ہیں جو ان اخلاقی قوانین کے پورے پورے پابند ہیں؟ کیا صرف زبانی طور پر ان کی اہمیت کا اعتراف ان کے استحکام کیلئے

کافی ہوسکتا ہے؟ کونسا ایسا اخلاقی قانون ہے جس کے خلاف
سینکڑوں دفعہ بغاوت نہ ہوچکی ہو؟ پھر دُنیا کیوں بیوقوفی سے ہر
اس انسان کو گردن زدنی قرار دے دیتی ہے جو علانیہ طور پر ان سے
انحراف کرتا ہے اور اس کو اسی قدر زیادہ نیک، بزرگ اور انسانیت
کا خیر خواہ سمجھنے لگتی ہے جس قدر زیادہ پوشیدہ طریق سے وہ ان کی
خلاف ورزی کرتا رہتا ہے۔ دُنیا کی ذہنیت کیسی عجیب اور غلامانہ
ہے کہ جن انسانوں کی رہنمائی اور عظمت کا جادو اس پر مسلط ہوچکا
ہے، کس طرح سمجھے اور سوچے بغیر ان کی ہر بات کی پیروی میں اپنی
نجات سمجھ رہی ہے؟ اور بھیڑوں کی طرح ان کے آگے چلی جارہی ہے
جس طرف "مذہب کے ڈنڈے" سے وہ اسے ہانکے لئے جارہے ہیں!

حبیب اپنی کوٹھی کے وسیع باغ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا
تھا اور ان ہی خیالات کی رو میں بہا جارہا تھا۔ یکایک مس فرگوسن
دبے پاؤں اس کے پاس آکر ٹھہر گئی۔ جب اس کی نیم بے ہوشی کو
کافی وقت گزر گیا اور مس فرگوسن محسوس کرنے لگی کہ اس کی موجودگی
بھی اس کو اپنے خوابوں سے جگانے میں ناکام ہوئی ہے تو اس نے
استکراہانہ انداز میں ایک بلند قہقہہ لگایا ـــــ جیسے وہ ایسی مدہوشی
کی حبیب سے توقع نہیں رکھنا چاہتی،

"آپ کے تخیلات کی رنگین دُنیا!" اور وہ پھرتی سے اپنے
کندھے خوشی میں نچاتے ہوئے اس کے بالمقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

حبیب ٹھٹک کر رہ گیا، اور پریشانی اور حیرت میں مس فرگوسن
کو دیکھنے لگا۔

"پیاری فرگوسن!" اس نے اپنی خفت ایک خفیف مسکراہٹ
سے دور کرتے ہوئے کہا۔

مرد کے سامنے عورت کو اپنے حسن کا مظاہرہ کرنے کا طریقہ،
خوب آتا ہے، اور دُنیا میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو مرد کی زبان سے
اپنے لئے تعریفی الفاظ سننے کی خواہشمند نہ ہو، بعض عورتیں اپنے
حسن کی تعریف اپنی زبان سے کرتی ہیں۔ اور بعض جاذب نظر لباسوں
سے، بعض مردوں کے سامنے اچھلنے کودنے اور اپنی طراری کا مظاہرہ
کرنے سے اور بعض فوٹو گرافروں اور اخبارات کے مدیروں کو اپنے
حسن کی "اشتہار بازی" کے لئے آلۂ کار بنانے سے اپنا مقصد نکالتی
ہیں۔

ہندوستان میں اکثر عورتیں اپنے حسن کا مظاہرہ خاموش رہ کر
کرتی ہیں جب تک کہ مرد خود بخود ان کے حسن کی تعریف میں رطب اللسان
نہیں ہوجاتے، بعض کسرِ نفسی سے مرد کے سامنے اپنے حسن کی تعریف
میں کسی دوسرے کے الفاظ دہراتے ہوئے، جیسے "دیکھو نا! امجد کے
ابا! موئی نجمہ اب بھی کہتی ہے کہ امجد کی شادی کی تقریب پر تمام عورتوں
میں میرا حُسن ہیرے کی طرح چمک رہا تھا! بھلا، چھ مہینے تو رہی
میں بیمار! ـــ اب کہاں ہیرا اور کہاں میں؟"

"نہیں نعیمہ! میری آنکھوں سے دیکھو! اب بھی سینکڑوں
سے اچھی ہو۔"

بعض عورتیں جب کبھی تنہا نہ ہوں تو ایک دوسرے کی
جا و بیجا تعریف اور توصیف کرتی ہیں، جس کے در پردہ تکلفات
کی آڑ میں اپنے اپنے حسن کے متعلق نئے روشن اور رنگین خیالات
پیدا کرنے کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔

لیکن مس فرگوسن ان مغربی عورتوں میں سے تھی، جو نمائشی
کھیلوں میں حصّہ لینے اور اپنی نصف عریانی سے اپنے "سڈول اور
حسین" جسم کا مظاہرہ کرنے اور اس طرح کئی نوجوانوں کی توجہ کا
مرکز بننے میں دلچسپی لیتی ہیں۔

اور یہی وجہ تھی کہ مس فرگوسن اگرچہ پہلے بھی حبیب کی زبان
سے اپنی مضبوط اور سڈول جسامت اور ٹینس میں مہارت کی کئی
بار تعریف سن چکی تھی لیکن اس وقت بھی اس نے اس کے سامنے
بیٹھتے ہی وہی ورزش وغیرہ کا موضوع زیر بحث لانا مناسب سمجھا
جس میں اگرچہ اسے احساس تھا کہ حبیب اس قدر دلچسپی لیگا،
جتنی اس کے نزدیک اسے لینی چاہئے،

"ورزش سے جسم بہت شاندار ہوتا ہے، حبیب!" اس نے
انتہائی مسرت سے کہا۔

"ہاں! لیکن یہاں تو عورتوں کو چار دیواری میں حیوانوں کی طرح محبوس رکھا جاتا ہے' جیسے کسی سازش کے قیدی ہوں۔"

حبیب اگرچہ کافی عرصہ انگلستان میں گزارنے کی وجہ سے مغربی عورتوں اور ان کے حسن کی نمائشوں سے کافی واقفیت حاصل کر چکا تھا اور اس کے لئے ایک عورت کا اپنے حسن کی تعریف میں اگرچہ کئی کتابیں بھی لکھ دینا جائز تھا' لیکن اس وقت وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا ..... اس کی زیادہ وجہ یہ تھی' کہ جس موضوع کی طرف حبیب گفتگو کا رخ بدلنا چاہتا تھا' مس فرگوسن اس سے بے نیاز ہو کر اپنی گفتگو جاری رکھنا چاہتی تھی ـــــ شاید اس لئے کہ اس موضوع میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی خصوصاً جبکہ حبیب بھی کئی بار اس کے متعلق اپنی نفرت کا اظہار کر چکا تھا ...... یعنی ہندوستان کا ناقابل برداشت ماحول (جو انگلینڈ سے سو فیصدی پست تھا) اور اس کی جاہلیت' مفلسی اور غلامی (جن سے نفرت اس لئے نہیں تھی کہ ایسی اور اس قسم کی خرابیاں بالکل دور نہیں ہو سکتیں بلکہ اس وجہ سے کہ اس کے انگلستان سے واپس آنے پر یہ سب دور کیوں نہیں ہوئیں! یعنی اس کی واپسی پر ہندوستان اس کے لئے تین سال میں یکایک انگلستان کیوں نہیں بن گیا!)

مرد کی یہ ازل سے خوش قسمتی یا بدقسمتی چلی آتی ہے کہ جب بھی وہ اپنے آپ کو عورت کے ساتھ پاتا ہے۔ تو اپنی انفرادی ذہنیت اور حیثیت بالکل معدوم کر دیتا ہے' اس طرح حبیب بھی صرف اس مسکراہٹ کے بعد دلچسپی اور سنجیدگی سے اس کی گفتگو پر دھیان دینے کو مجبور ہو گیا تھا۔

وہ ایک فصیح مقرر کی طرح اپنے حسن اور مشاغل پر روشنی ڈالتی رہی' بعض اوقات اپنی گفتگو کو زیادہ پُر اثر بنانے کے لئے اپنے دائیں ہاتھ کو زور سے جنبش دے دیتی اور کبھی اپنے لبوں کو زور سے بھینچاتے ہوئے اپنے مردہ الفاظ میں زندگی پھونک دیتی۔ غرض کافی دیر "باتیں بنانے" کے بعد اس کی گفتگو فلمی صنعت پر آکر رُکی۔

"مجھے بھی ایک امریکن ڈائرکٹر نے اس صنعت کی "خدمت" کے لئے مدعو کیا تھا؟"

"تو پھر آپ گئیں کیوں نہیں....."

"مجھے ایسی زندگی ناپسند ہے۔"

"خوب!" حبیب نے داد دیتے ہوئے جیسے اس کی مس صاحبہ بہت شریف ہیں اور ایکٹروں جیسی "مکروہ" زندگی سے نفرت کرتی ہیں۔

"آج یہاں کون سا کھیل چل رہا ہے؟" اس نے حبیب کی داد کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "آج تو کوئی ہندوستانی فلم دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

"ہندوستانی فلم"؟ حبیب نے انتہائی بیزاری سے کہا۔ "میں تو ہندوستانی فلم دیکھنا ایک ناقابل معافی گناہ سمجھتا ہوں...... ہندوستان نے بس ایک فلم تیار کیا ہے جس کا میں دل سے مدّاح ہوں۔"

"کون سا؟"

"کرما" حبیب نے باچھیں کھلاتے ہوئے کہا۔ "اسے میں نے "ولایت" میں دیکھا تھا"

"اچھا تو انگلش پکچر سہی" فرگوسن نے اپنے اس غیر معمولی قومی افتخار پر مسکراتے ہوئے کہا۔

"پومپائی کا انجام" رٹز میں چل رہا ہے۔ اور میں اگرچہ اسے کئی بار دیکھ چکا ہوں' لیکن پھر بھی آپ کے ہمراہ ضرور دیکھوں گا۔"

چنانچہ اس باہمی فیصلے پر "فوراً ہی عملدر آمد" ہونا شروع ہو گیا۔

⟵ ⟶

دوسرے دن وہ بہت سویرے اٹھے اور اپنے اپنے بستروں میں پڑے پڑے ہی پچھلی رات کی فلم پر تنقید اور تبصرے کرنے لگے' فرگوسن کا چہرہ خمار آلود تھا' جس میں اس کے بے تکلف اور آوارگی کی حد تک پہنچے ہوئے آزاد رخ پر حجاب اور سنجیدگی رقص کر رہی تھی' اس لئے حبیب کی نگاہوں کے لئے آج اس حسین چہرے میں "رومانیت" اور غیر معمولی رعنائی کی جھلک تھی' .... اور وہ اپنی تمام توجہات سے اسے بار بار تک رہا تھا۔ اور اپنی خوش قسمتی پر دل ہی دل میں

نازاں ہو رہا تھا۔

وہ اپنی رائے کا اظہار فصیح اور بلیغ اور مناسب الفاظ میں —— جیساکہ وہ عام طور پر علمی اور ادبی مجلسوں میں کیا کرتا تھا —— نہیں کر رہا تھا، بلکہ ٹوٹے پھوٹے بے جوڑ الفاظ میں، جس سے صاف معلوم ہو رہا تھا، کہ اس کا دماغ کسی اور شاہراہ پر چل رہا ہے، اور وہ زیر بحث فلم کی بجائے کسی اور تخیلی ڈرامہ کی فلم دیکھ رہا ہے،

فرگوسن حبیب کی اس ہیئت پر دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی اور اس کی نیم بے ہوشی کے باوجود اپنے خیالات کا اظہار برابر اسی زور اور شور سے کر رہی تھی، چنانچہ جب گھنٹی بجی اور تھوڑی دیر بعد نوکر داخل ہوا تو اُسے نہایت افسوس اور بادلِ ناخواستہ طور پر مجبوراً اپنی گفتگو بند کر دینی پڑی۔

"کیا ہے؟" حبیب نے اپنے تخیل کی مدہوشی سے جاگ کر ایک ترش آواز میں پوچھا،

"حضور!" نوکر نے مودبانہ انداز میں کہا۔ "حمید صاحب تشریف لائے ہیں۔"

"اچھا!" حبیب نے استکراہانہ آواز میں کہا "بلاؤ!"

فرگوسن حمید کے نام پر حبیب کو معنی خیز اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی، جس کے چہرے سے نفرت اور تصنع اس طرح ٹپک رہا تھا، جیسے وہ ایک بیوقوف انسان سے ملاقات کرنے اور اپنا وقت ضائع کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اور جیسے "بلاؤ" کا لفظ اس نے غیر ارادی طور پر کہا ہے اور اسے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا!

"اسلام علیکم" حمید نے اندر آکر ایک خوش آہنگ انداز میں خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے سے کہا۔

لیکن جب اس نے اُن کے چہروں پر نگاہ کی تو ان میں نفرت اور بیگانگی کے آثار دیکھ کر وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا، جیسے اس پر ایک بجلی گر پڑی ہے، اور ایسے سلوک کی امید وہ خصوصاً حبیب سے کبھی نہیں رکھتا تھا۔

وہ ایک نیم مجروح انسان کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے ان کے سامنے ایک کرسی پر آہستہ سے بیٹھ گیا،

وہ ابھی تک اپنے سلام کے جواب کا منتظر تھا، لیکن اول تو شاید حبیب نے اس کے سلام کا جواب ہی نہیں دیا تھا، اور اگر دیا تھا تو اس قدر مدھم آواز میں کہ حمید اسے سُن ہی نہیں سکا تھا۔

"سُنایئے! آپ کے والدین راضی ہو گئے؟" حبیب نے مخالف طرف مُنہ پھیرتے ہوئے کہا، جیسے وہ عام طور پر اپنے نوکروں سے کیا کرتا تھا۔

"ہاں! اور انہوں نے شادی کی بھی بخوشی اجازت دیدی ہے" حمید نے تقریباً بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"شادی" مس فرگوسن قہقہہ مار کر ہنسی۔

حمید حیرت اور اندوہ سے دیوانہ وار مُنہ پھاڑ کر رہ گیا، اس کی آنکھوں کے آگے ایک سفیدی سی چھا گئی، جس میں زندگی کی تمام شکلیں اسے بہت ہی مدھم نظر آنے لگیں۔

"کیوں؟" اس نے سسکتی ہوئی مجروح آواز میں پوچھا

"ان سے دریافت فرمایئے آپ!" حبیب نے طنزاً آواز میں مسکراتے ہوئے مس فرگوسن کی طرف اشارہ کیا اور اپنی آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے بے نیازانہ انداز میں نزدیک پڑی ہوئی میز پر سے ایک کتاب اٹھا کر دیکھنے لگ گیا۔

"یعنی آپ اپنے خوابوں کو پریشان اور بے تعبیر سمجھیئے" فرگوسن نے تقریباً نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔

حمید بغیر کچھ کہے انتہائی ملول اور برہم چہرے لئے اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔

"پاگل ہو گیا ہے حمید!" حبیب نے اپنا افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"شاید کسی بھوت کا اثر ہو گیا ہے" فرگوسن بھی اس کی ہمنوا ہوئی۔

پھر دونوں مل کر بلند قہقہے لگانے لگے۔

ہاماگوچی

ایک سچا اور نادر واقعہ

تاریخ شاہد ہے کہ جاپان ہمیشہ سے زلزلوں اور طغیانیوں کا شکار ہوتا چلا آیا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی شدید جھٹکے کی وجہ سے ہزاروں جانیں ضائع ہوگئیں۔ جزیرہ ہونے کی وجہ سے آئے دن یہاں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ۱۷ جون ۱۸۹۶ء کی شام کو ایک ایسا ہی شدید جھٹکا محسوس ہوا جس میں تقریباً تیس ہزار جانیں ضائع ہوئیں۔ ذیل کا جو واقعہ میں بیان کرنے والا ہوں وہ بھی ہو بہو اسی طرح کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔

لوگ اسے ہاماگوچی کا ہٹی کہا کرتے تھے، لیکن عام طور پر وہ صرف ہاماگوچی کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ایک گاؤں میں رہا کرتا تھا اور اپنے گاؤں کا سب سے معمر شخص تھا۔ اس لئے لوگ اس کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ مالی حالت کے لحاظ سے بھی وہ سب سے اچھا تھا۔ ہاماگوچی نے اپنی آنکھوں سے اپنے بال بچوں کو زلزلے کا شکار ہوتے دیکھا تھا۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں اس خاندان کے دو رکن رہ گئے تھے۔ ایک وہ اور ایک اس کا آٹھ دس سال کا کمسن پوتا۔ اور اسی ایک مرکز پر ہاماگوچی کی امیدوں کی دنیا قائم تھی۔ لڑکے کا نام ٹاڈا تھا۔ ہاماگوچی اپنے گاؤں کا سردار بھی تھا۔ وہ ہر وقت اسی دھن میں مگن رہتا تھا کہ اپنے آدمیوں کو ممکن سے ممکن آسانیاں بہم پہنچا سکے۔ وہ لوگوں کو نصائح و پند کرتا۔ اور ضرورت کے وقت مالی امداد دینے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ وہ ایک کاشتکار تھا۔ اور اس کی کل جائداد صرف اس کے کھیت تھے۔ انہیں وہ سونے سے بڑھ کر چاہتا تھا۔

ان تمام خصوصیات کے علاوہ وہ پنچایت کا چودھری بھی تھا اور اکثر بڑی خوش اسلوبی سے وہ گاؤں کے جھگڑوں کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ یہ گاؤں نوے[۹۰] گھروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اور اس گاؤں کے آدمی نیک اور خوش مزاج تھے۔

ہاماگوچی کی جھونپڑی ایک ٹیلے پر واقع تھی اور باقی جھونپڑیاں ٹیلے سے نیچے ایک میدان میں تھیں۔ ہر ایک جھونپڑی سے ملحق مالک مکان کا کھیت تھا۔ اور اس میدان سے قریباً دو تین میل دور سمندر کا کنارہ۔ ہاماگوچی کا کھیت تین سمتوں سے جنگل سے گھرا ہوا تھا۔ صرف ایک سمت جگہ خالی تھی جہاں سے سمندر نظر آتا تھا۔ ہاماگوچی کے گھر سے کچھ فاصلے پر جاپانیوں کا مندر تھا۔ جہاں قصبے کے لوگ اپنے دیوتاؤں کو نظریں دیا کرتے تھے۔ مندر میں ایک گھنٹہ لٹکا ہوا تھا جو خطرے کا الارم تھا۔ لوگوں کا یہ معمول تھا کہ فصل کٹ جانے پر سمندر کے کنارے جاکر خوشی مناتے اور تھوڑی دیر کے لئے دنیا و مافیہا کو بھول جاتے تھے

فصل کٹ چکی ہے اور آدمی جوق در جوق سمندر کے کنارے جا رہے ہیں۔ صرف دو متنفس آج اس تقریب میں شامل نہ ہوسکے

ایک تو ہاماگوچی اور ایک ٹاڈا۔ ہاماگوچی آج کچھ علیل ہے، اس لئے
اس نے ٹاڈا کو بھی اس تقریب میں شامل ہونے سے روک دیا ہے
بار بار اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ گاؤں کے دوسرے
لوگ اس کے متعلق کیا خیال کریں گے۔ کبھی اس جذبہ سے مغلوب
ہوکر وہ چاہتا ہے کہ اس جشن میں جاکر حصہ لے کبھی علالت اس جذبہ
اور ارادہ پر حاوی ہو جاتی ہے۔

اسی الجھن میں وہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اور کھڑا ہوکر
میلے کی طرف دیکھنے لگا۔ گھروں کی چھتوں اور راستوں پر جھنڈیاں
ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن پھر بھی فضا
میں وہ خنکی نہیں جو ہونی چاہئے۔ فضا میں اب بھی ویسی ہی گرمی ہے
جو زلزلے کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک معمولی
جھٹکا محسوس ہوا۔ پھر سکون چھا گیا۔ زلزلہ بالکل معمولی تھا۔ لیکن
ہاماگوچی کے نزدیک اس کی اہمیت تھی۔ نہ معلوم اس نے ایسے کتنے
جھٹکے دیکھے تھے۔ پھر بھی ہاماگوچی اس سے خائف ہو رہا تھا۔ اسی اثناء
میں اچانک اس کی نگاہ سمندر کی طرف گئی۔ سمندر عجیب طوفانی حالت
میں تھا۔ اب اس کے رہے سہے شکوک بھی جاتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے
سمندر کنارے سے اُدھر ہٹنا شروع ہوا۔ گو ہوا بالکل مخالف تھی لیکن
پانی سمندر کے کنارے کے خلاف ہٹا جا رہا تھا۔ اب وہ اس خطرے
کو پوری طرح سمجھ گیا۔ "ادھر سمندر موجزن تھا ادھر اس کے دل میں انسانی
ہمدردی کا طوفان" وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان آدمیوں کی جان بچالے
سمندر پر پہنچنا بھی آسان نہ تھا، اور سمندر تک پہونچنے کے لئے کسی فوری
تدبیر کی ضرورت تھی۔ اسی خیال میں وہ کھویا ہوا تھا کہ اچانک کہنے
لگا "ٹاڈا۔ مجھے ایک مشعل جلا دو۔"

میلے کے زمانہ میں رات کو مشعلیں جلائی جاتی تھیں جس میں کپڑا
ٹھونس کر کپڑے کے اندر تیل ڈالا جاتا تھا۔ لڑکے نے فوراً حکم کی تعمیل
کی۔ ہاماگوچی مشعل لئے ہوئے کھیت کی طرف دوڑا۔ فصل بالکل سوکھ
چکی تھی اور یہی اس کی پونجی تھی۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ہاماگوچی
نے کھیت میں پہونچکر ایک طرف سے آگ لگانی شروع کی۔ اور دیکھتے ہی
دیکھتے آگ کے بڑے بڑے شعلے اٹھنے لگے۔ ٹاڈا فرط حیرت سے دیکھ
رہا تھا اور اس کے معصوم چہرے سے اندرونی کشمکش ظاہر تھی۔ ہاماگوچی
کو اتنی مہلت نہ تھی کہ وہ لڑکے کو تمام باتیں سمجھا سکتا۔ مندر کے پجاری
نے جب آگ کے شعلے دیکھے فوراً خطرہ کا گھنٹہ بجانا شروع کیا۔ لوگوں
نے گھنٹہ کی آواز سُنی اور آگ کی طرف دوڑے۔

سُورج غروب ہو رہا تھا اور ابھی تک سمندر ساحل کی مخالف سمت
میں بہا جا رہا تھا۔ ہاماگوچی کے دیکھتے ہی دیکھتے آدمی آنے شروع
ہو گئے۔ آنے والے لوگ آگ بجھانے کی فکر میں تھے۔ مگر ہاماگوچی نے
منع کر دیا۔ آنے والے اس کے مُنہ کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔
انہوں نے ہاماگوچی سے پوچھا "آگ کیونکر لگی" اس سے پہلے کہ ہاماگوچی
جواب دے ٹاڈا نے بڑھ کر کہا "آگ تو اوجی سام نے خود ہی لگائی ہے
میں نے خود دیکھا ہے۔" یہ سُنکر لوگ اسے سچ مچ پاگل خیال کرنے
لگے۔

گاؤں کی کل آبادی جو کہ چار سو افراد پر مشتمل تھی جب ٹیلے پر پہنچ
گئی۔ اس وقت ہاماگوچی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور بآواز بلند کہنے
لگا "ہاں۔ آگ کے متعلق لڑکا بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ آگ خود میں
نے ہی لگائی ہے۔ لیکن کیوں لگائی ہے یہ تم ابھی دیکھ لوگے۔ میں
پاگل نہیں ہوں اور نہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھے پاگل سمجھیں۔ یہ کہتے
ہوئے اس نے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔ دیکھو سمندر کی طرف دیکھو
اور کہو کہ کیا میں واقعی مختل الحواس ہوں۔" لوگوں نے اس طرف
دیکھا۔ پانی کی لہریں پہاڑوں کی طرح گاؤں کی طرف امنڈی چلی
آتی تھیں۔ لوگ یہ منظر دیکھ کر خائف ہو گئے۔ اور اکثر ایسے بھی تھے جنہوں
نے خوف کی وجہ سے چیخنا شروع کر دیا۔ سمندر اسی طرح امنڈا چلا آرہا
تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی گاؤں میں آگیا۔ اور بڑے زور و شور سے
گاؤں پر حملہ کیا۔ اسی طرح پانچ چھ مرتبہ لگاتار حملہ ہوتا رہا لیکن ہر بار
کم تیزی کے ساتھ۔ حتیٰ کہ اس کا زور بالکل گھٹ گیا اور پانی اپنی
جگہ پر ساکن ہو گیا۔ ہاماگوچی کا ٹیلہ بالکل سلامت رہا۔ لوگ خوف
کی وجہ سے بوکھلائے جا رہے تھے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کا گاؤں

تباہ ہوگیا۔ جہاں لہلہاتے کھیت نظر آتے تھے وہاں سلف میدان تھا۔" میں نے آگ اسی سلئے لگائی تھی۔" ہاماگوچی نے کہا

لوگوں کے دلوں میں اس کی وقعت دوچند ہوگئی۔ ہاماگوچی اب فقیر تھا۔ یہ اپنی تمام پونجی برباد کرچکا تھا۔ لیکن پھر بھی خوش تھا ٹاٹوا دوڑ کر اپنے دادا کے قدموں پر گر پڑا۔ لوگ جواب اپنے پورے ہوش میں آگئے تھے۔ ہاماگوچی کے سامنے ایسے جُھک گئے جیسے کسی دیوتا کے سامنے جھکا کرتے ہیں۔

ہاماگوچی کی آنکھوں سے چند قطرے ٹپک کر زمین میں جذب ہوگئے۔ لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ "میرا گھر تمہارا اپنا گھر ہے آپ یہاں بڑی خوشی سے رہ سکتے ہیں۔ باقی جو ہیں مندر میں گزارہ کرسکتے ہیں۔ یہ کہہ کر ہاماگوچی گھر کی طرف ہولیا۔ لوگ بھی اس کے پیچھے چلے جارہے تھے۔

چونکہ اس زمانہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ مدد پہونچانی بہت مشکل تھی۔ اس لئے یہ مصیبت لوگوں پر بہت دنوں رہی جب خوش حالی کا زمانہ آیا۔ لوگوں نے گھر از سرنو تعمیر کئے لیکن ہاماگوچی اب بھی اسی جھونپڑی میں پڑا رہتا۔ اسے اب دنیا کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ لوگ اس کے احسان کا بدلہ توکسی صورت سے بھی ادا نہ کرسکتے تھے۔ پھر بھی اپنی دانست میں انہوں نے ہاماگوچی کیلئے بہت کچھ کیا۔ ہاماگوچی کے نام پر ایک مندر بنوادیا۔ جس میں اس کا نام سونے کے حرفوں میں لکھا گیا۔ لوگ اسے دیوتا سمجھنے لگے۔ اور اس کے مندر میں اسی کی مورت کی پوجا کرنے لگے۔ لیکن ہاماگوچی اپنی جھونپڑی میں پڑا رہتا۔ وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز تھا۔

ہاماگوچی پر اس کا کچھ اثر ہوا یا نہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ ہاں میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہاماگوچی کو مرے ہوئے ڈیڑھ سو سال ہوگئے ہیں۔ لیکن اب بھی اس کا نام زندہ ہے۔ اب بھی اس کا مندر موجود ہے۔ اور اب بھی عقیدت مند وہاں جاکر مصیبت کے وقت اس کی روح سے دُعائیں مانگا کرتے ہیں۔

(ترجمہ)

یوسف کوٹلوی

(از شیلانگ)

کو بہت قریب کر دیا ہے، سب آتے جاتے رہیں گے۔

محلہ کی عورت۔ یہ ٹھیک ہے مگر اختر میاں ماں کی مامتا بڑی چیز ہے۔

لطیفہ کی ہند دسہیلی۔ پردیسی کی ریت کو سب کا من للچائے
اوگن دا میں ایک ہے رہے نہ سنگ لیجائے

(سب) لوگ کھڑے تھے کہ یاسمین چیخی)

یاسمین (بلی) "میاؤں" ——— "میاؤں"!

(اس کی آواز میں مخلصانہ درد اور بے لوث
محبت کی چنگاری تھی سکندر اپنے تاثرات پر
قابو نہ پا سکا)

سکندر۔ محبت کی چنگاری سے انسانی دل یوں خالی! اور حیوانی سینہ یوں روشن، میری پیاری چنبیلی! تو میرے وطن کے تمام عزیزوں اور دوستوں سے پاک و مقدس ہے، تیرا دل حیوان ہو کر آدمی کی محبت سے لبریز ہے، جن لوگوں کے لئے میں خاک ہوا، جن کے لئے میں نے سب کچھ کیا، جن کے لئے میں نے اپنی زندگی تج دی وہ سب مجھ سے دور، دور رہیں، کیوں نہ دور رہیں، دوست ہیں، عزیز ہیں، اور "انسان ہیں"، مگر تو حیوان ہو کر اپنی دردناک آواز سے میرا دامن پکڑتی ہے، اے میری رنگوں کی گیند تجھے یہ معلوم نہیں کہ محبت کرنا سب سے بڑا جرم ہے۔ وہ لوگ جو صبح سے شام تک میرے قصیدہ خواں تھے آہ اُن میں سے ایک نہیں جو مجھ سے سچائی کے ساتھ کہے ——— تم کیوں جا رہے ہو؟ یہ دُنیا، یہ انسان! میری نظر سے اس لمحہ میں ایک بڑے مینا[illegible] کی چھتری کی طرح گر گئی ہے۔

(یاسمین کو گود میں اٹھا کر)

آ میری بلی! میں اپنے آنسو تیرے بالوں میں جذب کر دوں۔ یہ دوستوں کے رومال، عزیزوں کے دامنوں، اور بہنوں کے ڈوپٹوں سے زیادہ سچے اور پاک ہیں، دوستوں کی پوشیدہ نیش زنی اور منافق کی چھپی ہوئی نشتر زنی تیرے تیز پنجوں اور مہلک دانتوں سے زیادہ خطرناک ہے۔

(بلی کو بوسہ دے کر)

اپنے تنفس کی موسیقی کو میرے بہرے کانوں سے قریب کر دے۔ یہ دُنیا اور انسان کے حیوانی سلوک سے پتھر ہو گئے ہیں انکو اپنے سانسوں سے ذی حس بنا دے۔ میرے پیارے چوپائے۔ رشکِ آدم چوپائے۔ میں زندگی کی اس منزل پر ہوں کہ مجھے انسانی رخساروں آوازوں اور چلتے پھرتے دو پایہ جانوروں سے زیادہ تیری غیر پاکیزہ مونچھوں کے بالوں اور کرخت تنفس میں شانتی محسوس ہوتی ہے۔

(ماں کی جدائی پر یکایک یاسمین کے بچے کلبلائے)
یاسمین کبھی سکندر کو دیکھتی تھی کبھی بچوں کو آخر
سکندر نے یاسمین کو اس کے بچوں میں چھوڑ دیا
جن میں سے ایک کو وہ چاٹنے لگی)

سکندر۔ اگر دل کی کوئی زبان ہے تو کیا یاسمین نے سب کچھ نہیں سُنا ہوگا؟ جب وہ بے زبان ہو کر سب کچھ کہہ سکتی ہے تو سُن کیوں نہیں سکتی؟

(یاسمین بولی)

میاؤں ——— میاؤں ——— میاؤں

(اور سکندر کے قدموں میں لوٹنے لگی۔ گویا
وہ یہ کہہ رہی تھی)

جاڑے کی راتوں میں، تو می شمعوں کی روشنی میں، جھلملاتے ہوئے تاروں کی پاک گود میں، تم بیٹھے ہوئے گنگنایا کرتے تھے۔ پیارے انسان! تم میری سانسوں کی دھوکنی کی بھی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے تمہارا گرم لحاف میری پناہ تھا۔ میں تمہارے گیتوں کی اتنی اسیر ہو گئی تھی کہ میں نے شکار بھی چھوڑ دیا تھا۔ جب تم گاتے تھے تو میں پڑی ہوئی سُنا کرتی تھی۔ میں کچھ نہیں سمجھتی تھی، مگر میرا بال بال کانپتا تھا۔ میری حیوانی روح، میرے لمبے لمبے بالوں والی کھال کے شامیانے تلے ناچتی تھی۔ جانے تم کس کے لئے گیت کہتے اور گاتے تھے۔ وہ گیت مجھے اب کون سُنائے گا۔ میں تو بلی ہوں، حیوان ہوں، انسان اپنے دسترخوان کی جھوٹی ہڈیوں سے میری دعوت

کرتے ہیں۔ تمہاری طرح اپنے ساتھ بیٹھ کر کون مجھے محبوبہ کی
طرح کھانا دیگا۔ ابھی تک میرے ایک ایک بال میں تمہارے
بوسوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ ابھی تک میری پیٹھ پر تمہاری
لمبی لمبی انگلیوں کے لمس کی حرارت اور کیفیت نہ دکھائی
دینے والے نشان چھوڑ گئی ہے آہ! میرے انسان! تمہارا
حیوان اب کس مخلوق کی گود میں پناہ لے۔

(سکندر کی آنکھوں میں آنسو اور آنکھیں
یاسمین کی آنکھوں میں گڑی ہوئی ہیں۔)

تم اب جا رہے ہو۔ اور ابدی طور پر جا رہے ہو۔ یہ ویران گھر
یہ اجڑا ہوا گھر، گویا مجھے جاگیر دے جا رہے ہو، وہ میری
آرامگاہ تمہاری بنتو کی چُنی ہوئی پیازی چندریا، وہ اب
اس ویرانے میں کبھی نظر نہ آئے گی۔ راتوں کو میرے نوزائیدہ
بچوں کی نگرانی اس گھر کی کاٹنے والی تاریکی اور تنہائی کرے گی
اور میرے بچے بلوں کی غذا ہو جائیں گے ـــــ میں اپنی
نگاہوں سے تمہارا دامن پکڑوں گی ـــــ کیسے جاؤ گے
میرے انسان! ـــــ لے چلو مجھے بھی اپنے ساتھ لے
چلو ـــــ میاؤں ـــــ میاؤں ـــــ میا ـــــ
کیوں لے چلو گے میں نگوڑی کس کام کی ہوں، ایک میری
جان ہوتی تو تم شاید ضرور لے چلتے، میں تندرست ہوتی
تو تم مجھے حسین اسباب ہی سمجھ کر ساتھ لے لیتے۔ مگر میں
ایک رات کی زچہ ہوں، میرے سات بچے ہیں، میاؤں ـــــ
ـــــ میاؤں ـــــ لے چلو۔
صبو کے دودھ میں سے تھوڑا سا میرے بچوں کو دیدیا کرنا
تم تو بڑے فیاض اور دل والے ہو۔ سُنتی ہوں تمہاری
جنس کو فیاضی کا بڑا دعویٰ ہے، مگر تم بخیل کب سے ہو گئے!؟
کیا وقت کا سایہ پڑ گیا! ایک بچے کو ـــــ نہیں دو کو
میں منہ میں دبا لوں گی۔ ان کو گاڑی میں بٹھا دوں گی اور
پھر اسی طرح ساتوں کو لے جاؤں گی، نہیں تو مجھے اور میرے
بچوں کو ایک ٹوکری میں رکھ دو، ایسا ہی کرو میرے خوبصورت
انسان! سچ جانو، میں تم بن نہیں جی سکتی، پھر کون اس
مکان میں آئے، کون جائے، میری آنکھیں در و دیوار میں تم
کو گاتے ہوئے دیکھیں گی، مگر نہ پائیں گی۔ نہ پائیں گی اور
میں پتھروں سے سر ماروں گی۔ میرے لمبے بال تمہارے بوسوں
کے عادی ہو گئے ہیں۔ یہ چھتوں کی گھنی گھاس اور در بدر
گھسٹتے گھسٹتے بدبودار اور بے نور ہو جائیں گے۔ تمہاری سانسوں
کا عطر میں کہاں سے حاصل کروں گی۔ تم جانتے نہیں ہو میں
حیوان ہوں، میری کوئی قیمت نہیں ہے، میں بلی ہوں میرا
حُسن گونگا، اور میری سجاوٹ خاک کی طرح بیکار ہے۔ تم
نے اس حُسن کو زبان بخشی، اور اس سجاوٹ کو عروج دیا، اب
مجھے نظر سے کیوں گراتے ہو ـــــ لے بھی چلو، میں
تمہارے ساتھ چلوں گی (دردناک آواز میں) ـــــ میاؤں!

(یاسمین نے مُنہ میں دو بچے دبائے اور دروازے
سے نکلنے کو تھی کہ سکندر نے کمرہ بند کر دیا
اور کنڈی لگا کر باہر کھڑا ہو گیا)

45

سکندر: یہ میں نے کیا سُنا، یاسمین لڑکیوں کی طرح بول رہی تھی،
وہی بول رہی تھی، تعلق نے زبان عطا کر دی، محبت نے
نطق بخش دیا، ایک بلی کو، ایک چوپایہ کو، اور یہ میرے دل
میں نرم نرم، ٹھنڈے ٹھنڈے کس کے پوروے محسوس ہو
رہے ہیں۔ میرے خیالوں میں کون مظلوم بنی کھڑی ہوئی ہے،
اس کی آنکھیں میرے خیال کی فضا پر چھائی جا رہی ہیں حسرت
بھری نگاہ دل ہلائے دیتی ہے۔ یہ کوئی اشرف المخلوق کی
نسل سے ہے، نہیں یاسمین! ایک بلی ـــــ ایک چوپایہ
اور اس کے بند آنکھوں والے بچے!

(اختر برآمدے میں آتا ہے)

اختر۔ سکندر کیا سوچ رہے ہو ـــــ کیا کوئی چیز رہ گئی؟
سکندر۔ جی ہاں!

اختر۔ کیا رہ گیا؟

سکندر۔ کچھ نہیں ــــ مگر ــــ سب کچھ، حیوان! ــــ مگر انسان!

(بات کاٹ کر)

اختر۔ خیر، کچھ لوگ رخصت کرنے کے لئے باہر تمہارے منتظر ہیں

سکندر۔ انسان؟! ــــ مگر حیوان!

تھوڑی دیر کے بعد کھڑکیوں اور دروازوں میں جھکی ہوئی لڑکیوں اور بوڑھی عورتوں کی ہلکی ہلکی چیخوں اور تیزی سے بہے ہوئے آنسوؤں میں لطیفہ کی گاڑی روانہ ہوگئی۔ چلتے چلتے سکندر نے حمیدہ بانو..... اپنی نانی سے کہا)

سکندر۔ نانی، پیاروں کی امانت تمہارے سپرد ہے۔

حمیدہ۔ اچھا پیارے!

دوسرا منظر

لطیفہ کا ویران مکان (یاسمین اور اس کے بچے ایک کمرہ میں بند ہیں، کمرہ کے اندر یاسمین دوڑتی پھرتی ہے حمیدہ اپنے چھوٹے بیٹے کو لے کر کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ یاسمین کے منہ میں ایک بچہ دبا ہوا ہے)

یاسمین۔ (بچوں کو چھوڑ کر) میاؤں! (دُم کو حمیدہ کی ٹانگوں میں اُٹھاتی ہے)

حمیدہ۔ چھوڑ گئے، تجھے سب چھوڑ گئے، یہ کمرہ تصویروں اور سامانوں سے کیسا سجا ہوا تھا۔ آہ کسے خبر تھی کہ چٹی دیوار پر صرف کیلوں کے منحوس نشان ہنستے ہوئے ماضی کی یادگار رہ جائیں گے کون جانتا تھا کہ میرے پیچھے سکندر کے گیتوں کی بجائے یہ سناٹا ہوگا۔ ہولناک سناٹا۔ خوفناک سناٹا ــــ ــــ الٰہی میرے پیارے کیوں چلے گئے!؟

(سسکیاں بھرتی ہے)

ماجد۔ سکندر صاحب راضی نہ ہوتے تو کوئی بھی یہاں سے نہ جاتا۔

حمیدہ۔ بھیّا اسی کا دل اکھڑ گیا تھا۔

بلّی۔ میاؤں ــــ میاؤں ــــ میاؤں!!!

حمیدہ۔ اری دکھیا! غم میں گھلی جاتی ہے۔ دیکھ تو ماجد! بچاری کا کیسا منہ اُتر گیا ہے!؟

یاسمین۔ میاؤں ــــ میاؤں ــــ میاؤں!

حمیدہ۔ مت رو، پوسی! میری پوسی!

ماجد۔ صاف کہہ رہی ہے "میاں!" ــــ ارے میاں اب رکھے ہیں، میرٹھ بھی پہنچ لئے۔

حمیدہ۔ محبّت بھی کیا بُری بَلا ہے سچ، اس میں آدم زاد اور حیوان کی شرط نہیں، ــــ ہائے صبّو سے کھیلا کرتی تھی، ارے سکندر اسے اپنے پاس سُلاتا تھا۔

ماجد۔ اچھا مجھے تو ذرا جانا ہے، بیڈمنٹن کا میچ ہے نسیمًا کو بھیجتا ہوں وہ اس کے بچوں وچوں گھر لے جائے گی۔

بلّی۔ میاؤں ــــ!

ماجد۔ کیوں غل مچاتی ہے، میں کہیں نہیں جاتا، میری قسمت مجھ میں اور میں علی گڑھ میں عمر بھر کے لئے قید ہوں۔

حمیدہ۔ تم بھی چلے جاؤ، تمہیں بڑا شوق ہے ہوا خوری کا! ارے جس کے دل پر بیتتی ہے وہی خوب جانتا ہے سبق لو اس بے زبان جانور سے ــــ کیسا چہرہ اتر گیا ہے (یاسمین سے) نا، نا میری پوسی، سکندر آئیگا اور تجھے لے جائیگا (بچوں پر ہاتھ پھیر کر) ہائے کیسے مُنّے مُنّے ہیں، پیارے پیارے، سب ان کے لئے روتے چلے گئے، شجو، باپ کے ڈر سے کچھ نہ کہہ سکی، دل پر پتھر رکھ کر چلی گئی، اس کی تو زندہ گڑ یا تھی۔ یہ بلّی۔ یہ بے زبان "عورت"!

(بلّی حمیدہ کی نگاہوں میں حسرت بھری نگاہیں گاڑے ہوئے ہے)

حمیدہ۔ مجھ سے کیا کہتی ہے، میرے پیاروں کی نشانی، کوئی میں نے

تجھے روک لیا' چل میں تجھے پیاروں کی امانت سمجھ کر پالوں گی'
میرے پیاروں کی یادگار' جیتی جاگتی یادگار'۔
(نسیما آتی ہے ٹوکری اس کے ہاتھ میں ہے)
نسیما۔ لو لُو! (ٹوکری پاس رکھتے ہوئے) ایک نہ دو' دو نہ چار' سات'
اب کے تو اس نے گھر ہی بھر دیا۔
حمیدہ۔ (نسیما کو بازو سے دھکا دیتے ہوئے) چل تیری آنکھوں میں خاک
کیا تیرے اولاد نہیں ہے' پوتے' نواسوں والی ہو کر ایسے کلمہ
زبان سے نکالتی ہے' جانور ہو یا آدمی اللہ نے جان سب کو
دی ہے یہ تو سوچا ہوتا کہ ان کے لئے میرے پیارے بسورتے
ہوئے چلے گئے' ڈائن کہیں کی' چل اُٹھا ٹوکری کو'
(دونوں جاتی ہیں)

تیسرا منظر

(ریل تیزی کے ساتھ جا رہی ہے سکندر کھڑکی
کے سہارے بیٹھا ہوا ہے)
سکندر۔ وہ کوٹھری میں بند ہوگی' چلا رہی ہوگی' چیخ رہی ہوگی چھوٹی
کھڑکی کی سلاخ کو توڑ دینا چاہتی ہوگی۔ اس اکیلی کوٹھری
میں جہاں ویرانی گی بدبو ہوگی اور یکسانہ گھٹن' اس کو تنہا
دیکھ کر زہرا کی روح تڑپ گئی ہوگی۔ یہ اس کی یادگار تھی
میں اس کو چھوڑ آیا' اتنا بے حواس ہو گیا کہ زہرا کی یادگار
کو چھوڑ آیا۔
اختر۔ (سکندر سے) کہہ آئے ہو بُوا سے! بچوں کو اور جنبیلی کو
لیجائیں اپنے گھر'
شاہجہاں۔ میاں جی! تم نے اُسے ہم سے چھڑایا ہے۔ اگر آپ کے چھینکنے
کا ڈر نہ ہوتا تو میں اس کو اپنی ڈوپٹیا میں باندھ لیتی۔
اختر۔ واہ' اور سات بچوں کے ٹکٹ کون دیتا!؟
نفیسہ۔ یوں جو کہو چند روپیوں کی خاطر' خاندانی بلی کو ہمیشہ کے لئے
ہاتھ سے کھو دیا' خدا جانے بیچاری کا کیا حشر ہوگا۔
اختر۔ کچھ حشر نہیں ہوگا۔ سکندر علی گڑھ آئیں گے تو لیجائیں گے
سکندر۔ (ڈبے سے فضا کی طرف گردن نکالتے ہوئے دانت بھینچ کر)
سوداگر انسان! مصلحت اور زر کا غلام' غلام اور غلام
ساز' مادہ کا پجاری' روح کا دشمن ——— اور اگر
قبلہ بجائے آدمی کے بلی ہوتے!! ——— اور یوں بے بسی
کے عالم میں چھوڑ دیے جاتے۔
نفیسہ۔ سکندر کے دوست آذر کی بہن زہرا نے باپ اور بھائی
سے لڑ کر یہ بچہ سکندر کو دیا تھا۔ بیٹی! میں وہ دن بھولی
نہیں ہوں' جس دن دیکھا زہرا کو ۱۰۴ بخار تھا اور ہم سب
دیکھنے گئے تھے۔ اس کے بستر پر یہ بچہ پڑا ہوا تھا۔ سفید
موتیوں کی خوبصورت کنٹھی اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھی
سکندر نے یاسمین کو پیار کیا اور بولا' ایسی خوبصورت بلی
میں نے تو دیکھی نہیں' یہ سنتے ہی زہرا نے کہا تھا
کہ نذر ہے میرے مرنے کے بعد یہ میری یادگار' اور پھر
وہ ہماری طرف دیکھ کر رونے لگی تھی۔ نہ وہ رہی نہ اُس
کی یادگار (بات کاٹ کر اور بے تاب ہو کر)
سکندر۔ بواجی' خدا کے لئے چپ ہو جائیے۔
نفیسہ۔ (نہیں بیٹا! میں تو بات کہہ رہی ہوں' خیر اب تم اس کو لے آنا' اور
سکندر۔ خط لکھتے رہنا' بوا اس کو حفاظت سے رکھیں گی' آدمی اسی چیز کی حفاظت
کرتا ہے جو اس کے لئے مفید ہو اور بیچاری یاسمین' وہ بلی' وہ بے زبان
حیوان' اس کو کون پوچھے گا' کیوں پوچھے گا' ان کے گھر میں تو بچے
بھی نہیں ہیں۔
(پھر فضا کو دیکھ کر)
دُنیا کے دوسرے انسانوں کی طرح میں بھی باغی ہوں' غدار ہوں' میرے
کوٹ کی جیبیں' بچوں سے مجنونانہ طور پر بھری ہونی چاہئیں تھیں'
اور میری گود میں یاسمین ——— سب چھوڑ آئے! اگر میں کیوں

چھوڑ آیا، زہری کی یادگار، آج میرا دل یہ حقیقت اگلے دیتا ہے کہ میں یاسمین کو زہری کی طرح پیار کرتا تھا۔ اس کا تنفس مجھے اکثر زہری کا تنفس معلوم ہوتا تھا، راتوں کو نیم غنودگی کے عالم میں میرے بستر میں اس کی کلبلاہٹ مجھے دھوکا ہو جاتا تھا کہ نازک زہری میری آغوش میں ہے، اب میرا کمرہ میری خوابگاہ، میرا بستر سب تاریک ہو گیا۔ (کھڑکی پر سر رکھ دیتا ہے)

چوتھا منظر

(حمیدہ خانم اور ماجد بیٹھے ہیں۔ یاسمین ایک چھوٹے کمرہ میں معہ اپنے بچوں کے بند ہے)۔

(حمیدہ چٹخنی کھول کر کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں اس کے پہونچتے ہی یاسمین چیخیں مارتی ہے)

یاسمین میاؤں ـــــ میاؤں ـــــ میاؤں!

حمیدہ۔ کیا کہتی ہے اری دُکھیا بیرہ کی ماری (ماجد سے) دیکھو تو ماجد میرے پیاروں کے دھیان میں اپنے کل کے پیدا ہونے والے بچوں کو بھی تو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی، اری نگوڑی تجھے کیا ہو گیا۔!

یاسمین۔ (بلی نے ایک نگاہ حمیدہ پر ڈالی گویا وہ کہہ رہی تھی) مجھے روک سے

محبّت کا حس جس کو تم متمدن اور ناطق حیوان مصلحت اندیشی اور جنسی تقاضوں سے تعبیر کرتے ہو، تمہارے احساس جدائی پر تمہارے پیاروں کا ایک خط شانتی کی بارش کر دیگا، اور جب تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ تمہارے پیارے ترقی اور زندگی کی نئی دُنیا میں خوش و خرم ہیں، تمہاری تڑپ ختم ہو جائے گی، مگر میری وہ تڑپ جس کی میں نمائش بھی نہیں کر سکتی میرے حیوانی قلب میں پاؤں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیگی۔ تم خیال کرتی ہو گی کہ میں تازہ گوشت کے ٹکڑوں اور دودھ کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ تو پھر؟ کوئی میں موجودہ عصر کی بیوی ہوں جو مکھن، توش اور چائے کی دیوانی ہوتی ہے، نانی! تم خیال کرتی ہو کہ میں گرم لحاف اور سفید چادروں کے لئے رو رہی ہوں، ہوش کی دوا کرو کوئی میں ماڈرن گرل ......

...... ہوں جو اونچی ایڑی کے جوتوں اور زریں ساریوں کی غلام ہے، تم جو میری تڑپ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے میری آنکھوں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی ہو، تو آخر کیوں؟ میں موجودہ زمانہ کی بلی ضرور ہوں، مگر عصر حاضر کی انسان نہیں، جسے ویدانت، بودھ ازم، عیسائیت، اسلام اور الحاد تک انسان نہ بنا سکا، میں تو محض بلی ہوں اور تڑپ رہی ہوں، میں کس لئے تڑپ رہی ہوں، ....

اس نامعلوم شے کے لئے جس کو انسان معلوم کرنے کے بعد بھی نہیں تڑپتا اور ہر حقیقت کو امتداد کی کارفرمائیوں سے مدد لے کر مٹا دیتا ہے!

نانی تم جانتی ہو، امتداد گو خارجی شے ہے مگر انسان کے احساس میں داخل ہے، کل تمہارے آنسوؤں میں جو روانی تھی وہ آج نہیں ہے گو تمہارے پیارے آدھے راستہ سے لوٹ کر نہیں آ گئے پھر تم کیوں کل کی حالت میں نہیں ہو!؟ اس کی پہلی وجہ یہی ہے نا کہ احساس کی چنگاری سرد پڑنے لگی، امتداد کو کیوں دوش دیتی ہو، خارج کا اس میں کیا قصور، یہ تو داخل ہی کی جادوگری ہے، انسانوں کی دُنیا کی حقیقت ہو تو ہو، ہم بلیوں کی دنیا کی یہ کہاوت نہیں کہ "وقت دل کے زخموں کا مرہم ہے" نانی جی! زمان و مکان دل کی کائنات سے خارج ہیں، یہ تو دل ہی ہے جو اپنے زخموں پر خود پھائے رکھتا ہے؟! امتداد کیسا؟!

انسان اشرف المخلوق ہے، ناطق ہے متبسم ہے، اس لئے اس کے مرد

فلسفہ وضع کر کے بیان کر سکتے ہیں اور اس کی عورتیں مردوں کے فلسفوں کو مکاتیب محبت میں زیب داستان کے طور پر نقل کر سکتی .... ہنس سکتی ہیں ہنسا سکتی ہیں رو سکتی ہیں رُلا سکتی ہیں خود تڑپنے کی مشق کر سکتی ہیں اور تڑپانے میں اُن کو ید طولےٰ حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر ہم تتلیاں ہم ادنیٰ مخلوق جنہیں "فیاض فطرت" نے بے زبانی اور انسانی مرد و عورتوں سے سب کچھ مختلف ساز و سامانِ شعور دیا ہے فلسفوں کے سہارے نہیں جیتیں، ہم تو اس "روگ" کے سہارے زندہ ہیں جو مجھے اس وقت تڑپا رہا ہے! انانی جی اب فیصلہ کرو کہ قدرت کے عظیم ترین اور عجیب تر عطیہ کی حفاظت ہم تتلیوں نے کی ہے یا اس چمن عالم کے بھونروں اور تتلیوں نے !؟

میاؤں ـــــ میاؤں ـــــ میاؤں !!!

ماجد۔ کیوں میاؤں میاؤں کئے جاتی ہے، قیام سے حرکت بہر حال بہتر ہے،

حمیدہ۔ جاؤ، تم بھی

ماجد۔ ہُوا! تم اس کی طرح نہیں تڑپ سکتیں، اوّل تو جاتے وقت ہی دامن پکڑ لوگی اور دیک کر بھاگ بھی گیا تو سر پکڑ کر رونے لگوگی

حمیدہ۔ چل شریر کہیں کا ـــــ!

ماجد۔ سچ، شرارت کی بات نہیں، آدمی کی قوّتِ نطق ہی نے اس کو بے عصمت اور بے مایہ کر دیا، چنبیلی کی تڑپ اس کے وجود میں مقید ہے، اس سے تڑپ ہے۔ شمع جس وقت تک روشن نہیں کی جاتی نور کا مخزن ہے مینا جس وقت تک سربند ہے محض شراب ہے، کلی جس وقت تک کھلی نہیں چمن کا بھید ہے، جولانی جب تک خروج نہ ہو جولانی ہے اور محبّت جس وقت تک بیان نہ ہو محبّت ہے، محفوظ طاقت کا اخراج

انتشار کا مقدمہ اور انتشار فنا و ارتقا و طاقت کی موت ہے۔

اگر کوئی سائنسداں بحیرۂ روم کی امواج اور اتھاہ آبی طاقت کو نہروں ندیوں اور نالوں میں تقسیم کر دے تو اس کی انفرادی بحری طاقت کیونکر باقی رہ سکتی ہے، اس کی موجیں ہزار دس ٹن وزن رکھنے والے جہازوں کو تنکے کی طرح کیوں ادھر سے ادھر پھینک سکتی ہیں، محض اس لئے کہ وہ عمیق ہے، وسیع ہے، عریض ہے، اور اپنے عرض و طول کے باوجود مقید ہے۔

حمیدہ۔ اوہو، بڑے آئے علّامہ! یہ تو دیکھتا نہیں کہ بے چاری نے کل سے کچھ کھایا نہیں۔

(دودھ پلاتی ہے مگر یاسمین نہیں پیتی)

پانچواں منظر

سکندر کا غربت کدہ

سکندر کا خاندان اپنے وطن سے باہر جا کر زندگی کے شب و روز گزار رہا ہے۔ سکندر اپنی کتابیں تصویریں اور سامان سجا رہا ہے۔ طوطے بیچنے والے کی آواز آتی ہے۔)

طوطے بیچنے والے کی آواز۔ مٹھوے لو مٹھو

(صباحت آتا ہے)

صباحت۔ اوہو، بھائی جان، ذرا جھانک کر دیکھئے، یاقوت کی گردن معلوم ہوتی ہے یاقوت کی، سبز پری ہے، —— وہ کہتا ہے جانِ عالم کے طوطے کی طرح بولیگا، بہادر شاہ کے تاریخی طوطے کی طرح بولے گا۔ ہمالہ کی چوٹی کے اوپر سے پکڑ کر لایا ہے، بڑا ہی خوبصورت ہے —— بھائی جان دلا دیجئے —— دلا بھی دیجئے۔

سکندر (ہنس کر) اچھا —— ! بلاؤ۔

(طوطے والے سے ایک طوطا خرید لیا جاتا ہے، شاہ جہاں آتی ہے)

شاہجہاں۔ کتنے میں لیا صباحت، اوہو، اس کے گلے میں تو بڑا زبردست کنٹھا ہے، مگر سٹو بھی، طوطے کا کیا پالنا، طوطا پالیں طوطا چشم (سکندر سے) بھائی جان اس شہر میں کوئی بلّی بیچنے والا نہیں آتا —— !؟ صباحت کو طوطا دلایا ہم کو بلّی دلا دیجئے۔ یا —— ؟

دیکا یک سکندر کو یاسمین کا خیال آیا اور "میاؤں" کی آواز)

ہاں، یا —— یاسمین کو علی گڑھ سے لا دیجئے"۔

انسان کا شعورِ نفسی اس کے لئے کس قدر مصیبت ہے، اے میری رشکِ آدم بلّی! تو ایک ثانیہ میں میری روح سے آ کر لپٹ گئی، بظاہر قریب نہیں ہے مگر میرے دماغ و دل میں اپنے تمام رنگوں اور تیز پنجوں کے ساتھ چل پھر رہی ہے، اُن تیز پنجوں کے ساتھ جو روئی سے بھی زیادہ نرم ہیں، میں سمجھتا ہوں پیاری یاسمین! تو شکوہ گزار ہے انسان کی بے وفا سرشت کی، تو گلہ کوش ہے آدم کے بے مروّت بیٹوں کی، مگر تو نہیں جانتی کہ اشرف المخلوق کا اُن اشیا کی طرف توجہ کرنا جو لذّتِ کام و دہن پیدا نہ کر سکیں اس کی "شرافتِ خلقی" اور نیابتِ الٰہی کی توہین ہے! —— اے کاش تو بلّی نہ ہوتی —— "مرغی" ہوتی !؟

(عالمِ خیال میں پھر آواز آتی ہے) میاؤں —— میاؤں —— میاؤں آہ کب تک پکارے جائے گی، اے بے زبان! تو میرے گیتوں کی رسیا ہے، اری وہ تو انسانوں کے ایک فرقہ کی زبان میں لکھے جاتے ہیں، اُن انسانوں کے ایک فرقہ کی زبان میں جن کی فرقہ پرستی کا یہ کمال ہے کہ ملکوں کا تو ذکر ہی کیا ہر ۵۰ کوس کے بعد زبان میں بعد المشرقین اور زمین آسمان کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور تو، تو اُس عظیم الشّان قوم سے تعلق رکھتی ہے جس نے نسل و قوم اور زبان و رسم الخط کی تمیز و تعیّن ہی پیدا نہیں کی۔ بے زبانی ہر جگہ بے زبانی ہے، میں نے تو نہیں سُنا کہ قطبِ شمالی کی بلّی گاتی ہے اور چین کی بلّی باتیں کرتی ہے، تیری قوم نے وحدانیتِ درندگی قایم رکھی، میری جنس کی حیوانیت دیکھ کہ وہ اشرف ہونے کا دعویٰ کرتی ہے مگر وحدتِ انسانیت قائم نہیں کر سکی، بلّی ہر جگہ بلّی ہے اور انسان کہیں انگریز ہے کہیں ہندوستانی، کہیں مغربی ہے کہیں مشرقی، کہیں ہندو ہے کہیں مسلمان، انگریز لڑکی ہندوستانی نوجوان سے محبّت نہیں کر سکتی کہ حاکم و محکوم کی عظیم خلیج ان کے درمیان حائل ہے، مسلم نوجوان ہندو کماری سے محبّت نہیں کر سکتا کہ قومیت اور مذہبیت عہد نامۂ محبت پر مہرِ توثیق ثبت کرنے کے لئے تیار نہیں، مگر تو میری نسل و قومیت معلوم کئے بغیر مجھ سے محبّت کرتی ہے۔!!

مجھے خوف ہے میری بلّی! تم میرے شیریں خون اور تلخ گوشت کے لئے تو محبّت نہیں کرتیں، اگر سوتے میں میری جنس کی طرح تم اپنے دانتوں کے تیز خنجر میرے حلقوم میں پیوست کر دو تو ایک ہفتہ کے لئے محفوظ غذا حاصل کر سکتی ہو، مگر میری بلّی! تم نے گوشت خور ہونے کے باوجود کبھی ایسا نہیں کیا۔ آؤ میرے تصوّر کے اس رنگ محل میں آؤ جہاں کسی انسانی دوشیزہ کو آنے کی اجازت نہیں ہے، بیٹھ جاؤ اور سنو! نوعِ انسانی "اہنسا" جیسا عظیم فلسفہ مدوّن کرتی ہے۔ ہر ذی روح کو تکلیف پہنچانا جرم قرار دیتی ہے مگر دوسری طرف ایک قوم دوسری قوم کو ہڑپ کر جانے کے لئے بیک وقت بیچین ہے لیکن مجھے معلوم ہے تمہارے تیز دانت نہ صرف میرے ملائم گوشت کے مقابلہ میں پانی ہو گئے بلکہ مجھے یاد ہے تم نے میرے کبوتروں پر بھی کبھی حملہ نہیں کیا، میں جانتا ہوں کہ تم کو محبت کے نامحسوس و فطری

اثرات نے براہ راست سمجھا دیا کہ کبوتر اور بلی ایک ہی خاندان "روح"
سے تعلق رکھتے ہیں، اور آخر کار تمہارے قدرتی "شیر پنجہ" ان پروں
کی گنبدوں کے سامنے موم ہو کر رہ گئے ۔
آدمی نے اپنی خلقی درندگی "کو تمدن و معاشرت کے اوزاروں سے
تراشا مگر وہ جتنی تراشی گئی اس کی دھار تیز ہوتی گئی، اور آج اس کی حیثیت
ایک زہریلے خنجر کی ہے جس کا دوسرا نام "بدنسل درندگی" ہے مگر تم نے
اے رشک آدم بلی! اپنی درندگی کی عصمت کو محفوظ رکھا، "تم "بے تپیا
اسپات" ہو اور آدمی "ڈھلا ہوا خنجر" ۔
آتا ہوں اے رشکِ آدم بلی! میں "خنجر" سے بچ کر تیرے ہی پاس
آتا ہوں، تو نے اپنی درندگی کو بدنسل و بے عصمت نہیں کیا ہے ۔"

چھٹا منظر

رات میں حمیدہ کا مکان

(یاسمین پلنگ کے ایک پایہ سے بندھی ہوئی ہے، رسی کا حلقہ اس
کی گردن میں پڑا ہے، بچے پاس ہی ایک بڑے ٹوکرے میں گدگدے
بستر پر کلبلا رہے ہیں، حمیدہ پان بناتی جاتی ہے اور روتی جاتی
ہے، یاسمین رسی کو توڑنا چاہتی ہے اور میاؤں میاؤں کا
شور مچا رہی ہے ۔)

حمیدہ۔ (خود ہی) کون یقین کرے گا، کس کی سمجھ میں آئیگا، اک بے زبان،
اِک جانور، یوں مچھلی کی طرح آدمی کے لئے تڑپے، دن کا تو ذکر ہی
کیا، روز رات کو رسی سے باندھتی ہوں، اور روز رسی توڑ بچوں کو
چھوڑ نفیسہ کے ویران بنگلہ میں بھاگ جاتی ہے، سکندر کے کمرہ
میں جا کر پاگلوں کی طرح زمین کھودتی ہے، در و دیوار سے سر ٹکراتی
ہے، مگر میرے پیارے اس کو نہیں ملتے ۔ خدا معلوم اس دکھیا کو
وہ کیوں چھوڑ گئے ۔

(یاسمین کو چمکارتے اور اس کے نرم و دراز بالوں پر
ہاتھ پھیرتے ہوئے ۔)

سو جا میری پوسی، تیری بے خوابی میرے دکھ کی بیداری ہے سو جا، میں
نے کل ہی خواب دیکھا ہے، سکندر تجھے لینے آ رہا ہے، تو خواب
نہیں دیکھتی، خواب دیکھا کر، خواب و خیال "حقیقت" سے کہیں زیادہ
میٹھی چیزیں ہیں، انسان کی زندگی میں ہر حقیقت خواب و خیال بننے
ہی کے لئے حقیقت کا لباس پہنتی ہے، میرے پیارے جو چلتی پھرتی
حقیقت تھے، دور ہو کر خواب و خیال ہو گئے، زندگی میں دوری
اور مرنے کے بعد دوری دونوں میں کچھ ایسا فرق تھوڑے ہی ہے
دونوں عدم کی حدیں ہیں، اور دونوں کو ہم دیکھ سکتے ہیں، لیکن ذرا
دیکھو اس آدم زاد کی بے بصری، جہاں تک نظر جاتی ہے اس کا
نام حدود و مناظر رکھا ہے، اور جہاں نظر نہیں پہنچ سکتی اس کا نام
عدم، اور موت رکھ دیا، اگر موت و عدم نادیدنی چیزیں ہوتیں تو
آدمی خواب کیوں دیکھتا، اور اپنے مرحوم بڑے بوڑھوں، عزیز، اقربا
سے خواب میں باتیں کیوں کرتا، اور خواب ہی نہیں، خیال کرنے سے
عاری ہو جاتا، جو باتیں عقل میں نہ آئیں اُن کا نام عدم اور جو زبان
سمجھی نہ جا سکے اُس کا نام "میری پوسی کی زبان بتا دینا" اچھی
سقراطیت ہے ۔

ماجد۔ (جاگ کر) ارے صاحب! آپا کیا گئیں آپ کا دماغ خراب ہو گیا
ایک وہ پاگل بلی ہے اور ایک آپ ہیں، اس کی چیخوں نے اور آپ
کے دن رات کے ذکر و اذکار نے میرا تو خواب و خور حرام کر دیا ہے،
خدا کے لئے اب سو جائیے ۔

حمیدہ۔ بیٹا سو جاؤں گی تو یاسمین رسی توڑ کر پھر نفیسہ کے بنگلے بھاگ
جائے گی ۔

ماجد۔ بھاگ جائے گی تو کیا آسمان ٹوٹ پڑے گا، صبح پھر آ جائے گی
—— خدا کے لئے سو جاؤ۔ میں صبح اس کو پکڑ لاؤں گا۔

(حمیدہ لیٹ جاتی ہے)

یاسمین

(نصف رات گزر جانے کے بعد یاسمین نے رسی توڑ دی
اور چھپتوں چھپتوں نفیسہ کے بنگلہ کی طرف روانہ ہو گئی، اس کے
گلے میں رسی لٹک رہی تھی۔ مگر ایک طاقت تھی کہ اسے

کھینچے لئے جا رہی تھی۔)

(وہ جا رہی تھی اور غالباً یہ سوچ رہی تھی)

یاسمین۔ اب تو شجّو اور سکندر آ گئے ہوں گے، کوئی عمر بھر کے لئے تھوڑے ہی گئے ہیں، آ گئے ہوں گے تو میں اپنے بچّوں کو پھر اُٹھائے جاؤں گی، میرے بچّوں کو ملاحت، صباحت اپنی گود میں اُٹھائے اُٹھائے پھریں گے۔ پھر وہی کافوری شمع ہوگی اور سکندر کی خاموش و پُرسکون خواب گاہ، پھر آدھی رات ہوگی اور بھیرویں کی تانیں، جاڑوں کی دھوپ میں شجّو کی رضائی کے قریب میں سورج کی شعاعوں سے پھر اسی طرح کھیلوں گی۔ انسانی آغوش کی گرمی، میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کچھ بھی ہو نسلِ انسانی بڑی نشیلی ہے۔ دلدوز ہے، اب کے اگر مجھے میرے شاعر کا معطر لحاف مل گیا تو میں ابدی نیند سو جاؤں گی

ساتواں منظر

"سکندر"

(ریل میں بیٹھا ہوا ہے اور دل ہی دل میں باتیں کر رہا ہے)

سکندر۔ انسان، رنگ و نسل کی بنیادوں پر محبت کی عمارت کھڑی کرتے ہیں، خواہش اور فطری تقاضات کی بنا پر ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، حالانکہ محبت تمام تعینّات اور شرائط سے اونچی شے ہے

آٹھواں منظر

(ایک مکان، مکان کے ایک گوشہ میں استادہ بلّیاں یاسمین)

(وہ غالباً ان خیالات میں ڈوبی ہوئی جا رہی تھی)

کہاں ہو شجّو، کدھر ہو بچّو! مجھے چھیڑتے نہیں، مجھے مارتے نہیں، ننھے ننھے ہاتھوں سے، اور تم کہاں ہو، میرے سکندر! آؤ میں تمہیں اپنے تنفس کی گرمیہ موسیقی کے ہونٹوں سے پیار کر دوں، میرا بے زبان بے نشان، بے منزل تجسس تمہیں کیونکر پائے!؟

(یکایک منڈیر سے گزرتے ہوئے اس کی رسّی ایک بلّی میں الجھی، اور اس کو پوری قوت سے جھٹکا لگا، جھٹکے کے ساتھ وہ بلّی میں لٹک کر رہ گئی، مکین و مکان، زمین و آسمان سب سو رہے تھے اور پیاروں کی امانت سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔)

نواں منظر

حمیدہ کا مکان

صبح کا وقت

(بلّی کی پھانسی سورج کی پہلی شعاع کے ساتھ محلّہ میں مشہور ہو گئی، حمیدہ دھاڑیں مار کر رو رہی تھی کہ سکندر مکان میں داخل ہوا۔)

سکندر۔ (ماجد سے) خیر تو ہے ـــــ ارے تم بھی رو رہے ہو، ـــــ نانی!؟

حمیدہ (لپٹ کر) بیٹا! تیری امانت ـــــ "یاسمین"!!

سکندر۔ مر گئی؟ ـــــ یاسمین مر گئی!؟ یاسمین!!

(محلّہ والے رسّی میں مردہ بلّی کو لاتے ہیں اور زمین پر رکھنا چاہتے ہیں)

سکندر۔ ہائیں! ایسی بے ادبی! یہ لاش زہرہ و مشتری کے دوش پر رکھنے کے قابل ہے۔ یہ اُس جانور کی لاش ہے جس نے روحِ انسانیت سے بازی جیت لی، یہ میری زہرہ کی یادگار!!

(سینہ سے لپٹا لیتا ہے اور گر پڑتا ہے)

ساغر (نظامی)

شرح و تفصیل

کتب، رسائل اور اخبارات کی تفصیل، جن پر اس نمبر میں اظہارِ رائے کیا گیا

کتابیں:-

(۱) آفتاب رسالت
(۲) دختران ہند سے
(۳) بحران عصر
(۴) حسن انتخاب - بہار مظہر
(۵) آخری رسول
(۶) عرض اخلاص
(۷) شانِ رسالت
(۸) ذکرِ حبیب
(۹) منادی کا سالنامہ
(۱۰) تحریک اتحادِ اسلامی
(۱۱) کلام لطف
(۱۲) امارت سخن
(۱۳) خطبۂ صدارت اجلاس علمائے کانفرنس بدایوں

۱۴

(۱۴) یادگارِ شیون
(۱۵) آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا شعبۂ اطلاعات
(۱۶) بنیادی حقوق و فرائض اور کانگریس کا اقتصادی پروگرام۔
(۱۷) منروا فلم کمپنی بمبئی

رسائل:-

(۱۸) ہندوستانی ماہنامہ
(۱۹) عارف
(۲۰) خضر راہ

اخبارات:-

(۲۱) با تصویر "ترقی" ہفتہ وار

دفتر "ایشیا" میں جس قدر جدید مطبوعات، رسائل و اخبارات ریویو کے لئے آئے تھے اُن سب کے متعلق میں نے اسی نمبر میں اظہار رائے کرنے کا عزم کیا تھا۔ لیکن عدم گنجائش کی وجہ سے کل ریویوز شائع نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی موجودہ نمبر کا بابِ انتقاد مکمل ایک جزو پر مشتمل ہے اور شاید یہ کافی ہے۔ باقی مضمون آئندہ نمبر جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع کیا جائے گا

ساغر

تبصرے

نئے مطبوعات رسائل اور اخبارات پر ایک نظر

آفتاب رسالت

مُصنفہ راؤ بہادر حاجی محمد عبدالحمید خان صاحب منظر باغپتی رئیس باغپت
ملنے کا پتہ :- باغپت ضلع میرٹھ - قیمت فی جلد ۸ر علاوہ محصول
حجم ۱۱۴ صفحات سائز ۲۰×۲۶/۱۶

سیرۃ رسولؐ اکرم پر ایک منظوم خوبصورت کتاب ہے۔ منظر صاحب کے شاعرانہ ذوق اور محبّت رسولؐ کا ایک حسین مظاہرہ ہے۔ کیپٹن نواب جمشید علی خان بہادر اور آن کے برادرِ عزیز منظر صاحب باغپتی اپنے ذوقِ ادب کے لئے مشہور ہیں اور عملی طور پر بھی اُردو ادب کی سرپرستی سے گریز نہیں فرماتے۔

یہ تصنیف جس طرح اپنے موضوع کے لحاظ سے مقدس ہے اسی طرح اس کی نسبت بھی ایک مقدس ذات سے ہے۔ منظر صاحب نے اپنی مادرِ مشفقہ کے نام اس کا انتساب کیا ہے۔ اس کے بعد وجہ تصنیف کے عنوان سے مصنف نے اس کتاب کی ضرورت و اشاعت پر روشنی ڈالی ہے جس کی اوّلین سطور میں تحریر کیا گیا ہے :-

> مسلمان اور خصوصًا مغرب زدہ مسلمان برابر اپنے مذہب سے دور ہوتے جارہے ہیں اور مغربی تعلیم نے یہاں تک اپنا اثر کیا کہ مذہبی کتب کا مطالعہ بھی قریب قریب ترک ہوتا جارہا ہے۔"

کوئی شک نہیں کہ مغربیت بہت کچھ موثر ہوئی ہے۔ لیکن از ہاں جیں یہ تصور بھی پرورش پارہا ہے کہ انسان کا شعور دماغی اُن منازل سے گزر گیا جہاں "مذہب" کا کچھ وزن تھا۔ اشتراکیت کے جدید نظریہ پھر اس کے اثرات اور دوسرے اقتصادی حقائق نے انسانی ذہن کو زیادہ تر "سیاسی" بنا دیا ہے۔ مذہب دراصل "پیٹ" اور "بھوک" کے بعد کی چیز تصور کیا جانے لگا۔ یہ انسانی بدبختی ہے مگر کیا کیجئے !؟
وجہ تصنیف کے بعد "تعارفِ مصنف" کے عنوان سے محشر صدیقی صاحب نے دو صفحے تحریر فرمائے ہیں بظاہر یہ اختصار خود کسی حسن کا آئینہ دار معلوم ہوتا ہے مگر واقعی طور پر یہ دونوں صفحے سخت پھُس پھُسے ہیں۔

"لیجئے" اور "بیٹھئے" کی غیر شاعرانہ نشّاری اس کتاب کے وزن کو کم کرتی ہے۔ وجہ تصنیف میں منظر صاحب نے مقدمہ نگاری کی مخالفت کی ہے مگر صفحہ اُسّی "تعارف" نظر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مصنف کے تو یہ بھی منافی ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر یہ کتاب مذہبی شاعری کو پسند کرنیوالوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ بزم میلاد شریف اور قومی جلسوں میں اس نظم کا پڑھنا مسلمانوں کے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ کہیں کہیں نظر گذر کے لئے ایک آدھ غلطی بھی پائی جاتی ہے، اُمید ہے کہ راؤ بہادر دوسرے ایڈیشن میں ان اغلاط کی تصحیح فرمادیں گے۔

دختران ہند سے

مصنفہ میاں حسن لطیفی بی۔ اے۔ ملنے کا پتہ دفتر شاطو لدھیانہ پنجاب۔ یہ ایک مختصر نظم ہے جو ہمارے دوست نے کاوش سے تحریر فرمائی ہے۔ اس کا انتساب ایک گمنام ہریجن عورت کے نام ہے۔ یہ عنوانیہ"

یعنی (Dedication) یقیناً بجد جدید و نادر ہے۔ نظم کا اولین شعر

لوریاں دیتی ہیں شب کو جو سرِ بالینِ خواب
وہ گرج سے اپنی کر سکتی ہیں پیدا انقلاب

ذی حیات شعر ہے مگر اس نظم میں جا بجا غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً
صفحہ ۲ پر ایک مصرع ہے

بعض کنواری لڑکیاں کہتی رہیں پہیلیاں

"کنواری" کا صحیح تلفظ اس مصرع میں باقی نہیں رہتا۔
صفحہ ۳ پر ایک مصرع ہے۔

طبقۂ پائمالِ نسوانِ عفیف!! انقلاب!

اس مصرع کو اس طرح "طبقۂ پائمالِ نِس۔ وانِ عفیفِ انقلاب" پڑھا جائے تو بحر میں آتا ہے یعنی لفظ نسواں اپنی حقیقی شکل و صورت میں مصرع میں نہیں آتا یہ نہ صحت ہے نہ حسن۔ بالکل یہی مثال صفحہ ۴ پر اس مصرع کی ہے

روحِ نسائیت کی انگڑائی کا ہے یہ ولولہ

انگ۔ ڑائی

اس بند کا دوسرا مصرع ہے اور اس میں بھی یہی عیب ہے۔

ہو طلبِ عمل سے سر۔ شار ہر ایک طالبہ

آگے چل کر ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ ؎

تم کبھی معبدوں میں تھیں حریتوں کی دیویاں

حریتوں۔ یعنی حریت کی جمع بنا کر اس کا اس طرح استعمال پہلی مرتبہ صرف لطیفی صاحب کے یہاں دیکھا گیا ہے۔

مژدۂ انقلاب دو کے ٹکڑے کا بار بار اعادہ ہوا ہے۔ اعادہ ضرور نظم میں ایک حسن اور زور پیدا کرتا ہے لیکن اعادہ ہونے والے ٹکڑے یا مصرعہ کو نہایت حادی اور بنیادی طور پر مضبوط و موثر ہونا چاہیے۔ صنفِ نازک کو مخاطب کر کے اُن سے مژدہ کا مطالبہ کرنا مرد کے لئے کہاں تک مناسب ہے۔

صفحہ ۱۰ پر پہلے بند کا دوسرا مصرع ہے۔

جوہرِ جان سوز کی رسم بھی تم نے کی ادا

اضافت کی حالت میں اعلان نون قطعی غلط ہے۔ "جوہرِ جاں سوز" ہونا چاہیے۔

صفحہ ۱۱ پر پھر وہی غلطی ہوتی ہے جو اس سے پہلے کئی مصرعوں میں ہو چکی ہے

ایسی زنِ غلام و غم۔ ماز سے کوئی بھی بہن

غم۔ ماز

اس مصرع کو جب تک ہم اس طرح نہ پڑھیں کہ "ایسی زنِ غلام و غم۔ ماز سے کوئی بھی بہن"، مصرع بحر میں نہیں پڑھا جا سکتا
ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ

پھول بچھائیں قدرداں یا کہ بکھیر دیں ببول

ببول کے کانٹے یا ببول کے پھول بکھیرے جا سکتے ہیں۔ محض ببول کے متعلق بکھیرا جانا نہیں لکھا جا سکتا۔
ایک جگہ عورتوں سے خطاب کرتے کرتے ہمارے دلچسپ دوست لکھنوی ہو گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

دخترک "منش" کے میل سے بھی گریز اک ذری (بمعنی ذرا)

اس لفظ کا استعمال یہاں نہ صرف بھونڈا ہے بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ ان اغلاط کے ساتھ ہی صفحہ ۱۲ پر دوسرے بند میں دو نادر اور زوردار مصرعے بھی نظر پڑتے ہیں

اپنے برادروں کو دو ہمت و عزم کا پیام
اپنے منگیتروں کو دو غزوہ و رزم کا پیام

لیکن ذرا غور کرتے ہیں تو ایہام سے دونوں خالی نظر نہیں آتے۔ حیرت ہوتی ہے کہ لطیفی کو کیا ہو گیا ہے۔ صفحہ ۱۳ پر دوسرے بند کا آخری مصرع ہے۔

جیش کے ساتھ ساتھ ساتھ جھنڈیاں لیکے جاؤگی

"ساتھ ساتھ" دو مرتبہ استعمال ہوتے دیکھا ہے تیسرا "ساتھ" بالکل لطیفی صاحب کی ایجاد ہے۔
کچھ بھی ہو ہم اپنے دوست کی خاص الخاص ذہنیت کے ضرور قائل ہیں۔ گو آپ متاہل زندگی بسر کرتے ہیں مگر ارشاد ہوتا ہے کہ ؎

زندگیٔ لطیفیٔ خستہ ہے ایک حسنِ نیم | دلشکنی سے بجھ رہا ہے یہ لطیف نابغہ
کاش ہو سوز میں شریکِ کوئی نگارِ آتشہ | سوختہ ہو دو آتشہ

"عورتو" کے بجائے اگر "دیویو" لکھا جاتا تو شعریت کے عناصر میں توازن پیدا ہو جاتا
میرے وطن کی عورتو مژدۂ انقلاب دو
Tragedy دوشیزہ

نظم کے ختم ہونے کے بعد آغاز، تشکیل، تسوید، تکمیل اور اشاعت اوّل کے سنین بھی دئے گئے ہیں گویا یہ نظم " دولت لطیفی " اور " حکومت صنف نازک ،، کے مابین کسی تاریخی معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے !؟

فلک سو سال چکر کھائے تب ایسا سخنور ہو

اے کاش اس ذہین شخص کو خود انتقادی کی دولت بھی نصیب ہوئی ہوتی تو کوئی شک نہیں کہ اس کی ذہانت قوم کو مالا مال اور اردو ادب کو سرفراز کر دیتی۔

بحران عصر المعروف "دکھی دنیا" — مصنفہ لطیفی صاحب (لدھیانہ) ملنے کا پتہ ادارہ شاعر لدھیانہ۔ یہ ایک چھوٹی سی نظم ہے جس کو خود لطیفی صاحب نے ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر سفید کاغذ پر سلیقہ سے شائع کیا ہے۔ جو شخص لطیفی صاحب کی شاعرانہ جد و جہد کا مطالعہ کرتا رہا ہے وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ جوہر ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں مگر وہ اس جوہر کے اجزائے ترکیبی میں توازن پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ان کے کلام میں صحت و یکسانیت اور ثبات کی کمی ہے۔

صفحہ نمبر ۴ برائی سے کہیں بدنام ہے اب نام اچھائی کا

صفحہ نمبر ۸ وہی دنیا کہ جس کا انحصار اصلی روپے پر ہے

اچھائی بغیر تشدید اور روپیہ بغیر "ے" کے لکھنا غلط ہے۔

معاشری اطمینان حاصل ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ کہتے ہیں اور تمام کا تمام برابر شائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ نظم دنیا کی ہر جزیہ کو محیط ہے مگر بس نظم ہے اس کے مطالعہ کا حاصل نہ " نشاط و حرکت " ہے نہ " الم و جمود "۔ دنیا کی ہر بات پہ لعنت کرنے کے بعد آخری شعر ارشاد ہوتا ہے ؎

اُسے کرنے دے کام اُسکا تو اپنا کام کرتا جا
مسلسل خدمتِ اسلام تا انجام کرتا جا

ہر شاعر آج مومن بننے کے بعد " اقبال " کی تقلید کرتا ہے اور شاعری کی بنیاد مذہبی تاثر پر رکھتا ہے۔ حالانکہ شاعری اور مذہب دو متضاد چیزیں ہیں۔ مذہب ایک قسم کی " تعین " ہے اور شاعری " کامل آزادی " میرے خیال سے شاعری کو " اسلامی " اور " غیر اسلامی " نہیں ہونا چاہئے۔

شاعری فطرت کی نمائندگی کا نام ہے نہ کہ اصولوں کے پرچار کا!

میرے دوست حسن لطیفی فطری شاعر ہیں۔ مگر کبھی انھوں نے اپنی خودی میں اپنی شاعری کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اُن کو جستجو کرنی چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے

حسن انتخاب المعروف بہ **بہارِ مظہر** — مولفہ و مرتبہ سید مظہر علیم فرید آبادی بی۔اے (علیگ) ملنے کا پتہ قصبہ فرید آباد متصل دہلی سائز ۲۰×۲۶/۸ طباعت و کاغذ متوسط۔

مولف نے کتاب کو نواب حیدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمن خان صاحب حسرت شروانی رئیس اعظم ریاست حبیب گنج و بھیکم پور و علی گڈھ کے نام معنون کیا ہے۔

یہ نسبت اس لحاظ سے نہایت موزوں ہے کہ نواب صدر یار جنگ بہادر ایک حقیقی ادیب و سخن سنج ہیں۔ مقدمہ مولوی عبد السلام صاحب ندوی نے تحریر فرمایا ہے،

۱۵۷

یہ انتخاب اس لحاظ سے بہت بڑا درجہ رکھتا ہے کہ اردو شعرائے قدیم کے کلام کا انتخاب مضامین و مطالب کے لحاظ سے کیا گیا ہے تقریباً ستر عنوانات کے ماتحت ہر موضوع پر بہترین اشعار جمع کر دئے گئے ہیں، شعر زندگی کے اعلیٰ ترین ذوق کا دوسرا نام ہے جو شخص شاعر ہے وہ اعلیٰ ترین انسان ہے اور جو انسان اچھے اور برے شعر میں تمیز کر سکتا ہے اس کے جوہری ہونے میں کوئی شک نہیں۔ سید مظہر علیم نے ان قیمتی موتیوں کی سچی پرکھ کا ثبوت دیکر اپنے جوہری ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

مقدمہ کے بعد مختصر دیباچہ مرتب ہے اس کے بعد صفحہ ۱ سے صفحہ ۱۶۰ تک منتخب اشعار کا سلسلہ، جن کی رنگا رنگی اور ہمہ گیری ناظرین کو لاکھوں دنیاؤں میں گم کر دیتی ہے۔ یقیناً ایسا انتخاب ہر اہل ذوق کے میز کی زینت بننا چاہئے آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شاعری کی کتاب کبھی اتنی غیر شاعرانہ طبع نہیں ہونی چاہئے۔ یہ نظم کی کتاب ہے مگر " راہ نجات " کی طرح طبع ہوئی ہے۔ آخر میں جو قطعہ ہائے تاریخی ہیں وہ بھی ایک فرسودہ رسم ہے

اور اب اس کی تقلید کی ضرورت نہیں۔

آخری رسول

مصنفہ مولانا ماہر القادری ناشر خواجہ بہاؤ الدین حیدر آبادی مکتبۂ علمیہ حیدر آباد دکن، حجم ۱۰۴ صفحات سائز ۲۰×۲۶/۱۶ قیمت ۸ر

"زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا" —— ہمارے دوست ماہر صاحب متضاد صفات کا ایک عجائب مجموعہ ہیں۔ جب انھیں شاعر کے روپ میں دیکھتے ہیں تو مولویت سے ذوق رکھتے معلوم ہوتے ہیں اور جب "مولوی" کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ ان کو شاعر یقین کیا جائے ہم ان کی دونوں حالتوں سے لطف اندوز ہونے والوں میں سے ہیں تاہم یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہوسکا ہے کہ وہ بیک وقت مولوی ہیں یا شاعر یا بیک وقت مولوی و شاعر دونوں ہیں —— !؟

لیکن بہرحال مولویت ہی سہی ماہر کی اہلیت ادبی سے کون انکار کرسکتا ہے جس طرف وہ نکل جاتے ہیں خواہ صحرا ہو یا گلشن واپسی میں ہم اُن کے ہاتھ میں لالہ و گل ہی دیکھتے ہیں۔ یہ کتاب جو بہترین کاغذ پر نفیس طبع ہوئی ہے انھیں کی تالیف ہے جو جناب رسول کریم کی سوانح حیات پر مشتمل ہے اس تالیف میں واقعات کو صحت و طرز بیان کی سلاست و سادگی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے غزوات کو ذرا پھیلا کر بیان کیا ہے۔ خواجہ صاحب کو اسی قسم کی مختصر سوانح حیات ماہر صاحب سے اور لکھانی چاہئیں۔

آخر میں ہم مکتبۂ علمیہ حیدر آباد دکن کے متعلق اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ سلطنت آصفیہ میں یہ ایک مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جو خاموشی سے اردو زبان کی خدمات انجام دے رہا ہے جو مصنفین و مولفین حیدر آباد دکن اپنی تصنیفات کی اشاعت اور ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہیں وہ خواجہ بہاؤ الدین حیدر آبادی مالک مکتبہ علمیہ چار مینار حیدر آباد سے تجارتی تعلقات استوار کریں۔

عرض اخلاص

کتابوں کے ملنے کا پتہ۔ مینجر شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی روشن و صاف، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی رئیس حبیب گنج و بھیکم پور کے ذوق ادبی اور تبحر علمی کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہے گویا ہم کسی مصدقہ حقیقت کو محض دہرائیں "عرض اخلاص" وہ یادگار تقریر ہے جو صدر کی حیثیت سے مدرسۃ البنات (جالندھر) کے اجلاس سالانہ ۱۹۳۶ء میں فرمائی۔ تعلیم نسواں کے متعلق اس تقریر میں گہری معلومات اور دلچسپ اشارے ہیں۔ تقریر کا رنگ مذہبی ہے مگر منقولات کے ساتھ معقولات سے بھی بحث کی گئی ہے۔

شان رسالت

یہ بھی نواب صدر یار جنگ بہادر کی ایک تقریر ہے جو خود حبیب گنج کی محفل مبارک میں گیارہ ربیع الآخر ۱۳۵۳ھ میں فرمائی۔ لفظ "شاکلتہ" کو بنیاد بنا کر تمام موضوع پر معرکۃ الآرا بیان ہے۔ امام بیضاوی نے "شاکلتہ" کے معنی "علی جوہر روحہ" تحریر کئے ہیں۔ تقریر کی نوعیت کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ اس پر نواب صاحب کا اسلوب بیان، سبحان اللہ، عالمانہ شان کے ساتھ ساتھ ادیبانہ نمکین کے وہ مناظر نظر آتے ہیں کہ روح جھومتی ہے اور دماغ تقریر کو قبول کرتا ہے۔

صفحہ ۱۴ پر صحابہ کرام کا شاکلہ، آنحضرت کا شاکلہ، آخرین کے متعلق رؤف رحیم کا شاکلہ، ان تینوں پر اظہار رائے کرنے کے بعد "خود ہمارا شاکلہ" کے عنوان سے بیان ہے یہاں نواب صاحب موصوف کی شان خطیبانہ پورے جوش پر آجاتی ہے۔ غرضکہ تقریر پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہے۔

ذکر حبیب

یہ وہ یادگار بیان ہے جو ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ کو حیدر آباد میں گیارہویں شریف کے موقع پر فرمایا۔ حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ بیان گو مختصر ہے مگر موضوع کے تمام متعلقات پر حاوی ہے اور مسرت کی بات یہ ہے کہ محض عقیدتی بیان نہیں ہے۔ اس کے مطالعہ سے غوث اعظم کے متعلق ایک مسلمان کو تمام معلومات ہوجاتی ہیں۔

منادی کا سالنامہ ۱۹۳۷ء

دفتر منادی دہلی درگاہ نظام الدین اولیا قیمت ۸ر

دو سال سے حضرت خواجہ حسن نظامی کے مشہور اخبار نے بھی ہر سال اپنا سالنامہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ گزشتہ سال بھی منادی نے اپنا سالنامہ شائع کیا تھا اور اس سال بھی ۹۰ صفحات پر مشتمل

ریڈر سائز پر اپنا سالنامہ شائع کیا ہے جس میں مسجدوں، عمارتوں، مشائخ وخلفائے سلسلۂ نظامیہ، بادشاہ، والیان ریاست، امراء، وزراء، مشاہیر، احباب، اخوان، تعلیم اطفال کے متعلق ۱۱ تصاویر ہیں۔ مضامین کی فہرست میں ایک ادبی ذوق رکھنے والے کے لئے خواجہ صاحب کے مضامین جاذب توجہ اور دلکش ہیں۔ اُردو اخبارات ورسائل کے نام کی فہرست لکھ کر اور ان کے اصول کو (یعنی وہ کانگریسی ہیں یا غیر کانگریسی، احراری ہیں یا فرقہ پرست، حکومت پرست ہیں یا قوم پرست) تحریر فرما کر یہ بھی واضح کیا ہے کہ ملک سے ۲۹ اخبار غیر کانگریسی اور ۱۵ اخبار کانگریسی شائع ہوتے ہیں۔ غالباً اس فہرست کی اشاعت سے ایڈیٹر صاحب کا یہ مقصد ہے کہ اُردو پریس پر کانگریس کا اثر نہیں ہے اگر حق وباطل کا انحصار اعداد وشمار ہی پر یقین کر لیا جائے تو تاریخ کے بہت سے عظیم الشان حقائق کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ سالنامہ میں سب سے زیادہ قیمتی شئے خود خواجہ صاحب کے مضامین کا انتخاب اور روزنامچہ ہے اس لئے سالنامہ ہر شخص کو ضرور خریدنا چاہئے۔ باوجود اس قدر حجم اور مصور ہونے کے قیمت حیرتناک طور پر کم ہے۔

تحریک اتحاد اسلامی
حصۂ سوم

ملنے کا پتہ، سیرت آفس مکان نمبر ۲۵ اسپارکس اسٹریٹ رنگون

یہ چھوٹی سی کتاب مختصر مختصر مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔ ہر مضمون میں کشفی شاہ صاحب نظامی نے مسلمانوں کو اتحاد کی تعلیم دی ہے لیکن تمام کتاب پڑھنے کے بعد بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مسلمان کس مرکز پر متحد ہوں اور کس مقصد کے لئے متحد ہوں! ؟

تمام کتاب میں "آزادی" کا ایک لفظ نہیں اور نہ کوئی اتحاد ہی کا پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"پھر دیکھو ایک ایک دن میں کئی علاقے مسخر ہوتے ہیں اور دنیا کے وارث تم ہی بنتے ہو" (!؟)

حیرت ہے کہ کشفی شاہ نظامی غلام اور بے بس مسلمانوں کو "مردِ مجاہد" تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سامنے مرہٹوں کی ایک فوج ہے اور پانی پت کا میدان!؟ مضامین کا لہجہ قدیم خطابت کا لہجہ ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

"مسلمان میدان عمل میں آچکے ہیں۔ مجاہد صف بندی میں مشغول ہیں"

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تمام کارواں غافل ہے نہ میر کارواں ہے نہ بانگ درا۔ یہ حاکم قوم محکومیت کے جس ارذل درجہ پر آگئی وہ حیرتناک ہے۔ اس غلامی اور بے بسی کے عالم میں غریب وغلام مسلمان سے اس قسم کی باتیں کرنا اُس کا مذاق اُڑانا ہے۔

جو لیڈر، جو صوفی، جو مولوی، جو شاعر، اور جو ادیب مسلمانوں کو دنیا میں باعزت دیکھنا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں ایک زندہ اور ذی وقار قوم کی حیثیت سے زندہ رکھنا چاہتا ہے اُس کا سب سے اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ بنیادی محکومیت اور غلامی کی زنجیروں کو کاٹے۔ گول مول باتوں سے اب کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا اور مسلمانوں سے اب تجارت بھی نہیں کی جاسکتی مسلمان مجبور ہیں۔ لیکن ۴۰ برس قبل کی طرح بے وقوف نہیں رہے۔ اس لئے ہر شخص کو جو بزعم خود مسلمانوں کا لیڈر بننا چاہتا ہے صاف اور واضح پروگرام قوم کے سامنے رکھنا چاہئے جس کو ہرگز انفرادی اور جماعتی نہیں ہونا چاہئے اگر وہ اسلام اور ہندوستان کی مطابقت میں ہوا تو قبول کیا جائے گا۔ ورنہ اس کا انجام ظاہر!

کشفی شاہ نظامی کو اپنا پروگرام اور اُس کی منتہا متعین کرنی چاہئے فی الحال ہم اُن سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ حکومت برطانیہ کی غلامی سے مسلمانوں کو آزاد کرانے کے لئے کوئی اسکیم پیش کریں۔

کلام لطف

مرتبۂ محمد بدر الدین علوی۔ قیمت نامعلوم، غالباً دار المصنفین اعظم گڑھ سے مل سکتا ہے۔

اس کتاب پر اظہار رائے کرنا نہ صرف ادبی فرض ہے بلکہ وطنی فرض کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ علی گڑھ کبھی اس عظیم الشان شخصیت کو فراموش نہیں کرسکتا جس کی ذات تمام ہندوستان کے لئے سرچشمۂ فیض تھی۔ میری مراد استاذ العلما حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحب رح سے ہے جن کی دولتسرا علی گڑھ میں میرے مکان سے ۵۰ گز کے فاصلے پر ہے۔ یہ کتاب مولانا رح کے اُردو وفارسی کلام کا مجموعہ ہے جس کو مولانا محمد بدر الدین علوی استاذ ادبیات عربی شعبۂ عربی مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ نے کمال سنجیدگی و صحت کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔

ذوقِ شعری اُستاذ العلماء کو ورثہ میں ملا تھا۔ مولانا کا اصلی وطن ملکھنہ تھا جو علی گڑھ کے ضلع میں ایک قصبہ ہے۔ آپ کے والد مولوی اسد اللہ صاحب مضطر بھی شاعر تھے اور اس درجے کے شاعر تھے کہ جب مرزا غالب کو اُن کا یہ مطلع سنایا گیا ؎

لے اُڑی طرزِ فغاں بلبلِ نالاں ہم سے
گُل نے سیکھی روشِ چاکِ گریباں ہم سے

تو بہت پسند آیا اور پوچھا کس کا ہے؟ سنانے والے نے اسد اللہ نام بتایا تو مرزا نے کہا کیوں نہو نام کا کمال ہے (مرزا کا نام بھی اسد اللہ خاں تھا) فارسی اور اُردو دونوں میں کہیں "ذرّہ" اور کہیں "لطف" تخلص فرماتے تھے۔ ایک بہتر سخن گو ہونے کے ساتھ ہی وہ ایک مبصر اور نقادِ سخن بھی تھے اور شاعری سے باوجود مولوی ہونے کے پورا ذوق تھا۔ اِن کے کلام میں فصاحت و بلاغت سلاست اور روانی، بے ساختگی اور آمد پائی جاتی ہے اور اُستادانہ انداز نمایاں ہے زیادہ تر فارسی میں فرماتے تھے۔ شاگردوں کو منظوم خطوط اور قطعہ ہائے تاریخ بھی بے ساختہ نظم فرماتے تھے۔

میرے بزرگ دوست مولوی بدر الدین صاحب علوی نے کتاب کی ترتیب مندرجۂ ذیل رکھی ہے[1]۔

۱۶۰

(۱) نعت (۲) مناجات (۳) مدح (۴) عشقیہ کلام (جو حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب ہے) (۵) مراثی، تاریخیں جنکی ترتیب باعتبار زمان و سنین ہے آخر میں متفرقات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ جن میں اوّل طویل نظمیں ہیں بعد میں مختصرات جن میں ترتیب حروف کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اب ہم مولانا کے کلام کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

اُردو کلام کا نمونہ

کس لئے مجھ سے بدگماں ہو تم — میں کبھی تم سے بدگماں نہوا

مصیبت ہے اے یار تیری جدائی — مجھے کھائے جاتی ہیں راتیں اندھیری

ہوتی ہے بُری وہ آشنائی — ہو جس سے ملی ہوئی جدائی

فارسی کلام کا نمونہ

ساقیا ما زمۓ عشقِ صنم مدہوشیم — ما چہ دانیم کہ مینا ست کجا جام کجاست

کجا نصیب کہ آں ماہ در برم آید — ہمیں بس است کہ گہ گاہ بردرم آید

دمکے بر سرِ بالینِ من از ناز بیا — ایکہ خورشید غلام است پرستارت ہو

قدیم اردو کی تقلید کے طور پر اردو فارسی کا مخلوط شعر

چو دیدم آں چشمِ سُرمگینش رواں شدم سیلِ خوں ز دیدہ
سجن کی انکھوں نے مجھ کو مارا، دہائی ساری خدائی کی ہے

مراثی کا نمونہ

استاذ العلماء کے کلام میں جو قدرتِ کلام پائی جاتی ہے اُس کا نمونہ اس مرثیہ میں ملاحظہ کیجئے۔ جو نواب تراب علی خان بہادر سالار جنگ اول مدار المہام دولت آصفیہ کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔

مرکزِ اقبال و دولت سرورِ عالی ہمم — تاجدار و تاج بخش و عزت افزائے جہاں
مجمع فضل و کمال و مرجع جاہ و جلال — منبع بذل و نوال و اخترِ ہندوستاں
مرجع عالم وزیرِ اعظمِ ملکِ دکن
صاحبِ سیف و قلم فرزانۂ آصف مکاں

مرثیہ میں جذبات نگاری کا کمال دیکھئے۔ اپنے صاحبزادے مولوی کرامت اللہ صاحب کی یاد میں قبرستان ہی میں یہ رباعی موزوں کی ؎

دل از غمِ فرقتِ کرامت خوں است — جاں بے رخِ او بصد الم مقروں است
اے سبزۂ تو از زیرِ زمیں می آئی — برگو کہ عزیزِ من کرامت چوں است

چوتھے مصرع میں جذبات کی چاشنی کے ساتھ ایک بے مثال حُسنِ تعبیر بھی پایا جاتا ہے۔

مولانا لطف اللہ رح کو تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ برجستگی، آمد اور شعریت ہر سہ عناصر متوازن رہتے تھے ورنہ قطعاتِ تاریخی اکثر بے کیف اور بھرتی ہی کے ہوتے ہیں۔

[1] "کلام لطف" صفحہ ۴

مولوی عنایت اللہ صاحب راوی اور روایت کے ناقل مولوی بدرالدین علوی تحریر فرماتے ہیں کہ "اپنے ہم زلف قاضی فضل علی کو برجستہ یہ مصرعِ خط میں لکھا جو واقعہ ہونے کے ساتھ تاریخ پر بھی مشتمل ہے:

خوب بارش ہوئی ہے ابکی سال

۱۲ ھ ۷۱

استاذ العلماء کے اُستاد مفتی عنایت اللہ صاحب جب جزیرۂ شور سے واپس ہو کر کاکوری تشریف لائے تو اشتیاقِ ملاقات میں یہ رباعی لکھ کر انھیں ارسال فرمائی ؎

بہلاؤں کہاں تک دلِ ناشاد کو میں — کب تک کروں ضبط آہ و فریاد کو میں
انشاء اللہ ایک ہفتے کے بعد — آتا ہوں قدمبوسیٔ اُستاد کو میں

۱۲ ھ ۷۷

بہرحال ہم اس کتاب کی اشاعت پر مولوی بدرالدین صاحب علوی کو مبارکباد دیتے ہیں۔ حقِ شاگردی یونہی ادا ہوا کرتا ہے۔ استاذ العلماء کے اُن تمام شاگردوں کو جو ہندوستان بھر میں پائے جاتے ہیں۔ اس کتاب کو اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیئے۔

امارتِ سخن

مُصنّفہ حاجی محمد اسحاق خاں صاحب مائل شروانی رئیس برلہ علی گڑھ۔ قیمت فی جلد عہ، کتاب مصنف کے پتے سے مل سکتی ہے۔

وطنِ عزیز ضلع علی گڑھ کے مشہور شاعر و ادیب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب مائل شروانی کے کلام کا مجموعہ ہے حضرت مائل ایک شریف النفس، خوش گو، قادر الکلام اور خوش مذاق شروانی خاندان کے رئیس ہیں جب میں [illegible]ء میں اپنے وطن میں مقیم تھا تو کئی بار مائل صاحب کا کلام مشاعروں میں خود اُن کی زبانِ مبارک سے سُننے کا اتفاق ہوا۔

اس دیوان کو جدید شاعری کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا غلطی ہے۔ قدیم اسلوبِ بیان اور استعارات و تصوّرات کے لحاظ سے ایک جامع دیوان ہے۔ مولوی سلامت اللہ صاحب رشک پلکھنوی مدظلہٗ نے صفحہ ۱۴۲ پر تحریر فرمایا ہے:۔

"میرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، داغؔ کا طرزِ بیان نظرانداز کر کے شاعری ب

ترانے بھجن ٹھمری میں مُقیّد ہو کر رہ گئی ہے۔ بہت کم سنا جاتا ہے کہ کسی نے مستقل دیوان ردیف وار پیش کر کے شعرائے متقدمین کی روحانی افزائشِ ذوق میں حصّہ لیا ہو"

میں مولوی صاحب کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ ردیف وار دیوان مرتب کیا جائے اور عزیز ترین اوقاتِ حیات کو اس غیر فطری سعی کی نذر کر دیا جائے۔ سوائے مشق کے اس کا کچھ حاصل نہیں ہے اور مشق نہیں بلکہ دنیا کے سامنے "حاصلِ مشق" پیش ہونا چاہیئے۔ رہے ترانے بھجن ٹھمری، سو ان اصنافِ سخن کو شاعری میں شمار نہ کرنا اور ان کی اہمیت سے انکار کرنا بھی میرے نزدیک تنگ دلی ہے۔ اُردو غزل سرا اور حقیقی شاعری سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ اگر مولانا پورب میں گائی جانے والی کجری سُن لیں تو اُن جیسا اہلِ دل دیوانہ ہو جائے۔ شاعری کی حقیقی روح جذبات کے سادہ اظہارِ بیان میں مضمر ہے۔ ایامِ جاہلیت کی عربی شاعری انھیں خصوصیات کی بنا پر تمام زبانوں کی شاعری سے آج بھی افضل خیال کی جاتی ہے۔

کبیر داس کا تمام کلام بھجن ہے۔ مگر کون ہے جو اس کے فلسفۂ توحید اور اُس کی شاعری کی فلسفیانہ بلندی اور اس کے بھجنوں کے عمق و تاثیر سے انکار کر سکے۔ کہتا ہے ؎

ہر سے کبیرا بھلا ہوا، مورے سر سے ٹلی بلائے

ہر مرے تو ہم مرے اور ہمری مرے بلائے
سانچے گرو کا بالکہ مرے نہ مارا جائے

ہر سے کبیرا بھلا ہوا،

حد حد کرکے سب گئے اور انحد گیا نہ کوئے
انحد کے میدان میں رہا کبیرا سوئے

ہر سے کبیرا بھلا ہوا،

دراصل فارسی شاعری سے اردو شاعری کے متاثر و متعلق ہونے ہی نے اس کی پیدا ہونے والی انفرادیت کو شدید نقصان پہنچایا۔ اب تلک

طور پر اِس نقصان کی تلافی ہوگی اور ہونی چاہئے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ نئے نئے اسالیب اور طرز پیدا کر رہا ہے اور لوگ اُس کو قبول کر رہے ہیں۔ لیکن بہرحال مائلؔ صاحب اور اُن کے کلام کو ہم اُسی دائرہ کے اندر دیکھیں گے جو اُن کے کلام کا مقرّرہ دائرہ ہے اور اِس دائرہ کے حدود میں وہ خوب فرماتے ہیں ؎

جذبۂ عشق باندازۂ مقدور گیا   عرش پر کوئی گیا کوئی سرِ طور گیا

قفس کہیں یہ کسی شاخِ گل پہ لٹکا دے   لئے پھرے گا مجھے تو کہاں کہاں صیّاد

نکل کے جا نہیں سکتا ہزار چاہوں میں   ہجومِ ناز میں بُری طرح گھر گیا ہوں میں

خطبۂ صدارتِ اجلاسِ علمار کانفرنس
منعقدہ ۲۰ مئی ۱۹۳۷ء بدایوں

یہ وہ یادگار خطبۂ صدارت ہے جو شیخ وحید احمد صاحب ایم۔ ایل۔ سی نے علمار کانفرنس منعقدہ ۲۰ مئی ۱۹۳۷ء بدایوں میں ارشاد فرمایا۔ خطبہ کی زبان ادیبانہ مدبرانہ ہے پہلے ہی صفحہ میں ایک نہایت مدبرانہ اور گہری بات شیخ صاحب نے فرمائی ہے اور یہی بات اِن کے تمام خطبۂ صدارت کی بنیاد ہے۔

"جس طرح یہ صحیح ہے کہ حقیقی اسلامی تعلیم کی رُو سے سیاست اور مذہب کو دو جداگانہ متضاد شعبوں میں تقسیم کرنا ناممکن تھا اِسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ اب دورِ حاضر کی سیاست اور اسلامی سیاست کو باہم متحد کرنا ناممکن ہے"

اِس تمہید کے بعد رسمی طور پر بدایوں کی آفاقی و تاریخی تشریح ہے اُس کے بعد یورپ کی سیاست پر نہایت گہرا تبصرہ ہے۔

"یورپ کے میدانِ سیاست کا ہر راہرو "میکاویلی" کے نقشِ قدم پر چلنے والا اور اُسی کی ضمیر فروش، کینہ پرور، حیلہ باز اور فتنہ پرداز تعلیم پر عامل ہے۔ ہر جائز و ناجائز وسیلہ سے طلبِ منفعت، حصولِ دولت اور غصبِ حکومت یورپ کی داخلی و خارجی سیاست کے مقاصدِ عالیہ میں سے ہے"

اِس تبصرے کے بعد "علمار، مذہب اور سیاسیات" کے متعلق ایک بات خوب کہی ہے:-

"ملک کی سیاسی زندگی میں ہمارے علمار نے اب تک جس حیثیت سے شرکت فرمائی ہے وہ اُن اجیر سپاہیوں کی سی ہے جو کسی زمانے میں دوسرے کے مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی جانیں بیچ ڈالتے تھے۔"

آگے چل کر علمار کو جنرل پیرو اور امیر خاں کے پنڈاریوں سے مثال دی ہے اس کے بعد دیہات کے مسلمانوں، اُن کے کلچر اور اُن کے مذہبی حالات کا نقشہ دلکش الفاظ میں کھینچا ہے۔ جس کے آخر میں شیخ صاحب نے فرمایا ہے:-

"کیا سیاست کے میدان میں آنے کے لئے ہیٹوں اور طربوشوں کا قحط تھا کہ مقدس جُبّہ کو تکلیف کرنا پڑی"

یعنی سیاسیات میں علمار کی شرکت شیخ صاحب کے نزدیک "قطعی" جرم" ہے اور اُن کے تمام خطبہ کا لب لباب یہ معلوم ہوتا ہے کہ علمار مذہب کی خدمت کرنے کے لئے ہیں نہ کہ سیاسیات کی، چنانچہ وہ آخر میں فرماتے ہیں۔

"میں دیکھ نہیں سکتا کہ رسُول اللہ کی مسند مقدس پر بیٹھنے والوں کے متبرک قدم جو ہماری گردنوں پر رہنے کے قابل ہیں عہدِ حاضر کی گندگیوں میں لتھڑے ہوئے نظر آئیں"

شیخ صاحب کا یہ جذبۂ احترام اپنی جگہ قابلِ قدر ضرور ہے۔ مگر جہاں تک ایشیا کا تعلق ہے وہ ابھی تک مذہبی معتقدات سے متاثر ہے اور گو ان کے زاویۂ نگاہ سے یہ غلط ہو مگر مسلمان اُسی وقت کسی تحریک میں شریک ہو سکتے ہیں جب کہ "جمعیۃ العلمار" اس پر مذہبی نقطۂ نگاہ سے جائز ہونے کی مہر ثبت کر دے۔

ایسے ملک میں جہاں ہر چیز مذہب کی کسوٹی پر کسی جاتی ہو یہ کیونکر ممکن ہے کہ علمبردارانِ مذہب سیاسیات سے علیحدہ رہ سکیں، اِن کا سیاسیات سے علیحدہ رہنا جمود پیدا کرنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ مسلمانوں میں ابھی اس درجہ سیاسی شعور پیدا نہیں ہوا ہے کہ وہ سیاسی اور مذہبی فرائض میں تقسیم و تمیز پیدا کر سکیں، یعنی بہ حیثیت مسلمان وہ خالص مذہبی ظاہر ہوں، اور

سیاسی جماعت کی حیثیت سے خود کو مغربی ثابت کریں۔

آپ کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے سیاست داں تقلید مغرب کے طور پر چاہے جس قدر ڈپلومیٹک ہو جائیں مگر علما کو اس سے حذر کرنا چاہئے۔ یعنی میر کارواں سیدھے راستہ پر چلے اور کارواں بھٹک جائے!؟

میری رائے میں یہ تضاد ہرگز قابل عمل نہیں ہے۔ مسلمانوں کو ایک مرکز عمل پر آنا چاہئے اور سیاست داں سے لے کر عالم دین تک کا فرض یہ اور صرف یہ ہونا چاہئے کہ وہ اسلام اور ہندوستان کو آزاد کرائے، یہی ایک راستہ ہے جس پر گام زن ہو کر ہم منزل مقصود پر پہنچ سکتے ہیں اور یورپ کے پنجۂ حرص و آز سے نہ صرف ہندوستان و عالم اسلامی کو بچا سکتے ہیں بلکہ کُل دنیا میں امن و مسرت قائم کر سکتے ہیں۔

منروا فلم کمپنی

یادش بخیر سیٹھ عبد علی صاحب مرحوم نے جو بنیاد رکھی تھی وہ اب ایک شاندار عمارت ہو چکی ہے۔ منروا فلم کمپنی جس کے ڈائرکٹر مسٹر سہراب مودی ہیں اپنے آرٹ اور کام میں برابر ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ اپنی جدوجہد سے پبلک کو آگاہ کرنے کے لئے اس نے اپنے اسٹوڈیو میں ایک پبلسٹی ڈپارٹمنٹ بھی قائم کیا ہے جو منروا فلم کمپنی کی فلمی جدوجہد سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتی رہتی ہے۔

منروا نے "آتمہ ترنگ" تصویر بنا کر اپنی خوش ذوقی اور آرٹ کی خدمت گزاری کا ثبوت دیا ہے جس میں ہندوستانی صنعت فلم سازی اور آرٹ کا بلند ترین معیار پیش کیا گیا ہے۔ بیرونی مناظر ناسک پور، نابیر جبلپور اور حیدرآباد میں لئے گئے۔ منروا کمپنی نے ہندوستانی زبان ہی میں پروڈکشن نہیں کیا۔ اس کی توجہات مرہٹی کلچر اور زبان کی طرف بھی مبذول رہتی۔ چنانچہ "نامدیو" مرہٹی تصویر ہے جو منروا نے خاص توجہ سے پروڈیوس کی۔ "نامدیو" بابو راؤ آپٹے کے ڈائرکشن میں تیار ہوا۔ اور مرہٹی زبان میں منروا کے ادبین شاہکار نے لوگوں کو حیران کر دیا۔ اور بھی کئی تصویریں منروا فلم کمپنی نے اپنے اہتمام میں تیار کیں جو مقبول اور مشہور ہوئیں۔

گو منروا کو اس دوران میں آفات ارضی و سماوی کا مقابلہ بھی کرنا پڑا لیکن مسٹر سہراب مودی اور ان کے برادر محترم کے حسن انتظام نے ان آفات کا مقابلہ کیا اور اپنے عملی توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بہرحال ہم مسٹر سہراب مودی کو ان کی کامیابیوں پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور ہماری آرزو ہے کہ منروا آرٹ اور فلم کی خدمت گزاری میں ہندوستان کی مشہور ترین کمپنیوں کی صفِ اوّل میں شمار کی جائے اور پھر اس درجہ ترقی کرے کہ وہ خود ہی اپنی صفِ اوّل ہو۔

آخر میں یہ کہے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ ہر کام میں گنجائش اور تنقید کے کافی امکانات ہیں۔ ---- منروا کو کبھی یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ اُن کا پروڈکشن رائے زنی سے بالا ہو سکتا ہے۔ اس لئے منروا کے ذمہ دار اصحاب کا فرض ہے کہ وہ خود اپنے محتسب اور نقاد بنے رہیں۔ خود احتسابی اور خود انتقادی ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔

یادگارِ شیون

یہ امرتسر کے مقبول و مشہور شاعر مرزا شجاع خان شیون ایرانی مرحوم کے فارسی اور اُردو کلام کا مجموعہ ہے۔ جسے اُن کے بھائی مرزا بیضا خان نے مرتب کیا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے مرزا شجاع کو ۱۹۲۵ء میں ایک بار امرتسر ہی میں دیکھا تھا وہ اُردو فارسی کے ایک نہایت خوشگو شاعر تھے اور غزل خوب کہتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں غالب کے نام سے مرزا نے ایک رسالہ بھی شائع کیا تھا۔ یادگار شیون میں سب سے اوّل شجاع کی تصویر دی گئی ہے۔ اس کے بعد اُن کے کلام فارسی پر عرشی صاحب کا تبصرہ، پھر مرزا مرحوم کی سوانح حیات، اس کے بعد فارسی و اُردو کلام۔ مرزا شجاع ایک خلیق ذہین، ذکی، سلیم الطبع، عالی حوصلہ اور سیر چشم نوجوان تھے شاعری سے فطری طور پر ذوق تھا۔ ۷-۸ سال بیمار رہ کر عین شباب کے عالم میں جون ۱۹۳۱ء کو انتقال فرمایا۔ فارسی میں خوب کہتے تھے۔ تخلص حیشی کرتے تھے۔

میخانہ نقش بیخودی جلوہ گاہ کیست
تا بہ شراب عکس رُخ رشک ماہ کیست

خونم بخاک ریختہ جرم داں عجب — بے خوف می خرامد و بیباک می رود

بادہ تیغ ریزد در جامم — تا حلاوت بر و لب و کامم
شام من گریہ از پئے صبحم — صبح من نالہ از پئے شامم

سایۂ مہر نیست در صحنم   تابشِ ماہ نیست بر بامم

حق سے فروغ رونق میخانہ چاہیے   رندوں کی آرزو بھی تو رندانہ چاہیے

انتقال سے کچھ دنوں قبل آخری غزل کا ایک شعر یادگار رہ گیا ؎

اسیرانِ ستم کو تھا پیام عید آزادی   مرا جوش رہائی میں قفس بر دوش چلنا

آل انڈیا کانگریس کمیٹی الہ آباد کا شعبۂ اطلاعات

انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کے

دور اندیش اور دوربین دماغ نے کانگریس کی جانب سے ایک مضبوط "پبلسٹی ڈپارٹمنٹ" قائم کر کے بہت بڑی کمی کو پورا کیا۔ جس دن سے کانگریس کے شعبۂ اطلاعات نے اپنا کام جاری کیا اسی دن سے ملک کے فرقہ پرست عناصر نسبتاً کمزور پڑ گئے۔ پہلے ہر بات کے لئے کانگریس کا نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کے لئے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ مگر اب ہر بات کے متعلق فوراً کانگریس کی پالیسی کی وضاحت بہت سی غلط فہمیوں کا سدِّ باب کر دیتی ہے اور یہ حکومت ہند کے پبلک انفارمیشن بیورو کا نہایت موزوں و مناسب جواب ہے۔ جہاں سے کمال ہوشیاری کے ساتھ ہندوستانی مفاد کے خلاف پروپگنڈا ہوتا رہتا ہے۔

بنیادی حقوق و فرائض اور کانگریس کا اقتصادی پروگرام

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۸ اگست ۱۹۳۱ء کو بمبئی میں فنڈامنٹل رائٹس کے متعلق جو قرارداد پاس

کی تھی اس کا اعادہ ایسے وقت میں یقینی ضروری تھا جبکہ جدید انڈیا ایکٹ پر نفاذ ہو رہا ہے اور کانگریس نے وزارتوں کو محض اس لئے قبول کر لیا ہے کہ وہ نئے قانون کو بیکار و نکما ثابت کر دیں اور وہ شئے مقصود حاصل کریں جو ہندوستان کے غریب و مفلس باشندوں کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ چنانچہ "بنیادی حقوق و فرائض اور کانگریس کا اقتصادی پروگرام" میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ:-

"ہندوستان کی اصلی نکبت و فلاکت دور کرنے کیلئے یہ بہت ضروری ہے کہ سیاسی آزادی میں فاقہ کش کروڑہا اہل ملک کی اقتصادی آزادی داخل سمجھی جائے۔ بلکہ اُن کا ایک جزو ضروری قرار پائے"

اس وجہ سے کانگریس اعلان کرتی ہے کہ کوئی کانسٹی ٹیوشن (ملکی قوانین و آئین) جو اس کی طرف سے طے پائے یا جو اس کے وسیلے سے سوراج گورنمنٹ تیار کرے اس میں امور ذیل کا ہونا لازمی ہے۔

بنیادی حقوق و فرائض

(۱) ہر باشندۂ ہندوستان کو حقوق ذیل حاصل ہوں گے یعنی اپنی رائے آزادی سے ظاہر کرنا، اور اشتراک عمل و باہمی اختلاط میں مکمل آزادی اور امن کے ساتھ بغیر اسلحہ کے ایسی اغراض کے واسطے مجتمع ہونا جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہوں۔

(۲) ہر باشندۂ ہندوستان کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی سے کر سکیگا اور اپنے مذہب کے فرائض و رسوم آزادی سے برت سکیگا۔ بشرطیکہ اس سے انتظام عامہ اور اخلاق میں کوئی نقص واقع ہو۔

(۳) ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور اُن کی زبان اور رسم تحریر محفوظ ہوں گے۔ نیز ملک کے وہ مختلف رقبے جو باعتبار اختلاف زبان کے قائم ہیں اُن کا تحفظ ہوگا۔

(۴) تمام باشندگان ہندوستان بلا امتیاز مذہب و مسلک یا ذات و قوم یا جنسیت کے قانون کی نظر میں برابر ہوں گے۔

(۵) کوئی باشندۂ ہندوستان خواہ مرد ہو یا عورت بوجہ اپنے مذہب یا ذات یا جنسیت کے کسی پبلک ملازمت یا عہدے یا اعزاز سے یا کسی تجارت یا پیشہ سے ممنوع نہیں سمجھا جائے گا۔

(۶) تمام باشندگانِ ہندوستان کو متعلق استعمال آب چاہ اور تالاب

کے نیز تعلیم گاہوں اور مقامات تفریح عامہ کے استعمال کے متعلق کہ جنکی برقراری اور انتظام اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے یا لوکل فنڈ (ڈسٹرکٹ و میونسپل بورڈ) سے ہوتا ہو یا جن کو پرائیویٹ اشخاص نے پبلک کے فائدے کے واسطے مخصوص کر دیا ہو ساوی حقوق حاصل ہونگے

(۷) ہر باشندۂ ہندوستان کو ہتھیار رکھنے اور لگانے کا حق، اُن قواعد اور ضوابط کے تحت میں جو اس بارہ میں مقرر کر دئے جائیں حاصل ہوگا۔

(۸) کسی شخص سے اُس کا حق آزادی چھینا نہیں جا سکتا اور نہ اُس کے کسی مکان یا جائداد میں مداخلت کی جا سکتی ہے اور نہ وہ ضبط او قرق کی جا سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ قانون کے مطابق ہو۔

(۹) مذہب کے معاملہ میں اسٹیٹ (حکومت وقت) غیر جانب دار ہوگی۔

(۱۰) حق رائے دہندگی ہر عاقل و بالغ کو حاصل ہوگا۔

(۱۱) مفت جبری ابتدائی تعلیم کا انتظام اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے ہوگا

(۱۲) اسٹیٹ (حکومت وقت) کی جانب سے کوئی خطاب نہیں ملیگا۔

(۱۳) ہر باشندۂ ملک کو حق حاصل ہوگا کہ ملک بھر میں جہاں اُس کا جی چاہے جائے نیز یہ کہ جہاں اُس کا جی چاہے سکونت اختیار کرے۔ جائداد حاصل کرے یا کوئی تجارت یا پیشہ وہاں کرے اور اُس کے خلاف قانونی کارروائی یا اُس کا قانونی تحفظ ہندوستان کے ہر حصّہ میں مساوی طور پر ہوگا۔

مزدوری پیشہ اشخاص

(۱) الف۔ مزدوری پیشہ جماعتوں کا اقتصادی نظام اصول انصاف کے مطابق ہوگا جس کی سب سے بڑی غرض یہ ہوگی کہ ایسے اشخاص کے طرز رہائش کا معیار اب سے بہت بہتر ہو جائے۔

ب اسٹیٹ (حکومت وقت) کارخانوں میں کام کرنیوالے مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کرتی رہے گی اس طور پر کہ مناسب قوانین کے ذریعہ سے نیز اُن کے سوا دوسرے ذرائع سے اُن لوگوں کے لئے ایک معقول مزدوری، اُن کی صحت کا مناسب انتظام، کام کرنے کے مقررہ گھنٹے اور مناسب انتظام درصورت نزاع درمیان مالکان کارخانہ اور کام کرنے والوں کے منضبط ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ بڑھاپے، بیماری اور بیکاری کی صورت میں ایسے لوگوں کی امداد کس طریقہ سے کی جائے گی۔

(۲) بیگاری اور ایسی مزدوری کہ جو بیگاری کے قریب قریب ہو بالکل بند کر دی جائے گی۔

(۳) مزدور عورتوں کے تحفظ کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ علی الخصوص زمانہ زچگی کی رخصت کا خاص انتظام کیا جائے گا۔

(۴) تعلیمی سن کے بچے کانوں اور کارخانوں میں کام کرنے سے مستثنیٰ ہونگے

(۵) کسانوں اور دیگر مزدوری پیشہ لوگوں کو پورا حق حاصل ہوگا کہ اپنے حقوق کی حفاظت کے واسطے یونین (اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے انجمنیں) قائم کریں۔

ادائی ٹیکس اور اخراجات

(۱) طریقۂ قبضۂ اراضی اور تشخیص مالگذاری و لگان کی اصلاح کر دی جائے گی۔ اور زراعتی آراضی کے بارہ کا ایک منصفانہ انتظام کیا جائے گا جس سے چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو فوری نفع پہونچیگا۔ بذریعۂ معقول تخفیف لگان اور مالگذاری کے جو وہ بالفعل ادا کرتے ہیں۔ اور درصورت غیر نفع بخش کاشتوں کے لگان معاف کر دیا جائے گا۔ جب تک کہ اس کی ضرورت سمجھی جائے گی اور اُن چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے فائدے کا جن کا اس قسم کی معافی یا تخفیف لگان سے نقصان ہوتا ہو خیال رکھا جائے گا اور اسی غرض سے ایک درجہ وار ٹکس ایک معقول مقررہ رقم سے زیادہ کی آمدنی آراضی پر قائم کیا جائے گا۔

(۲) ایک مقررہ رقم سے زیادہ کی جائداد پر ایک تدریجی محصول جانشینی (Death Duty) مقرر کیا جائے گا۔

(۳) فوجی اخراجات میں بہت بڑی تخفیف عمل میں آئیگی اور وہ موجودہ اخراجات سے تقریباً نصف رکھے جائیں گے۔

(۴) سول ڈیپارٹمنٹ کے اخراجات اور تنخواہ ملازمین میں بھی معتدبہ تخفیف کی جائے گی۔ اسٹیٹ (حکومت وقت) کا کوئی ملازم سوائے اُن لوگوں کے جنکا تقرر بطور اکسپرٹ (ماہر فن) وغیرہ کے کیا جائے ایک مقررہ رقم سے زیادہ تنخواہ نہیں پائے گا اور یہ مقررہ رقم معمولاً پانچسو روپیہ ماہوار سے متجاوز نہوگی۔

(۵) ایسے نمک پر جو ہندوستان میں بنایا جائے کوئی محصول نہیں لگے گا۔

اقتصادی اور سوشل پروگرام

نمبر ۱

اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے دیسی کپڑے کی حفاظت کی جائیگی اور اس غرض سے بیرونی کپڑے اور بیرونی تاگے کے ملک سے اخراج کی پالیسی پر عمل کیا جائے گا اور اس کے علاوہ اور بھی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں جو ضروری سمجھی جائیں۔ دیسی کپڑے کے علاوہ اور دیسی دستکاریوں کا تحفظ بمقابلہ اُسی قسم کی بیرونی دستکاریوں کے اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے عمل میں آئیگا۔ جب کبھی اس کی ضرورت واقع ہوگی۔

نمبر ۲

منشی اشیاء اور ادویہ کی قطعی ممانعت ہوگی سوائے اس کے کہ طبی اغراض کے لئے اُن کے استعمال کی ضرورت ہو۔

نمبر ۳

کرنسی (سکۂ رائج الوقت) اور ایکسچینج (بٹاون) کا نرخ قومی مفاد کے اعتبار سے مقرر ہوگا۔

نمبر ۴

تمام دیسی صنعتیں (Key Industries) کانیں، ریلوے، آبی راستے، جہازرانی اور دیگر ذرائع آمد و رفت اسٹیٹ کی ملک ہوں گی۔ اور اسٹیٹ (حکومتِ وقت) ہی کے قبضہ میں رہیں گی۔

نمبر ۵

زراعتی قرضوں کی تخفیف اور سود کی کمی کا انتظام کیا جائے گا۔

نمبر ۶

اسٹیٹ (حکومت وقت) کی طرف سے باشندگان ملک کی فوجی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ تاکہ باقاعدہ فوج کے علاوہ (National Defence) ملک کی مدافعت کے واسطے والنٹیروں کے دستے عند الضرورت تیار رہیں

یہ ہیں وہ "بنیادی حقوق و فرائض" جو ہندوستان کو آزادی اور ترقی کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کے افلاس اور غلامی کا حقیقی علاج ہیں اور جو قانون و آئین ان بنیادی حقوق و فرائض سے خالی ہوگا یقیناً وہ ہندوستان کے لئے مفید نہیں ہوسکتا۔

(۲) ہٹ دھرمی، غلامی، فرقہ پرستی اور "ابوجہلیت" کا کوئی علاج نہیں لیکن جس شخص میں ذرا بھی عقل ہے وہ اعتراف کرے گا کہ اس بنیادی علاج کے بعد کوئی گنجائش شک وشبہ کی رہ نہیں جاتی۔ کسی ملک کی داخلی اور کسی قوم کی قومی آزادی کے لئے اس سے زیادہ کیا آزادی دیجاسکتی ہے کہ ہر شخص کو ضمیر کی آزادی حاصل ہو۔ کانگریس بنیادی حقوق میں اس مقدس حق کو سب سے اوّل درجہ دیتی ہے اور ضمیر کی آزادی نہیں بلکہ وہ کہتی ہے کہ:۔

" اور وہ اپنے مذہب کا اعلان آزادی سے کرسکیگا اور اپنے مذہب کے فرائض و رسوم آزادی سے برت سکیگا"

جو فرقہ پرست ہندوستان پر برطانی تسلط کی لعنت کو طاری وحاوی دیکھنا مذہبی فرض سے زیادہ مقدس خیال کرتے ہیں اور بات بات میں مذہب کا نام تجارتی طور پر لے کر شور مچاتے ہیں کہ آزادی حاصل ہوجانے کے بعد مذہب خطرے میں پڑجائیگا یا مذہبی آزادی باقی نہیں رہیگی، میں اُن سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا وہ ایمان داری کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں۔ کیا اس کی وضاحت کے بعد کوئی حقیقت ان کے اندیشے کی باقی رہ جاتی ہے؟ دوسروں کا ذکر نہیں لیکن مسلمان اگر ایسا خیال کریں تو مجھے اُن پر رونا آئیگا کیونکہ میرے خیال سے مسلمانوں کا یہ "اندیشہ" ایک ہی معنی رکھ سکتا ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کو بھول گئے اور اُن کی "روحِ یقین" سرد پڑگئی۔ مسلمان کا تو مذہب ہی آزادی ہے۔ جو شخص آزادی کے خلاف ہے وہ اسلام کے خلاف ہے۔ بہرحال مسلمان ہوں یا ہندو، عیسائی ہوں یا پارسی، اچھوت ہوں یا کوئی دوسری ہندوستانی قوم، قانون ہر ایک کے لئے ایک ہے اور قومی حکومت کا ہر قانون حکومت کی غرض سے وضع نہیں کیا جاتا بلکہ قومی ضرورت کی بنیاد پر بنایا جاتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ کانگریس کے "بنیادی حقوق و فرائض" ہندوستان کے باشندوں کے مشکلات و مصائب کا حل ہیں۔ یعنی کوئی آئین خواہ وہ حکومت کی طرف سے بنے یا اس کی طرف سے یا مشترکہ مندرجۂ بالا بنیادی حقوق و فرائض سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ حقوق کانگریس کا بنیادی مقصود ہیں۔

(۲) مسلم لیگ جو آجکل مقابلہ کے طور پر شورش انگیز ہے اس کے حامی اور دوسرے فرقہ پرست اور تن آسان رجعت پسندوں کے "باتونی" اس خدشہ کو بھی بیان کرتے ہیں کہ اگر ملک کو آزادی حاصل ہوگئی تو ہندو قوم ہمارے تمدن، ہماری زبان، اور رسم تحریر کو ہڑپ کر جائے گی۔

تمام خدشات کو پیش کرنے کی نوعیت ہمیشہ یہ دیکھی گئی (اور نہ دیکھی جاتی تو ثابت ہوتی) کہ یا تو ان جماعتوں کو اپنی طاقت اور عملی قوتوں پر بھروسہ نہیں ہے یا یہ سراسر آزادی اور ملک کی فلاح کے دشمن ہیں۔ میں ایسے تمام افراد اور ایسی جماعتوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی اکثریت کی حکومت اس قسم کا تصور اپنے مفاد و قیام کی خاطر بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ ہر ذی فہم جانتا ہے کہ کسی فرقہ کی اپنی کمزوری اس کو تباہ کر سکتی ہے نہ کہ دوسروں کی طاقت!؟ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے کانگریس اس باب میں نہایت وضاحت کیساتھ بنیادی حقوق کا اعلان اپنی طرف سے تجویز کی صورت میں کر چکی ہے

(۳) "ملک کی اقلیتوں کے تمدن اور ان کی زبان اور رسم تحریر محفوظ ہوں گے۔ نیز ملک کے وہ مختلف رقبے باعتبار اختلاف زبان قائم ہیں اُن کا تحفظ ہوگا۔"

اک بر سر اقتدار آنیوالی یا پوری قوم ہندوستانی کی فلاح و آزادی کی خاطر جد و جہد کرنے والی جماعت سے متذکرہ مقصد کے متعلق جو توقع کی جا سکتی ہے وہ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ پھر اس کے ذمہ دار صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے اس مسئلہ پر جتنی بار اور جس قدر واضح اظہار خیال کیا ہے اس کے بعد شک و اتہام کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

رسالہ "ہمایوں" میں عطاء اللہ صاحب پالوی نے ایک طویل مضمون میں میرے متعلق لکھا ہے کہ ساغر صاحب نے پنڈت جواہر لال کی پوزیشن صاف کرنا چاہی ہے مگر افسوس کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے" اس کے بعد انھوں نے پریشد کے اجلاس میں پنڈت جی کی موجودگی اور خموشی کے متعلق شکایت کی ہے۔ اُن کو معلوم ہونا چاہئے کہ پنڈت جواہر لال کی پوزیشن سورج کی طرح روشن ہے زبان کے مسئلہ پر اُنھوں نے جس قدر وضاحت اور دیانت داری سے اظہار خیال کیا ہے کسی نے نہیں کیا اور وہ صداقت کیساتھ اُردو کے حامی ہیں۔

مجھ سے اس مسئلہ پر زبانی تبادلۂ خیال کے دوران میں اُنھوں نے کہا کہ پریشد میں میری خاموشی کی یہ تعبیر غلط ہے۔ بلکہ میں مسئلۂ زیر بحث کو سمجھ کر اظہارِ خیال کرنا چاہتا تھا۔

لیکن بہر حال یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ ان مسائل کو کانگریس نظرانداز کرتی۔ چنانچہ بنیادی حقوق و فرائض میں اُس نے ۱۹۳۱ء ہی میں ان کی اہمیت پر روشنی ڈال دی تھی۔

وہ لوگ جن کو سیاسی شعور حاصل نہیں ہوا ہے وہ ایک دن اس نعمت سے ضرور بہرہ ور ہوں گے۔ لیکن ترقی یافتہ جماعتوں کی جد و جہد کو تنگدلی، شک، اور فرقہ پرستی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا نہ صرف نامناسب ہے، بلکہ مفید نہیں ہے۔ ہر شخص کو یہ جاننا چاہئے کہ ہندوستان لحہ بہ لحہ انقلاب سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ فرسودگی، سستی۔ کاہلی۔ قدامت پرستی اور قدیم الخیالی کے زنگ آلود ہتھیاروں سے اس انقلاب کا مقابلہ ناممکن ہے۔ اس کے مقابلہ کے لئے نقطۂ نگاہ کو تبدیل کرنا پڑے گا۔ تبدیل ہی نہیں وسیع بھی کرنا ہوگا ورنہ نتیجہ وہی ہوگا جو نہتے سپاہی کا ہوا کرتا ہے۔

بہر حال کانگریس کے نزدیک فنڈامنٹل رائٹس کی جتنی اہمیت ہے اُس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اِن کو دوبارہ کئی زبانوں میں شائع کیا اور یہ اعادہ اس بات کی بین شہادت ہے کہ کانگریس نئے کانسٹی ٹیوشن میں ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق و فرائض و نیز اپنے اقتصادی اور سوشیل پروگرام کو ہرگز نظرانداز نہیں کر سکتی۔ اپنے اقتصادی اور سوشل پروگرام میں اُس نے جو کچھ طے کیا ہے وہ عام ہندوستانیوں کے معمولی ترین مفاد تک پر حاوی ہے اور کامل آزادی کا تصور لئے ہوئے ہے کیونکہ کرنسی (سکہ رائج الوقت) اور ایکسچنج (تبادلہ) کا نرخ قومی مفاد کے اعتبار سے مقرر ہونا حکومت ہند یا برطانوی پارلیمنٹ کب برداشت کر سکتی ہے۔ ان تمام چیزوں پر اقتدار حاصل ہو جانے کے معنی "کامل آزادی" کی بنیادی منزل تک پہونچ جانا ہے۔

یہ ایک نیا ادبی رسالہ ہے جو مرادآباد سے شائع ہونا شروع ہوا ہے اور جس کا دوسرا نمبر پیش نظر ہے۔ رسالہ کی لکھائی چھپائی متوسط درجہ کی خوشنما ہے لیکن جابجا لیتھو کی نقاشی نے سادگی و خوش ذوقی کا خون کر دیا ہے۔ کاغذ سفید اور چکنا لگایا گیا ہے۔ مضامین اچھے ہیں زیر نظر نمبر بھی ہمارے دوست رشید احمد صاحب صدیقی کا مضمون ہندوستانی بہت اچھا ہے۔ دوسرا مضمون "جگر اور شراب" بھی خوب ہے۔ لیکن مضمون نگار کی اس صوفیانہ رائے سے میں اتفاق نہیں کرتا کہ ہمارے دوست کی بادہ نوشی انسانوں کی عادت یا ارض انسان کی رسم کے علاوہ کوئی "عرشی لٹک" ہے۔ جگر کا شعر بجائے خود "شراب" ہے۔ رسالہ مجموعی طور پر اچھا ہے۔ رشید صاحب کو اس کی طرف مزید توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور انھیں کو نہیں بلکہ ہر اردو داں کو آج ہندوستانی زبان کی ترقی و ثبات کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہر شخص اس کی خدمت کو ضروریات زندگی میں شریک کرلے۔

عارف لاہور

مقام اشاعت نِل روڈ لاہور، ایڈیٹر عبدالرحمن صاحب شوق، سالانہ چندہ عہ،

یہ ایک مذہبی رسالہ ہے جس کا "معین" نمبر پیش نظر ہے۔ اس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کے مفصل حالات درج ہیں۔ تنقیدی حصہ بالکل نہیں ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔

خضر راہ

چیف ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن، ایڈیٹر یعسوب حسن قیمت سالانہ للعہ فی پرچہ ۳ر

یہ بھی نیا رسالہ ہے اور ہمارے قدیم دوست حکیم محمد یوسف حسن صاحب ایڈیٹر "نیرنگ خیال" نے جاری کیا ہے۔ سرورق نہایت دیدہ زیب سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۹۶ صفحات، مضامین عام فہم دلچسپ اور ادبی۔ "ونیس کی پیدائش" کے عنوان سے جو تصویر اس رسالہ میں شائع ہوئی ہے وہ آرٹ کا شاہکار ہے۔ اور بھی تصویریں خوب ہیں۔ رسالہ مجموعی طور پر خریدنے اور پڑھنے کے قابل ہے حکیم یوسف حسن صاحب نے اردو ادب کی جتنی خدمت کی ہے اُس کا تقاضا ہے کہ اُن کے اس جدید رسالے کو قوم زیادہ سے زیادہ تعداد میں خریدے۔

باتصویر ہفتہ وار ترقی لکھنؤ

کسی اخبار کی اشاعت بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ مگر اخبار ہی ایک ایسا کام ہے جس کو ہم ہندوستانی انتہائی غیر ذمہ داری سے انجام دیتے ہیں۔ اسکی اصلی وجہ خود ہمارے کردار میں پوشیدہ ہے۔ ہم زندگی کو ذمہ دارانہ نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے تو اُس کے جزئیات کو کیا اہمیت دے سکتے ہیں؟! انھیں خیالات کی وجہ سے جب کوئی نیا اخبار یا رسالہ مدیر ایشیا کو موصول ہوتا ہے تو اُس کی وجہ اشاعت پر غور کرنے لگتا ہے۔ اخبار یا تو رائے عامّہ کا نمائندہ ہوتا ہے یا اس کا کام کسی خاص ملکی و قومی مقصد کے لئے رائے عامّہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یا وہ رجعت پسند طبقوں کی نمائندگی کا ذلیل فرض ادا کرتا ہے۔ یا وہ آزاد طبقوں کے گیت گا کر اُن کے حق میں فضا پیدا کرتا ہے۔ بہرحال اخبار ایک نہایت اہم شے ہے۔ جس کی تمام تر ذمّہ داری اُس کے ادارۂ تحریر ــــــــــ پر ہوتی ہے اور انسانی نسل کی ذہنی و دماغی رجحانات کو مٹانا یا ابھارنا ذمہ دار مدیر سے تعلق رکھتا ہے۔

ترقی، حال ہی میں لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ اس کا نام ہی اس کے کام کا اعلان ہے یہ سیّد تبارک حسین صاحب جعفری کی سرپرستی اور لکھنؤ کے نوجوان شاعر حضرت عمر انصاری کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔ سرورق دبیز آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے اور سرورق کے بلاک کے علاوہ پانچ تصویریں ہیں جو فلم کے مناظر سے تعلق رکھتی ہیں۔ کاغذ ۲۶×۲۰/۲۲ پونڈ ہے "شاعر کے مدارج حیات"، مولوی عبدالباری آسی کا مضمون اپنی نوعیت کا نہایت دلچسپ اور انوکھا مضمون ہے۔ ایک خاص ترتیب کے ساتھ غالب کے اشعار کی تعبیر و تفسیر کی گئی ہے اور باقی چیزیں بھی خوب ہیں لیکن وہ جو نمائندگی کا فرض ہے وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کا سیاسی مسلک کیا ہے اور کسی سیاسی بحث پر عدم اظہار اس شک میں مبتلا کرتا ہے کہ ترقی سیاسی اخبار ہے بھی کہ نہیں۔ البتہ دل پر یہ اثر ضرور ہوتا ہے کہ زمانے کے تقاضات کے مطابق فلمی عنصر اس میں زیادہ ہے میرے خیال سے ادبی رسائل بھی سیاسی بیداری اور مباحث حاضرہ سے آنکھ بند نہیں کر سکتے تو کیونکر ہفتہ وار اخبار کو ہم اس عنصر سے آزاد خیال کریں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ترقی اپنے سیاسی مسلک کو قائم کرے اور پھر اسی کے مطابق تمام ملکی و قومی معاملات پر رائے دے کر ملک و قوم کی رہبری کرے۔

ترقی کے اندر چند ہی ہفتوں میں مذہبی عنصر کی زیادتی ہوگئی ہے اور ادارے میں بھی کچھ انقلاب ہوا ہے۔ بہرکیف مجموعی طور پر ترقی خاصا اخبار ہے۔

(ساغر نظامی)

بقیہ مضمون صفحہ ۱۶

زبان کا مسئلہ اور اُس کا حل

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۶ء کے بعد سے اردو دنیا میں ایک نئی بیداری پیدا ہوگئی۔ مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن کی مسلسل اور مستقل جدوجہد نے تمام ادارہ ہائے خیال کو متحد کردیا۔ اور کل اُردو دنیا خواب سے چونک پڑی۔

اس جدوجہد اور بیداری کا تعلق محض ادبی حلقوں سے نہیں رہا بلکہ سیاسی ذمہ دار ہستیوں تک کو اس مسئلہ سے دلچسپی لینی پڑی اور اس دلچسپی کا نتیجہ یہ ہے کہ خود غرضی اور قومی عصبیت کے لئے اس مسئلہ میں گنجائش باقی نہیں رہی اور بالآخر دونوں قوموں اور دونوں زبانوں کے ماہرین کو ایک مرکز پر جمع ہونا پڑا۔

اس سلسلے میں "بہار اُردو کمیٹی" کی طرف سے پٹنہ میں ایک اجلاس ۲۸ اگست ۱۹۳۹ء کو ہوا۔ جس کے بعد بابو راجندر پرشاد جی اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے نے ایک متفقہ بیان شائع کیا ہے جو ذیل میں درج ہے۔

"۲۸ اگست کو "بہار اردو کمیٹی" کے اجلاس میں ہمیں ہندوستانی زبان کے سوال پر چند دوستوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ اس بارے میں بدقسمتی سے جو غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے اسے دور کرنے کے لئے ہم سبھی مضطرب اور فکرمند تھے اور ہیں۔ یہ اعلان کرتے ہوئے بیحد خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس گفتگو کے نتیجہ کے طور پر ہمیں معلوم ہوا کہ اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر ہم سب ایک بہت بڑی حد تک ہم رائے ہیں۔ یعنی ہم سب کی یہ متفقہ رائے تھی کہ "ہندوستانی" کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کا درجہ حاصل ہونا چاہیے اور یہ اُردو نیز ناگری دونوں حروف میں لکھی جانی چاہئے جن کا سرکاری و تعلیمی مقصد کے لئے یکساں درجہ تسلیم کیا جائے۔ "ہندوستانی" سے ہمارا مطلب اُس وسیع ترین اور عالمگیر زبان سے ہے جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہے۔ اور ہمارا یہ یقین ہے کہ اس کے الفاظ کے انتخاب و استعمال کا معیار وہی ہونا چاہئے جو اس وقت عام طور پر زیر عمل ہے۔ ہماری یہ بھی رائے ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں کو علمی زبانوں کی حیثیت سے درجۂ کمال تک نشوونما کرنے کے پورے پورے موقع حاصل ہونے چاہئیں۔

اس لئے ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ اُردو و ہندی علماء کے باہمی تعاون سے ایک ایسی لغات تیار کی جائے جس میں وہ تمام الفاظ درج ہو جائیں جو مشترکہ طور پر اُردو و ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔

ایک ایسی لغت کی تیاری کے لئے نیز مختلف نمایاں سوالات مثلاً علمی اور ٹیکنیکل اصطلاحات کا انتخاب وغیرہ کے حل کرنے کے لئے ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ ایک نمائندہ کمیٹی مقرر کی جائے جس میں اُردو و ہندی کے وہ بارسوخ حامی شامل ہوں جو دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب ترین لاکر ہندوستانی زبان کو نشوونما دینے کی تجویز میں کامل یقین رکھتے ہوں اور اس طرح دونوں زبانوں کے حامیوں میں باہمی خیراندیشی اور ہم خیالی پیدا کرنے کے خواہاں ہوں۔"

گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں "دل پسند اقدام" کے عنوان سے اس بیان پر اظہار استحسان کیا ہے اور اُن کی تجویز ہے کہ کمیٹی کے ممبران کی تعداد کم سے کم ہونی چاہئے تاکہ کام میں وسیع اختلاف اور تاخیر پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

مسئلہ زبان کا یہ حل ایسا عجیب نہیں ہے کہ مندرجۂ بالا اعلان کے مصنف و مشتہر اس کی اہمیت و عامیت سے واقف نہ تھے مگر جب تک خوب آویزش نہ ہولی اس سے قبل اس مسئلہ کا حل پیدا نہ ہوسکا۔ قصہ در اصل یہ ہے کہ ؎

کوہ و دریا سے گزر سکتے ہیں مانندِ نسیم ہے گراں سیرِ غمِ راحلہ و زاد سے تو

زبان کا مسئلہ اور صدر انڈین نیشنل کانگریس

پنڈت جواہرلال نہرو نے "زبان کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک نہایت اہم مقالہ شائع کیا ہے "ہندوستانی" زبان کی تعریف کرتے ہوئے پنڈت جی لکھتے ہیں :-

"ہندوستانی کی جیسا کہ وہ شمالی اور وسطی ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بولی اور لکھی جاتی ہے، بہت سی مختلف صورتیں ہیں جن سے کئی چھوٹی چھوٹی بولیاں پیدا ہو گئی ہیں مگر یہ تعلیم کی کمی کے لازمی نتائج ہیں اور جمہور میں تعلیم کے عام ہونے سے یہ غائب ہو جائیں گی اور صحتِ زبان کا ایک معیار قائم ہو جائے گا۔

رہا رسم الخط، تو دیوناگری اور اُردو طرزِ تحریر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اِس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں کہ ان میں سے ایک رسم الخط دوسرے کو جذب کر لے گا۔ اِس لئے ہم نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم رہیں اور پھولیں پھلیں۔ اِس میں شک نہیں کہ اِس صورت میں اُن لوگوں پر جو دونوں زبانیں سیکھنا چاہیں گے ایک زائد بار پڑے گا اور ایک حد تک جُداگانہ ذہنیت کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی۔ لیکن ہمیں یہ قباحتیں برداشت ہی کرنی پڑیں گی۔ کیونکہ اِس کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں ہے دونوں رسم الخط ہماری زبان کی مخصوص طبیعت کے حصّے ہیں اور اِن کے گرد نہ صرف اِن سے مخصوص ادبیات جمع ہو گئی ہیں بلکہ جذبات کے ایسے زبردست حصار کھنچ گئے ہیں جن کی شکست و ریخت ناممکن ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مستقبل بعید ہمارے لئے کیا کچھ لائے گا لیکن اِس وقت تو دونوں کو جُوں کا تُوں رکھنا پڑے گا۔"

رسوم الخط کے متعلق پنڈت جی تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"ہمارے رسوم الخط ہماری ادبیّات کے لازمی حصّے ہیں۔ اُن کے بغیر ہم اپنی قدیم روایات سے بالکل جدا ہو جائیں گے۔"

اُردو کی تدریجی اور تاریخی حقیقت و تاریخ بیان کرتے ہوئے جواہرلال جی نے بالکل درست لکھا ہے کہ :-

"۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک اُردو کے معنی رسم الخط کو چھوڑ کر ہندی ہی سمجھے جاتے تھے۔ یہ اُنیسویں صدی کے وسطِ آخر کا ذکر ہے کہ ہندی اور اُردو کے الفاظ کے دو مختلف معنی لئے جانے لگے اور یہ اختلاف روز بروز بڑھتا گیا۔"

یہ مقالہ اپنے موضوع پر نہایت وسیع اور عالمانہ ہے۔ لفظ لفظ سے صرف مسائل کے حل کی اسپرٹ ظاہر ہوتی ہے۔ یہ حیرتناک بات ہے کہ جو شخص عملی سیاسیات میں تمام عمر گزار دے وہ ادبی مسائل پر چلتے پھرتے اِس قدر بہتر سوچ سکتا ہے اور سوچ کر اتنا بہتر لکھ سکتا ہے۔ زبان اور حکومت کی پالیسی کے متعلق جواہرلال جی تحریر فرماتے ہیں :-

"ہر صوبہ میں حکومت کے امور وہاں کی مقامی زبان میں سرانجام پانے چاہئیں لیکن ہر صوبہ میں "ہندوستانی" کی آل انڈیا حیثیت کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ ہندوستانی بولنے والے صوبوں میں دونوں رسوم الخط کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا لازمی ہے۔"

بہت ممکن ہے کہ اِس مسئلہ کے ذمہ دار عالموں کے پاس اِس سے بہتر کوئی حل ہو لیکن پنڈت جواہرلال نہرو نے جو حل پیش کیا ہے وہ اپنے موضوع کے تمام ضروری امور کو گھیرے ہوئے ہے اور میرے نزدیک کوئی راستہ سوائے اِس کے ممکن نہیں،

اب ہم ذیل میں اُن کی تجاویز کو نقل کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ زبان کے مسئلہ کو ہر قوم کے نقطۂ نگاہ سے سلجھانے کے لئے بہترین راہ نکالی گئی ہے۔

١٧٠

گیارھویں شق میں پنڈت جی نے "بنیادی انگریزی" کے طرز پر بنیادی ہندوستانی کی جو تجویز پیش کی ہے وہ بھی ماہرین زبان کے لئے خاص چیز ہے اور دعوتِ فکر دیتی ہے۔

(۱) ہمارے پبلک کام اور سرکاری تعلیم کے لئے ہر لسانی رقبہ کی مخصوص زبان استعمال ہونی چاہئے اور اس رقبہ میں اُس زبان کو باقی زبانوں پر فوقیت حاصل ہونی چاہئے۔ اِس مطلب کے لئے ہندوستان میں مندرجۂ ذیل زبانوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے۔
ہندوستانی (اُردو اور ہندی دونوں) بنگالی۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ تامل۔ تلوگو۔ کناری۔ ملیالم۔ اڑیا۔ آسامی۔ سندھی اور کسی حد تک پشتو اور پنجابی۔

(۲) ہندوستانی بولنے والے رقبوں میں اردو ہندی دونوں اپنے جدا جدا رسم الخط کے ساتھ سرکاری طور پر تسلیم کی جانی چاہئیں۔ پبلک اعلانات دونوں رسوم میں جاری ہونے لازمی ہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہو کہ عدالتوں اور دفاتر کے ساتھ معاملات کرنے میں دونوں میں سے ایک رسم الخط کو چُن لے اور اُسے یہ مجبوری نہیں ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے رسم الخط میں اپنی تحریر کی نقل داخل کرے۔

(۳) ہندوستانی رقبہ میں ہندوستانی ذریعۂ تعلیم ہوگی اور تعلیم دونوں رسوم الخط میں دی جائے گی اور دونوں کو تسلیم کیا جائے گا طلباء یا اُن کے والدین دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حق رکھیں گے۔ طلبا پر دونوں رسوم الخط سیکھنے لازم نہیں ہوں گے۔ اگرچہ ثانوی مدارس میں دوسرا رسوم الخط سیکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

(۴) ہندوستانی کو (مع اپنے دونوں رسوم الخط کے) سرکاری طور پر آل انڈیا زبان تسلیم کیا جائے گا اور اِس لحاظ سے ہر شخص مجاز ہوگا کہ وہ ہندوستان کے کسی دفتر یا عدالت کے ساتھ ہندوستانی میں معاملہ کرے اور تحریریں دونوں میں سے کوئی ایک رسوم الخط اختیار کرے اور اُس پر لازم نہیں ہوگا کہ اپنی تحریر کی نقل دوسرے رسوم الخط میں مہیّا کرے۔

(۵) دیوناگری۔ بنگالی۔ گجراتی اور مرہٹی رسوم الخط کو متّحد کرنے اور ایک ایسا مخلوط رسم الخط مقرر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو چھاپے، ٹائپ رائٹر اور دیگر جدید ایجادوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکے۔

(۶) سندھی رسم الخط کو اردو میں جذب کر دینا چاہئے اور اُردو رسم الخط کو ممکن حد تک سہل تر کر کے چھاپے اور ٹائپ رائٹر کے لئے موزوں بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(۷) جنوبی رسوم الخط کو دیوناگری کے قریب قریب لانے کی ممکنات کا پتہ چلانا چاہئے اور اگر یہ ممکنات بہم نہ پہونچ سکیں تو مختلف جنوبی زبانوں یعنی تامل۔ تلوگو۔ کناری اور ملیالم کے لئے ایک مخلوط رسم الخط کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔

(۸) لاطینی رسم الخط میں ہیں خواہ کیسی ہی خوبیاں نظر آئیں کم از کم موجودہ دور میں اسے رائج کرنے کے امکانات پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ پس ہمارے لئے صرف دو رسوم الخط رہ جائیں گے۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی کا مخلوط رسم الخط اور اُردو سندھی کا رسم الخط اور اگر ضرورت ہو تو جنوبی زبانوں کا ایک مخلوط رسم الخط اِس صورت میں کہ وہ اوّل الذکر رسم الخط سے مطابقت نہ کر سکیں۔

(۹) ہندوستانی بولنے والے رقبوں میں ہندی اور اُردو کا جداگانہ رجحان اگر ترقی کی طرف مائل ہو تو خطرے کا باعث نہیں اور اِن دونوں کے نشوونما میں رُکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے یہ جداگانہ فروغ زیادہ دقیق تصوّرات کے زبان میں داخل ہونے کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ہندی اور اُردو کی علیحدہ علیحدہ ترقی بھی ہندوستانی کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

آگے چلکر جب عالمگیر تحریکوں اور قومیت ہند کا دباؤ اِس طرف آن پڑے گا تو ہر چیز اپنی نشست پر ٹھیک بیٹھ جائے گی۔ اور پھر جمہور کی عام

۱۷۴

تعلیم سے ایک معیار اور یکسانیت قائم ہو جائے گی۔

(۱۰) ہمیں زبان کے (اس میں اردو ہندی کی تخصیص نہیں سب زبانیں مراد ہیں) مقبول عام طرز بیان پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ مصنفین کو عوام کی تعلیم کے لئے عوام کی سادہ زبان میں لکھنا چاہیے اور اُن مضامین پر لکھنا چاہیے جن کی عوام کو ضرورت ہے۔ درباری اور مصنوعی طرز تحریر کی حوصلہ شکنی کرنا اور سادہ و پُر زور طرز تحریر کو فروغ دینا چاہیے۔ اس روش سے جہاں اور بہت سے فائدے ہوں گے وہاں اُردو ہندی میں بھی یکسانیت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

(۱۱) بنیادی انگریزی کی طرز پر ہندوستانی میں سے ایک بنیادی ہندوستانی پیدا کرنی چاہیے یہ ایک سادہ زبان ہوگی جس کی گرامر نہ ہونے کے برابر اور لغات ایک ہزار الفاظ سے زائد نہیں ہوگی۔ اسے معمولی بول چال اور لکھت پڑھت کے لئے ایک مکمل زبان بنانا ہوگا۔ اس کا گوشت پوست خالص ہندوستانی ہوگا۔ اور یہ زبان وسیع تر مطالعہ کے لئے پہلے زینے کا کام دے گی۔

(۱۲) بنیادی ہندوستانی کے علاوہ ہمیں متعدد اصطلاحی علمی۔ سائنٹفک سیاسی اور تجارتی الفاظ مقرر کرنے ہوں گے جو اُردو ہندی اور اگر ممکن ہو تو ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی یکساں استعمال ہو سکیں گے۔ جہاں کہیں ممکن ہو ایسے الفاظ غیر ملکی زبانوں سے مستعار لے کر اپنی زبان میں پیوند کر لئے جائیں اور دیگر مناسب اور موزوں الفاظ اپنی زبانوں سے چُن کر فہرستیں بنالی جائیں۔ تاکہ تمام اصطلاحی اور سائنٹفک معمولات میں ہم ایک نہایت صحیح اور یکساں ذخیرۂ الفاظ استعمال کر سکیں

(۱۳) حکومت کی تعلیمی پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ تعلیم طالب علم کی زبان میں دی جائے۔ ہر لسانی رقبے میں پرائمری سے لیکر یونیورسٹی تک تعلیم کے لئے اس رقبے کی زبان مستعمل ہو۔ اگر کسی زبان کے رقبے میں ایسے طلباء کی ایک کافی تعداد موجود ہو جن کی مادری زبان حلقے کی زبان سے مختلف ہو تو ان کا حق ہوگا کہ پرائمری تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کریں بشرطیکہ وہ ایک مرکزی مقام پر جمع ہو سکیں۔ اگر ان کی تعداد کافی ہو تو یہ بھی ہو سکے کہ انھیں ثانوی تعلیم ان کی مادری زبان میں دیجائے۔ مگر ایسے تمام طلباء کے لئے اپنے حلقے کی قدرتی زبان بطور ایک لازمی مضمون کے لینی پڑے گی۔

(۱۴) ہندوستانی نہ بولنے والے صوبوں میں بنیادی ہندوستانی ثانوی مدارس میں سکھائی جائے اور رسم الخط کا سوال طلباء پر چھوڑ دیا جائے

(۱۵) یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے ذریعۂ تعلیم رقبے کی زبان ہوگی اور ہندوستانی اپنے کسی رسم الخط کے ساتھ اور غیر ملکی زبان لازمی مضامین ہونگے یہ لازمی شرط اعلیٰ صنعتی نصابات کی صورت میں نافذ نہیں کی جائے گی۔ اگرچہ اس حلقے کے طالب علموں کے لئے بھی زبانوں کا سیکھنا مناسب ہوگا۔

(۱۶) ثانوی مدارس میں ہماری قدیم قومی زبانیں اور غیر ملکی زبانیں سکھانے کا انتظام کیا جائے گا۔ لیکن خاص نصابات یا یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لئے تیاری کی صورت کے علاوہ ان کی تعلیم لازمی نہیں ہوگی۔

(۱۷) ہندوستانی زبانوں میں غیر ملکی زبانوں کی قدیم کتابوں کے تراجم بڑے پیمانے پر کئے جانے چاہئیں تاکہ ہماری زبانیں ان ممالک کی تمدنی۔ ادبی اور سوشیل تحریکوں سے لگاؤ پیدا کریں اور اس اتصال سے اپنے لئے طاقت و قوت حاصل کریں۔

ساغر نظامی

۲۰/۹/۴۶ع

دُنیا کی سیاسی فضا پر ایک طائرانہ نظر

از ساغر نظامی

زمانہ ہر لمحہ میں انقلاب سے کسقدر دوچار ہو رہا ہے اور قدم قدم پر جدید فلسفوں، نظریوں اور نظام ہائے عمل نے ترک و اختیار کی جو قیامت برپا ہے اسکا اندازہ کرنے کے لئے دُنیا کے نقشہ اور نقشہ کے ایک ایک خط پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے — !

وہ ہندوستان جس کی افلاس زدہ گلیوں اور خاک اُڑتی ہوئی سڑکوں پر "ایک خاکی ٹوپ" کی ہلکی سی جھلک انسانوں کی بھیڑ کو پھاڑ دیتی تھی اور "پولیس مین" کی سُرخ پگڑی دلوں کو لرزا دیتی تھی آج شہر یار سرمست کی طرح مست خرام ہے، ایک بڑی حد تک اس کی خودی نے ان تمام ذلتوں کو ٹھکرا دیا ہے جو غلامی کی نشانیاں تھیں، کبھی سیاست کا لفظ دلوں کو دہلا دیتا تھا مگر آج بہانگِ دہل ہندوستانی قومیت اور کامل آزادی کے حق کو پیش کیا جا رہا ہے —— !؟

یہ ہندوستانی "خودی" کا بلوغ ہے جسکا نشو و نما پیہم سیاسی جدوجہد اور عام سنساری تحریکات کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔

بہت دنوں تک مُلکی سیاسیات سرمایہ داروں اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کے افراد کا شغل رہے۔ لیکن اب سیاسی میدان آزاد دیوانوں کے ہاتھ ہے۔ عام معاشری زندگی میں نوابوں، رائے بہادروں، مہاجنوں، اور سرمایہ داروں کی سواریاں تختِ سلیمان کی طرح اُڑتی ہوئی ان ہی آنکھوں نے دیکھی تھیں، طاقت کی محدود طاقت سے انکار نہیں مگر یہی آنکھیں یہ تماشا بھی دیکھ رہی ہیں کہ سماج کا شعور اور انسانی دماغ کی بیداری آنکھ اُٹھا کر بھی کسی تختِ سلیماں کو نہیں دیکھتی، آج ہر نظر بجائے خود ملکۂ صبا بنی ہوئی ہے ——

اور ابھی ردِ عمل کا بچپن ہی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی جوانی کتنی قیامت خیز ہوگی، کیا انقلاب اور سماج کے شعور کی تیز رفتاری سے کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ قدرت ماضی کے گناہوں میں سے ایک گناہ کا بھی مواخذہ لئے بغیر قدیم سیہ کاروں کو زندہ چھوڑ دیگی۔!!

جدید گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے نیشنل کانگریس نے وزارتیں قبول کیں اور آج ہندوستان کے اہم صوبوں میں کانگریس یعنی نیشنل حکومت قائم ہو چکی ہے، چند ہی ماہ میں کانگریس نے عوام کے نقطۂ نگاہ سے صوبہ جاتی حکومتوں کا کاروبار کامیابی کے ساتھ چلا کر ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی قوم میں اپنے مُلک کے نظم و نسق کی کامل اہلیت پیدا ہو گئی ہے اور آج اگر حکومتِ برطانیہ ازراہِ کرم ہندوستان پر سے اپنا غاصبانہ قبضہ ہٹالے تو وہ تمام ملک کا انتظام بذاتِ خود کر سکتی ہے ہمارے شاعر نے خوب کہا ہے

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

کانگریسی وزرا کا جزو و کل تمام تر قومی رنگ میں رنگا ہوا ہے اور اس وقت تک جو کچھ وہ کر سکے ہیں، حکومتِ ہند کی تاریخ اسکا جواب دینے سے قاصر ہے، اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے کہنہ اور قدیم افرادِ عوام یا عوام کے مفاد سے ادنیٰ درجہ کا تعلق بھی نہیں رکھتے تھے۔

حکومت ہندوستان پر محض حکومت کر رہی تھی، اسی طرح یہ رجعت پسند
اور حکومت کے دوست ہر اُس طریقۂ عمل کی تائید کرتے تھے جو خود
حکومتِ ہند کے مفاد کے مطابق ہوتا تھا۔ ان کی معراج تو صرف یہ
تھی کہ یہ حکومت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے نظر آئیں۔ ان کے قلوب
غریبوں، مزدوروں اور فلاکت و نکبت کے درد سے یکسر خالی تھے۔
اور یہ جانتے تھے کہ کوئی ایسا انقلاب جو عوام کو بیدار کر دے۔ خود
ان کے زوال کا دیباچہ ثابت ہوگا چنانچہ ان سب شہنشاہیت کے
پجاریوں اور استبداد کے بندوں نے کوئی کسر ہندوستان کو تباہ
و برباد کرنے میں باقی نہیں رکھی۔ ہندوستان کی رگ رگ سے خون
چوس لینے میں جتنی مدد یہ انگریزوں کو دے سکتے تھے اس میں کمال
استبداد اور فیاضی کا مظاہرہ کیا گیا۔

چنانچہ جدید گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو میں ہندوستان کے ملک فروش
عناصر کے تعاون کا نتیجہ سمجھتا ہوں، جس کے نفاذ کے بعد یہ تمام حکومت پرست
خیال کئے ہوئے تھے کہ (پراونشل اٹانامی) پر عمل ہوتے ہی ہم صوبہ جاتی
حکومتوں پر قابض ہو جائیں گے۔ اور ان کا یہ خیال ایک حد تک بجا
بھی تھا کہ کانگریس وزارتیں قبول نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن عوام
کے متفقہ مطالبہ اور نزاکتِ وقت نے کانگریس کو وزارتیں قبول کرنے
کے لئے مجبور کر دیا، قبولِ وزارت کے بعد جو انقلاب ہوا اس کے منظر سے
رجعت پسند اور ملک و قوم کے دشمنوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں
ایک فلسفی نے پہلے ہی کہدیا تھا۔ ۵

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کیواسطے ہے کلاہ

تقریباً ساتوں صوبوں کی حکومتوں نے اسوقت تک عوام کے
مفاد اور ان کی مبادیات کا جسقدر خیال رکھ کر قدم اُٹھایا ہے وہ
قابلِ مبارکباد ہے، کسانوں کی حمایت اور ملک سے افلاس دُور
کرنے کے ممکن ذرائع کو عمل میں لانے کے امکانات پر جسقدر کام
ہو سکا ہے وہ بحالتِ موجودہ مطمئن کرنے والا ہے

لیکن جو رجعت پسند اور بے اصول لوگ کانگریس کے متعلق
یہ لغو اور غلط پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ اس نے کامل آزادی کی راہ
کو ترک کر دیا ہے اور ہندو آزادی نہیں چاہتے وہ حاسد ہیں اور
عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ ان کے لئے سیاسیات کے میدان میں کوئی
جگہ خالی نہیں ہے اسلئے انکا شوق خونمائی فسادانگیزی پر تیار کرتا ہے،
اور وہ عوام کو صوبہ جاتی نیشنل حکومتوں کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

برادرانِ وطن سے ہم کو غرض نہیں لیکن جو نام نہاد مسلم لیڈر
یہ حرکت کر رہے ہیں، وہ اسلام، ہندوستان، اور عوام کے شدید
دشمن ہیں، کانگریسی حکومتوں کا وقار، ہندوستانی قومیت کا وقار
ہے، کانگریس کا ڈسپلن کُل ہندوستان کا ڈسپلن ہے۔ اس ڈسپلن
کو جو باقی نہیں رکھے گا وہ مادرِ وطن کا ناخلف فرزند ہے۔

سات صوبوں میں کانگریس کا وزارتیں بنا لینا ہرگز یہ معنی نہیں
رکھتا کہ اس نے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" کو منظور کر لیا ہے،
کانگریس نے خود عوام کے متفقہ مطالبے پر اس نئے قانون کو محض اسلئے
منظور کیا ہے کہ جس حد تک اسکی رو سے عوام کی خدمت ہو سکے کیجائے
اور عوام کے قلوب میں جو خوف اجنبی حکومت کا قائم ہو گیا ہے۔
اسکو دور کر دیا جائے، یہ تمام حقائق روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں،
لیکن ترقی، آزادی، شرافت اور ملکی فلاح کے دشمن ایسے بے دماغ
اور سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ انقلاب کا اعتراف یا اعلان نہیں
کرتے، مگر وہ کب تک منکر رہیں گے ایک دن انقلاب خود ہی اپنی
زبان بن جائے گا۔

کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہ نئے آئین کو منظور نہیں کرتی اور فنا
کر دینا چاہتی ہے سورج کی طرح روشن ہے۔ سندھ۔ مدراس اور
بہار اسمبلی نے باقاعدہ نامنظوری کا ریزولیوشن پاس کیا ہے اور ایک
دستور ساز اسمبلی (کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی) کا مطالبہ بجائے خود جدید آئین
کے خلاف ایک اقدام ہے۔

موجودہ نیا آئین جو ہندوستانیوں کے سر تھوپا گیا ہے ہرگز ہندوستان

کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا' ہندوستان کے لئے قانون ایک ایسی اسمبلی بنا سکتی ہے جو جمیع ہندستانی قوم کی نمائندگی کرے اس دستور ساز اسمبلی کے متعلق کانگریس کی طرف سے مرکزی اسمبلی میں بھی رزیولیوشن پیش ہو گیا۔ اور جیسے جیسے فیڈریشن کے قیام کا زمانہ ہم سے قریب ہوتا جاتا ہے' کانگریس پوری طاقت سے حکومت کی مشینری میں شریک رہکر نئے آئین کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ جن سادہ دل حضرات کا یہہ خیال ہے کہ حکومت کانگریس کو فیڈریشن میں بہ خوشامد شریک کرنے میں کامیاب ہو جائے گی' وہ شدید فریب میں مبتلا ہیں۔ گو کانگریس فیڈریشن کے بنیادی اصول کے خلاف نہیں لیکن وہ اسوقت تک فیڈریشن میں شرکت نہیں کرے گی جب تک کہ اسکی اکثریت نہو۔ اور اس کی اکثریت اسوقت تک ممکن نہیں ہے جبوقت تک کہ والیان ریاست کی نمائندگی کم نکی جائے۔

فیڈریشن میں کانگریس کی شرکت کا اسوقت تک بظاہر کوئی امکان معلوم نہیں ہوتا جب تک کہ اسکی پوزیشن کے مطابق کوئی صورت حال نہ پیدا ہو جائے۔

جدید دستور میں رجعت پسند اور سرمایہ دار طبقوں کو خاص اہمیت دی گئی ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان پر برطانوی سامراج ہمیشہ مسلط رہے۔ فیڈریشن میں رائے عامہ کو شکست دینے کے لئے راجا مہاراجوں کو رکھا گیا ہے (اور فیڈرل اسمبلی کے علاوہ ایوان اعلیٰ (یعنی کونسل آف اسٹیٹ) میں سرمایہ داروں اور بڑے زمینداروں کو حق نمائندگی دیا گیا ہے۔

فیڈرل ایوانات (فیڈرل اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ) کا سانچہ ہی اس قانون کے واضع اور صناع نے اس کاریگری سے بنایا ہے کہ یہ ایوانات ہندوستان کی تمام رجعت پسند طاقتوں کا ایک حصین مضبوط بن کر رہ جائینگے۔ اس سے بدتر شان سرمایہ داری اور کیا ہو سکتی ہے کہ والیان ریاست کی فیڈریشن میں نمائندگی ہوگی اور غیر مشروط نمائندگی ہوگی یعنی یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ پہلے جمہوری نظام پر اپنی ریاستوں کا نظم و نسق مرتب کریں۔

بلکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں واضح کر دیا گیا ہے" کہ دیسی ریاستوں کے داخلہ کا کوئی اثر ان معاہدات پر نہیں پڑے گا جو شاہ برطانیہ اور ان کے مابین ہوئے ہیں اور نہ انکی داخلی فرماں روائی پر"

مختصر یہ ہے کہ موجودہ دستور وفاقی (فیڈرل آئین) برطانیہ کا کوئی انعام نہیں ہے' بلکہ اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ ایک قیدی کو حوالات میں بند رکھا جائے اور مطالبۂ رہائی پر حوالات سے تو نکال دیا جائے مگر پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر آزاد فضا میں چھوڑ دیا جائے۔ نام نہاد آئین جدید سے یہ خدشہ ہے کہ وطن پرستی کا جذبہ صوبجاتی عصبیت میں تبدیل نہ ہو جائے۔۔!؟

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی

صوبجاتی خود مختاری کو کوئی اہمیت اسلئے نہیں دی جا سکتی کہ اسکی ساری خود مختاریت گورنروں کے ایک اشارۂ چشم پر ختم ہو سکتی ہے' گورنروں کے اختیارات خصوصی نے صوبجاتی خود مختاری کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رکھی اور مرکز میں فیڈریشن اسلئے غلط و لغو ہے کہ یہ طرز آئین تو مساوی طاقتوں میں نافذ ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں ایک طرف برطانوی ہند کی جمہوری قوت ہے اور دوسری طرف مطلق العنان والیان ریاست کی طاقتیں ایسی دو متضاد دو مختلف طاقتوں کو ملا کر فیڈریشن قائم نہیں کیا جا سکتا۔

ان تمام آئینی گتھیوں کا حل صرف یہی ہو سکتا ہے کہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کا مطالبہ کیا جائے۔ مسٹر ستیہ مورتی نے جو دلیل کانگریس کے اس مطالبہ کے اہم ہونے کے متعلق دی ہے وہ مضبوط ترین دلیل ہے:۔

" یہ مطالبہ اُس جماعت (کانگریس) کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے جو اب غیر ذمہ دار ایجیٹیٹروں کی جماعت کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ہندوستان کے ۷ صوبوں میں حکومت کا نظم و نسق چلا رہی ہے"

کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے متعلق یہ کہنا کہ آئین کا فیصلہ بلا شرکت غیرے پارلیمنٹ کا کام ہے اس لئے فضول ہے کہ اس سے پہلے کئی برطانوی نو آبادیوں مثلاً آئرلینڈ اور افریقہ میں ایسا ہی عمل میں لایا جا چکا ہے۔

حکومت کا کام اس مطالبہ کی منظوری، دستور ساز اسمبلی کا کام قانون سازی، پارلیمنٹ کا کام اُس پر اپنی مہر ثبت کرنا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نمائندہ اسمبلی انقلاب یا کم از کم نیم انقلاب کی حالت میں طلب کی جا سکتی ہے۔ یعنی جب قوت و اختیار عوام کے ہاتھوں میں ہو اس وقت کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کا مطالبہ حق بجانب ہوتا ہے۔ فضا شناس نہیں ہیں۔

ایسے لوگوں کو مسٹر ستیہ مورتی نے جو مرکزی اسمبلی میں تجویز کے مجوز تھے بہت اچھا جواب دیا ہے۔

"لیکن دُنیا کی تاریخ کا آخری ورق ابھی لکھا نہیں گیا۔ جب تک مہاتما گاندھی موجود ہیں کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی طلب کی جائے گی اور پُرامن ذرائع سے اس مُلک کے باشندے اختیارات حاصل کرینگے"

کوئی شک نہیں، فیڈریشن آزادی اور جمہوریت کی آزاد روح کے خلاف سامراج اور شہنشاہیت پرستوں کی خوفناک سازش ہے اس سازش کو سمجھتے ہوئے جو ہندوستانی فیڈریشن کو کامیاب بنانے میں مدد دے وہ یا تو مقدس وطن کا دشمن ہے، یا قدرت نے اس کو عقل و ادراک سے عاری کر دیا ہے۔ میری رائے میں کبھی اور کسی شخص کو بھی اس معقول ترین مطالبہ کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے۔

ہندوستان سے باہر دُنیا میں جو انقلابات ہو رہے ہیں اُن سے بھی ہندوستان کا متاثر ہونا لازمی ہے، سنساری سیاسیات میں آمریت جس طرح نشوونما پا رہی ہے۔ اور اس کے نشوونما میں جسقدر انسانی خون جسقدر انسانی استخواں اور جسقدر گوشت و پوست صرف ہو رہا ہے وہ یورپ کی بڑھتی ہوئی خود غرضی، اور آمریت کا روپ بھر کر شہنشاہیت کے جذبۂ خواہش کی تکمیل کی روشن دلیل ہے۔ یہ صورتِ حال خود شہنشاہیت کے زوال کے اسباب پیدا کریگی، جمہوریت کی شکست پورے انسانی سماج کی شکست ہے جسے کبھی انسان برداشت نہیں کر سکے گا، آمریت کی طرف یورپ کا یہ شدید رجحان، آگ کے طوفان سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ یوروپ کی ہر قوم خود اپنے ہی آتشکدے میں بھسم ہو جائے۔

ادھر پچھلے سال روس نے اپنے نظامِ دستوری میں جو انقلاب کیا وہ روحِ جمہوریت کا آخری ممکن خاکہ ہے، گو اس کے جزئیات پر مفصل تبصرہ ممکن نہیں۔ لیکن یہ اندازہ بہ آسانی ہو جاتا ہے کہ روس نمائندہ حکومت کے بنیادی اصولوں کو سمجھ گیا ہے۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۳ء کے دستورِ اساسی کے مقابلہ میں نئے دستورِ اساسی میں ایک بنیادی تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں۔ روس میں ایک طبقے کی حکومت ایک قوم کی حکومت کا لباس بدل رہی ہے۔ یہ انقلاب یقیناً بالکل نیا اور حیرتناک انقلاب ہے کہ مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ کی جگہ محنت کرنیوالے عوام کی حکومت کا اعلان کر دیا گیا۔ روس کے اس نئے دستورِ اساسی میں ایک اہم اعلان افراد کی آزادی کا اعلان ہے، اس دستور کی رو سے سوویٹ روس اس منزل کی طرف قدم اُٹھائے گا جہاں غیر طبقاتی سماج رائج ہو گئی۔ مزدوروں اور کسانوں کے مساوی حقوق ہوں گے۔

فرد کے حقوق کو تسلیم کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ آمرانہ انقلاب کے بجائے احراری انقلاب کا ڈنکا بجے گا۔

روس کا یہ دستورِ جدید ہٹلر اور مسولینی کی ریڑھ کی ہڈی پر ایک ضربِ کاری ہے اس دستور نے شہنشاہیت پرستوں، اور انسانی جمہوریت کے دشمنوں کے ارادوں پر انسانی ذہن و دماغ کو ایک ایسے فکر کا موقع دیا ہے اسکا نتیجہ آمریت کے خلاف شدید بغاوت کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

روس نے اپنے سیاسی و معاشی فلسفۂ زندگی کو یوں واضح کر کے جرمنی اور اٹلی کے رستے ہوئے ناسور کو نمایاں کر کے دکھا دیا ہے، جس انسانی آزادی کے حقوق سے جرمنی اور اٹلی کے عوام محروم کر دیئے گئے ہیں۔ روس میں اس انسانی آزادی کی دولت کو آزادانہ لُٹا دیا گیا ہے۔

ہٹلر اور مسولینی انسانی ذہن و دماغ کے اس رجحان کا مقابلہ بارود

اور فولاد سے کرنا چاہتے ہیں۔ اسپین میں وہ جمہوریت کے باغیوں کو امداد دیکر
انسانیت کو پسپا کر دینا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حالات انہیں کی موافقت
کریں مگر دُنیا ان کے بنائے ہوئے نقشہ کو سمجھ گئی ہے اور یہ حقیقت اب
تصدیق کے درجہ سے بھی آگے بڑھ چکی ہے کہ اسپین کی بغاوت دستور پسندی
اور جمہوری حکومت کو تباہ کرنے کے لئے ایک فاسسٹ سازش ہے۔
اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہسپانوی خانہ جنگی محض فسطائیت اور اشتراکیت
کی لڑائی نہیں ہے بلکہ یہ آزادی اور استبداد کی جنگ ہے، ہر ہٹلر
ہزار کہیں کہ فرانکو اسپین کا باغی نہیں ہے، مگر دُنیا اُسے نہ صرف اسپین
بلکہ امنِ عالم کا باغی یقین کرتی ہے، اگر دُنیا کو پھر کسی جنگ عظیم کا مقابلہ کرنا
پڑا تو اسکا مرکز آغاز صرف یوروپ ہوگا۔

اسپین کے علاوہ چین اور جاپان کی جنگ دُنیا کے خرمن امن میں
کوئی معمولی چنگاری نہیں، جاپان کا اپنا مفاد خواہ اس جنگ میں کچھ بھی
ہو لیکن چین کی آزادی خطرہ میں ہے۔ اس ترقی یافتہ زمانے میں کسی
قوم کا کسی دوسری قوم کی آزادی پر حملہ کرنا عصر حاضر کے تمام تمدنی اخلاقی
اور ذہنی و دماغی ارتقا پر حملہ کرنا ہے۔

مسئلہ فلسطین جس کی اہمیت دُنیا کے تمام مسلمانوں کے نزدیک
اتنی ہی ہے جتنی حجاز اور مسئلہ خلافت کی تھی، آلک ایک عالمگیر بے چینی
کا سبب بنا ہوا ہے، پیل کمیشن کی رپورٹ شائع ہوتے ہی ہندوستان
نے تقسیم فلسطین کے خلاف شدید احتجاج شروع کر دیا تھا اور اب
اسپر عمل درآمد ہونے کے بعد سے تو ہندوستان میں نہایت پُرزور احتجاج
شروع ہوا ہے۔ اگر حکومت برطانیہ نے اپنے فیصلہ کو مسترد نہ کیا تو مسلمان
برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ، شاہی دربار کا مقاطعہ، اور سابقہ و
آئندہ جنگی قرضوں کی ادائیگی سے انکار کر دینگے، مجلس عمل نے پروگرام
مرتب کر لیا ہے اور عنقریب ہی ایک عام فلسطین کانفرنس کے انعقاد کے
بعد اس پر عمل درآمد کی پالیسی پر عمل کیا جائے گا۔ یہاں موقع نہیں ہے
کہ فلسطین کے تمام متعلقات پر بحث کی جائے، لیکن اتنا ضرور عرض
کر سکتا ہوں کہ تقسیم فلسطین کے ذریعہ عربوں کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا ہے،
جو بہترین حصہ ملک تھا وہ یہودیوں کو دیدیا گیا ہے اور جو بدترین حصہ
تھا وہ مسلمانوں کو عطا فرمایا گیا ہے۔ اور درمیانی حصہ جس میں بیت المقدس
واقع ہے وہ برطانیہ نے خود اپنی حکمرداری میں رکھا ہے۔
غازی اتاترک نے تقسیم فلسطین کے متعلق ٹرکی پارلیمنٹ میں زبردست
تقریر کی اور حکومت برطانیہ کو بتا دیا کہ ترک تقسیم فلسطین کو برداشت
نہیں کر سکتے۔ ترکی کے علاوہ بھی تمام عالم اسلامی میں اسوقت تقسیم
فلسطین کے متعلق شدید اظہار ناراضگی ہے۔

اس تمام عالمگیر اضطراب کی موجودگی میں جمعیۃ الاقوام جس
طرح چُپ ہے وہ موجودہ صدی کا عجیب وغریب راز ہے۔ اس راز میں
اضافہ کرنے والی یہ نئی مصدقہ اطلاع ہے کہ سر آغا خاں کو لیگ اسمبلی
کی صدارت تفویض کی گئی ہے جو دُنیا میں سامراج کے دست و بازو ہیں۔
آپ نے لیگ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہندوستان کے فلسفۂ امن پر
روشنی ڈالی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ لیگ کا بھی یہی مقصد ہے۔
لیگ اسمبلی اور سر آغا خاں کی صدارت، کوئی بے معنی بات نہیں ہے۔
غازی اتاترک کی تحریک اتحاد ایشیا کا تصور ایک حد تک معرض تشکیل
میں آچکا ہے اور میثاق ملی مرتب کیا جا چکا ہے۔ ایشیا کی اکثر سلطنتوں
کے علاوہ اس میں عراق بھی شریک ہو گیا ہے۔ سر آغا خاں کا مذہبی اثر
اگر تبت کی سرحدوں پر ہے تو عراق بھی اُس سے خالی نہیں۔ ایسے عالم میں
جب فلسطین کا مسئلہ تمام عالم اسلامی میں شدید ہیجان و اضطراب کا
باعث بنا ہوا ہے۔ ایک مسلمان کو لیگ اسمبلی کا صدر بنانا سارے
عالم اسلامی کے لئے متأثر کُن ہو سکتا ہے، لیکن یہ اعزاز مسلمانوں
کے لئے ______ کانٹوں کا تاج ہے۔ جمعیۃ الاقوام نے اسوقت تک
امنِ عالم ____ کے لئے کیا کیا ہے جو وہ آغا خاں کی صدارت میں تیر
ماریگی، اگر بین الاقوامی مسائل پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ ہو گئے اور
مسائل حاضرہ کا کوئی حل تلاش نہیں کیا گیا (جسکا یقین ہے)، تو دُنیا کی
نگاہوں میں مسلمانوں کی پوزیشن نہایت نازک ہو جائیگی

سر آغاخاں کو ہرگز حکومت برطانیہ کی ملوکیت پرستانہ اغراض کا آلۂ کار بنکر "دُز دانِ کفن" کی انجمن میں ہندوستان کے فلسفۂ امن کی علمبرداری کو رسوا کرنے کا حق نہیں۔ ہندوستان نے تو اپنے فلسفۂ امن پر عمل پیرا ہو کر اور اُس فلسفہ کو دُنیا میں پھیلا کر دکھا دیا۔ مگر لیگ اسوقت تک اپنے مقصد میں ناکام ہے، بلکہ سامراجی اور فیسسٹ طاقتوں کی نمائندگی کر کے اُس نے مجبور اور غریب قوموں پر دنیا تنگ کر دی۔

آج لیگ کہاں ہے جب جاپان نے غریب چینیوں پر زندگی تنگ کر دی ہے اور جنگ کا باقاعدہ اعلان کئے بغیر ہی چین پر چڑھ گیا ہے۔ کیا لیگ اُس بہری اور اندھی بڑھیا کی طرح نہیں ہے جو راستے سے گذرنے والے شور و غل کا اندازہ نہیں کر سکتی!؟ اگر ایسا ہے تو اس کے وجود سے اسکا عدم بہتر ہے، ہندوستان کے وہ مسلمان جو کچھ بھی سیاسی شعور رکھتے ہیں، سر آغاخاں کی صدارتِ لیگ اسمبلی کو مسرت اور پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

کانگریس اور مسلم لیگ کی رسہ کشی برابر جاری ہے، لیکن عقلمند حلقے اس رسہ کشی کو مسلم لیگ کی حماقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ حقیقت کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے کہ کانگریس مُلک کی سب سے عظیم اور واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہے۔ جس کے دروازے ہر قوم کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ کانگریس کے سیاسی اقتدار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے "ہندو مہا سبھا" جیسی کٹر اور فرقہ پرست جماعت کو میدان سے نکال باہر کیا۔ پھر اس کے مقابلے میں کوئی فرقہ پرست جماعت کیونکر کامیاب ہو سکتی ہے!؟

اسوقت تک خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن پنڈت جواہرلال کی تازہ تقریر نے اس امکان کو اصولی طور پر ناممکن ثابت کر دیا ہے۔

"مسلم لیگ جس کا وجود صرف چند صوبوں میں ہی نظر آتا ہے۔ اونچے درجہ کے گنے چنے مسلمانوں تک ہی محدود ہے اسکی پالیسی اور اسکا پروگرام کانگریس سے مختلف ہے ایسی حالت میں ان دونوں کے درمیان کیونکر اتحاد ہو سکتا ہے جب تک کہ کانگریس اپنے اصول کو ترک کر دے"۔

کوئی شک نہیں کہ محمد علی جناح کی ذات اسوقت "مسلم لیگ" ہے اگر وہ اور چند برطانیہ پرست علیحدہ ہو جائیں تو مسلم لیگ ختم ہے۔ ایسی جناب آسا جماعت کی شرکت ہرگز مسلمانوں کے حال و مستقبل کے لئے مفید نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے لئے واحد راستہ ایک ہی ہے کہ وہ ادائے فرض کی بنیاد پر قطعی غیر مشروط طور پر کانگریس میں شرکت کریں۔ ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ اور کانگریس کے علاوہ تیسری پارٹی نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔

جو لوگ سودا کرنا چاہتے اور "تحفظ حقوق" کی راگنی چھیڑے ہوئے ہیں وہ اسلام اور مسلمان دونوں کی روایات کی توہین کرتے ہیں، مسلمانوں کو بزدلی و بے اعتمادی کا زہر پلاتے ہیں، اور قوم کو فرقہ پرستی کی تعلیم دیکر ہندوستان میں برطانوی سامراج کی بنیادوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ مسلمان کے لئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن یقین کریں اسکے مفاد کو اپنی ذات کا مفاد سمجھیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ جو بیٹا ماں سے محبت کرے، ماں اسکو اپنی گود سے پھینک دے۔

"بندے ماترم"

کچھ دنوں سے ہندوستان کے قومی گیت "بندے ماترم" کا مسئلہ بعض سیاسی حلقوں میں ایک موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اینگلو انڈین اخبارات نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ گیت بابو بنکم چندر چٹرجی نے اپنی کتاب "آنند مٹھ" میں مسلم حکومت کے خلاف تصنیف کیا تھا۔ اور یہ ایک ہندو گیت ہے جسے مسلمانوں کو تسلیم نہ کرنا چاہئے۔

اس تشریح کی نوعیت ہی یہ بتا رہی ہے کہ اینگلو انڈین اخبارات کی نیت نیک نہیں اور وہ نہایت شاعرانہ مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں۔

ہندو اخبارات اس گیت کی مخالفت کو "ہندوستانی قومیت" کی مخالفت سے تعبیر کر رہے ہیں اور خود صدرِ کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو نے اسکے متعلق ایک بیان دیا ہے جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

اگرچہ اس گیت کو کانگریس کی رسمی منظوری حاصل نہیں ہے۔
لیکن چونکہ بہت دنوں سے "بندے ماترم" جدوجہد آزادی
اور برٹش امپریلزم کے خلاف ایجی ٹیشن کا ایک جزو بن گیا
ہی اسلئے دوسرے گیتوں کے ساتھ یہ عام جلسوں میں گایا جاتا
ہی۔ اس میں کوئی لفظ مذہب کے لئے قابلِ اعتراض نہیں ہے۔
ممکن ہے کوئی "الہامی گانا" آئندہ اس سے بہتر ہو جائے،
مگر سرِ دست اسکو ترک کرنے کا کوئی سبب نہیں ہے۔

یہ مسئلہ سیاسیات سے زیادہ ادبیات اور زبان سے تعلق رکھتا ہے اسلئے ملک کے ادبی و شاعر حلقے اسکا حل پیش کر سکتے ہیں۔ نہ کہ اینگلو انڈین یا دیسی اخبارات کیونکہ وہ "ہندوستان کے "قومی گیت" کے کلچرل، قومی اور لسانی عناصر و اجزا سے قدرتی و حیثیاتی طور پر نابلدِ محض ہیں۔

آیئے پہلے یہ گیت سُنئے:۔

"ماں تجھے ہم نمسکار کرتے ہیں۔"
"تیرے پانی کی ندیاں خوبصورت ہیں۔"
"تیرے پھل میٹھے ہیں۔"
"توجنوب کی طرف سے آنیوالی ٹھنڈی ہواؤں سے شیتل رہتی ہے۔"
"تو ہرے بھرے کھیتوں سے بھرپور ہی۔" "تیری چاندنی سفید اور حسین ہی"
"تیری راتیں کھلی ہوئی ہیں" "پھولوں سے لدے ہوئے اشجار تیری شوبھا کو بڑھا رہے ہیں"
"تیری مسکراہٹ میں مٹھاس ہی" "تیری آواز میں مادھری ہے"
"تو سکھ دیتی ہے" "تو ہماری رکھشا کرتی ہے"
"ہم تیس کروڑ آوازوں کو ایک آواز بنا کر تیری فتح کے گونجتے ہوئے نعرے بلند کرینگے"
"ہم ساٹھ کروڑ بازوؤں میں تلواریں لیکر تیری حفاظت کرینگے۔"
"تجھے کمزور کون کہتا ہی ماں" "تو عظیم طاقت کی مالک ہے"
"تو دشمنوں کی چھاونیوں کو مٹانے والی ہے"
"تو رکھشا کرنے والی ہے" "ہم تجھے نمسکار کرتے ہیں"

گیت کے ترجمہ سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ کوئی لفظ ہندوستان کی کسی قوم کیلئے مخصوص نہیں ہی۔ تمام گیت میں خالص جذبۂ حبِّ وطن کی روح کارفرما ہی۔ اسلئے اس گیت کو اینگلو انڈین اخبارات یا بعض مسلمانوں کا یہ کہنا کہ یہ فرقہ پرستی کا آئینہ دار ہی، جہل و ناواقفیت پر مبنی ہی، لیکن اس سے زیادہ اہم اعتراض یہ ہو سکتا ہی اور وہ یہ ہے کہ بنگالی زبان کا گیت تمام ہندوستانی قوم کا گیت کیونکر ہو سکتا ہی، قومی گیت کے گانے کا مقصد یہ ہی کہ وہ عوام میں مقدس وطن کیلئے جان نثاری، وفاداری اور محبت کا جذبہ پیدا کرے، لیکن جو قومی گیت پورے شمالی ہندوستان، پنجاب، سندھ، مدراس، سرحد اور اکثر ہندوستانی قوموں میں سمجھا نہ جا سکے اسکو کیونکر کامیاب و کارفرما تسلیم کیا جا سکتا ہے یہ بنگالی زبان کا گیت جس میں سنسکرت کے الفاظ بھی ہیں اسلئے ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسمیں چند سنسکرت کے لفظ ہیں۔ بلکہ اسپر اعتراض کی گنجائش اسلئے ہی کہ یہ سمجھا نہیں جاتا۔ یہ کہنا ظلم ہوگا کہ یہ شاعر کا نقص ہی، لوگ جانتے ہیں کہ تحریکِ تقسیمِ بنگالہ کے موقع پر اسکو استعمال کیا گیا مابعد نیشنل کانگریس میں گایا جانے لگا، اسکی وجہ غالباً اسکی مقبولیت میں پوشیدہ تھی یا اس حقیقت میں کہ بنگالیوں نے اوّل اوّل کانگریس سے اپنی نمایاں وابستگی کا ثبوت دیا۔

لیکن اب ہم سیاسی شعور کی اس منزل پر آ گئے ہیں کہ ہمکو ہندوستانی قومیت کی بنیادیں ایک ماہر معمار کی طرح رکھنی ہیں اور اپنی سیاسی جدوجہد کے سانچے کو پہلے سے زیادہ مکمل اور آئیڈیل بنانا ہی، کانگریس کی شاندار سیاسی کامیابی اور نمائندہ حیثیت کا تقاضہ ہی کہ ملکی مسائل سے تعلق رکھنے والی معمولی سی معمولی باتوں کا بھی خیال رکھا جائے، اور ہندوستانی قومی گیت کا مسئلہ تو کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہی، اسکو متحدہ قومیت، متحدہ زبان، اور متحدہ جذبۂ حب الوطنی کا نمائندہ ہونا چاہئے، اور "بنیادی ہندوستانی" میں لکھا جانا چاہئے۔

پہلے تو بنیادی طور پر یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہمیں ایک زبان تمام ملک کیلئے "بنیادی ہندوستانی" کے نام سے بنانی ہی اس زبان کو وضع کرنیکے بعد مروّجہ قومی گیت کی تبدیلی کے متعلق فیصلہ کرنا چاہئے، اور اس فیصلے کے بعد قومی گیت کا نظم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ کانگریس اور وطن سے محبت رکھنے والے شعراء کا فرض ہی کہ وہ باہمی تعاون کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کریں، تجرباتی طور پر مختلف قومی گیت نظم کئے جائیں لیکن انکے لئے زبان "بنیادی ہندوستانی" ہی ہونی چاہئے تاکہ یہ سوال ہی پیدا نہ ہو کہ اس میں سنسکرت یا فارسی کے الفاظ ہیں یا اسکا شاعر ہندو ہی یا مسلمان، اخبارات میں میں نے اس اپیل کو بغور پڑھا ہی جس میں مجھے "قومی گیت" کہنے کی دعوت دی گئی ہی کہ میں مادرِ وطن کے گیت گاؤں اور جاوداں ہو جاؤں!؟ میں سوچ رہا ہوں کہ اس فرض سے سبکدوش ہو کر سعادت دارین حاصل کروں،

۱۷۹

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ
ہر قسم کی کتابیں ملنے کا بہترین مرکز
بادۂ مشرق
ساغر نظامی
شعلۂ شبنم
از جوش ملیح آبادی
صبوحی
از ساغر نظامی
دورِ شباب
ساغر
فکر و نشاط
نقش و نگار

وجدان وکیف قومیت واسلامیت کی روح کارفرما ہے اور پیغمبر اسلام کے علاوہ رام چندر جی، کرشن جی، مہاتما گوتم بدھ اور اکثر اسلامی و ہندوستانی قائدین پر ایسی نظمیں اس کتاب میں پائی جاتی ہیں، جو اتحادِ اقوام کا سبب بننے کی طاقت رکھتی ہیں شباب، آزادی، مسرت اور زندگی کا ایک مواج سمندر بادۂ مشرق کے صفحات میں موجیں مارتا ہے، آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو اعتراف فرمائیں گے کہ ساغر نے اپنی اس کتاب سے ایشیا کی عظمت کو دوبالا کر دیا ہے "بادۂ مشرق" اردو شاعری میں عقیدہ، زبان، خیال اور اپنے پیغام کے لحاظ سے اولین کتاب ہے۔

قیمت مجلد ۵؍ علاوہ محصول۔

سرودِ شباب

جوانی کے موضوع پر اردو شاعری میں سب سے عجیب اور جدید کتاب ہے۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں شبابیات کے عنوان سے ساغر نظامی کی ۴۷ رباعیاں شایع ہوئی تھیں، اب گیارہ برس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن سرودِ شباب کے نام سے کافی ترمیم کے بعد شایع کیا گیا ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ اپنی نئی ترتیب کی بنا پر یہ بجائے خود ایک نئی تصنیف ہے۔ شبابیات میں محض شاعر اپنے شباب کا مغنی تھا لیکن گیارہ برس میں شعور نے سینکڑوں منزلیں طے کیں اور وہ اس منزل پر آ پہونچا جہاں خودفریبی، خودنگری، خودپرستی، بیخودی اور خودستائی حسن کی مداحی میں تبدیل ہو جاتی ہے، چنانچہ پہلے حصہ میں شاعر اپنے جوانی کے گیت پوری سرمستی سے گاتا ہے اور دوسرے حصہ میں حسن کا نغمہ گر ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کتاب "بادۂ مشرق" سائز پر چھاپی گئی ہے اور ہر رباعی کی تصویر پس منظر (Back graund) میں دی گئی ہے، اس التزام نے کتاب کو جوانی کا طلسم زار بنا دیا ہے۔ کاغذ نہایت اعلیٰ اور کتابت اعلیٰ ترین ہے، چھپائی میں "ساغر پریس" نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ جلدبندی کے بجائے کتاب کو ریشمین فیتہ سے باندھا گیا ہے، ٹائٹل رنگین، بلاک اور آرٹ کا بہترین نمونہ۔

قیمت عہ؍ علاوہ محصول۔

دیگر انشاپردازوں کے شاہکار

امام الہند علامہ ابوالکلام آزاد

خونِ شہادت کے دو قطرے

یہ مختصر رسالہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے عالم جوانی کا شاہکار ہے جو منصور و سرمد کے پُرجوش د

مستند حالات پر مشتمل ہے، اول تو موضوع ہی اپنی جگہ بہت پُرجوش ہے اس پر مولانا آزاد کی پُرجوش ادبیت پڑھتے پڑھتے انسان جھوم جاتا ہے۔ قیمت صرف ۲؍

مولوی عبدالباری آسی

تذکرۂ خندۂ گل

کون ہے جو مولوی عبدالباری آسی الدنی کی ذات سے نہ واقف ہو، آپ ہندوستان کے مشہور ادیب ہیں، یہ تذکرہ آپ ہی کی کاوش ترتیب کا نتیجہ ہے، جو اردو و فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات و منتخب کلام پر مشتمل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تذکرہ اردو زبان میں سب سے پہلی اور نئی چیز ہے، شیدایانِ ادب کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے قیمت للعہ؍ علاوہ محصول

سید مقبول احمد بی اے

"فلسفۂ مذہب"

سید مقبول احمد صاحب کی یہ کتاب مذہب اور اس کے متعلقات پر غیر ملاّیانہ نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہے اس کتاب میں مذہب اور اخلاق کی تشریح جدید اور ارتقائی نقطۂ نگاہ سے کی گئی ہے۔ ہر معاملہ کو عقلی طور پر سمجھایا گیا ہے، مطالعہ کے قابل کتاب ہے اور بہت فلسفیانہ طور پر تحریر کی گئی ہے

قیمت عہ؍ علاوہ محصول

حاجی عبدالمجید صاحب کاتبؔ

"خریطۂ نعت"

یہ ردیف وار نعتیہ دیوان ہے۔ جو مولانا کاتبؔ کی تصنیف ہے۔ اس مختصر دیوان کو پڑھ کر محبتِ رسولؐ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اسے خریدنا چاہئے، چیدہ نعتیہ کلام کا یہ بہترین مجموعہ ہے۔ قیمت مع محصول ۸؍

مولانا نیاز فتحپوری مدیر نگار

"ایک شاعر کا انجام"

حضرت نیاز فتحپوری ہندوستان کی ان ہنگامہ خیز ہستیوں میں سے ہیں، جن کی ہستی اردو ادب کی جان ہے۔ یہ مختصر افسانہ ان کے عہدِ شباب کا شاہکار ہے اور اس قدر بلند چیز ہے کہ اب وہ خود بھی چاہیں تو ایسی معرکۃ الآرا کہانی نہیں لکھ سکتے، لفظ لفظ میں حرارتِ شباب پائی جاتی ہے قیمت ۱۰؍ علاوہ محصول۔

فراست الید

یہ مختصر کتاب بھی علامہ نیازی کے دماغ و قلم کا نتیجہ ہے جو علم سمدرک (Palmistry) پر مشتمل ہے جسے ہات اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر ایک انسان کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل پر حکم لگانے کے علم کو کہتے ہیں۔ اس علم کے متعلق یہ مختصر سی

کتاب مکمل معلومات رکھتی ہے (Palmistry) سے ذوق رکھنے
والوں کیلئے یہ ایک بہترین کتاب ہے - قیمت علاوہ محصول - عمر

مذاکراتِ نیاز

یہ حضرت نیاز کی ڈائری ہے - یہ ان ادبی و
تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۷ء و
۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں نگار میں شایع ہوئے تھے - اور جنکو ملک نے بیحد
پسند کیا تھا - یہ مضامین حضرت نیاز کی ارتقائی انشاء کے شاہکار ہیں -
جا بجا طنزیات کی گہری مگر مہذب چاشنی پائی جاتی ہے جو حضرت نیاز کی انشا
پردازی کی خصوصیت ہے، حجم ۱۶۸ صفحات، قیمت عمر

جذباتِ بھاشا

اس کتاب میں ہندی دوہوں کو جمع کیا گیا
ہے اور ہندی شاعری پر تنقید کی گئی ہے -
اور خوب خوب دادِ سخن دی ہے - شروع میں خلیقی صاحب دہلوی کا دیباچہ ہے
اردو زبان کیلئے بہت ضروری کتاب ہے اور اس کو لکھکر مولانا نیاز نے اپنی ہندی دانی
کا پورا پورا ثبوت دیا ہے - قیمت ۱۲ علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

یہ بھی چند افسانوں کا مجموعہ ہے جس
میں پیروں اور مولویوں کی عشرہ
برانداز کردینے والی حرکات کا ذکر ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ آج سوسائٹی میں سب
سے زیادہ گرہ مخلوق صرف مولوی اور پیر ہے، بہت دلچسپ کتاب ہے - ہر شخص
کو دیکھنی چاہئے - قیمت علاوہ محصول ۵

مادئین کا مذہب

یہ انگریزی سے ترجمہ ہے جس میں "چند
گھنٹے حکمائے قدیم کی روحوں کے ساتھ" کے
عنوان سے ایک اسلوب بدیع کے ذریعہ ہیئتِ اجتماعی کے نقائص اور ضرورتِ
انقلاب پر دلچسپ تبصرہ ہے، بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے -
قیمت علاوہ محصول عمر

جمالستان

یہ نگارستان کے بعد حضرت مولانا نیاز کے افسانوں
کا دوسرا ضخیم مجموعہ ہے جو تقریباً پانچسو صفحات پر
مشتمل ہے - ہر افسانہ پڑھنے کے قابل ہے، ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے
نیاز کا جو درجہ ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر ادیب و ہر ادب پرست
کو جمالستان کا مطالعہ بمنزلہ فرض ہے - اس کے مطالعہ سے ہر شخص کو معلوم
ہوجاتا ہے کہ نیاز اردو کا اسٹونین ہے - قیمت للعہ علاوہ محصول -

ترغیباتِ جنسی

یہ بھی حضرت نیاز کی معرکۃ الآرا تالیف ہے
جسمیں تاریخی، علمی اور نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے انسان
کے میلان جنسی پر ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے
اس موضوع پر اردو میں اس سے قبل کوئی کتاب نہیں دیکھی گئی ہے
فحاشی کی تعریف کے بعد فحاشی کی ابتدا اور اس کے اسباب سے بحث کیگئی
ہے اور اس کے بعد پہلے باب میں "شادی" کے عنوان سے اس کے متعلقات
سے بحث ہے، اس کے علاوہ مختلف اقوام کے رسم و رواج کو تحریر کیا گیا ہے
دوسرے باب میں "طلاق و خلع" کے ماتحت قدیم روم، قدیم ویلز، قدیم چین،
قدیم جاپان وغیرہ میں طلاق و خلع کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کے تمام بڑے ممالک
کے حالیہ طرز طلاق و خلع کو دکھایا گیا ہے اس کے بعد کتاب مندرجہ ذیل ابواب
میں تقسیم ہے اور ہر عنوانِ باب کے ماتحت مختلف ضمنی عنوانات ہیں -
مذہبی فحاشیاں - فحاشی پر عمومی تبصرہ - استلذاذ بالمثل - عورتیں اور
استلذاذ بالمثل - استلذاذ بالمثل - استلذاذ بالوحوش - استلذاذ بالنفس - فحاشی
عہد قدیم میں - فحاشی قرون وسطیٰ میں - عہد جدید اور فحاشی - اخلاق جنسی -
ان تمام عنوانات کے ماتحت معلومات کی ایک دنیا ہے اس موضوع
پر آپ اس کتاب سے بہتر سارے اردو ادب میں نہیں دیکھ سکتے -
قیمت علاوہ محصول ہے ۸ غیر مجلد ہے -

سید فرید جعفری مچھلی شہری
"دلکی رانی"

سید فرید جعفری ملک کے ان نوجوان
گر پختہ کار ادیبوں میں سے ہیں جن
کی کتابیں چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ ختم
ہوجاتی ہیں "دل کی کہانی ایک ہریجن
کی زبانی" ان ہی کی تصنیف ہے جس میں ایک ہریجن کی بپتا بیان کیگئی
ہے، جو بہت دردناک ہے، زبان لطیف اور آسان ہے -
قیمت ۸ علاوہ محصول -

محبت کے پھول

یہ ایشیا کے شاعر اعظم ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور
کے مشہور و مقبول ڈرامہ "رڈ اینڈ سن"
کا آزاد ترجمہ ہے اور فرید صاحب ہی نے اسکو ترجمہ کیا ہے - جس کا تعارف
شوکت علی صاحب فہمی نے لکھا ہے اور تقریظ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب
کے قلم سے ہے - ٹیگور نے اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کی حریص ذہنیت

پر روشنی ڈالی ہے

ادر ٹیگور نے اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کی ان خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ جنھیں عرف عام میں سرمایہ کی سرمستیاں اور مزدور طبقہ کی سرفروشیاں اور فاقہ مستیاں کہا جاتا ہے وہ اس ڈرامہ میں موجودہ تہذیب کو نہایت بھڑکیلی بنا کر پیش کرتا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۸ر

ابوالفضل راز چاندپوری
دنیائے راز

ہندوستان کے کہنہ مشق ادیب اور روشن خیال شاعر حضرت مولانا ابوالفضل راز چاندپوری کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کا مقدمہ مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر بی۔ اے نے لکھا ہے۔ ساری کتاب سات ابواب میں تقسیم اور ۸۴ نظموں پر مشتمل ہے اور اس کی ہر نظم بتاتی ہے کہ راز جدید عہد کا بہترین نمائندہ ہے۔ کتاب نقائص ومعائب سے پاک ہے اور نکھری ہوئی لطیف شاعری کو پیش کرتی ہے۔ ہر شاعر اور شعر وسخن کے دلدادہ کو یہ مجموعہ ضرور دیکھنا چاہئے۔ قیمت ۱/ علاوہ محصول

بشیر ملیح آبادی
حضرت جوش ملیح آبادی کے والد کا دیوان
کلام بشیر

ملک کے مشہور ومعروف شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کے والد کا کلام "کلام بشیر" کے نام سے شائع ہوچکا ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت فی جلد ۸ر علاوہ محصول۔

تہذیب عمل

عملی زندگی کی اصلاح کے لئے چند مفید مقالات کا مجموعہ یہ اخلاقی کتاب ہے۔ بچوں اور طلبا کیلئے بے حد مفید ہے اس کے مطالعہ سے انسان کے اخلاق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، ہر فہیم باپ کو اپنے بچوں کے لئے یہ کتاب ضرور منگانی چاہئے۔ قیمت ۶ر علاوہ محصول

مرزا جعفر علیخاں اثر بی اے
اثرستان

ہندوستان کے مشہور اور مستند شاعر و ادیب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی اے ڈپٹی کلکٹر کا دیوان غزلیات۔ شروع میں نواب صاحب کی تصویر بھی شامل کتاب ہے۔ اثر صاحب کی شاعرانہ پوزیشن اسقدر اہم ہے کہ ہر شخص ان کے

کلام کو استفادہ کے طور پر دیکھتا ہے لیکن ان کے کلام میں ایک خاص رس اور جذبات کی گہری چاشنی اس درجہ پائی جاتی ہے کہ دل ہر شعر پہ بے چین اور مست ہوجاتا ہے۔ شعر وادب کے دلدادگان کو یہ دیوان اپنے پاس ضرور رکھنا چاہئے۔ حجم ۱۵۰ صفحات۔ قیمت عہ علاوہ محصول

باسط بسوانی
شاہد معنیٰ

جناب ماسٹر باسط بسوانی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے قاضی ظہیر الدین احمد صاحب بسوانی نے مرتب کیا ہے دیکھنے اور پڑھنے کے قابل ہے قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ علاوہ محصول۔

حضرت شوکت تھانوی
طوفان تبسم

شوکت صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے شوکت صاحب مزاح نگاروں کی اولین صف کے ادیب ہیں۔ ان کے مزاح میں ایک لطیف شوخی اور مذاق پایا جاتا ہے، زبان آسان اور سادہ ہے۔ دوسرے صفحہ سے ہی مذاق شروع ہوجاتا ہے "اپنی بیوی کے نام" آپ نے اپنے طوفان تبسم کو منسوب کیا ہے، اس کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کا دیباچہ ہے۔ پھر مضامین شروع ہوتے ہیں، ہر مضمون بجائے خود ایک کشت زعفران ہے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑجاتے ہیں، شوکت کا طوفان تبسم زندگی کے تمام غم اپنی رو میں بہالیجاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے جو غیر فانی مسرت حاصل ہوتی ہے اس کے لحاظ سے عہ قیمت بہت ہی کم ہے۔ (علاوہ محصول)

محمود الرحمن ندوی
دولت غزنویہ

مولوی محمود الرحمن صاحب ندوی کی تاریخی تالیف ہے۔ جس میں تاریخی تحقیق۔ و تدقیق کے بعد غازی سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے ولولہ انگیز مجاہدانہ دینی اور علمی کارنامے دکھائے گئے ہیں اور ان تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ جو اسلام کے دشمنوں نے تاریخ میں پیدا کردی ہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ غزنوی خاندان کے متعلق یہ مکمل تاریخ ہے۔ ہر مسلمان کیلئے اس کا مطالعہ ضروری ہے

حکیم یوسف حسن
پرواز خیال

حکیم یوسف حسن صاحب مدیر اعلیٰ "نیرنگ خیال" لاہور کے چار مختصر ڈراموں اور تین مکالموں کا مجموعہ ہے۔ نہایت خوبصورت اور نفیس طبع ہوا ہے۔ پروفیسر تاثیر ایم۔ اے کے

کے قلم سے دیباچہ ہے۔ یہ ڈرامے اور مکالمے بے حد دلچسپ ہیں زبان نہایت آسان اور دلچسپ ہے۔ ہلکی سی چاشنی مزاح کی پائی جاتی ہے قیمت صرف ۵ر علاوہ محصول

لالہ رُخ

ل احمد اکبرآبادی

طامس مور کی مشہور مثنوی ہے اور انگریزی ادب میں اعلیٰ پایہ کی تصنیف خیال کی جاتی ہے ملک کے مشہور ادیب لطیف الدین احمد اکبرآبادی نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے' ترجمہ بہ حیثیت ترجمہ بہت ہی بلند ہوا۔ اور اس کا درجہ بھی اردو میں وہی ہے جو طامس مور کی مشہور مثنوی کا ہے۔ لطیف الدین احمد صاحب اکبرآبادی کو جو مہارت ترجمہ میں حاصل ہے، وہ ہندوستان کے کم ادیبوں کو میسر ہے' "لالہ رُخ" نے اردو ادب کی آغوش کو بہت بڑی دولتِ ادب سے معمور کیا۔ زبان اس درجہ بلند اور شیریں ہے کہ پڑھتے پڑھتے انسان جھوم جاتا ہے۔ مور کی شاعری کی زبان کا ساتھ دیتی ہے' آپ اس کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

ماہ و پرویں

میر ولی اللہ

میر ولی اللہ کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے

میر ولی اللہ بی اے ایبٹ آباد (پنجاب) کے مشہور ادیب ہیں اور مزاحیہ مضامین لکھنے میں ان کو مہارت تامہ حاصل ہے، کتاب آٹھ مضامین پر مشتمل ہے۔ اور ہر مضمون بجائے خود پڑھنے اور لطف لینے کے قابل ہے۔

قیمت ۱۲ر علاوہ محصول۔

گناہ کی راتیں

ایم۔ اسلم

ایم۔ اسلم۔ صاحب رئیس لاہور کے اخلاقی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ایم اسلم صاحب پنجاب کے نہایت پختہ کار ادیبوں میں سے ہیں اور لاتعداد کتابوں کے مصنف ہیں۔ کتاب میں سات افسانے ہیں اور ہر افسانہ عبرت وہیبت کا آئینہ ہے۔ نوجوانوں کے لئے اس کے صفحات میں تعلیم اخلاق کے خزانے ہیں۔ اور مہذب انسانوں کیلئے مشعلِ ہدایت کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ بھی ضرور دیکھئے، زبان لطیف اور دلچسپ ہے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

سرگذشت اسیر

وکٹر ہیوگو (سعادت حسن مترجم)

وکٹر ہیوگو کی مشہور تصنیف The Last days of the candemned کا کامیاب ترجمہ ہے جس میں تنسیخ سزائے موت کے معاشری اسباب' سے بحث کی گئی ہے۔ وکٹر کی یہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے' سعادت حسن صاحب منٹو نے اس کا ترجمہ کرکے اردو ادب پر احسان کیا ہے۔ شروع میں مترجم کا ایک دیباچہ ہے۔ جس میں کتاب اور صاحب کتاب کی ذات اور اسباب تحریر کا ذکر ہے' مترجم کے دیباچہ کے بعد مصنف یعنی خود وکٹر ہیوگو کا دیباچہ ہے اور اس کے بعد اصل کتاب ہے۔ موجودہ دور انقلاب میں اس کتاب کا مطالعہ لازمی امر ہے۔ اس لئے ہر شخص کو اپنی لائبریری میں سرگذشتِ اسیر کو ضرور جگہ دینی چاہئے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

موجودہ لندن کے اسرار

نورالٰہی و محمد عمر

نورالٰہی محمد عمر صاحب کی شاندار تصنیف ہے۔ جس میں فلسفۂ جرائم پر نظر ڈالی گئی ہے کتاب میں جا بجا حیرت انگیز مقامات آتے ہیں اور لندن کی پُراسرار زندگی کے مناظر' انسان کے دماغ و دل کو حیرت میں ڈالدیتے ہیں۔ بہت دلچسپ اور حیرت ناک ہے۔ قیمت صرف عہ ر

سیر المصنفین

سید محمد یحییٰ تنہا بی اے۔

اردو نثر نگاروں کا مکمل تذکرہ' ادب اردو میں اپنے موضوع پر سب سے اولین اور بہتر کتاب ہے' سعید' دلچسپ اور لبریز معلومات' اردو ادب کے شیدائیوں کیلئے ایک قیمتی اور بہترین تحفہ کوئی کتب خانہ ہمارے خیال سے اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ ادبی تنقید و تاریخ کی دنیا میں یہ شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ قیمت جلد اول عاؔ جلد دوم ہے ر علاوہ محصول۔

۵

تاریخ امریکہ

حجم ۷۰۲ صفحات کاغذ بہترین اور طباعت وغیرہ خوب ہے' اردو زبان میں نہایت نادر تاریخی کتاب ہے' امریکہ کے جتنے متعلقات ہیں ان سب کا ذکر اور تاریخی و سیاسی لحاظ سے اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کا تصور امریکہ کا نام لیتے ہی انسان کو ہو سکتا ہے قیمت عاؔ علاوہ محصول

"ترانہ"

مرزا یاس عظیم آبادی

ہندوستان کے مشہور شاعر مرزا یاس یگانہ چنگیزی عظیم آبادی کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ شروع میں یاس صاحب

کا دلچسپ دیباچہ ہے، اس کے بعد رباعیاں ہیں ہر رباعی بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے جسمیں حقائق و معارف اور طنزیات کے دریا بھرے ہوئے ہیں اور واقعی رباعیات کا یہ مجموعہ اس قدر دلچسپ ہے کہ ہر صاحبِ ذوق کو اسے دیکھنا چاہئے ۔قیمت ۸/عہ علاوہ محصول ۔

فرانسیسی افسانے

فرانسیسی ادب کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو اس مختصر سی کتاب کو ضرور دیکھئے قیمت صرف ۴/

شیطان کی خالہ

یہ بھی ایک بے حد دلچسپ ناول ہے ضرور دیکھئے قیمت ۱۲/

بیروزگاری کا علاج

آجکل سب سے زیادہ عظیم مسئلہ روزگار کا ہے ۔ ہر شخص تلاشِ معاش میں سرگرداں نظر آتا ہے، اس کتاب کے ۱۲۸ صفحات ضرور ایک پریشانِ معاش کو شاہراہ معاش دکھا سکتے ہیں، اگر اس میں جرأتِ مردانہ و قوتِ ارادی کی روح موجود ہے ۔ قیمت صرف آٹھ آنے ۸/

تاریخ مغربی یورپ

ڈاکٹر رابن سن کی کتاب History of Western Europe کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ، نہایت سبق آموز ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یورپ کے سیاسی اور معاشری معاملات سمجھ میں آجاتے ہیں ۔قیمت ۸/ع علاوہ محصول

٦

خیالات اورنگ

امریکہ کے مشہور مصنف "واشنگٹن ارونگ" کے چند مضامین کا ترجمہ ادب کے فدا کاروں اور انشا پردازوں کے لئے بہترین تحفہ ہے ۔ فن کتاب نویسی، لٹریچر میں انقلاب اور ایک شادی کا دلفریب انجام، یہ مضامین دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں ۔قیمت صرف ۸/ آنے

تاریخ ادب اردو

ہسٹری آف اردو لٹریچر، مصنفہ رام بابو سکسینہ کا اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے لکھنوی نے کیا ہے ——— سنہری اور مضبوط جلد تقریباً سب ہی اہل تذکرہ کے فوٹو ۔ اچھی کتاب ہے قیمت صرف للعہ/

محاسن کلام غالب

مرزا غالب کی شاعری پر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا قابل قدر اور معرکتہ الآرا تبصرہ ۔قیمت عہ/

مقدمہ شعر و شاعری

خواجہ حالی مرحوم کی مشہور و معروف تصنیف، اردو شاعری پر مفصل و مبسوط تنقید، تمام اصناف سخن کی مثالیں اور جدید راہوں پر روشنی قیمت باختلاف طباعت ۸/عہ عہ ۸/ع

ایشیائی شاعری

ایشیا کے مختلف زبانوں کی شاعری خاص کر اردو شاعری پر مفید معلومات کا ذخیرہ از مولانا اشہدی ۔ قیمت عہ/

تذکرہ شعراء اردو

مشہور استادِ سخن حضرت میر حسن مصنف مثنوی "سحر البیان" کا مرتبہ تذکرہ مع مقدمہ نواب صدر الصدور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی ۔ قیمت مجلد ۱۲/عہ

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر

فارسی زبان کے جو اثرات مرہٹی قواعد، اسالیبِ بیان وغیرہ پر پڑے ...... مولوی صاحب نے لکھے ہیں ۔ قیمت صرف ۸/

آب حیات

اردو شاعری کا دلچسپ افسانہ اور اساتذہ اردو کا دلکش تذکرہ از مولانا محمد حسین آزاد مرحوم قیمت سے/

شعر الہند

قدمائے دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات، تمام اصنافِ شاعری، یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقیدی نظر ۔ شعراء کا تذکرہ و نمونۂ کلام ہر دو حصص عہ

شعر العجم

علامہ شبلی مرحوم کی شہرۂ آفاق اور معرکتہ الآرا تصنیف فارسی شاعری کی مکمل تاریخ عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی و خصوصیات و اسلوب پر تبصرہ، تمام مشہور و معروف اساتذہ سخن کے تذکرے اور نمونۂ کلام ۔ قیمت حصہ اول ۸/ع دوم ۸/ع سوم ع/ چہارم ۸/ع پنجم ع/ ۔ مکمل سیٹ کی قیمت غـ۵/

داستان عجم

یہ کتاب اصل میں ایران کے مشہور قومی شاعر فردوسی کی شہرۂ آفاق کتاب شاہنامہ کی تاریخ ہے، فاضل مصنف نے شاہنامے کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اس کتاب کا فارسی اور دوسری زبانوں کے لٹریچر پر کیا اثر پڑا۔ کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ نواب خیال مرحوم کی لکھی ہوئی ہے۔ قیمت عہ

سخنوران ایران

ایران کی مردم خیز زمین کو شاعری اور ادب میں خاص امتیاز حاصل ہے مگر پہلے وہاں کی شاعری صرف قصیدہ و غزل تک محدود تھی اور اب جب سے وہاں کی سیاسیات میں انقلاب ہوا ہے۔ شاعری کے زمین و آسمان بھی بدل گئے۔ نثر نگاروں نے بھی اپنا طرز بدلا اور صاف اور سادہ اسلوب کو ترجیح دی۔ اس میں عصر کے ایرانی شعراء کے حالات ہیں اور ان کے کلام کا نمونہ اور ہر شاعر کا فوٹو بھی ہے۔ زبان آج کل ہی کی فارسی ہے کتاب ٹائپ میں خاص اہتمام سے اعلیٰ پیمانہ پر چھپی ہے۔ قیمت ۱۸

نگارستان فارس

رودگی سے نورالعین واقف بٹالوی تک مشاہیر فارسی شعراء کا تذکرہ اور ان کا منتخب کلام۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ از مولانا آزاد مرحوم قیمت سے

محمود اور فردوسی

سلطان محمود غزنوی پر جو اعتراضات عموماً کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سلطان نے فردوسی شاعر کے ساتھ وعدہ خلافی کی۔ جناب قاضی عبدالصمد صاحب نے اس کی تردید میں لکھی ہے اور معقول عقلی و نقلی دلائل سے اسے بے بنیاد ثابت کیا ہے، اپنے نتائج تحقیق کی اشاعت سے پہلے فاضل مولف نے انھیں ملک کے مستند ماہرین کو دکھا لیا ہے۔ قیمت ۸ر

نکات غالب

مرزا غالب مرحوم کی آپ بیتی بہت سے ادبی رموز و نکات زبان خود انہی کے قلم جوہر رقم سے قیمت عہ

اقبال

ڈاکٹر سر اقبال کی شاعری پر مبسوط تبصرہ اور سوانح از احمد دین صاحب۔ قیمت ۶ر

اردو سے ہندوؤں کا تعلق

مولانا شرر مرحوم کا ایک جامع و مفید رسالہ قیمت صرف ۴ر

اکبر الہ آبادی

نامور ظریف و اصلاحی شاعر اکبر الہ آبادی کی شاعری اور ان کی زندگی پر مکمل تبصرہ و سوانح اور کلام کا انتخاب نہایت وقیع کتاب۔ بڑا سائز۔ تقریباً پانچسو صفحے۔ طباعت وغیرہ عمدہ مجلد مضبوط۔ قیمت صرف صہ

ٹیگور اور انکی شاعری

از مخدوم محی الدین بی اے عثمانیہ اس کتاب میں ٹیگور کے سوانح حیات اور ان کے کلام پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں ان کے حالات اور ان کے ادبی کارناموں پر مقبولیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت عہ

بہترین غزل گو

مشہور ادیب حضرت امیر بدایونی کا وہ مضمون جو الناظر کے انعامی ... مقابلے میں لکھا گیا ہے۔ قیمت ۴ر

جدید اردو شاعری

اردو شاعری میں جو انقلاب رونما ہوا اس کی پوری تفصیل اور اس پر تبصرہ از عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے قیمت سے

حقیقت علمی شاعری

از نصیر الدین حسین بیرسٹر ایٹ لا عجیب و غریب مثنوی میں شاعر نے شاعری کی حقیقت۔ مختلف ملکوں میں اس کے اثرات و نتائج۔ مختلف قوموں کی شاعری کی خصوصیات دکھائی ہیں۔
پھر تفصیل کے ساتھ اردو شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ مثنوی کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف کی نظر اردو شعرا کے کلام و خصوصیات پر کتنی عمیق ہے۔ قیمت عہ

ناٹک ساگر

ڈرامہ کے مشہور و مستند نقاد محمد عمر نور الٰہی صاحبان کی بہترین تصنیف جس میں ہندوستان اور ایران کے جدید و قدیم ڈرامے پر سیر حاصل اور کار آمد بحث ہے۔ قیمت عہ

مقالات شبلی

پچھلے دور کے جلیل القدر ادیب و فاضل علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے مذہبی، ادبی، تعلیمی تنقیدی اور تاریخی مقالات و مضامین کا قابل قدر مجموعہ جدید ترتیب اور نہایت خوش اسلوبی سے ان کے فاضل تلامذہ نے الگ الگ جلدوں میں شایع کیا ہے

جلد اوّل مذہبی عہ ۔ دوم ادبی ۱۲ر سوم تعلیمی عہ ر چہارم تنقیدی عہ ر ۔ پنجم حصہ اوّل تاریخی عہ ر

رسائل شبلی

علامہ شبلی مرحوم کے چند مبسوط مقالات جو علیحدہ علیحدہ رسالوں کی صورت میں چھپے تھے یکجا شائع کر دیے گئے ہیں قیمت عہ

زیب النسار مولانا شبلی مرحوم کا تاریخی مقالہ ۱ر

جہانگیر " " " " ۲ر

اسلامی حکومت " " " " ۲ر

اسلامی مدارس " " " " ۴ر

اسلامی کتب خانے " " " " ۴ر

مضامین شرر

مولانا شرر مرحوم کے تقریباً جملہ مضامین جو بہت منتشر تھے بڑی محنت سے موضوع کے اعتبار سے الگ الگ جلدوں اور حصّوں میں شایع ہوئے ہیں۔

جلد اول شاعرانہ و عاشقانہ حصہ اوّل ۸ر ۔ دوم ۸ر سوم عہ ر

جلد دوم تاریخی و جغرافی ۔ حصہ اول ۸ر دوم عہ ر سوم عہ ر

جلد سوم سیر و سوانح حصہ اول ۸ر دوم عہ ر سوم عہ ر

جلد چہارم ادب و تحقیق مسائل عہ

جلد پنجم اصلاح قوم و ملت قیمت عہ ر

جلد ششم متفرق تاریخی واقعات عہ

جلد ہفتم نظمیں، ڈرامے اور مختلف مضامین

انگلستان کی عورتیں

مولانا شرر مرحوم کا وہ لیکچر جو سفر انگلستان کی واپسی پر ہوا (۳۰) برس پہلے کی انگلستان کی عورتوں کی جیتی جاگتی تصویر

قیمت صرف ۲ر

انتخاب مخزن

سر شیخ عبد القادر بالقابہ کے مشہور و مقتدر اور زبان و ادب اردو کے نامور خادم رسالہ "مخزن" کے گرانقدر اور منتخب مضامین کا مجموعہ۔ قیمت حصہ اول عہ ر ۔ دوم عہ ر سوم ۶ر

مضامین چکبست

مشہور ادیب پنڈت برج نرائن چکبست انجہانی کے مختلف ادبی، علمی مضامین کا مجموعہ دلکش ۔ قیمت ۓ ر

سی پارہ دل

خواجہ حسن نظامی کے دلکش مضامین کا مجموعہ قیمت ۶ر

افادات مہدی

نامور انشا پرداز و جواں مرگ ادیب ایم مہدی حسن مرحوم المعروف بہ افادی الاقتصادی کے بہترین مقالات کا مجموعہ ۔ قیمت صرف ۓ ر

پطرس کے مضامین

مشہور و بلند پایہ مزاحیہ نگار مسٹر اے ایس بخاری ڈائرکٹر دہلی براڈکاسٹنگ کے نہایت دلکش و دلچسپ مضامین کا مجموعہ ۔ طباعت اعلیٰ قیمت عا

مضامین فرحت

مشہور و معروف مزاحیہ نگار اور فاضل ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی سشن جج گلبرگہ (دکن) کے مختلف علمی، ادبی مضامین کا مجموعہ حصہ اول ۸ر ۔ دوم ۸ر سوم ۸ر چہارم ۸ر

دہلی کا یادگار مشاعرہ

مشہور ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سشن جج گلبرگہ کا مشہور و مقبول مقالہ جو موصوف نے ۱۲۶۱ھ کے یادگار مشاعرہ کا حال اس طرح لکھا ہے کہ اس زمانے کی تہذیب و معاشرت کی ہو بہو تصویر آنکھوں میں سما جاتی ہے۔ انداز بیان از حد دلچسپ ۔ شعرائے شریک مشاعرہ کی قلمی تصویریں اور ان کے کلام کا انتخاب قیمت صرف ۱۲ر

زرِ گل

مشہور محقق و ادیب قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے ادبی مقالات کا مجموعہ۔

قیمت صرف ۸ر

مترجمات

مشہور فاضل و ادیب قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی کے علمی و ادبی مقالات کا قابلقدر مجموعہ جو عربی و انگریزی وغیرہ سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف ۸ر

مخزنِ ادب

اردو کے پرانے پرانے ادیبوں مثلاً سر شیخ عبدالقادر، سید سجاد حیدر، سر اقبال، میر نیرنگ وغیرہم کے قابلِ قدر مفید و کارآمد نثر و نظم مضامین کا مجموعہ متوسط سائز (۲۶۴) صفحے طباعت وغیرہ پاکیزہ۔ قیمت مجلد صرف ؎

لیلےٰ کے خطوط

از مشہور فاضل ادیب قاضی عبدالغفار صاحب زبان و ادب کے اعتبار سے یہ خطوط اردو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں جو ایک طوائف کی طرف سے اس کے عاشق کو لکھے گئے ہیں رومانس اور افسانویت سے لبریز۔ قیمت عہ

ادبستان

کہنہ مشق ادیب جناب خلیقی دہلوی کے دلکش اور بے شمار ادبی لطافتوں سے زرخیز نہایت دلچسپ مضامین کا حسین و جمیل مرقع۔ شروع میں اختر شیرانی صاحب کا مقدمہ خوبصورت سنہری جلد طباعت وغیرہ اعلیٰ۔ قیمت صرف ۶؎

انشائے لطیف

مشہور و صاحبِ طرز ادیب و انشاپرداز مسٹر لطیف الدین احمد کے (۱۵) منتخب افسانے پونے تین سو صفحے قابلِ دید کتاب ہے۔ قیمت ۶؎

نغماتِ موت

محترمہ حجاب بیگم امتیاز علی تاج کے قابلِ قدر رشحاتِ قلم۔ قیمت صرف ۶ر

۱۰

روحِ تہذیب

یہ مقالہ ۱۹۳۲ء میں جناب خواجہ غلام السیدین صاحب نے اردو اکادمی کے جلسہ میں پڑھا تھا۔ اس میں نہایت دل آویز طریقے سے تہذیب کے حقیقی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں ایک فرضی خواب کے نام سے ہماری موجودہ تہذیب پر تنقید کی گئی ہے۔ دوسرے میں تہذیب کے متعلق اصولی بحث اور اس کی تعریف کی ہے۔ خواجہ صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے اس مبحث پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے قلم میں شگفتگی، زبان میں روانی ہے طرزِ بیان میں سہل سے سہل تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

قیمت ۸ر

میدانِ عمل

منشی پریم چند صاحب کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے یہ منشی صاحب کے پچھلے تمام کارناموں پر بھاری ہے۔ اس میں ملک کی موجودہ بیدار و بے چین روح کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ اور دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے۔ بیحد دلچسپ۔ اور نتیجہ خیز ناول (۵۰۰ صفحے) کتابت اعلیٰ۔ کاغذ نفیس۔ روشن طباعت۔ خوبصورت اور مضبوط جلد۔ دیدہ زیب مصور ڈسٹ کور۔ اور قیمت صرف ۶؎

تائیس

شہرۂ آفاق فرانسیسی ادیب اناطول فرانس کے زندۂ جاوید ناول کا بے نظیر ترجمہ۔ ملک کے مایۂ ناز ادیب و مترجم مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے (علیگ) دہلوی مدظلہ کے ترجمے کا یہ ایک بہترین نمونہ ہے۔ اصل ناول کی اہمیت و ترجمے کے محاسن دونوں لحاظ سے یہ کتاب پڑھنے، استفادہ ادبی کرنے اور رکھنے کے لائق ہے۔ ۴۸۰ صفحے مجلد

قیمت صرف ۶؎

نجم السحر

مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے، دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن نے رائیڈر ہیگرڈ کی کتاب "مارننگ اسٹار" کا ترجمہ کیا ہے۔ مصر قدیم یعنی فراعنۂ مصر کے زمانے کی ہوبہو تصویریں اس کمال سے پیش کی گئی ہیں کہ ایک ایک بات آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اصل مصنف و مترجم دونوں کی حیثیت غیر معمولی ہے۔

قیمت صرف ۶؎

سلامبو

اردو کے مشہور مترجم مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی مدظلہ نے حال ہی میں۔ فلابئر کا بیش بہا رومان ترجمہ کیا ہے۔ قدیم قرطاجنہ کی سچی تصویریں اور عشق و رومان کی دردانگیز داستانیں۔ سائز متوسط۔ قیمت صرف ؎

گوشۂ عافیت

دیہاتی بھائیوں کی کشمکش اور دیسی حکام کے مظالم کی دردناک داستان اور ان کے دور کرنے کے وسائل پر منشی پریم چند صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں یہ ناول لکھا ہے

قیمت ہر دو حصص ۱۲ ؎

نرملا

ایک عمر رسیدہ بزرگ کی دوسری شادی کی ناکامیاں اور گھر کی تباہیاں بہت عبرتناک ناول از منشی پریم چند۔ قیمت ۸ر

فردوسِ خیال — منشی پریم چند کی جادو بیانی وسحر نگاری کا مرقع۔ قیمت ۸؍

چوگانِ ہستی — فطرت نگار منشی پریم چند کا لاجواب ناول منشی صاحب کی قادر الکلامی اور جذبات نگاری کا اعلیٰ نمونہ۔ دو حصے (۴۹۶ + ۵۱۰) صفحے مجلد قیمت ۱۲؍

پردۂ مجاز — مشہور افسانہ وناول نگار منشی پریم چند کا ایک دلچسپ ناول۔ مختلف طبائع کے زیر اثر محبت کیسی کیسی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ قیمت ۶؍

نجات — منشی پریم چند کا ناول (۱۰۲) صفحے۔ قیمت ۸؍

الفانسو — مولانا شررؔ مرحوم کا ایک سچا تاریخی ناول۔ قیمت ۱۲؍

بابک خرمی — عہد عباسیہ کا تاریخی ناول قیمت ۸؍

حسن انجلینا — روس وشام کی لڑائی کا تاریخی ناول۔ از مولانا شررؔ مرحوم نہایت دلچسپ۔ قیمت صرف ۶؍

زوالِ بغداد — بغداد کی تباہی کا تاریخی درد انگیز ناول۔ قیمت ۸؍

شوقین ملکہ — صلیبی جنگوں کے ہیبت ناک واقعات ناول کے پیرایہ میں۔ از مولانا شررؔ مرحوم۔ قیمت ۸؍

عزیز مصر — مولانا شررؔ مرحوم کا ایک تاریخی ناول۔ عہد بنی طولون کا ایک دلچسپ بیان۔ قیمت ۸؍

رُومۃ الکبریٰ — قدیم سلطنت روم کے حالات قیمت ۸؍

فلورا فلورنڈا — مولانا مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں ہسپانیہ کے عہد خلافت کے حالات بصورت ناول لکھے ہیں قیمت ۸؍

مفتوح فاتح — فرانس میں عربوں کا داخلہ قیمت ۸؍

فلپانا — مولانا شررؔ مرحوم کا تاریخی ناول۔ ارض طرابلس پر صحابۂ کرام کے حملے قیمت ۸؍

فردوسِ بریں — اسمٰعیلیوں، باطنیوں کے حیرت ناک و محیر العقول واقعات، دلچسپ ترین ناول یہ مولانا نے صرف ایک شب میں لکھا تھا۔ قیمت ۸

لعبت چین — عہد صحابہ کرام کا ایک تاریخی ناول۔ فتوحات ماوراء النہر کے حالات۔ از مولانا شررؔ مرحوم۔ قیمت ۸؍

ملک العزیز ورجنا — شیر دل رچرڈ اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی معرکہ آرائیاں، میدان جنگ کے نظارے اور زنان کے چٹخارے، سچی تاریخی حکایتیں، عشق ومحبت کی گھاتیں۔ بہت دلچسپ۔ قیمت ۱۰؍ ۔ ۸؍

منصور موہنا — ہندوستان میں اسلامی سلطنت۔ فتح سندھ کے بعد قائم ہوئی۔ اس زمانے کے حالات بطرز ناول نہایت دلچسپ اور ولولہ انگیز۔ از مولانا شررؔ مرحوم۔ قیمت ۱۰؍ و ۸؍ و ۸؍

مینا بازار — عہد شاہجہاں کا ایک تاریخی ناول۔ از مولانا شررؔ مرحوم۔ قیمت ۸؍

فتح اندلس — پانچویں صدی عیسوی میں جبکہ مسیحیت رومیوں کا قومی مذہب بن رہی تھی۔ رومیوں کی معاشرت اور ان کی تمدنی حالت پر ایک دلچسپ تاریخی ناول۔ از مولانا شررؔ یہ ناول کئی بار چھپ چکا ہے۔ قیمت ۸؍

ماہ ملک — مولانا شررؔ مرحوم نے دولت غوریہ کے عروج اور کارنامے، ان کی معاشرت کے علاوہ شہزادی ماہ ملک کے سچے حالات اس ناول میں درج کئے ہیں۔ قیمت ۶؍

یوسف ونجمہ — جگ بیتی نہیں آپ بیتی۔ قیمت ۸؍

11

ملکۂ زنوبیہ
عربی نژاد ایک حسین شہزادی کے رومانی حالات
قیمت ۳ر

شیریں ملکۂ عجم
فرہاد کی معشوقہ کے حالات۔
قیمت ۴ر

افسانۂ قیس
عاشق لیلےٰ (مجنون عامری) کے حالات
قیمت ۳ر

دربارِ حرامپور
ہندوستانی رئیسوں کی عیش پرستیوں کے
عبرتناک و پُراسرار نمونے از مولانا شرر مرحوم
قیمت حصہ ۱ و ۲ ۱۰ر

توبۃ النصوح
اخلاق و تہذیب کا معلّم مرحوم کا مشہور ناول
قیمت عہ ر

مراۃ العروس
خانہ داری وغیرہ معاشرتی امور کا اُستاد
مرحوم کا مشہور ناول۔ قیمت عہ ر

آفتابِ دمشق
عہد صدیقی و فاروقی کے کارنامے
اسلام اور نصرانیت کے معرکے اور ایک
ٹریجڈی معاشقہ از مولانا راشد الخیری مرحوم۔ قیمت عہ ر و عہ ر

امین کا دم واپسیں
ہارون الرشید مشہور خلیفۂ
عباسی کے فرزند امین کے دردناک
قتل کا واقعہ۔ از مولانا راشد الخیری مرحوم۔ قیمت ۴ر

۱۲

اندلس کی شہزادی
مسلمانانِ اندلس کس طرح معراجِ ترقی
پر پہونچے اور پھر اپنے اعمال کی بدولت
فنا ہوئے۔ از مولانا راشد الخیری مرحوم۔ قیمت ۸ر

صبحِ زندگی
مولانا راشد الخیری مرحوم کا مقبول و مشہور ناول
قیمت عہ

شامِ زندگی
مولانا راشد الخیری کے مشہور ناول صبح زندگی
کا دوسرا حصّہ، شادی سے مرنے تک کے واقعات
قیمت عہ

شبِ زندگی
مولانا مرحوم کے سلسلۂ زندگی کے ناولوں میں سے
بہت دلچسپ حصہ اول و دوم قیمت عہ

نوحۂ زندگی
مولانا راشد الخیری مرحوم کا ایک بے حد دردناک ناول
بیواؤں کے عقدِ ثانی پر۔ قیمت ۱۲ر

منازل السائرہ
مولانا راشد الخیری مرحوم کا ایک غیر معمولی ناول
مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش کا بہترین نمونہ
یونیورسٹیوں میں اکثر جگہ داخل نصاب ہے۔ قیمت عہ

وداعِ خاتون
مولانا راشد الخیری مرحوم کا نوشتہ ایک اصلاحی
افسانہ۔ لڑکی سسرال والوں کے دل کس طرح
ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ قیمت ۶ر

حجاج بن یوسف
مصر کے مشہور عربی ناول نگار جرجی
زیدان کے تاریخی ناول کا ترجمہ۔
خلیفہ عبدالملک کی طرف سے حجاج کا مکہ پہونچ کر حضرت عبداللہ بن زبیر سے
مقابلہ کرنا۔ مکہ کا محاصرہ اس زمانہ کا طریقِ جنگ و معاشرت اور ضمناً ایک افسانہ
محبت۔ ترجمہ مولوی ظہور احمد وحشی
قیمت عہ

عبدالرحمٰن ناصر
جرجی زیدان کے ایک ناول کا ترجمہ۔
خلیفہ عبدالرحمٰن کے واقعات کا دلچسپ مرقع
قیمت صرف عہ ر

محبّت
رُوس کے شہرۂ آفاق فیلسوف مصلح ادیب کونٹ ٹالسٹائی
کی ایک بہت اچھی اخلاقی کہانی کا ترجمہ۔ جناب مولوی عبدالرزاق صاحب
ملیح آبادی نے کیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۵۰ صفحے۔ قیمت ۴ر

ابن سراج
ابو عبداللہ آخری شاہ غرناطہ کے پوتے کی
دل ہلا دینے والی داستانِ عشق۔ قیمت ۸ر

راسپوٹین
ولی کے روپ میں شیطان جس نے سلطنتِ
روس تباہ کر ڈالی۔ زار و زارینا کے بیرکی سیاہ
کاریوں کی داستان۔ قیمت ۸ر

مہدی
بال کین کے شہرۂ آفاق ناول "دی وہائٹ پرافٹ" کا ترجمہ
از ایم اسلم۔ سرزمینِ مصر کی ایک نہایت لطیف داستان۔ مصری اور
برطانوی سیاست، مصریوں کی حب الوطنی، وبے چارگی وغیرہ دلگداز افسانہ
طباعت نفیس، بہت سی رنگین و یک رنگ تصویریں، خوبصورت مصوّر و رنگین جلد، بڑا سائز
۴۰۰ صفحے۔ قیمت سے ر

سیب کا درخت

مشہور فرنگی ادیب گالز وری کے بہترین ناول کا بہترین ترجمہ - جس پر مصنف نوبل پرائز بہت غیر معمولی انعام کا مستحق ٹھہرا - ملک کے مایۂ ناز ادیب جناب قاضی عبد الغفار صاحب مدیر "پیام" کی پاکیزہ زبان - لوچدار عشق و رومان کا مرقع - قیمت ۱۳ر

گناہ کی بیٹی

ایک بنگالی ناول کا کامیاب ترجمہ حسن و عشق کی کہانی - معرفت کے بیش بہا نکتے - قیمت ۸ر

انجامِ ہوس

ایک لڑکے کی دردناک کہانی اسی کی زبانی جس میں ایک شریف لڑکے کی بری صحبت اور اس کی بداعمالیوں کا نتیجہ - موثر انداز میں لکھا گیا ہے قیمت ۱۰ر

شراب عیش

طوائف سے شادی کر کے اسے بہو بیٹیوں میں ملا کر بٹھانے کے نتائج اور ایک بڈھی نائکہ کے نہایت دلچسپ اور سبق آموز حالات - قیمت ۱۰ر

احمق الذی

منشی سجاد حسین مرحوم کا ایک مزاحیہ شاہکار کاغذ خراب قیمت ۸ر

امراؤ جان ادا

مرزا محمد ہادی رسوا - ایم - اے مرحوم کا مشہور ناول - نہایت خراب کاغذ - قیمت مقابلتہً بہت زیادہ یعنی ۸عہ

اسرار بالشویزم

وسط ایشیا کی سیاسی حالت اور وہاں کے سیاسی عقائد ایک دلچسپ ناول کے پیرایہ میں - قیمت ۸ر

دخترِ فرعون

مصر و ایران کے تمدن و معاشرت و تہذیب و شائستگی کا ہو بہو فوٹو اور اس کی رفعت و عروج کا بیان - مصر و ایران کی پرانی تاریخ و آثار قدیمہ سے دلچسپی پیدا کرنے کے علاوہ خود اپنے ملک ہند کی پرانی چیزوں سے خاص لگاؤ پیدا کرنے والی بہت عمدہ کتاب - مشہور جرمن ماہر علوم مصریہ کی تصنیف کا سلیس ترجمہ از جناب لطافت حسین خانصاحب - قیمت ہر دو حصص صرف للعہ

بلیک شرٹ

"بروس کریم" کے ایک معرکتہ الآرا انگریزی ناول کا ترجمہ - یورپ و امریکہ میں کوئی ناول اتنا مقبول نہیں ہوا - اسکی اشاعت پر یورپی ممالک میں تہلکہ مچگیا - ۲۸۱ صفحے - قیمت صرف عہ

نرگس جمال

بلجیم کے مشہور ڈرامہ نویس مارس میٹرلنگ کے ڈرامے "جائزن" کا ترجمہ از مسٹر شاہد احمد بی اے ایڈیٹر "ساقی" ...... قیمت عہ

نوجوان درتھر کی داستان غم

جرمنی کے مشہور فلسفی گوئٹے کے ایک شاہکار کا ترجمہ - شروع میں فاضل مترجم کی طرف سے ایک مفصل دیباچہ جسمیں اس شاعر حکیم کے حالات زندگی، اس کی نفسیات قصہ و افرادِ قصہ پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے - قیمت ۸ر مجلد ۸عہ

کارنامجات آرسین لوپن

مشہور مصنف "مارس لیبلانک" کی ایک عجیب و غریب کتاب کا ترجمہ - سراغرساں آرسین لوپن کے نو حیرت انگیز کارنامے قیمت ۸عہ

گردش آفاق

رینالڈس کے نام سے اردو دنیا اچھی طرح واقف ہے - اس کے اکثر ناول اردو میں منتقل ہو چکے ہیں - تاہم اس کے کئی اچھے اچھے ناولوں کا ابھی ترجمہ نہیں ہوا تھا - گردش آفاق انہی میں سے ایک ہے - یہ ایک شوقیہ افسانہ ہے اور بہت کامیاب ترجمہ بھی بہت صاف اور سلیس ہے - قیمت حصہ اول ۸عہ حصہ دوم ۸عہ حصہ سوم ۸عہ

معاشقہ نپولین

ایک فرانسیسی مصنف کا لکھا ہوا تاریخی ناول جس کا ہیرو شہنشاہ نپولین اعظم ہے ایک دلچسپ حیرت انگیز افسانۂ محبت اس سے معلوم ہوگا - کہ نپولین جیسے ہستی کی نجی زندگی کیسی تاریک و رکیک تھی - طباعت وغیرہ عمدہ - متعدد فوٹو مجلد قیمت عہ

پیرس کے اسرار

جرائم و اسرار اور حسن و عشق کی ایک ہوش ربا داستان جسکا محل وقوع فرانس کا دارالسلطنت پیرس ہے - طباعت عمدہ ٹائٹل پر حسن و معصومیت کی ایک دلفریب تصویر - قیمت صرف ۸ر

وادی خوف

سر آرتھر کانن ڈائل کے ایک ناول کا ترجمہ سرلک ہومز کے ہوش ربا کارنامے - مترجمہ

محمد نصیر صاحب عثمانی استاذ جامعہ عثمانیہ۔ طبع دوم قیمت ۱۲؍

نیلی چھتری مشہور و معروف جاسوسی ناول نگار مسٹر ظفر عمر کا مقبول جاسوسی ناول حیرت انگیز خفیہ کارنامے قیمت عہ؍

چوروں کا کلب ظفر عمر صاحب کا اسی سلسلہ کا دوسرا ناول۔ قیمت ۹؍

بہرام کی گرفتاری ظفر صاحب کا اسی سلسلہ کا تیسرا ناول قیمت عہ؍

بہرام کی رہائی بہرام کی گرفتاری کا دوسرا حصہ جو مشہور فاضل ادیب مرزا ہادی رسوا مرحوم نے پورا کیا۔ قیمت ۱۲؍

رنج و راحت ظفر عمر صاحب کے صاحبزادے مسٹر آفتاب عمر بی اے کا نوشتہ نہایت دلچسپ ناول۔ زندگی کی مختلف کیفیات کا عبرتناک خاکہ۔ قیمت صرف عہ؍

اپاسنا کے تار بنگالی زبان کے مشہور ناول شانتی کا عکس لطیف۔ اور اس میں سحر کارانہ اضافہ حسین و جمیل اور مصور ٹائٹل ۲۷۴ صفحے۔ اور قیمت ۱۲؍

سادھنا کے تار یہ ایک مظلوم دیوی کے حسرتناک زندگی کے نشیب و فراز کی تفسیر اور قربانی کی مکمل تصویر ہے۔ یہ بنگال کے مشہور ناول "مایا" کا عکس لطیف ہے اور منشی گوری لال اختر نے اس میں سحر کارانہ اضافہ کیا ہے۔ قیمت ۱۲؍

کیمیاگر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) کے مختلف افسانوں کا دلکش مجموعہ۔ طباعت وغیرہ خوبصورت۔ یہ افسانے اعلیٰ اور ستھرے مذاق کے طبقے میں عموماً پسند کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ؍

فسانۂ جوش مشہور و مقتدر ادیب جناب سلطان حیدر صاحب جوش کے منتخب افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت صرف عہ؍

جوشِ فکر حضرت سلطان حیدر صاحب جوش کے افسانوں کا تازہ دوسرا مجموعہ۔ قیمت ۱۲؍

تلاشِ راز حضرت نیاز فتحپوری کا نوشتہ۔ ایک رومان خیز ہندوستانی افسانۂ محبت۔ قیمت ۶؍

شہاب کی سرگذشت حضرت نیاز فتحپوری کا نوشتہ ایک دلچسپ اور رومان خیز افسانہ نیاز کی خصوصیات انشا کا دلآویز مرقع۔ قیمت عہ؍

لیلیٰ مجنوں مشہور ادیب سید سجاد حیدر یلدرم کا نوشتہ بہت دلچسپ افسانہ۔ قیمت ۴؍

پرانا خواب اور دوسرے افسانے مشہور ادیب سید سجاد حیدر یلدرم کے دلفریب افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ۱۲؍

پرانا خواب حضرت یلدرم کا بیحد دلچسپ افسانہ۔ قیمت ۱۰؍

آسیب الفت عشق و محبت کے عنصر کو آسیب اور مردوں کی روحوں کے تخیل سے ملا دیا گیا ہے۔ نہایت دلچسپ افسانہ ہے۔ قیمت ۱۲

نیرنگیٔ تقدیر نذر سجاد حیدر صاحبہ کا یہ ایک معاشرتی افسانہ ہے۔ اس میں نوجوانوں پر مغرب کے برے اثرات بتانِ فرنگ کی طوطا چشمی اور ان کے مقابلے میں مشرقی بیوی کی وفاشعاری اور شوہر پرستی اور اسی قبیل کے اکثر معاشرتی مسائل پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت ۴

اصنامِ خیالی جلیل احمد قدوائی کے افسانوں کا مجموعہ ہے مغربی افسانہ نگاروں کے بعض چیدہ افسانوں کے تراجم .... قیمت ۶؍

سیر گل جناب جلیل قدوائی کے افسانوں کا مجموعہ جس میں چیخوف اور موپاسان کے افسانوں کے تراجم بھی شامل ہیں .... قیمت ۱۲؍

خاک پر دانہ منشی پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ۔ نہایت دل آویز پیرایہ میں لکھا ہے۔ قیمت عہ؍

غبن
سفید پوشوں کے مالی ترددات اور ترغیبات کا خاکہ۔ رسم و رواج کی بیہودہ پابندیوں کا خطرناک انجام۔ منشی پریم چند صاحب نے نہایت دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں۔
قیمت ہر دو حصص ۶

بیگناہ مجرم
مہاشہ سدرشن جی مشہور افسانہ نگار کا ایک نہایت پاکیزہ مذاق کا اخلاقی مجلسی ناول۔
قیمت صرف عہ

صبح وطن
جناب سدرشن کے ۱۲ قومی ملکی سبق آموز اور دلچسپ کہانیوں کا بے نظیر مجموعہ۔
قیمت عہ

پتھر سی ہیرا
محبت کی ایک نگاہ، ایک انسان کی زندگی میں کیسے کیسے انقلاب پیدا کرسکتی ہے اور خونخوار وحشی درندوں کو کس آسانی سے رام کرسکتی ہے۔ یہ سچا افسانہ بتائیگا۔ کہ دنیائے انسانی میں ایک عورت کی سچی ہمدردی اور محبت بھری گفتگو کیا کچھ جادو کرسکتی ہے۔ یہ قصہ یقین دلائیگا۔ کہ بچوں کی صحیح تربیت کا طریقہ کیا ہے۔ ایسا دلچسپ اور دلآویز ہے کہ ختم کئے بغیر نہیں چھوٹے گا۔ یہ ادبی رنگینیوں کا بھی بس ہیرا ہے اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کے قلم کا ایک اچھا نمونہ ہے۔
قیمت صرف ۱۴

دامن باغباں
مشہور ادیب اور صحافت نگار جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی کے منتخب اصلاحی افسانوں کا نہایت قابل قدر مجموعہ۔ ہر افسانہ ایک مستقل پیام ہے۔ اور ہر لحاظ سے کامیاب۔ طباعت وغیرہ عمدہ و نفیس۔ قیمت صرف عہ

پرواز خیال
یہ نہایت دلچسپ۔ تین مکالموں اور چار مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ جو رسالۂ نیرنگ خیال میں پہلی بار شایع ہوئے اور بہت پسند کئے گئے۔ اردو میں نادر قسم کا تحفہ۔ طباعت وغیرہ عمدہ۔ قیمت صرف ۵

حجاب زندگی
سید عابد علی صاحب بی۔ اے کے افسانوں کا مجموعہ طباعت عمدہ۔
قیمت ۱۲

داستان غدر
۱۸۵۷ء پر ایک دلچسپ اور پُر معلومات اور عبرت ناک کتاب۔ از جناب ظہیر دہلوی
قیمت ۶

عورت کا دل
یہ بنگال کے مشہور افسانہ نگار بابو ہیمندر کمار رائے کے ایک بہترین قصہ کا ترجمہ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ عورت اپنے محبوب کے لئے کیسے کیسے ایثار کرسکتی ہے۔ اور اس کا دل کیسی سخت سے سخت مصیبتیں برداشت کرتا ہے۔ ترجمہ بہت کامیاب اور شگفتہ
قیمت عہ

بڑی بی
چار مزیدار پُرلطف اور اخلاق آموز کہانیاں۔
قیمت ۱۲

ناظمہ کی آپ بیتی
ایک شریف زادی کی عبرت ناک سچی آپ بیتی دوشیزگی ازدواجی اور ایکٹرس کے تین عبرت ناک جوڑے۔ قیمت ۶

نصیحت کا کرن پھول
ایک سچا اور پُرتاثیر اصلاحی افسانہ از مولانا آزاد مرحوم
قیمت ۸

آفتاب زندگی
مرزا عظیم بیگ چغتائی کا لکھا ہوا عورتوں کی اصلاح۔ تہذیب و اخلاق کے لئے ایک نہایت دلچسپ قصہ۔ قیمت ۹

سدا بہار پھول
مہاشہ سدرشن کی لکھی ہوئی دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں۔ قیمت ۱۲

ناٹک کتھا
خالص ہندوستانی رومان (۷) نہایت لطیف کہانیاں از نامور ادیب محمد عمر نور الٰہی صاحب۔ قیمت صرف ۸

چینی قزاق
چین میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں موتیوں کی ہوس میں بے گناہ بیوی کا قتل گوروں کی گت۔ انتقام اور ہوس۔ زمانہ سازی کی کارستانیاں بہت دلچسپ اور عبرت انگیز قصہ ہے۔ چینیوں کے عادات و اطوار پر اس سے خوب روشنی پڑتی ہے۔
قیمت عہ

الہامی افسانے

قرآنی قصص وحکایات نہایت دلچسپ درس آموز افسانوں کے پیرایہ میں ہزاروں نصائح کا مجموعہ۔ پچھلی قوموں کی معاشرت اور تمدن وغیرہ کا ہو بہو نقشہ بہت عمدہ کتاب ہے۔ طباعت وغیرہ اعلیٰ۔ مجلّد مطلّا۔
قیمت حصہ ۱ و ۲ مکمل صرف ۶

الحمرا کے افسانے

مشہور امریکن مصنف واشنگٹن ارونگ کی شہرۂ آفاق تصنیف جسمیں ہسپانیہ کے مسلمان بادشاہوں کے عہد کا مرانی کی تصویر افسانوں کے پیرایے میں کھینچی گئی ہے۔ قیمت ۶

انگریزی افسانے

دنیا کے شاہکار افسانوں کا دوسرا حصہ۔ قیمت عہ

افسانہائے عشق

جناب حامد علیخاں صاحب ہمایوں کے دلچسپ افسانوں کا دلکش مجموعہ
قیمت عہ

چینی وجاپانی افسانے

مشرق بعید کے ممالک کے چیدہ قصص عشق کا مجموعہ .... قیمت ۹

دلگداز افسانے

حضرت کوثر چاندپوری کے بہت موثر افسانوں کا مجموعہ
قیمت عہ ر

دردناک افسانے

۱۶

مشہور ادیب جناب نسیم کے (۱۸) دلچسپ افسانوں کا مرقع جمیل مع مقدمہ حضرت شوکت تھانوی
قیمت صرف ۶

شاہکار افسانے

یہ اردو کے مشہور افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو جمن بکڈپو نے بڑے سلیقہ سے شائع کیا ہے۔ شروع میں حکیم سید آشفتہ لکھنوی کا مقدمہ بھی ہے۔ منشی سدرشن علی عباس حسینی ایم اے، عابد علی صاحب، ڈاکٹر گرلوی، ملا رموزی سبھی اس محفل کی رونق ہیں۔
قیمت عہ ر

غدر دہلی کے افسانے

خواجہ حسن نظامی صاحب کے غدر کے بہت سے دردناک۔ اور حسرت انگیز حادثات وواقعات افسانوں کے انداز میں لکھے ہیں۔ بہت سی کارآمد معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ ۱۲ حصے۔

حصہ	نام	قیمت
حصہ اول	بیگمات کے آنسو	۸ عہ
حصہ دوم	انگریزوں کی بپتا	۸ ر
حصہ سوم	محاصرہ دہلی کے خطوط	۴ ر
حصہ چہارم	بہادر شاہ بادشاہ کا مقدمہ	۶
حصہ پنجم	گرفتار شدہ خطوط	عہ ۴ ر
حصہ ششم	غدر دہلی کے اخبار	۴ ر
حصہ ہفتم	غالب کا روزنامچہ	۱۲ ر
حصہ ہشتم	دہلی کی جانکنی	عہ ر
حصہ نہم	دہلی کا آخری سانس	۸ عہ
حصہ دہم	غدر کی صبح وشام	۸ عہ
حصہ یازدہم	دہلی کی آخری شمع	[illegible]
حصہ دوازدہم	غدر کا نتیجہ	۸

داستان رانی کیتکی

حضرت انشا کی ایک نادر کہانی جسمیں فارسی عربی کا ایک لفظ نہیں اور کمال یہ کہ ہندی بھی ایسی کہ ہر شخص سمجھ لے مع مقدمہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے۔ جدید نستعلیق ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔
قیمت ۴ ر

سب رس

اردو نثر کی ایک قدیم و نایاب کتاب باہتمام وصحت کے التزام سے مع مقدمہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے شائع ہوئی ہے۔ مصنف مولانا وجہی۔ سلطان قطب شاہ کے درباری ادیب تھے۔ یہ حسن ادب کی بڑی رس بھری کہانی ہے۔ حقیقت کو مجاز کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد للعہ

محبت کا انتقام

فطرت نگار مہاشے سدرشن کا ایک عبرت انگیز ڈراما
قیمت عہ

آرٹ اور شاعری کا حسین و جمیل مرقع

سرودِ شباب

جوانی کے موضوع پر اردو شاعری میں ایک عجیب و جدید کتاب

ساغرؔ نظامی کی قدیم تصنیف "شبابیات" ترمیم و تنسیخ کے بعد ادبی مرکز نے "سرودِ شباب" کے نام سے شایع کی ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ دو ابواب کے اضافہ اور اپنی نئی ترتیب کی بنا پر یہ بجائے خود ایک نئی تصنیف ہے۔ پہلا باب "ماہِ نیم ماہ" ہے۔ جس میں شاعر اپنے شباب کا مغنی ہے اور گیارہ برس کے بعد دوسرا باب "مہرِ نیم روز" تصنیف کیا گیا ہے گویا شعور کی سینکڑوں منزلیں طے کر کے وہ اُس مرکز پر پہونچا جہاں جوانی کی خودفریبی، خودنگری میں، خودپرستی، بیخودی میں، اور خودستائی حسن کی مدّاحی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پہلے حصّہ میں شاعر اپنی جوانی کے گیت پوری سرمستی سے گاتا ہے اور دوسرے حصّہ میں حسن کے گیت مکمل سرشاری کے ساتھ الاپتا ہے۔

[...]را باب — "کارگاہِ شباب" ہے یہ شاعر کے تازہ افکار و واردات کا آئینہ ہے۔ کتاب بادہ مشرق سائز پر نہایت حسن و جمال کے ساتھ طبع ہوئی ہے [...]منظر (Background) میں ہر رباعی کی تصویر دیگئی ہے اس التزام نے کتاب کو جوانی کا طلسم زار بنا دیا ہے۔ کاغذ وہی لگایا گیا ہے [...]دہ مشرق میں استعمال ہوا ہے کتابت اعلیٰ ترین اور طباعت بہترین ہے۔ جلدبندی کے بجائے کتاب کو ریشمین فیتہ سے باندھا گیا ہے، ٹائٹل ڈائی کا ہے [...]انشا کا بہترین نمونہ۔ اس کتاب کی تیاری میں ساغر پریس نے اپنے حسنِ انتظام کا کمال دکھایا ہے۔ قیمت خط و کتابت کے ذریعے سے معلوم کیجیے۔

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

یوپی میں خوبصورت صحیح، باشوکت اور بہترین طباعت کا واحد مرکز

ساغر پریس میرٹھ

(شعبۂ طباعت ادبی مرکز میرٹھ)

معیاری طباعت کو پسند کرنیوالے اصحاب کو نوید

ساغر نظامی کے زیر انتظام و نگرانی میرٹھ میں ساغر پریس نے جو کارہائے نمایاں کئے اُن کا بہترین نمونہ "بادۂ مشرق" ہے جسکی طباعت کے متعلق متفقہ طور پر ہندوستان کی یہ رائے ہے کہ اُردو تو کیا انگریزی زبان میں بھی اس شان کی کتاب نہیں دیکھی گئی، اگر آپ اپنی تصنیف یا کوئی کام بغیر کسی دقت و پریشانی کے اپنے مرکز پر مقیم رہ کر چھپوانا چاہتے ہیں تو منیجر ساغر پریس کو مطلع فرمایئے حسب عندیہ و دلخواہ باصحت تیار کرکے آپکو پہونچا دیا جائیگا۔ نہ آپکو کاپیاں دیکھنے کی ضرورت ہوگی نہ پروف ملاحظہ کرینگی۔ خود ساغر نظامی کی نگرانی میں ہر کام پایۂ تکمیل کو پہونچایا جائیگا۔

خط و کتابت کیلئے پتہ :-

احمد یار خاں منیجر "ساغر پریس" گھنٹہ گھر میرٹھ

(پرنٹر و پبلشر ساغر نظامی مطبوعہ ساغر پریس میرٹھ شہر)